صلاح الدین ایوبی ﷫
کی زندگی پر اردو زبان میں پہلی مرتبہ تفصیلی اور تحقیقی کتاب



فاتح و محافظ القدس

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت و کارنامے

(جلد اوّل)

مولانا محمد اسماعیل ریحان
استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی



نام کتاب: سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

مؤلف: مولانا محمد اسماعیل ریحان

طبع جدید: ستمبر 2014ء

ناشر: المنہل بلاک A-1 گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی 021-34612901 | 0321-2000870

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لا إله إلا الله محمد رسول الله

فاتح و محافظ القدس

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ

—— شخصیت و کارنامے ——

صلاح الدین ایوبیؒ کی زندگی پر اردو زبان میں پہلی مرتبہ تفصیلی اور تحقیقی کتاب

جلدِ اوّل

مولانا محمد اسماعیل ریحان

استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

الناشر

المنہل

بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

021-34612901 | 0321-2000870

فہرستِ مضامین

پہلی بات

سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی رحمہ اللہ عالم اسلام کی تاریخ کے وہ عظیم فاتح اور بے مثل قائد ہیں جن کی عظمتوں کو اپنوں ہی نے نہیں غیروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ سلطان ایوبی کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ جہاں تک اسلامی تاریخ کا تعلق ہے، میرے خیال میں مسلمان بادشاہوں میں سے شاید ہی کسی کو اتنی عظمت، مقبولیت اور محبوبیت نصیب ہوئی ہو جتنی سلطان کو۔

سلطان صلاح الدین ہر اسلامی مجاہد کے لیے اسوہ ہیں، ہر مسلمان قائد کے لیے ایک نمونہ ہیں، ان کی زندگی ایک عالم کے لیے بھی مشعل راہ ہے اور ایک سپاہی کے لیے بھی۔ ان کے حالات میں ایک حکمران کے لیے بھی رہنمائی کے اسباق ہیں اور ایک ماتحت کے لیے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان کی زندگی کا ہر ورق ایک نصیحت اور ایک پیام ہے جس کو اپنا کر ہم اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔ سلطان ایوبی کو دیگر سلاطین میں یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ ان کے حالات کو ان کے دور کے وقائع نگاروں نے نہایت تفصیل سے محفوظ کیا ہے۔ میرے علم کے مطابق عالم اسلام کے کسی اور حکمران کے حالات اتنی وضاحت اور جزئیات کے اس قدر احاطے کے ساتھ نہیں لکھے گئے۔ پھر خوش قسمتی سے یہ تمام اصل ماخذ اس دور سے آج تک محفوظ چلے آئے ہیں اور بعد والے ان سے مسلسل استفادہ کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے سلطان ایوبی پر کام لیے ماخذ تھوڑی سے تلاش سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ "شیر خوارزم" کے پیش لفظ میں راقم نے سلطان جلال الدین کے احوال کی چھان بین کے لیے جس دردسری کا ذکر کیا تھا، سلطان صلاح الدین ایوبی پر کام کے دوران ویسی اعصاب شکن صورتحال سے سابقہ نہیں پڑا۔

ماخذ کی دستیابی سے فائدہ اٹھا کر سلطان ایوبی کی ذات پر بعد میں بے شمار کتب لکھی گئی ہیں خاص کر عالم عرب میں گزشتہ تین چار دہائیوں میں اس موضوع پر بہت عمدہ کام ہوا ہے۔ کئی یورپی ناشروں کا کاروبار بھی سلطان پر لکھی ہوئی کتب کے دم سے چل رہا ہے۔ فلسطین، شام، مصر، عراق اور سرزمین حجاز کے نوجوانوں میں آج بھی سلطان ایوبی کی مقبولیت دورِ حاضر کے کسی لیڈر یا سیاست دان سے کہیں

زیادہ ہے۔ نوجوان سلطان ایوبی کی زندگی پر لکھی گئی کتب ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور راہِ حق میں قربانیاں دینے کے لیے پرعزم ہوتے ہیں۔ اسرائیل کا ہر ظلم انہیں سلطان ایوبی کی یاد دلاتا ہے اور وہ ان مظالم کا جواب دینے کے لیے سلطان کے طرزِ حیات کو رہنما بناتے ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ کی بازیافت کے لیے وہ سلطان ایوبی کا دیا ہوا سبق دہرانے کے لیے تیار ہیں جس سے اسرائیل اور امریکا پر لرزہ طاری ہے۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو زبان اس سلسلے میں بانجھ دکھائی دیتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں گزشتہ چالیس پچاس برس سے جہاں تاریخِ اسلام کا شعبہ بے اعتنائی کا شکار ہے، وہاں تاریخ کا یہ عظیم کردار بھی اہلِ علم کی توجہ سے محروم اور جاہل قلم کاروں کی خامہ فرسائیوں سے خراشیدہ ہے۔ تاریخ کی ابجد تک سے ناواقف داستان نگار تاریخی میدان میں اس خلا کو بھانپ چکے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایک مسلم نوجوان کی سلطان ایوبی سے عقیدت کا بھی اندازہ ہے لہٰذا انہوں نے من گھڑت افسانوں کو سلطان ایوبی کی تاریخ کے نام پر شائع کرنا اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج تاریخ کا کوئی پیاسا کتابوں کی مارکیٹ میں جاتا ہے تو اسے سلطان صلاح الدین ایوبی کے حالات پر بے سروپا داستانیں ملتی ہیں جنہیں سچ تصور کر کے وہ تاریخ کے بارے میں اس سے زیادہ جاہل ہو جاتا ہے جتنا وہ ان کا مطالعہ کرنے سے پہلے تھا۔ اس کے دل و دماغ میں تاریخِ اسلامی کا باعظمت تصور مسخ ہو جاتا ہے اور حلال و حرام کے تصورات تک پامال ہونے لگتے ہیں۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سلطان ایوبی کی جنگوں کی تفصیل تلاش کرنے والے اکثر حضرات التمش نامی مصنف کی ''داستان ایمان فروشوں کی'' پڑھا کرتے ہیں جو سراسر من گھڑت واقعات اور خود ساختہ حوالوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تین جلدوں میں فقط گنتی کے کچھ صفحات ہیں جنہیں تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ باقی علی بن سفیان، البرق، سیف اللہ اور ناجی جیسے فرضی کرداروں پر مشتمل طبع زاد افسانے ہیں جنہیں نہایت ڈھٹائی کے ساتھ مسلم اور مغربی مؤرخین کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس تصنیف میں ذکر کردہ تمام مسلم اور نصرانی جاسوس مرد اور لڑکیاں اور ان سے منسوب تمام واقعات فرضی ہیں۔ تاریخ میں ان کے متعلق ایک شوشہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مگر افسوس کہ تاریخ سے ناواقف لوگ ایسی خرافات کو سچ یقین کیے ہوئے ہیں۔ اس مصنف کی ''تاریخ دانی'' کا عالم یہ ہے وہ کہیں سلطان ایوبی کو ریجنالٹ (ریجی نالڈ) جیسے گستاخِ رسالت سے معانقہ کرتے دکھاتے ہیں، کہیں اسپین سے اسلام کا پرچم سلطان ایوبی سے پہلے ہی اترا ہوا بتاتے ہیں۔ جگہ جگہ سلطان نورالدین زنگی کو بغداد کا حکمران ظاہر کرتے ہیں۔ سلطان کی زبانی جمعے کے خطبے میں خلفاء کا نام لینا ممنوع قرار دلواتے

ہیں اور سلطان کی جانب سے کئی کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت کا قانون جاری کرواتے ہیں۔

حالانکہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سلطان نے زندگی میں ریجنالٹ کو ایک ہی بار دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اس کی گردن اڑادی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسپین سے اسلام کا پرچم سلطان سے پہلے نہیں ان کی وفات کے تین سو آٹھ سال بعد اترا تھا...... اور یہ کہ نورالدین زنگی بغداد کے نہیں حلب اور دمشق کے حکمران تھے...... اور یہ کہ سلطان ایوبی نے خود بڑے اہتمام سے خلفاء کا نام خطبے میں جاری کرانے کی رسم شروع کی تھی...... اور یہ کہ خود سلطان کے اپنے نکاح میں بیک وقت تین تین چار چار بیویاں رہی تھیں جن سے ان کے بیس بیٹے تھے۔

''داستان ایمان فروشوں کی'' کا مکمل تنقیدی جائزہ لینا میرے اہداف میں شامل ہے اور ان شاء اللہ آپ اس بارے میں جلد خوشخبری سنیں گے۔ مگر اس سے پہلے ایک ایسی تصنیف کی سخت ضرورت محسوس ہورہی تھی جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے حالات کو مکمل امانت، ثقاہت اور تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے لائے اور لوگوں کو جہالت کی رو میں اندھا دھند بہنے سے بچائے۔

زیرِ نظر کتاب اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔ یہ سلطان ایوبی کی سیرت اور کارناموں کو پوری سچائی دیانت اور تحقیق سے پیش کرتی ہے۔ ان کے ابتدائی حالات سے لے کر ان کی جدوجہدِ آزادیٔ اقصیٰ، تیسری صلیبی جنگ کے معرکوں، سلطان کی شب و روز کی مصروفیتوں اور ان کی گفتار و کردار کی جھلکیوں کو سب سے زیادہ ثقہ راویوں اور مستند ترین کتابوں کے حوالے سے آپ کے سامنے لاتی ہے۔ یہ اس دور کے سیاسی و عسکری پس منظر کے بارے میں بھی مفصل معلومات دیتی ہے اور یورپی بادشاہتوں کی سیاہ کاریوں اور مکروفریب کا پول بھی کھولتی ہے۔

اس کاوش کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں:

1- واقعات کی تحقیق میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی مگر انداز مباحثانہ نہیں...... واقعات نگاری کا سا ہے...... ایسا کہ قارئین خود کو اس قدیم ماحول میں چلتا پھرتا محسوس کریں...... اسے دلچسپی سے پڑھیں ...... اس میں کھو جائیں...... یوں واقعات کو یاد رکھنے کے لیے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑے......

2- واقعات کو کڑی در کڑی جوڑا گیا ہے...... مگر اس ربط کو الفاظ میں واضح نہیں کیا گیا...... بس انداز بیان ایسا رکھا گیا ہے کہ واقعات میں بہاؤ محسوس ہو۔ قارئین خود بخود ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کا سفر کرتے رہیں۔

3- ہجری اور شمسی تاریخوں کے اندراج کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس سے بعض اوقات

عبارت بوجھل ہونے لگتی ہے......اور کہیں کہیں ڈائری کا سا رنگ محسوس ہوتا ہے......مگر اسے گوارا کرلیا جائے......کیونکہ اس وقت عربی، انگریزی اور اردو سمیت کسی زبان میں کوئی ایسی تصنیف نہیں جو سلطان کے حالات کو زمانے کی اتنی واضح اور مفصل ترتیب سے بیان کرتی ہو۔ یہ تصنیف بعد والوں کے لیے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھے گی......اور محققین کو اس کلفت سے نجات دے گی۔

4- کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد القدس پر بیرونی طاقتوں کے قبضے سے شروع ہوتی ہے اور عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی، شیر کوہ اور نجم الدین ایوبی جیسے مجاہدوں کی جدوجہد سے گزرتے ہوئے سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں قبلہ اوّل کی بازیابی پر ختم ہوتی ہے۔ دوسری جلد بیت المقدس کی آزادی کے بعد مغربی طاقتوں کے عالم اسلام پر اس متحدہ حملے کی تفصیل پر مشتمل ہے جسے تاریخ ''تیسری صلیبی جنگ'' کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ حصہ سلطان کی وفات اور ان کے بعد برپا ہونے والی صلیبی جنگوں کے مختصر جائزے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

5- سلطان کی زندگی میں کئی بڑے موڑ آتے رہے۔ ان کی جدوجہد کئی مراحل پر مشتمل رہی۔ اس تصنیف میں ہر مرحلے کو ایک حصہ بنادیا گیا ہے۔ پہلی جلد پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور دوسری جلد چار حصوں پر۔

6- ''شیر خوارزم'' کی بہ نسبت اس داستان میں مذکور افراد و کردار خاصے زیادہ ہیں اور زمانہ بھی تقریباً دوگنا۔ شیر خوارزم ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے وسط تک کے واقعات کو سموئے ہوئے ہے جس میں اصل زمانہ سلطان جلال الدین کے جہاد کے بارہ سالوں کا ہے۔ مگر زیرِ نظر تصنیف پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں قبلہ اوّل پر صلیبی قبضے سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں آٹھویں صلیبی جنگ تک تقریباً دو صدیوں کے اہم حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ پھر اس میں اصل حصہ جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے دورِ اقتدار اور ان کی جدوجہد کا ہے تقریباً پچیس برس تک کو محیط ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی ضخامت بھی زیادہ ہے اور شخصیات و کردار بھی یہاں بکثرت ہیں جو ہر پانچ دس سال بعد کے حالات میں بدل جاتے ہیں۔ اس لیے راقم نے ہر حصے کے شروع میں اس میں مذکور شخصیات کی فہرست مع مختصر تعارف دے دی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے واقعات کو سمجھنے میں بہت سہولت رہے گی۔

7- تاریخ کا اصل فائدہ اس سے عبرت اور سبق حاصل کرنا ہے۔ اس لیے ہر حصے کے آخر میں، اس میں مندرج واقعات سے ملنے والے اسباق کو ''اسباقِ تاریخ'' کے نام سے پیش کردیا گیا ہے۔

8- ہر حصے کے اہم واقعات کو الگ الگ باب کی شکل دی گئی ہے اور ہر باب کے آخر میں حوالہ جات دیے گئے ہیں۔ بعض حوالے عبارت کے اندر بھی موجود ہیں۔

9- جلد اوّل کے آخر میں ''اختتامیہ'' کے عنوان سے چند صفحات ہیں جن میں اگلی جلد کے واقعات کا خلاصہ دے دیا گیا ہے۔ تا کہ اگر کبھی کسی شخص کے ہاتھ صرف ایک ہی جلد لگے تو وہ بالکل تشنہ نہ رہ جائے۔ بعد کے ضروری واقعات کا اجمالی علم اسے ضرور ہو جائے۔

اسی طرح جلد دوم کے شروع میں ابتدائیہ میں جلد اوّل کے اہم واقعات کا خلاصہ دے دیا گیا ہے تا کہ اگر کوئی شخص ایک وقفے کے بعد دوسری جلد پڑھنا شروع کرے تو پہلی جلد کے واقعات ذہن میں تازہ ہو جائیں۔ یا اگر کوئی دوسری جلد ہی سے مطالعہ شروع کرے تو اسے سابقہ واقعات کا اندازہ ہو جائے۔

10- دوسری جلد کے آخر میں ''اختتامیہ'' کے عنوان سے القدس پر یہودیوں کے قبضے کے بارے میں ضروری حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے تا کہ القدس کی آزادی کے حوالے سے ہم اپنی کارکردگی کا جائزہ لیں اور اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کریں۔

11- کوئی بات خود ساختہ نہیں۔ ہر چیز کا پورا پورا حوالہ موجود ہے..... بعض اوقات ایک واقعے میں جگہ جگہ حوالہ جاتی اشارے ملیں گے۔ اس کی وجہ یہ کہ بہت سے واقعات اصل ماخذ میں ایک مربوط شکل میں نہیں۔ کچھ مناظر ایک راوی نے بیان کیے ہیں، کچھ دوسرے نے۔ راقم نے منتشر ٹکڑوں کو جمع کر کے مکمل تصویر بنائی ہے جس میں مبالغہ آرائی ہے نہ ملاوٹ۔ ہر بات مستند حوالوں سے پیش کی جائے۔ اکثر مواد انہی ماخذ سے لیا ہے جو سلطان کے ہم عصر و حاضر باش وقائع نگاروں یا سلطان کے قریبی دور کے مؤرخین نے مرتب کیے ہیں۔ اگر چہ قریبی زمانے میں سلطان پر لکھی گئی بہت سی عربی تصانیف اس وقت دستیاب ہیں مگر میں نے چند مقامات کے سوا کوئی واقعہ ان کے حوالے سے نقل نہیں کیا بلکہ اصل قدیم ماخذ کی عبارتیں کشید کر کے ہی تمام واقعات کو ترتیب دیا ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قریبی دور کی کتب کی بعض اغلاط بھی سامنے آگئیں اور میں ان کے اعادے سے بچ گیا۔

12- یورپی بادشاہوں اور صلیبی قائدین کی سرگرمیوں سے متعلق میں نے قریبی دور کی بعض کتب سے استفادہ کیا کیونکہ ایسی بعض تفاصیل عربی کتب میں نہیں ملتیں اس لیے صلیبیوں کے حالات سے متعلق بہت سی باتیں میں نے اسٹینلے لین پول کی ''صلاح الدین ایوبی'' اور ہیرلڈ لیمب کی

''کروسیڈز'' سے نقل کی ہیں۔ کچھ چیزیں ہملٹن اور ولیم آف ٹائر کی ہسٹری سے لی ہیں۔ وکی پیڈیا سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح کی کچھ شہادتیں سراج الدین احمد کی حیات صلاح الدین سے لی ہیں جو انہوں نے زیادہ تر تاریخ مجاڈ سے نقل کی ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ بھی لیا ہے ان کا ماخذ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی قدیم عربی کتب ہیں۔

13- مستشرقین کی تاریخی خیانتوں کا موقع بہ موقع جائزہ لیا گیا ہے۔

14- چند مسلم مورخین کو بھی بعض مقامات پر کچھ غلط فہمیاں ہوئی تھیں۔ وہاں روایت و درایت کی روشنی میں صحیح بات سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک بہت کام کی بات۔ تاریخ کی مشہور کتب کو آج کل مختلف ادارے نت نئے انداز سے چھاپ رہے ہیں۔ مثلاً البدایہ والنہایہ کوئی چھ جلدوں میں کوئی آٹھ جلدوں میں اور کوئی بارہ جلدوں میں چھاپ رہا ۔اسی طرح تاریخ ابن خلدون چھ جلدوں میں بھی ہے اور دس جلدوں میں بھی۔ اس سے صفحات اور جلدوں کی تعداد میں بہت فرق پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا اکثر اوقات حوالے تلاش کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ جو واقعہ آپ فلاں صفحہ نمبر اور فلاں جلد نمبر میں تلاش کر رہے ہوتے ہیں وہ نئی اشاعت میں کسی اور جلد یا کسی اور صفحہ نمبر پر درج ہوتا ہے۔ اگر یہ دشواری پیش آئے تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ واقعات کو تاریخ کے حساب سے تلاش کریں۔ مثلاً بیت المقدس کی فتح سے متعلق کسی بات کا حوالہ چیک کرنا ہے۔ آپ معلوم کریں کہ یہ واقعہ کس سن کا ہے۔ جب آپ دیکھیں کہ یہ 583ھ کا ہے تو آپ البدایہ والنہایہ، الکامل فی التاریخ یا کتاب الروضتین کی فہرست پر جا کر دیکھیں کہ 583ھ کے حالات کس صفحے پر ہیں۔ اس طرح تھوڑی سی دیر میں حوالہ چیک کیا جا سکتا ہے۔

بہر کیف راقم سلطان کے یہ حالات پورے اعتماد کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ اگر قریبی دور میں لکھی گئی کتب پر اکتفا کر کے کام کیا جاتا اور وہ بھی عام سے انداز میں ......تو شاید ڈیڑھ دو سال میں فراغت ہو جاتی مگر اصل ماخذ سے تحقیق کرنا اور پھر تاریخ و ادب کو جمع کرنا محنت طلب شے ہے۔ اس لیے اس کاوش پر تقریباً چھ سال صرف ہو گئے۔ کام کا آغاز کراچی میں شعبان 1427ھ (اگست 2006ء) میں ہوا تھا۔ مسودے کی تکمیل 6 ربیع الاول 1432ھ (10 فروری 2011ء) کو ہوئی تھی۔ نظر ثانی اور اضافوں کا سلسلہ 16 رمضان المبارک 1433ھ (6 اگست 2012ء) کو اختتام پذیر ہوا۔ بعض پہلوؤں پر مزید تحقیق اور کمپوزنگ کی تصحیح سے جمعہ 15 رجب 1434ھ (24 مئی 2013ء) کو فارغ ہوا۔ حوالوں کی جانچ پڑتال کا کام 18 ربیع الاول 1435ھ (20 جنوری 2014ء) کو پورا ہوا۔

اس طرح سات سال سات ماہ میں یہ کام تکمیل کو پہنچا۔

میں ان دنوں کو اپنی زندگی کے بہترین دن سمجھتا ہوں جو اس مطالعے اور تصنیف کے باعث چھٹی صدی ہجری کے اس عظیم مجاہد کے دوش بدوش گزرے ہیں۔ ان شاء اللہ تاریخ کے ان صفحات کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ بھی خود کو سلطان رحمہ اللہ کے ہم رکاب محسوس کریں گے جس کے بعد یقینا آپ کے خیالات واحساسات کو ایک نیا رخ اور جذبات کو ایک نئی توانائی ملے گی۔ یہی میرا مدعا اور یہی میری محنت کا حاصل ہے۔

والسلام
محمد اسماعیل ریحان
ادارہ علوم القرآن
خالق داد تحصیل حسن ابدال

باب:1

ہلال اور صلیب

488ھ(1095ء)

......تا......

563ھ(1167ء)

شخصیات

پیٹر (پطرس) .... یورپی راہب

پوپ اربن .... پہلی صلیبی جنگ کا داعی

قلیج ارسلان .... ایشیائے کوچک کا حکمران

(یہ قلیج ارسلان الگ ہے اور سلطان ایوبی کے دور کا قلیج ارسلان الگ)

ملک شاہ .... سلجوقی بادشاہ

تاج الدین تتش .... ملک شاہ کا بھائی

مستعلی .... مصر کا عبیدی حکمران

بدر جمالی .... مصری حکمران کا وزیر

مسترشد باللہ .... بغداد کا عباسی خلیفہ

عماد الدین زنگی .... موصل کا حاکم

نور الدین زنگی .... عماد الدین زنگی کا بیٹا، حاکم حلب

قطب الدین مودود .... نور الدین زنگی کا بھائی

سیف الدین غازی .... نور الدین زنگی کا بھائی

(یہ سیف الدین الگ ہے اور سلطان ایوبی کا معاصر سیف الدین غازی الگ)

شاذی .... صلاح الدین یوسف کا دادا

بہروز .... شاذی کا بغدادی دوست

نجم الدین ایوب .... صلاح الدین کا والد

شیرکوہ .... صلاح الدین کا چچا

فصل:1

پطرس، پیٹر ڈی ہرمٹ

بیخ بستہ یورپ کے تنگ وتاریک اور پر ہجوم بازاروں میں اس قدر رش اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ ان دنوں چوکوں اور بازاروں میں خچر پر سوار ایک پستہ قد سیاہ فام فقیر چیختا چلاتا دکھائی دیتا تھا۔ لوگ دم سادھے اس کی پکار سنا کرتے تھے۔ اس کی آواز میں ایسا درد تھا کہ بہت سے افراد دھاڑیں مار مار کر رو دیتے تھے۔ اس کی زبان شعلے اگلتی تھی، اس کے ایک ایک لفظ سے سامعین کے دل ودماغ جھنجھنا اٹھتے تھے۔ یہ فقیر انہیں بتاتا تھا کہ مسلمان نصرانیوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھاتے ہیں، وہ صلیب اور مرقدِ مسیح کی کس کس طرح توہین کر رہے ہیں۔ وہ انہیں سمجھاتا کہ یروشلم ان کی میراث ہے جسے واپس لینا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ یہ دیوانہ فرانس کا ایک راہب پیٹر ڈی ہرمٹ تھا جسے عرب مؤرخین "پطرس" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ شروع سے شدت پسند اور تند مزاج تھا۔ خود بعض یورپی مؤرخین اسے پاگل اور جنونی قرار دیتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے لوگ رہتی نسلوں تک کو شدید ترین المیوں اور ناقابل تلافی اجتماعی نقصانات سے دوچار کرتے چلے آئے ہیں۔

پیٹر ڈی ہرمٹ 484ھ (1092ء) میں راہبوں کی ایک جماعت کے ساتھ القدس کی زیارت کے لیے گیا تھا۔ دورِ خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں نے قیصر کو شکست دے کر نصرانیت کو بحیرۂ روم کے پار دھکیل دیا تھا۔ تب سے فلسطین کے مقاماتِ مقدسہ مسلمانوں کی تحویل میں تھے۔ القدس ہی میں نصرانیوں کی خودساختہ مرقدِ مسیح بھی تھی جسے ان کے سب سے مقدس مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے نصرانیوں کی ان مذہبی یادگاروں کو ان کے حال پر رہنے دیا تھا۔ عیسائی اپنے اس مذہبی مرکز کی بازیابی کا خواب صدیوں سے دیکھ رہے تھے مگر ان کا مسلمانوں پر کوئی بس نہیں چلتا تھا۔

نصرانیوں کو مسلم معاشرے میں کوئی تکلیف لاحق نہیں تھی۔ ان کے گرجے بھی محفوظ تھے اور جان ومال بھی۔ مسلم امراء کے ہاں کسی فن میں مہارت رکھنے والے عیسائی افراد کو باعزت مناصب بھی دیے

جاتے تھے۔ ہارون الرشید کے دور میں عیسائی بادشاہ شارلیمان کے ساتھ بیت المقدس آنے والے عیسائی زائرین کے حوالے سے جو معاہدہ کیا گیا تھا، مسلمان اس کی سختی کے پابندی کرتے رہے۔ ارضِ مقدس کو یورپی سیاحوں اور زائروں کے لیے کبھی بند نہیں کیا گیا بلکہ زیارت کے لیے آنے والے نصرانی تمام سہولتیں ملنے کے باوجود اپنے مذہبی مرکز کو مسلمانوں کے قبضہ میں دیکھ کر جلتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مالداری اور خوشحالی دیکھ کر بھی انہیں شدید حسد ہوتا تھا اور وہ یہ جذبہ لے کر اپنے وطن کو لوٹتے تھے کہ کسی طرح اس سرزمین کی دولت اور وسائل پر قابض ہو جائیں۔ صدیوں سے پلنے والا یہ حسد، جذبہ انتقام اور ہوسِ مال و ملک گیری صلیبی جنگوں کے اصل محرکات تھے۔

صلیبی جنگوں کے باقاعدہ آغاز سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ہلال وصلیب میں شدید تناؤ کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ چوتھی صدی ہجری میں عباسی خلافت بے اختیار ہو کر دیلمی شیعہ امراء کے زیرِ اثر آ چکی تھی اور عالم اسلام کی وحدت ختم ہو گئی تھی۔ ریاستیں خودمختار، منتشر اور کمزور تھیں۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر قیصرِ روم کا سالار نیکوفورس (نقفور) شام کے ساحل پر قابض ہو گیا۔ سیف الدولہ نامی ایک حاکم اس سے لڑتا رہا مگر 356ھ میں اس کی وفات کے بعد نصرانیوں کی ہمت بڑھ گئی اور 361ھ میں وہ دیار بکر تک قابض ہو گئے۔ یہ لڑائیاں صلیبی جنگیں نہیں کہلاتیں مگر ان کی تمہید مانی جاتی ہیں۔ نصرانیوں کی یہ فتوحات پائدار ثابت نہ ہوئیں اور مسلمانوں نے اپنے علاقے کچھ مدت بعد آزاد کرا لیے مگر اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمان اب نصرانیوں کے مقابلے میں ناقابل شکست قوت نہیں رہے۔

اس دوران عیسائی زائرین کی بیت المقدس میں آمد جاری تھی۔ انہوں نے مقدس سرزمین کے آداب کو فراموش کر کے جگہ جگہ اودھم مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے قافلے بنا کر آتے اور بعض اوقات راستے میں پڑنے والے اسلامی شہروں کی انتظامیہ کو تنگ کر کے رکھ دیتے۔ پادریوں نے یروشلم کی زیارت کو دوزخ سے آزادی کا ذریعہ قرار دیا ہوا تھا اس لیے زائرین کے قافلوں میں بڑی تعداد شرابیوں، بدکاروں اور غنڈوں کی ہوتی تھی جو تمام گناہوں سے پاک ہونے کے شوق میں جوق در جوق ادھر کا رخ کرتے تھے مگر وہ خدا خوفی، پرہیزگاری اور ادب و انکسار سے کوسوں دور رہتے۔ راستے بھر ناچتے گاتے، شراب نوشی کرتے اور باجے بجاتے القدس میں داخل ہوتے۔ جب ان کی خرمستیاں حد سے بڑھ گئیں تو مسلم حکمرانوں نے ان پر کچھ پابندیاں عائد کر دیں اور انہیں مجبور کیا کہ وہ خاموشی اور ادب و احترام کے ساتھ ارضِ مقدس میں آئیں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی بھی کی گئی۔ اس رویے کو عیسائی زائروں نے جبر و تشدد کا نام دے دیا۔

پیٹر راہب جب القدس پہنچا تھا تو ان دنوں بھی زائرین پر کچھ پابندیاں عائد تھیں۔ پیٹر نے ان پابندیوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور تمنا کی کہ کسی طرح یہ مقدس شہر مسلمانوں سے واپس لے لیا جائے۔ القدس کے بشپ (بڑے پادری) نے اسے مسلمانوں کے مظالم کے فرضی قصے سنا کر مزید مشتعل کر دیا۔ جب پیٹر نے بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے جذبے کا اظہار کیا تو بڑے پادری نے جواب دیا: ''یورپی تاجدار ہی آ کر ہمیں نجات دے سکتے ہیں۔''

اس پر پیٹر نے شاہانِ یورپ کو جھنجھوڑنے کی ذمہ داری قبول کی اور بشپ نے اسے یورپی بادشاہوں کے نام خطوط دیے جن میں انہیں شام پر حملے کی دعوت دی گئی تھی۔ پیٹر یہ خطوط لے کر اٹلی کے دارالحکومت روم میں کلیسا کے سربراہ پوپ سے ملا۔ صدیوں سے کلیسا دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک مشرقی کلیسا تھا جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ دوسرا مغربی کلیسا تھا جس کا مرکز روم تھا۔ دونوں میں صدیوں سے عداوت چلی آ رہی تھی مگر مسلم دشمنی میں دونوں ایک تھے۔

پیٹر راہب روم کے پوپ اربن ثانی سے ملا جو حد درجے متعصب انسان تھا۔ اس نے القدس کی بازیابی کے خیال کو بڑی دلچسپی سے سنا اور پیٹر کو گلے لگا کر اسے یہ مہم سونپی کہ وہ یورپ کے کونے کونے میں جا کر عوام اور حکام کو شام پر حملے کی دعوت دے۔ بس پھر کیا تھا!! پیٹر یورپ کے دورے پر نکل گیا اور اس نے پورے یورپ کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسے یروشلم میں یسوع کی قبر سے یہ پکار سنائی دی تھی:

''اٹھ! میرے پیروکاروں کے مصائب کا چرچا کر، یہ وقت ہے کہ میرے خدا کی نصرت ہو اور مقدس مقامات آزاد ہوں۔''[۵]

صلیبی جنگ کی آگ ❊ پیٹر کے ان دعووں اور شعلہ نوا تقاریر نے اہلِ یورپ کو مشرق پر ٹوٹ پڑنے کے لیے اس طرح ابھارا کہ لگتا تھا ان کے پاس جینے کا کوئی اور مقصد ہی نہیں ہے۔ خود یورپی حکمران بھی اس مہم میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ کچھ مدت پہلے 479ھ (1086ء) میں مراکش کے حکمران یوسف بن تاشفین نے اسپین میں نصرانیوں کو عبرتناک شکست دی تھی جس کا بدلہ لینے کے لیے عیسائی موقعے کے متلاشی چلے آ رہے تھے۔ پھر اس دوران 484ھ (1091ء) میں بحیرہ روم میں واقع اسلامی ملک صقلیہ (سسلی) پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے جس کی وجہ سے انہیں مسلمانوں کو ایشیا کے میدانوں میں بھی شکست دینے کی امید ہو چلی تھی۔

۵ حیات صلاح الدین ایوبی، ص: 10 تا 15، ماہر وب الصلیبیہ للفرری العلوی: 45

اِدھر یورپ میں یہ سوچ پروان چڑھ رہی تھی۔ اُدھر قسطنطنیہ کے شہنشاہ ''ایلکسی اس'' نے بھی روم سے سابقہ اختلافات فراموش کر کے مسلمانوں کے خلاف اتحاد کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی۔ اصل میں قسطنطنیہ کو سلجوقی ترکوں سے خطرہ لاحق تھا۔ 463ھ (1071ء) میں نامور سلجوقی حکمران الپ ارسلان نے قسطنطنیہ کے قیصر ارمانوس دیوجانس کو ایسی شکست دی تھی کہ قسطنطنیہ کا دم لبوں پر آ گیا تھا۔ اس کے بعد سے قسطنطنیہ کے ہر تاجدار کو مسلمانوں کے حملے کا دھڑکا لگا رہتا تھا خصوصاً سلجوقیوں کے مرد جری ملک شاہ کی ہیبت سے قسطنطنیہ برسوں کانپتا رہا تھا مگر جن دنوں پیٹر ڈی ہرمٹ القدس کا سفر کر کے لوٹا، ملک شاہ کی اچانک وفات ہو گئی۔ یہ شوال 485ھ (نومبر 1092ء) کا واقعہ ہے۔

ملک شاہ کے رخصت ہوتے ہی شام کی سلجوقی حکومت کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ قیصر 'ایلکسی اس' نے اسے بہترین موقع تصور کرتے ہوئے پوپ اور یورپی حکمرانوں کو خطوط لکھ کر انہیں جلد از جلد شام پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے خطرہ ظاہر کیا کہ اگر یورپ ایشیا کے نصرانیوں کی مدد کو نہ آیا تو ترک قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے ملک کی دوشیزاؤں کے حسن و جمال کی تصویر کشی کرتے ہوئے یورپی جنگجوؤں کو امید دلائی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کر کے ان حسیناؤں کے نہ صرف دل جیت سکتے ہیں بلکہ انعام میں ان کے جسم بھی پا سکتے ہیں۔ فرانسیسی مورخ میچاؤ اعتراف کرتا ہے کہ قیصر کی ان گھٹیا ترغیبات نے مغرب کے جنگ جوؤں کے جذبات کو متحرک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یورپی نوابوں اور پادریوں کی اس مہم میں دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جاگیردارانہ نظام کی زیادتیوں اور کلیسا کی بے جا سختیوں کی وجہ سے لوگوں میں حکومتوں اور مذہب سے بیزاری پیدا ہو چکی تھی۔ یورپ کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے محسوس کیا کہ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کی توجہات کا رخ بیرونی معاملات کی طرف پھیر دیں تو اندرونی مسائل فراموش ہو جائیں گے اور ان کی بدعنوانیوں کے خلاف کسی موثر احتجاج کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔

اونچے گھرانوں کے عیسائیوں کی اس مہم جوئی میں دلچسپی کا ایک سبب یہ تھا کہ فارغ اور بے مقصد زندگی گزارنے والے کم ثروت عیسائی شہزادوں کو جاگیروں کے لیے نو آبادیات کی تلاش تھی جبکہ یورپی تاجر نئی منڈیوں کی جستجو میں تھے۔ مسلمانوں کے خلاف جنگوں کا سلسلہ ان مقاصد کے حصول کا اچھا بہانہ بن سکتا تھا۔ عام لوگ پادریوں کے بھڑکانے کی وجہ سے اس مہم میں شرکت پر آمادہ ہوئے۔ دراصل عیسائیت کے ''پیدائشی گناہ'' کے تصور نے ہر شخص میں احساسِ جرم پیدا کر رکھا تھا اور حقیقتاً بھی عیسائی معاشرے میں اخلاقی جرائم کا کوئی حد و شمار نہ تھا۔ پادریوں نے لوگوں کو ورغلانے کے لیے اعلان کر دیا کہ اس جنگ

میں شرکت سے آدمی گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح صلیبی قائدین اپنے اصل سیاسی و مادی مقاصد کو اوجھل رکھ کر جنگوں کو مذہبی لبادہ اوڑھاتے ہوئے عوام کو مشتعل کر رہے تھے۔ [۹]

عالم اسلام کا سیاسی انتشار:- ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ صلیبی جنگ جوؤں کا حوصلہ بڑھانے میں دو اور محرکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پہلا محرک مسلمانوں کا بڑھتا ہوا سیاسی انتشار تھا جس کی ابتداء تیسری صدی عیسوی میں عباسی خلافت کی کمزوری سے اور انتہاء شمالی افریقہ کی عبیدی حکومت کے عروج اور ایشیا کے خود مختار سلاطین کی بالادستی پر ہوئی تھی۔ چوتھی صدی ہجری میں عباسی خلافت عملاً بے اختیار ہو چکی تھی اور عالم اسلام درجنوں منتشر حکومتوں کا مجموعہ بن گیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں جب صلیبی جنگیں چھڑیں تو عالم اسلام تین بڑے سیاسی جزیروں میں بٹا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک حصہ وہ تھا جہاں بغداد کے عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس میں حجاز، ایشیائے کوچک، عراق، ایران، خراسان اور ہندوستان کی درجنوں خود مختار ریاستیں شامل تھیں جن میں سلجوقیوں کو سب سے طاقتور مانا جاتا تھا۔ دوسرا حصہ شمالی افریقہ اور مصر کا تھا جہاں شیعوں کے ایک خاندان بنو عبید نے الگ خلافت قائم کی ہوئی تھی۔ یہ خاندان سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کا سخت مخالف تھا۔ تیسرا حصہ مراکش اور اسپین پر مشتمل تھا جہاں مرابطین کی حکومت تھی۔ یہاں عباسی خلفاء کا خطبہ تو پڑھا جاتا تھا مگر عملاً اس علاقے کا باقی عالم اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجموعی طور پر عالم اسلام کے ان تینوں بڑے حصوں میں کوئی ربط وضبط نہیں تھا بلکہ بعض اوقات سیاسی معاملات میں وہ ایک دوسرے کے حریف نظر آتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ انتشار یورپی طاقتوں کی صلیبی جنگوں میں پُرامیدی اور دلچسپی کا بڑا اہم سبب تھا۔

ان جنگوں کا دوسرا بڑا محرک مصر کے حکمران خانوادے بنو عبید کا احمقانہ رویہ تھا۔ وہ عباسی خلافت اور سلجوقی سلاطین کے دشمن تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں سلجوقی ان سے مصر نہ چھین لیں۔ ملک شاہ کے دور میں جب سلجوقی عملداری شام کی سرحدوں تک پھیل گئی تو بنو عبید کے خدشات مزید بڑھ گئے۔ آخر کار عبیدی حکمران مستنصر باللہ نے 462ھ (1070ء) میں صلیبیوں کو شام پر حملے کی دعوت دے ڈالی تاکہ اس کے مخالف سلجوقی کمزور پڑ جائیں۔ مستنصر کو یہ بھی امید تھی کہ صلیبی شام پر قابض ہو کر اس کے اور سلجوقیوں کے درمیان حائل ہو جائیں گے اور مصر سلجوقیوں کی یلغار کے خطرات سے محفوظ ہو جائے گا جو ملک شاہ کے بھائی تاج الدولہ تتش کی قیادت میں شام میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ملک شاہ نے اسے شام کی مہمات سپرد کر کے وعدہ کیا تھا کہ وہ جتنا بھی علاقہ فتح کرے گا وہ اسی کا شمار ہو گا چنانچہ

[۹] حیات صلاح الدین: 15 تا 20، الحروب الصلیبیۃ، ردی المطوی: 44

تتش نے 471ھ (1078ء) تک حلب اور دمشق سمیت شام کے بیشتر علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔ اگرچہ مصری وزیر اعظم بدر جمالی نے فوج کشی کر کے سلجوقیوں کو شام سے نکالنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ 485ھ (1092ء) میں تتش نے حمص بھی فتح کرلیا۔ القدس بھی اسی کے پاس تھا اور اس کی جانب سے امیر ارتق یہاں کا حاکم تھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ پیٹر راہب القدس کی زیارت کر کے واپس جا چکا تھا۔ ادھر قضا و قدر نے مسلمانوں کو ایک ابتلائے عظیم میں ڈالنا طے کر دیا تھا۔ رمضان 485ھ (اکتوبر 1092ء) میں سلجوقیوں کے عظیم بادشاہ ملک شاہ کا انتقال ہوگیا جس کے فوراً بعد اس کے بیٹوں برکیارق، محمود اور محمد میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ اس سے یورپی فرنگیوں اور مصر کے بنو عبید دونوں کو اپنی اپنی جگہ فلسطین پر قبضے کی امنگ پیدا ہوگئی۔ تین سال ہی گزرے تھے کہ بنو عبید کا حکمران مستنصر بھی جس نے ساٹھ سال تک مصر پر حکومت کی تھی 487ھ (1094ء) میں فوت ہوگیا۔ اس طرح مصر کی حکومت بھی کمزور پڑ کر صلیبیوں سے اپنے ملک کا دفاع کرنے کے قابل نہ رہی۔ مستنصر جس نے خود فرنگیوں کو شام پر حملے کی دعوت دی تھی، یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ اس کی اولاد کو بہت جلد اس کی حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور جب صلیبی شام کے ساحلوں پر اتریں گے تو مصر کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

شام میں جب تک ملک شاہ کا بھائی تتش موجود تھا، قبلۂ اول کسی کے لیے بھی تر نوالہ ثابت نہیں ہوسکتا تھا مگر ملک شاہ کی موت سے شروع ہونے والی سلجوقی شہزادوں میں اقتدار کی کشاکشی تتش کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہوئی۔ 488ھ (1095ء) میں اس کے بھتیجے سلطان برکیارق بن ملک شاہ نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہوئی کہ سلطان برکیارق خود بھی شام و فلسطین پر تسلط حاصل نہ کرسکا اور یوں یہ خطہ اقتدار کے حریص امراء کا اکھاڑا بن گیا۔ تتش کے ایک بیٹے رضوان نے حلب پر قبضہ کرلیا، دوسرے بیٹے دقاق نے دمشق کو اپنی مملکت بنالیا۔ انطاکیہ پر ملک شاہ کے پوتے باغستان نے خود مختار حکومت قائم کرلی۔ بیت المقدس تتش کے نائب ارتق کے دو بیٹوں سقمان اور ایلغازی کی تحویل میں رہ گیا۔ اس طرح شام اور فلسطین چھوٹی چھوٹی خود مختار اور کمزور ریاستوں میں بٹ گئے تھے اور یہ تمام ریاستیں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ انہیں صلیبی خطرے کا کوئی احساس نہ تھا جو عن قریب امنڈنے کو تھا۔[1]

غرض صلیبی جنگ کی آگ بھڑکانے والے بڑے اسباب یہ تھے:

---

[1] الحروب الصلیبیۃ للعروسی المطوی:ص16تا20،الکامل فی التاریخ حوادث سن 480ھ تا 485ھ

1- مصر اور شمالی افریقہ پر مسلط بنوعبید کا صلیبیوں کو شام پر حملے کے لیے اکسانا تا کہ ان کے مخالف سلجوقی بادشاہ کمزور پڑ جائیں۔
2- قیصر ارمانوس کی سلطان الپ ارسلان سے شکست فاش کے بعد نصرانیوں کے دونوں بڑے مراکز قسطنطنیہ اور روم کا خوفزدہ ہو کر قریب آنا اور مشرقی اور مغربی کلیسا کا مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جانا۔
3- یوسف بن تاشفین کے ہاتھوں اندلس میں یورپ کے نصرانیوں کو ملنے والی عبرتناک شکست کے بعد عیسائیوں میں بدلہ لینے کا تڑپ پیدا ہونا۔
4- صقلیہ پر نصرانیوں کے قبضے سے مسلمانوں کے خلاف کامیابیوں کی نئی امنگیں ابھرنا۔
5- یورپی شہزادوں کا نئی جاگیروں اور تاجروں کو نئی منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں ہونا۔
6- ملک شاہ کی وفات کے بعد شام کا کئی ٹکڑوں میں بٹ کر نصرانیوں کے لیے تر نوالہ بن جانا۔
7- پادریوں کا صلیبی جنگ میں لوگوں کو مذہبی حوالے سے مشتعل کرنا اور گناہوں کی بخشش کا یقین دلانا۔

کلر ماؤنٹ کانفرنس:٭ اس دوران کہ شام اور فلسطین میں ملک شاہ کے وارث ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے، یورپ میں پہلی صلیبی جنگ کا باقاعدہ فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ ذوالقعدہ 488ھ (نومبر 1095ء) میں فرانس کے شہر کلر ماؤنٹ (Cler Mont) میں ایک عظیم مذہبی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی دعوت پوپ اربن ثانی نے دی تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے امراء، پادریوں اور عام لوگوں کا ہجوم اتنا تھا کہ شہر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ یورپی حکام اور پادریوں کے ذہنوں میں اس جنگ کے ہمہ جہت مقاصد تھے۔ وہ القدس کی بازیابی کے علاوہ اسپین سمیت دیگر مسلم ممالک پر بھی قبضہ کر کے مسلمانوں سے گزشتہ صدیوں کی شکستوں کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی تجارت، دولت، پیداوار، معدنیات، اقتصادی وسائل اور عالمی تجارتی شاہراہوں پر جو عالم اسلام سے گزرتی تھیں قبضہ کرنا ان کا خواب تھا۔

مگر یورپی بادشاہ اور پادری ان مقاصد کو چھپاتے رہے۔ اجلاس کی آخری نشست میں پیٹر دی ہرمٹ نے بڑی اشتعال انگیز تقریر کر کے حاضرین کو شعلہ جوالا بنا دیا۔ پھر پوپ اربن ثانی نے خطاب کر کے امرائے یورپ کو القدس کی بازیابی پر ابھارا۔ حاضرین یروشلم کی بازیابی کے لیے اس قدر پرجوش ہوئے کہ سب کے منہ سے نکلا: ''یہ خدا کی مرضی ہے۔''

پوپ نے کہا: ''ہاں بے شک خدا کی یہی مرضی ہے۔ اسی نے تم کو یہ الفاظ سکھائے ہیں، تم ان کو اپنا جنگی نعرہ بنالو۔''

پھر اس نے صلیب دکھاتے ہوئے اعلان کیا:

''یسوع خود اپنی قبر سے یہ صلیب تم کو پیش کرنے نکلا ہے۔ یہی نشان بنی اسرائیل کے بچھڑے ہوئے بیٹوں کے لیے فوج کے درمیان بلند کیا جائیگا۔ اسی کو اپنے کاندھوں اور سینوں پر آویزاں کرو۔ یہی تمہارے بازوؤں اور پرچموں پر چمکے۔ یہی تمہاری فتح یا شہادت کا ضامن ہوگا۔ یہ تم کو یاد دلائے گا کہ مسیح تمہارے لیے مرا ہے اور تم کو اس کے لیے مرنا ہے۔''

جب پوپ نے بائبل میں مذکور مسیح کے ایک فقرے کو استعمال کرتے ہوئے کہا:

''جو اس جنگ میں صلیب اٹھا کر ساتھ نہیں ہوگا وہ میرا پیروکار نہیں رہے گا۔''

تو حاضرین میں کہرام مچ گیا۔ پوپ کے نائب نے لوگوں سے گناہوں کی معافی کا وعدہ کیا تو سب سجدے میں گر گئے۔ اس جنگ کو کروسیڈ (صلیبی جنگ) کا نام دے دیا گیا۔ لوگوں نے اپنے کپڑوں کو سرخ صلیب سے سجالیا۔

چونکہ پوپ نے اعلان کیا تھا کہ اس جنگ میں شرکت سے آدمی گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا اس لیے پیدائشی گناہ کا عقیدہ رکھنے والے لاکھوں عیسائی جو اخلاقی گناہوں کے احساس تلے دبے ہوئے تھے، اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ولیم اوف ٹائر اہلِ یورپ کے اس جوش وجذبے کا حال یوں لکھتا ہے:

''فقیروں اور تارک الدنیا لوگوں نے اپنے حجروں اور عبادت گاہوں کو چھوڑ دیا جن میں وہ عمر نے کی قسمیں کھا چکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی خدائی ہاتھ ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ عبادت گزار اور درویش جنگلوں اور بیابانوں سے نکل کر صلیبی جنگ میں شریک ہو گئے۔ ناقابلِ یقین بات یہ ہے کہ چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنی خفیہ پناہ گاہوں کو چھوڑ دیا، اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور صلیب لے کر گناہوں کے کفارے کے لیے فلسطین جانے کا عہد کیا۔ یورپ جلاوطنی کی سرزمین معلوم ہوتا تھا جسے ہر شخص چھوڑنے پر آمادہ تھا۔''[1]

بے مقصد زندگی گزارنے والے بہت سے عیسائی شہزادے اور نواب جن کو نئی جاگیروں کے لیے نوآبادیات کی تلاش تھی اور نئی منڈیوں کے متلاشی یورپی تاجر بھی کروسیڈ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے۔ مسلمانوں کے خلاف جنگ ان کے لیے نئی جاگیروں کے حصول اور تجارت کا اچھا بہانہ بن سکتا تھا۔ فرانسیسی مؤرخ لیبان لکھتا ہے:

---

[1] جامع سوانح العدیہ: ص 21، بحوالہ تاریخ ہا ادوار بہ اسلوبیہ فقر ری المطری: 46

"جنت کے حصول کے علاوہ ہر شخص کو اس جنگ میں مال ملنے کا موقع بھی نظر آتا تھا۔ وہ کاشتکار بھی اس میں شریک ہو گئے جو زمین داروں کے غلام تھے اور آزادی چاہتے تھے۔ بڑے خانوادوں کے وہ افراد جو قانونِ میراث سے محروم کر دیے گئے تھے، وہ امراء جنہیں آبائی جائداد سے کم حصہ ملا تھا اور وہ راہب جو خانقاہی زندگی کی مشقتوں سے اکتا گئے تھے اس لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔"[۸]

<u>ڈاکٹر محمد اسد کا تبصرہ</u> ❋ نومسلم ڈاکٹر محمد اسد نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "The road to Makkah" کی تمہید میں لکھا ہے کہ یورپ کی اسلام دشمن نفسیات کا دیباچہ اسی کانفرنس میں لکھ دیا گیا تھا اور یہی اسلام دشمنی تب سے اب تک یورپ کی روح میں رچی بسی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"صلیبی جنگوں سے سارے یورپ کو ایک مشترکہ نصب العین مل گیا، یعنی مسیحیت کا نیم سیاسی اور نیم مذہبی تصور جس نے آخرکار اپنی جگہ پر یورپ کے ثقافتی تصور کو تخلیق کیا۔ جب نومبر 1095ء میں پوپ اربن ثانی نے کلیر ماؤنٹ کے مقام پر اپنی شہرہ آفاق تقریر کے دوران مسیحیوں کو اس "ناہنجار قوم" کے ساتھ برسرپیکار ہونے کے لیے للکارا جس نے ارضِ مقدس پر قبضہ کر لیا تھا تو اس وقت موصوف نے دراصل ذانستہ طور پر مغربی تہذیب کی دستاویز ہی کا اعلان کیا تھا اور اس کا نظریہ پیش کیا تھا۔" (The road to Makkah,p:06)

---

۸ تاریخ اسلام حسن ابراہیم حسن مصری: 4/123، بحوالہ تاریخ یورپ اے جے گرانٹ، ص 355

پہلی صلیبی جنگ

مسلمانوں کی نصرانیوں سے سینکڑوں لڑائیاں ہو چکی ہیں مگر ہر لڑائی کو صلیبی جنگ نہیں کہا جاتا۔ اصطلاح میں صلیبی جنگیں صرف ان لڑائیوں کو کہا جاتا ہے جن کی دعوت نصرانیوں کے مذہبی پیشواؤں اور پادریوں نے دی تھی اور جو صلیب کے نام پر لڑی گئی تھیں۔ یہ جنگیں با قاعدہ طور پر سن 489ھ (1096ء) میں شروع ہوئیں اور ان کا اختتام 690ھ (1291ء) میں ہوا، اس طرح یہ دو صدیوں پر محیط ہیں۔

پہلی صلیبی جنگ کے لیے لشکر تیار ہوئے تو افراد کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کے ایک ساتھ روانہ ہونے میں یہ خطرہ تھا کہ راستے میں خوراک و رسد پوری نہ ہو سکے۔ چنانچہ کئی لشکر بن کر کچھ کچھ مدت کے وقفے سے روانہ ہوئے۔ یلغار کے پہلے مرحلے میں پیٹر راہب تیرہ لاکھ افراد کا مجمع لے کر روانہ ہوا مگر اتنی بڑی فوج کو ایک ناتجربہ کار بدحواس راہب کیسے سنبھال سکتا تھا۔ چنانچہ یہ فوج راستے ہی میں بڑی ابتری کا شکار ہو گئی۔ جب یہ بلغاریہ پہنچی تو سامان رسد کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مقامی آبادی کو لوٹنا شروع کر دیا۔ بلغاریہ کی فوج نے اس طوفان بدتمیزی کی روک تھام کے لیے صلیبی سورماؤں پر حملہ کر دیا اور ہزاروں افراد کو ڈھیر کر دیا۔ یہ لشکر اپنی جان بچا کر بڑی کسمپرسی کے عالم میں قسطنطنیہ پہنچا جہاں قیصر ان کے لیے چشم براہ تھا۔ قیصر نے خود اس لشکر کو شام پر حملے کی دعوت دی تھی اور خوبصورت لڑکیوں کا لالچ دے کر انہیں بلایا تھا مگر اس لشکر کے سپاہیوں کی بے لگامی کا یہ عالم تھا کہ خود قیصر کو لینے کے دینے پڑ گئے اور انہیں عالم اسلام کی طرف رخصت کر کے ہی وہ چین کا سانس لے سکا۔[1]

لشکر صلیب ایشیائے کوچک میں: صلیبی لشکر جب عالم اسلام میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ایشیائے کوچک میں سلاجقۂ روم کی مملکت سے گزرا اور مقامی آبادی پر ظلم و ستم کی انتہاء کر دی۔ ان کے ایک سالار رینالڈ نے دس ہزار نارمنوں کے ساتھ ''ملسیا'' کے قریب سرحد کے ایک خالی قلعے پر قبضہ کر کے گرد و نواح میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ فرانسیسی مؤرخ مجاڈ تاریخ حروب صلیبیہ میں لکھتا ہے:

[1] الحروب الصلیبیۃ: 47۔51

"انہوں نے صلیب کے نیچے ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا کہ فطرت ان کے تصور سے کانپ اٹھتی ہے۔"

نیز وہ لکھتا ہے:

"صلیبیوں نے منیسا کے نواح میں بھیانک مظالم ڈھائے، بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور بوٹی بوٹی کر کے سیخوں پر چڑھایا۔"[1]

یہ سلاجقۂ روم کا علاقہ تھا جو خراسان اور شام کے سلجوقیوں سے الگ ایک شاہی خانوادہ تھا۔ اس کا بانی سلجوقی قبیلے کا ایک سردار سلیمان بن قتلمش تھا جسے الپ ارسلان سلجوقی نے ایشیائے کوچک کا حاکم مقرر کیا مگر اس نے یہاں خودمختار حکومت قائم کر لی جس کا مرکز قونیہ تھا۔ جب صلیبی لشکر یہاں پہنچا تو قونیہ میں سلیمان کے جانشین سلطان قلیچ ارسلان کی حکومت تھی۔ اس نے نصرانیوں کے مظالم سے حواس باختہ ہوئے بغیر فوری طور پر جوابی حملہ کیا اور ان کی غیر مرتب فوج کو شکست فاش دے کر منیسا اور دیگر تمام سرحدی علاقوں کو خالی کرا لیا۔ مجاڈ کے مطابق صلیبی جنگ کے اس ابتدائی مرحلے میں تین لاکھ صلیبی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مجاڈ لکھتا ہے:

"وہ ترکوں کا پہلا حملہ بھی برداشت نہ کر سکے اور تقریباً سبھی تہ تیغ ہو گئے۔ صرف وہ لوگ بچے جنہوں نے دین اسلام قبول کرنے اور نصرانیوں کے خلاف لڑنے کی قسمیں کھا کر اپنی جان بچائی۔"[2]

پیٹر چند بچے کھچے افراد کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر یورپ لوٹ جانے میں کامیاب ہو گیا مگر یہ شکست اس کی ساری ناموری پر پانی پھیر دینے کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے لیے یورپ کو برانگیختہ کرنے والا یہ بدبخت انسان باقاعدہ جنگوں کے آغاز سے پہلے ہی ذلیل وخوار ہو کر گمنامی کے گوشے میں جا پڑا۔[3]

دوسرا لشکر: اس شکست کے باوجود اہل یورپ کا جوش وخروش کم نہ ہوا اور یورپ کے بڑے بڑے امراء نے پیشہ ور افواج کے ساتھ ارض مقدس جانے کی تیاری مکمل کر لی۔ کلر ماؤنٹ کانفرنس کے آٹھ ماہ بعد لورین کا جنگ آزما نواب گاڈفرے ڈی بولین 80 ہزار پیادے اور دس ہزار گھڑسوار لے کر پابہ رکاب ہوا۔ اس کے دو بھائی ایلیس ٹیس اور بالڈون بھی اپنی فوجوں کو لے کر چل پڑے۔ اس کا چچیرا بھائی بالڈون ڈی بورگ بھی پیچھے نہ رہا۔ اٹلی کا ایک نواب بوہیمنڈ، نارمنڈی کا حاکم رابرٹ بھی

[1] حیات صلاح الدین، ص 24 بحوالہ مجاڈ، ص 73
[2] محولہ بالا
[3] محولہ بالا

صلیب اٹھا کر مقدس جنگ کے لیے نکل پڑے۔ جنوبی فرانس سے ریمنڈ اور ایڈ ہیمر ایک لاکھ فوج لے کر شریک ہوئے۔ اس طرح اس فوج کی مجموعی تعداد پانچ لاکھ پیادوں اور ایک لاکھ سواروں تک پہنچ گئی۔ قسطنطنیہ سے ہوتے ہوئے یہ فوج 21 جمادی الاولیٰ 490ھ (6 مئی 1097ء) کو سلجوقی ترکوں کے سرحدی قلعے منیسا کے سامنے پہنچ گئی۔ ترکوں نے مقابلے کی تیاری کر رکھی تھی۔ ایک ماہ تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر میں رابرٹ نارمنڈی کے آجانے سے صلیبیوں کا محاصرہ مزید سخت ہوگیا۔ تب ترکوں نے صلیبیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنا قلعہ، قسطنطنیہ کے قیصر کے حوالے کر دیا۔[5]

انطاکیہ کا معرکہ: 16 رجب (29 جون) کو صلیبی لشکر شام کی سرحد پر آ کر انطاکیہ کی سمت روانہ ہوگیا۔ راستے میں سلجوقی ترکوں نے انہیں گھیر لیا، عیسائی بڑی مشکل سے ان کے نرغے سے نکل سکے۔ آگے چل کر راستہ بھٹک جانے کے سبب وہ بدترین بھوک اور پیاس کا شکار ہو گئے۔ کئی کئی سو افراد ایک ہی دن میں مر گئے۔ سپاہیوں نے نقاہت کی وجہ سے بھاری زرہیں اتار کر پھینک دیں۔ جولائی کی گرمی میں شدید پیاس نے انہیں تڑپا دیا۔ فوج مختلف راستوں میں بکھر گئی اور آخر کار 12 ذوالقعدہ 490ھ (21 اکتوبر 1097ء) کو انطاکیہ کے سامنے جمع ہوگئی۔ اس وقت شام میں سیاسی انتشار کی وجہ سے ملک شاہ کا پوتا باغستان یہاں کا خودمختار حاکم تھا۔ اس کے پاس پندرہ ہزار سپاہی تھے جو تین لاکھ کے اس لشکر کے سامنے ڈٹ گئے اور سات ماہ تک شہر کا دفاع کرتے رہے۔

اس مدت میں کئی عیسائی نواب دیگر شہروں پر بھی ہاتھ صاف کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں بالڈون سب سے کامیاب رہا جس نے ساحلی شہر طرطوس پر قبضہ کیا۔ پھر شمال میں ایڈیسہ (الرُہا) کے شہزادے تھوروس نے جو شاہِ قسطنطنیہ کا باج گزار تھا، اسے سلجوقی ترکوں کے خطرات کی روک تھام کے لیے اپنے ہاں بلالیا۔ بالڈون اس کی مدد کے عنوان سے وہاں پہنچ گیا۔ کچھ مدت بعد شہزادہ مر گیا اور بالڈون اڈیسہ (الرُہا) کا مالک بن بیٹھا۔ اس طرح یورپی امراء میں وہ سب سے پہلے ایک مستقل ریاست حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اگرچہ اس طرح وہ صلیبی جنگ میں شریک نہ رہ سکا اور لشکر سے الگ ہوگیا مگر بعد میں وہ صلیبی لشکر کو خوراک ورسد پہنچانے میں سب سے زیادہ فعال کردار ادا کرتا رہا۔

اس دوران مصر کے عبیدی حکمران مستعلی نے خودغرضی کی انتہاء کر دی۔ وہ شام کی سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کرنے کی مہم شروع کر چکا تھا۔ اس کی فوج نے ربیع الاول 490ھ (مارچ 1097ء) میں شام کے ساحلی شہر صور پر قبضہ جما لیا تھا۔ پھر اس نے

[5] الحروب الصلیبیہ: ص: 60، 51

بیت المقدس کا محاصرہ کر کے چھ ہفتوں کے بعد شعبان 490ھ (جولائی 1197ء) میں اسے سلجوقیوں سے چھین لیا تھا۔ اب القدس میں عبیدیوں کا نائب افتخارالدولہ حاکم بن گیا۔ عبیدی حکمران کو اس ناپاک حرکت کے بعد خود ہی یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ عیسائی کہیں اس سے اپنی دوستی فراموش کر کے اسی کے مقبوضات پر ہاتھ صاف نہ کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ اس نے انطاکیہ کا محاصرہ کرنے والے صلیبی قائدین کے پاس اپنے سفیر بھیج کر بزدلانہ چاپلوسی پر مبنی یہ پیغام دیا:

"صلیبیوں نے جو فتوحات آل علی کے دشمن سنی ترکوں کے خلاف حاصل کی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آپ کو خدا ہی نے ایشیا میں بھیجا ہے تا کہ آپ انصاف کا وسیلہ بنیں۔ ہم جانتے ہیں کہ صلیبیوں کی سب سے بڑی خواہش القدس کی زیارت ہے۔ پس ہم آپ کو ایک ماہ کا وقت دیتے ہیں کہ آپ بغیر ہتھیاروں کے القدس میں جائیں اور پوری آزادی سے زیارت اور عبادت کی رسوم بجالائیں۔ اس صورت میں آپ کو خلیفہ کا پورا پورا تعاون میسر رہے گا۔"

عبیدی حکمران نے اس پیش کش کو نامنظور کرنے کی صورت میں صلیبیوں کو خطرناک انجام کی کھوکھلی دھمکی بھی دی تھی۔ صلیبی سورما جو یروشلم پر بزور شمشیر قبضہ کرنے کی ٹھان کر آئے تھے، بھلا مصر کے کمزور حکمران کی بات پر کیوں کان دھرتے۔ انہوں نے سفیر کو سخت الفاظ میں جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہم قسم کھا چکے ہیں کہ ہم یروشلم کو مسیح کے منکروں سے آزاد کرائیں گے۔ اپنے آقا کو بتادو کہ جو صلیبی انطاکیہ کے پاس خیمہ زن ہیں وہ مصر کی حکومت سے ڈرتے ہیں نہ بغداد کے خلیفہ سے۔"

انطاکیہ کا محاصرہ پورے جوش و خروش سے جاری رہا۔ اس دوران حمص، قیساریہ، حلب اور دمشق سے کچھ فوجیں محصورین کی مدد کے لیے روانہ تو ہوئیں تھیں مگر وہ راستے ہی میں نصرانیوں سے کچھ جھڑپوں کے بعد واپس چلی گئیں۔ اس طرح اہل شہر کسی بیرونی امداد سے بالکل محروم رہے۔ شام کے دیگر شہروں کے حکام انطاکیہ والوں کی کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ ایک تو وہ خود منتشر تھے، دوسرے اس وقت وہ عبیدیوں کے حملے سے خود کو بچانے کی فکر میں مبتلا تھے۔ شاید انطاکیہ اب بھی بچ جاتا کیوں کہ سلجوقی سلطان اور دوسرے شہروں کے حکام نے آخر میں اہل انطاکیہ کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج روانہ کر دی تھی جو حاکم موصل کربوقا کی قیادت میں عن قریب پہنچنے والی تھی۔ مگر فیروز نامی ایک غدار امیر نے نصرانیوں کی فتح کی راہ ہموار کر دی۔ یہ امیر درحقیقت عیسائی تھا مگر بظاہر مشرف با اسلام ہو کر مسلمانوں کو دھوکا دے رہا تھا، مدبر یہ تھی کہ انطاکیہ کا حاکم باغستان اس پر پورا اعتماد کرتا تھا۔ فیروز نے صلیبی لشکر کے نواب بوہیمنڈ سے ساز باز کر لی اور ایک شب جب شہر کے باشندے بے فکر ہو کر سو رہے تھے اس نے

اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے صلیبیوں کو شہر میں داخل ہونے کا موقع دے دیا۔ صلیبی ایک طوفان کی طرح شہر میں گھس گئے اور لوگوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ شہر کی فوج قلعے میں محصور ہوگئی اور حاکم شہر فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ رجب 491ھ (جون 1098ء) کا واقعہ ہے۔

موصل کا حاکم کربوقا جو امدادی فوج لیے آرہا تھا، بلاوجہ فوج کو بہت سست روی سے چلا رہا تھا۔ اگر وہ تیز رفتار سے کوچ کرتا تو نہ صرف انطاکیہ کو بچایا جا سکتا تھا بلکہ بزدل صلیبیوں کو یہیں سے یورپ لوٹ جانے پر مجبور کیا جا سکتا تھا مگر کربوقا کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ فوج اس وقت انطاکیہ پہنچی جب شہر میں مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگائے جا چکے تھے۔ کربوقا کے ہمرکاب لشکر جو اٹھائیس امیروں کی افواج پر مشتمل تھا انطاکیہ کے سامنے خیمہ زن ہوگیا جب کہ صلیبیوں نے اس سے بچنے کے لیے انطاکیہ کی فصیلوں کی پناہ لے لی۔ صلیبیوں کو ایک تو مسلمانوں کے لشکر کا خوف تھا دوسرے ان کی رسد ختم ہو چکی تھی۔ وہ گھوڑوں کو کاٹ کاٹ کر اور درختوں کے پتے چبا کر اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔ انہوں نے گھبرا کے کربوقا سے امان مانگی مگر کربوقا نے جواب دیا: ''اب تو تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔''

کربوقا کا یہ جواب شجاعت نہیں تکبر پر مبنی تھا۔ وہ ایک بداخلاق انسان تھا جس کی درشتی اور تحقیر آمیز رویے سے تمام ماتحت افسران بددل ہو چکے تھے۔ اُدھر نصرانیوں کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ کر ان کے ایک راہب نے عجیب چال چلی۔ اس نے چپکے سے ایک پرانا نیزہ زمین میں دفن کر دیا اور فوج کے امراء سے کہا:

''سنا ہے کہ یسوع مسیح کا ایک نیزہ انطاکیہ میں دفن ہے، اسے تلاش کرو۔ اگر مل گیا تو فتح ہمارا مقدر ہے۔ اگر نہ ملا تو ہلاکت طے ہے۔''

راہب کے کہنے پر امرائے فوج نے تین دن تک روزے رکھے اور دعائیں کیں، پھر راہب کے کہنے پر کھدائی کی گئی تو ایک جگہ سے وہ نیزہ نکل آیا۔ اس سے صلیبیوں میں ایک جوش پھیل گیا اور وہ مقابلے کے لیے کمربستہ ہوکر کھلے میدان میں نکل آئے۔ پیر 25 رجب 491ھ (28 جون 1098ء) کو دونوں لشکروں میں گھمسان کا رن پڑا۔ کربوقا کی نااہلی کی وجہ سے مسلمان پرجوش صلیبیوں کے سامنے جم کر نہ لڑ سکے۔ ان کے سینکڑوں افراد شہید ہوئے اور باقی ماندہ پسپا ہوگئے۔ اس شکست فاش نے شام اور فلسطین کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

صلیبی چاہتے تو کسی دقت کے بغیر القدس کی طرف بڑھ سکتے تھے مگر اکثر نواب اپنے لیے الگ الگ شہر بھی فتح کرنا چاہتے تھے اس لیے کئی ماہ تک وہ مختلف ساحلی شہروں پر حملے کرتے اور مسلمانوں کے

خون سے ہولی کھیلتے رہے۔ نواب ریمنڈ نے البیرہ کو فتح کر کے وہاں تمام مسلم آبادی کو فنا کر دیا۔ معرہ میں اس نے ایسا قتل عام کیا کہ کوئی شخص مسلمانوں کی لاشوں سے گزرے بغیر شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ طرطوس کو مسلمانوں نے خود خالی کر دیا تھا۔ صلیبی اس پر قبضہ کرتے ہوئے عکا پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے یہاں کئی ماہ تک سخت مدافعانہ لڑائی لڑی۔ صلیبیوں نے شام اور فلسطین کے ان ساحلی شہروں کی مہمات میں ایک لاکھ سے زائد افراد کا خون بہایا۔

اس دوران عاقبت نااندیش حکمران مستعلی سلجوقی ترکوں، قیصر الیکسی اس، مغربی عیسائی حکمرانوں اور صلیبی لشکر کے قائدین سے خط و کتابت کرتا رہا، وہ غالب فریق کا اتحادی بن کر اپنے مفادات حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ اس نے صلیبی سرداروں کے لیے قیمتی تحائف بھی بھیجے۔ گاڈ فرے کو چالیس ہزار اشرفیوں، تیس بیش قیمت جوڑوں اور سونے چاندی کے ساز و سامان سے سجے ہوئے عربی گھوڑے کی خلعت پیش کی۔ مستعلی کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح بیت المقدس کو جسے اس نے کچھ مدت قبل ہی سلجوقیوں سے چھینا تھا بدستور اپنے پاس رکھے مگر صلیبیوں نے اس کی خواہش کو دوبارہ حقارت سے مسترد کر دیا۔ [1]

<u>سقوطِ القدس کے جگر پاش مناظر</u> ❊ آخرکار عیسائی لشکر سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے رملہ سے ہو کر 6 جون 1099ء کو القدس کے سامنے پہنچ گیا جہاں مستعلی کا نائب افتخار الدولہ انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے تین لاکھ صلیبیوں میں سے صرف پچاس ہزار افراد رہ گئے تھے۔ اگر مسلمان اتحاد و اتفاق سے کام لیتے تو اس لشکر کو شکست دینا کچھ مشکل نہ تھا مگر افسوس کہ القدس کے محصورین کے لیے شام سے لے کر بغداد تک کہیں سے کوئی مدد نہ پہنچی اور تاریخ کا وہ دردناک ترین دن آ کر رہا جب صلیبیوں نے بیالیس دن کے محاصرے کے بعد بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور وہاں خون کی ندیاں بہا دیں۔

فرانسیسی مورخ ''میشو'' کے بقول:

''صلیبیوں نے ایسے تعصب کا ثبوت دیا جس کی مثال نہیں ملتی، عربوں کو اونچے اونچے برجوں اور مکانوں کی چھتوں سے گرایا گیا، آگ میں زندہ جلایا گیا، گھروں سے نکال کر میدانوں میں جانوروں کی طرح گھسیٹا گیا، صلیبی جنگجو مسلمانوں کو مقتول مسلمانوں کی لاشوں پر لے جا کر قتل کرتے، کئی ہفتوں تک قتل عام کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ستر ہزار سے زائد مسلمان صرف مسجد اقصیٰ میں تہ تیغ کیے گئے۔''

مچاڈ لکھتا ہے:

---

[1] الکامل ابن اثیر: 491ھ، 492ھ، ماڈرن ہسٹری آف صلیبیہ: 52، حیات صلاح الدین: 26

"گلیوں اور گھروں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ یروشلم میں شکست خوردہ مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔"

نیز وہ کہتا ہے:

"جب عیسائی مسجد عمر رضی اللہ عنہ پر قابض ہوئے جہاں مسلمانوں نے تھوڑی دیر کے لیے پناہ لی تھی تو خونریزی اور قتل عام کا منظر دہرایا گیا۔ سوار اور پیادہ صلیبی مسجد میں گھس کر مسلمانوں میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس ہیبت ناک ہنگامے میں گریہ وزاری اور موت کی چیخ وپکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ فاتحین بھاگنے کی کوشش کرنے والوں کا تعاقب کر کے لاشوں کے ڈھیروں کو پامال کر رہے تھے۔ ریمنڈ ڈی اگلیس کا چشم دید بیان ہے کہ مسجد کے اندر اور صحن میں مقتولین کا بہتا ہوا خون ہمارے گھوڑوں کی لگاموں تک پہنچ گیا تھا۔"

فرانسیسی مورخ لیبان کا بیان ہے:

"ہمارے لوگ بچوں کے ٹکڑے کر رہے تھے، جوانوں اور بوڑھوں کو قتل کر رہے تھے۔ کسی جاندار کو زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ جلد فارغ ہونے کے لیے ایک ہی رسی میں کئی کئی افراد کو لٹکا رہے تھے۔"

"شہر کے راستوں میں خون کے دریا بہہ رہے تھے اور چاروں طرف لاشیں پھیلی ہوئی تھیں۔"

"بیت المقدس کے راستوں اور ہر جگہ پر سروں اور ہاتھ پیروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مگر جو کچھ وقوع پذیر ہوا اس کے مقابلے میں یہ بہت کم ہے۔ ہیکل سلیمانی میں اس قدر خون بہا کہ اس میں لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔"

سقوطِ القدس 23 شعبان 492ھ (15 جولائی 1099ء) کو ہوا۔ عیسائی کمانڈروں نے اس کے بعد پوپ کو خوشخبری کا پیغام بھجوایا اور اس میں لکھا:

"اگر آپ دشمنوں کے ساتھ ہمارا سلوک معلوم کرنا چاہتے ہیں تو مختصراً اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی سلیمان علیہ السلام کی عبادت گاہ (مسجد عمر رضی اللہ عنہ) میں داخل ہوئے تو ان کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔"[5]

مگر یہ قتل عام بھی صلیبیوں کے غیظ وغضب کو سرد نہ کر سکا۔ تیسرے دن صلیبی قائدین نے ایک مجلس مشاورت منعقد کر کے فیصلہ کیا کہ یروشلم کے تمام باقی ماندہ مسلمانوں اور یہودیوں کو بھی قتل کر دیا جائے، چنانچہ مزید ایک ہفتے تک مقامی باشندوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ایک چشم دید شاہد

5 ملاحظہ ہو: صلیبی جنگیں... ص 257

البرٹ ڈی ایکس کے بیان کے مطابق نہ صرف محلوں، مسجدوں اور گلیوں میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں بلکہ ویران مقامات پر بھی ان کے انبار لگ رہے تھے۔

ستر ہزار سے زائد مسلمانوں کی مظلومانہ شہادت اور قبلہ اول پر کفار کے قبضے سے عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی، شعراء نے اشک انگیز مرثیے کہے۔ دمشق کے قاضی نے خلیفۂ بغداد کے دربار میں اپنی ڈاڑھی نوچ ڈالی اور تمام حاضرین دربار زار و قطار روئے۔ مگر یہ نالہ و شیون بے فائدہ تھا۔ اس حادثے نے مسلم حکمرانوں کو وقتی طور پر جھنجوڑا تو سہی مگر وہ وقتی جوش [illegible]رش کے بعد پھر ٹھنڈے پڑ گئے اور عملی طور پر کچھ کرنے سے گریزاں رہے۔ دربار خلافت بغداد نے سلطان برکیارق اور دوسرے سلجوقی شہزادوں کو متحد ہو کر القدس کی بازیابی کے لیے افواج تیار کرنے کی تاکید کی مگر یہ حکمران باہمی مناقشوں میں الجھے رہے اور اس قومی فریضے پر توجہ دینے سے قاصر رہے۔ مصر کے حکمران نے اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے افضل بن بدر جمالی کو ایک فوج دے کر القدس کی طرف بھیجا مگر یہ ناتجربہ کار فوج راستے ہی میں صلیبیوں سے بری طرح شکست کھا کر پسپا ہو گئی۔

بیت المقدس کے سقوط کے بعد مسیحی اقوام نے مقبوضہ شام و فلسطین کو تقسیم کر کے القدس، الرُّحا، طرابلس، انطاکیہ، اور یافا کی پانچ مستقل صلیبی ریاستیں قائم کر لیں۔ رمضان 512ھ (جنوری 1119ء) میں انہوں نے حلب کے قریب عزاز پر بھی قبضہ کر لیا اور یوں مسلمانوں کے لیے خطرات مزید بڑھ گئے۔

اس دور میں دنیائے اسلام کو ایک اور نہایت پرخطر تحریک کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ حسن بن صباح نامی ایک دہشت گرد کی خفیہ تنظیم تھی جس کا مرکز شمالی ایران کے بلند ترین کوہستان میں کوہ الموت کی چوٹیوں پر تھا۔ حسن بن صباح نے یہاں ایک مصنوعی جنت بنائی تھی جہاں "حوروں" کی ایک جھلک دکھا کر وہ اپنے مریدوں کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر لیتا تھا۔ یہ مرید خفیہ کارندوں کے طور پر دنیائے اسلام کے ہر ملک، ہر دربار اور ہر شعبے میں موجود رہتے تھے اور مرکز سے اشارہ ملتے ہی اپنے مخالفین کو خنجروں کا نشانہ بنا ڈالتے تھے۔ یہ تنظیم عالم اسلام کے لیے یورپ کے نصرانیوں اور مصر کی خودساختہ "فاطمی خلافت" سے کم خطرناک نہ تھی۔

غرض حالات نہایت پریشان کن تھے، عالم اسلام کے اکثر حکمران خانہ جنگیوں میں مست تھے، بعض صلیبیوں کے حلیف بن گئے تھے، ان میں سے کوئی ایک بھی نصرانیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ [1]

یہی دن تھے جب کردستان کا ایک گمنام خاندان شام آ کر آباد ہوا...... یہ وہ خاندان تھا جس کی قسمت میں القدس کی بازیافت کی سعادت لکھ دی گئی تھی۔

---

[1] الکامل: 492ھ۔ 493ھ، ماروب الصلیبیہ: 52 تا 58، بغیۃ الطلب: 1/65 ش

فصل:2

نجم الدین ایوب

موجودہ ایران عراق اور ترکی کی سرحدوں پر واقع ''کردستان'' کا علاقہ اپنے مخصوص جغرافیائی حالات، محل وقوع اور اپنے باشندوں کی طبعی خصوصیات کی بناء پر ہمیشہ سے ایک الگ پہچان رکھتا آیا ہے۔ قدیم جغرافیہ دانوں نے کردستان کی حد بندی آذر بائی جان اور لُرستان کے درمیانی علاقے کے طور پر کی ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ وہ علاقے جہاں کردوں کی آبادی مستقل طور پر پائی جاتی ہے لُرستان سے ملاطیہ تک تقریباً چھ سو میل لمبائی میں جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلے ہوئے ہیں، اس علاقے کی چوڑائی مختلف نقاط پر 120 سے 150 میل تک بدلتی رہتی ہے۔ موجودہ ایران کے شہر کرمانشاہ، سلماس، اُرمیہ اور خوئی، عراق کے ضلعے موصل اور اربل اور ترکی کے وہ علاقے جو دجلہ اور فرات کی وادی کا حصہ ہیں یا ایرانی سرحد سے متصل ہیں کردستان میں شامل ہیں۔ ان میں دیار بکر اور ارزن الروم قابل ذکر ہیں۔ کرد اپنے اصل علاقے کے علاوہ گردونواح کے تقریباً تمام ملکوں اور شہروں میں بھی پائے جاتے تھے۔ آج بھی یہ صورتحال برقرار ہے۔ [1]

مؤرخ المسعودی کے مطابق کرد اصل میں وہ ایرانی النسل لوگ ہیں جو قدیم عجمی حکمران ضحاک کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ان پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے چنانچہ کردوں میں بعض ایرانی اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ تاہم پہاڑوں کی سخت کوش زندگی اور تمدنی دنیا سے دوری نے ان میں کچھ اور ممتاز خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو انہیں ایرانیوں سے جدا کرتی ہیں۔

مگر دوسری طرف ان کی بیشتر خصوصیات اہلِ فارس سے مختلف ہیں۔ ایرانیوں کے برخلاف کردوں کی طبیعت تہذیب وتمدن کی نفاستوں اور علوم وفنون کی باریکیوں کی بجائے شمشیر وسناں کے جوہر دکھانے اور گھوڑوں کی پشت پر بلا تکان طویل سفر کرنے کی جانب مائل رہی ہے۔ یہ آزاد منش اور خود

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ: 17/165_166 اور 200_222

سر لوگ کبھی کسی حکومت کے تابع رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہاں کے لوگ صدیوں پہلے کی طرح آج بھی بہت دلیر، لڑاکا اور سخت مزاج شمار ہوتے ہیں۔ ان کی یہ عادات ایرانیوں کی افتادِ طبع سے الگ بلکہ برعکس ہیں، جنہیں دیکھتے ہوئے المسعودی کی روایت مشکوک ہو جاتی ہے۔

ماہرین انساب کا ایک اور قول جسے خاصی مقبولیت حاصل رہی ہے یہ ہے کہ کرد زمانہ ماقبل از اسلام کے عربوں کی نسل سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یمن کے غسانیوں سے بےزار ہو کر اس دور دراز علاقے میں چلے آئے تھے اور عرب سے بُعد اور عجم سے قرب نے انہیں اپنی زبان وتمدن سے محروم کر دیا مگر ایک حد تک عربوں کی قومی خصوصیات ان میں نمایاں رہیں۔ کردوں کے نسب کے بارے میں مذکورہ دونوں اقوال میں سے صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنا مشکل ہے لیکن عرب مورخین نے دوسرے قول کو زیادہ پسند کیا ہے۔ اگر زبان کا فرق نہ ہو تو ایک کرد بالکل عرب بدو معلوم ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے کردوں میں جہالت اسی طرح راسخ تھی جیسے بدوؤں میں۔

اسلام کے دورِ زریں میں یہاں ایمان ومعرفت کی روشنی پھیلی مگر خلافت اسلامیہ کا دورِ زوال شروع ہوتے ہی جب جگہ جگہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا تو ''کردستان'' بھی ایک ایسا آزاد خطہ بن گیا جہاں صرف طاقت کی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہاں لاقانونیت عروج پر تھی اور دور جاہلیت کی طرح چوری ڈاکہ اور راہ زنی جیسے بدنام پیشے مقامی باشندوں کی عادت ثانیہ بن چکے تھے۔ یہ فطری اوصاف کو صحیح راہنمائی نہ ملنے کا نتیجہ تھا جو ایسے ماحول میں ہمیشہ اسی طور پر ظاہر ہوا کرتا ہے۔ تاہم اس دور میں بھی کردوں کے وہ لوگ جنہیں اپنے طبعی جوہر صحیح رخ پر استعمال کرنے کا موقع ملا، دنیا کے بہترین معاشروں، ملکوں، درباروں، اداروں اور میدانوں میں خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ انہی نامور کردوں میں ایک نام شاذی بن مروان کا ہے۔

ہم کردستان کی ہمسایہ ریاست آذربائی جان کے شمال مشرقی حصے میں واقع شہر دوین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں ہماری تاریخی داستان شاذی بن مروان ہی کی زندگی سے شروع ہو رہی ہے۔

دوین ❁ اس چھوٹے سے شہر میں بڑے بڑے علماء نے جنم لیا، امام غزالی رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد شیخ نصر اللہ بن منصور الحیری کا تعلق اسی شہر سے رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ علاقائی دارالحکومت بھی رہا تھا۔ اس فصیل بند شہر میں مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں اور نصرانیوں کی بھی خاصی تعداد آباد تھی۔ نواح شہر کے پہاڑوں میں دیہاتی لوگ بھیڑ بکریاں پالتے تھے اور دوین کے ہنر مند باشندے ان مویشیوں کے بالوں سے خوبصورت قالین بنتے تھے۔ ان قالینوں کو ایک خاص کیڑے سے حاصل کردہ رنگ سے

رنگ کر نہایت شوخ اور دلکش بنالیا جاتا۔ ❶

شاذی بن مروان جو کہ کردوں کے قبیلے کی ایک شاخ ''روادیہ'' سے تعلق رکھتا تھا، دوین شہر کے قریبی گاؤں ''اجدناکن'' میں پیدا ہوا تھا۔ بعد میں اس نے شہری زندگی پسند کرتے ہوئے دوین میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ یہ دلیر اور باہمت کردان لوگوں میں سے تھا جن کی طبیعت میں کسی ایک منزل پر ٹھہر جانے کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ شاذی شہر کے بااثر ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا، عزت وجاہت اور مال ودولت کے لحاظ سے اس کے پاس سب کچھ تھا، اس کی عمر کہولت کی حدود میں پہنچ چکی تھی، اس کے دو بیٹے ایوب اور شیرکوہ اس کے بڑھاپے کا سہارا بننے کے لیے موجود تھے۔ تاہم شاذی کو اس پر اطمینان نہ تھا۔ دوین اگرچہ شہر تھا مگر ایک نیم دیہاتی تہذیب کی عکاسی کرتا تھا، پھر نصرانیوں اور یہودیوں کی ملی جلی آبادی بھی یہاں بدمزگی کا باعث تھی۔ شاذی کو یقین تھا کہ اس کے باصلاحیت بیٹے یہاں رہ کر وہ مقام کبھی حاصل نہیں کرپائیں گے جو وہ اپنے تصور میں ان کے لیے دیکھا کرتا تھا۔ ''دوین'' چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے شاذی کے لئے نئی منزل طے کرنا ضروری تھا۔ یہ نئی منزل بغداد سے بہتر کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔ ❷

<u>منتشر عالم اسلام اور بغداد کا پرسکون جزیرہ</u> ❁ بغداد ایک ایسا پرسکون جزیرہ تھا جہاں سب کچھ پانے کی تمنا میں دنیا بھر کے لوگ کھنچے چلے آرہے تھے۔ منصور عباسی کا بسایا ہوا یہ عظیم شہر اگرچہ اپنی سابقہ سیاسی اہمیت کھوچکا تھا مگر علمی، صنعتی، تجارتی اور تعمیری لحاظ سے اس وقت بھی دنیا میں اس کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ یہ امن وسلامتی کا ایک ایسا گہوارہ تھا جہاں ہر کوئی اپنی الگ دنیا آباد کر کے فکرِ جہاں سے بے گانہ ہوجاتا تھا۔ امراء کے لیے یہ عیش وراحت کی نہ ختم ہونے والی محفل تھی جس میں آنکھ کھولنے سے آنکھ بند کرنے تک کوئی وقفہ نہ تھا۔ عباسی خلفاء کے ذوقِ تعمیر نے اس خوبصورت شہر کو طلسماتی داستانوں کا مصداق بنادیا تھا۔ اس کی رونق ورعنائی کے ہوش ربا قصوں پر باہر کے لوگ مشکل سے یقین کرتے تھے۔

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، یہ دور عالم اسلام میں بڑی بدامنی کا تھا، یورپ کی جانب سے اسلامی دنیا پر حملے جاری تھے اور ان کے دفاع کے لیے مسلمانوں کے پاس کوئی متحدہ قوت موجود نہ تھی جبکہ یورپی طاقتیں ''اتحاد میں یقینی کامیابی'' کے گر پر عمل پیرا ہوچکی تھیں۔ سلجوقیوں کے مردِ آہن ملک شاہ کی وفات، اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی اور عبیدی حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کے باعث نصرانیوں کو عالم اسلام پر یلغار کا سنہرا موقع مل گیا اور بیت المقدس نصرانیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک عرصے

❶ معجم البلدان: 3/328، صلاح الدین۔ لین پول: ص 8 ❷ صلاح الدین لین پول: ص: 8

تک عالم اسلام کے مذہبی رہنما القدس کی آزادی کے لیے وقتاً فوقتاً آواز اٹھاتے رہے، ان کی پکار پر عوام جمع بھی ہوجاتے تھے جن کے دباؤ کے سامنے مجبور ہوکر مقامی حکمران القدس کی آزادی کے لیے اعلانِ جہاد بھی کردیتے تھے مگران مہمات کی لہریں چند میلوں تک نصرانیوں کے مقبوضہ قلعوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں۔ بغداد میں ملک شاہ سلجوقی کے جانشین سلطان برکیارق کے زمانے میں القدس کے حوالے سے ایک تحریک برپا ہی مگراس کے بعد مسلم حکمرانوں کی بے اتفاقی اور خود خلافت بغداد کی عدم دلچسپی دیکھ کر عوام بھی خاموش ہوگئے۔ بغداد حسب سابق ایک خوابیدہ شہر تھا جہاں لوگ حسین خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے آرہے تھے۔ باہر کی دنیا، عالمی سیاست اور بیرونی خطرات سے اس جزیرے کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ۱

مجاہد الدین بہروز رحمہ اللہ: شاذی نے دوین سے بوریا بستر باندھ کر بغداد جانے کے لیے سوچ بچار شروع کی تو اسے یاد آیا کہ اس کا ایک دوست ''مجاہد الدین بہروز'' وہاں کسی بڑے حکومتی منصب پر فائز ہے اور وہ اس سے مدد لے کر بغداد میں قدم جما سکتا ہے۔ رومی نسل کا گورا چٹا، بہروز ''دوین'' میں ایک کم حیثیت شخص تھا، بعض مورخ تو اسے غلام بتاتے ہیں اس کے باوجود وہ علوم وفنون میں ماہر تھا، قسمت آزمائی کرنے کیلئے دوین سے فارس اور پھر سلجوقی دربار میں جا پہنچا، وہاں اس کے علم وفضل کے باعث اسے پہلے سلطان وقت شاہ مسعود سلجوقی کے شہزادوں کا اتالیق بنایا گیا اور پھر جمال الدولہ کا خطاب دے کر بغداد شہر کا منتظم اعلیٰ مقرر کردیا گیا۔ شاذی کو بہروز سے پرانے مراسم کی وجہ سے خاطر خواہ تعاون کی امید تھی چنانچہ وہ ایک دن اپنے کنبے سمیت دوین سے روانہ ہوا اور کئی ہفتوں کے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے بغداد پہنچ گیا۔ بہروز نے شاذی کا پرتپاک استقبال کیا، اسے اپنے پاس رکھا، شاذی یہاں اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل بنانے آیا تھا اور اب اس کے مخلص دوست بہروز کا اس سلسلے میں فکرمند ہونا لازمی تھا۔ ۲

مسترشد باللہ رحمہ اللہ: ان دنوں بغداد میں مسترشد باللہ مسند خلافت پر براجمان تھا، وہ سابقہ خلفاء کی بہ نسبت کئی حیرت انگیز خوبیوں کا مالک تھا، عیش وعشرت سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا، درویشوں کی طرح صوف کا لباس پہنتا اور قصر خلافت کے ایک گوشے میں عبادت خداوندی میں مشغول رہتا تھا، اس کا دور امن اور خوشحالی کا دور تھا۔ گزشتہ خلفاء کے زمانے سے عوام پر عائد ٹیکس موقوف کر کے اس نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اگرچہ خلافت عباسیہ کا دائرہ کار عملی طور پر بہت محدود ہوگیا تھا تاہم اس بچے کچے علاقے میں اس نے شرعی احکام کے نفاذ کا غیر معمولی اہتمام کیا اور انتظامی لحاظ سے قابل تعریف

۱ الکامل فی التاریخ: 6/338_602 ۲ ابن خلدون: 5/274، النجوم الزاہرۃ: 6/2_4

تبدیلیاں لا کر نظام حکومت کو بہترین خطوط پر استوار کر دیا تھا۔ [4]

بغداد کے سیاسی پس منظر پر گزشتہ دو صدیوں سے ان خود مختار حکمرانوں اور سلاطین کا گہرا اثر تھا جن کے آباؤ اجداد کبھی خلافت کے ادنیٰ جاگیر دار شمار ہوتے تھے۔ ان دنوں بغداد سلطان مسعود سلجوقی کے زیر اثر تھا اور ہر حکمران کی طرح وہ بھی دربار خلافت کے احترام کے باوجود اس مرکزِ اسلام کو اپنے سیاسی مفادات کے تابع رکھنا چاہتا تھا۔ بغداد میں اپنا منتظم اعلیٰ مقرر کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ترک امراء بغداد میں خلیفہ کے محافظ کی نہیں بلکہ خلیفہ گر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایسے حالات میں بہروز نے محسوس کیا ترکوں کے مقابلے میں ایک کرد کے لیے بغداد میں ترقی کے امکانات زیادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ شاذی کے لیے کوئی اور مناسب جگہ سوچنے لگا۔

خوش قسمتی سے انہی دنوں سلطان مسعود نے بہروز کی کارکردگی سے خوش ہو کر اسے تکریت کی جاگیر بخش دی۔ بہروز کے لیے یہ ایک بہت بڑا انعام تھا مگر بغداد میں اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ وہ تکریت کی جاگیر کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شاذی کو اس کام کے لیے موزوں سمجھا اور اسے وہاں جاگیر کا انتظام سنبھالنے پر رضامند کر لیا۔ کچھ دنوں بعد شاذی اپنے نوجوان بیٹوں اور کنبے سمیت تکریت چلا آیا۔

تکریت دریائے دجلہ کے کنارے ایک پر رونق شہر تھا۔ ایک نہایت مضبوط قلعہ اور بلند فصیل اس کے دفاعی انتظامات کے ناقابل تسخیر ہونے کا پتا دیتے تھے۔ شہری آبادی چند پہاڑیوں پر آبادی تھی جبکہ قلعہ شہر کے شمال میں ایک دو سو فٹ بلند چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ شہر مدینۃ الاسلام بغداد سے تیس کوس (90) میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ [5]

تکریت پہنچ کر شاذی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس منزل تک پہنچ چکا ہے جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔ دوین کا ایک دیہاتی کرد، وادئ دجلہ کے سرسبز و شاداب علاقے میں اتنی بڑی جاگیر اور اتنے مضبوط قلعے کے منتظم کی حیثیت سے جس عزت و توقیر کا مالک بن چکا تھا وہ اس کے آباؤ اجداد میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اب وہ اپنی اولاد کے شاندار مستقبل کی بنیاد رکھ کر آرام سے سفر آخرت پر روانہ ہو سکتا ہے۔

کچھ مدت بعد شاذی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ تکریت ہی میں اس کی تدفین ہوئی جس پر بعد میں عقیدت مندوں نے ایک گنبد بنوا دیا۔ بہروز کو شاذی کی وفات کی اطلاع ملی تو اسے نہایت رنج ہوا۔ اس نے شاذی کے بڑے بیٹے ایوب کو باپ کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ [6]

[4] الکامل فی التاریخ: 652/6، دول الاسلام للذہبی: 50/2، تاریخ الخلفاء، ص: 243
[5] اردو دائرہ معارف اسلامیہ: 693/6
[6] ابن خلدون: 271/6، کتاب الروضتین: 1/2_6

ایوب جو بعد میں نجم الدین کے لقب سے مشہور ہو کر نجم الدین ایوب کہلایا ایک ہوشیار، متحمل مزاج اور دوراندیش نوجوان تھا۔ تکریت کی قلعہ داری کا عہدہ سنبھالتے ہوئے اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تقدیر خداوندی اس کے خاندان سے اتنا بڑا کام لینے کا فیصلہ کر چکی ہے جس کے تذکرے قیامت تک گونجتے رہیں گے اور مورخ تاریخ کا وہ باب نہایت سرمستی کے ساتھ تحریر کرے گا جس میں اس کی اولاد کی شمشیروں سے صلیبیوں کی صفیں درہم برہم ہوتی نظر آئیں گی۔

شام کی سیاسی صورتحال:۔ کئی برس گزر گئے۔ تکریت کے قلعے میں نجم الدین ایوب نہایت تشویش کی نگاہ سے اس ہنگامۂ محشر کا نظارہ کر رہا تھا جو شام کے ساحلوں پر برپا تھا۔ بیت المقدس کے علاوہ انطاکیہ اور رہا (اڈیسہ) جیسے مضبوط ترین اسلامی مورچے تو بہت پہلے نصرانیوں کے قبضے میں آ گئے تھے مگر ان چند سالوں میں عکا، طرابلس، طرطوس اور حصن الاثارب سمیت درجنوں چھوٹے بڑے شہر اور قلعے بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔ پھر 518ھ (1124ء) میں صیدون کا مستحکم قلعہ بھی نصرانیوں کے ہاتھ آ گیا اور شام کے ہر حاکم اور قلعہ دار کو اپنا علاقہ خطرے کی زد میں نظر آنے لگا۔ یہ شام کے ساحلی علاقوں میں نصرانیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان کی ناجائز ریاستیں شمال سے جنوب تک تقریباً آٹھ سو کلومیٹر طول میں پھیل گئی تھی۔ اگرچہ چوڑائی میں ان ساحلی مقبوضات کا رقبہ 80 کلومیٹر سے زیادہ نہ تھا مگر اس طرح شام کی تقریباً تمام اہم بندرگاہیں جو بحیرۂ روم کے ساتھ لگتی تھیں یورپ کے ہاتھ آ چکی تھیں۔ غزہ سے لے کر انطاکیہ کے شمال تک تمام ساحل ان کے پاس تھے۔ مختلف یورپی بادشاہوں کے نائبین اپنے مفتوحہ علاقوں کے خود مختار حاکم تھے۔ شام کے اندرونی علاقوں میں یہ عیسائی ریاستیں دمشق، حلب، بعلبک، حماۃ اور عمان جیسے اسلامی شہروں کے بالمقابل آ چکی تھیں۔ ان ریاستوں کی حد بندی اس طرح تھی:

1- انطاکیہ: یہ ریاست بحیرۂ روم کے ساحل پر لمبائی میں پائیراموس سے مرغات کے شمال تک اور چوڑائی میں حلب اور حماۃ کے اسلامی شہروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ قلعۂ اثارب، امامیہ اور معرّی اس کے اہم علاقے تھے، لاذقیہ کی اہم بندرگاہ بھی اس کا حصہ تھی۔

2- طرابلس: لبنان اور ساحل سمندر کے درمیان ایک پٹی کی شکل میں واقع ریاست "طرابلس" مرغات (مرکب)، کرک، جبیل اور طرطوسہ کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس کے شمال میں انطاکیہ اور جنوب میں یروشلم (القدس) کی ریاست تھی۔

3- یروشلم: سرزمین بیت المقدس کو یروشلم کا نام دے کر ایک الگ ریاست بنا دیا گیا تھا جو فلسطین، لبنان اور شام کے اہم علاقوں سے لے کر اردن اور بحیرۂ مردار تک پھیلی ہوئی تھی۔ بیروت، صیدا،

قیساریہ، ارسوف اور یافا سے لے کر مصر کا سرحدی قلعہ عسقلان بھی اس کے تحت تھا۔

4۔ الرُّھا (اُڈیسہ Odessa): ان تمام ریاستوں کے شمال میں رُہا (اڈیسہ) کی ریاست تھی جو رقبے میں ان سب سے بڑھ کر تھی۔ یہ ساحل سے ہٹ کر شام اور عراق کے اندرونی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں سروج، عین تاب، ساموسٹا، مرعش اور تل باشر جیسے علاقے شامل تھے۔

اس کی آخری سرحد دیار بکر سے جاملتی تھی۔ دریائے فرات اس کے عین درمیان سے گزرتا تھا۔

نوٹ: بعض مؤرخین نے رُہا/اڈیسہ کا مصداق عزاز کو قرار دیا ہے جو حلب کا شمالی قلعہ تھا مگر یہ درست نہیں۔ اصل میں الرُّہا شمالی حران کا وہ شہر ہے جسے بازنطینی رومیوں نے آباد کیا تھا۔ یہ نہر بلیخ کے منابع کے پاس ہے۔ اس کا یونانی نام callrho ہے جسے عربوں نے الرُّھا بنادیا۔ صلیبی نوابوں نے پہلی صلیبی جنگ میں القدس کی فتح سے پہلے ہی اس شہر پر قبضہ کر کے ایک ریاست کی بنیاد ڈال دی تھی جو پھیلتی چلی گئی۔ عزاز اس کا ایک حصہ تھا جسے 512ھ میں فرنگیوں نے فتح کیا تھا۔

ان تمام ریاستوں کے حکمران القدس کے فرمانروا کو اپنا قائد تسلیم کرتے تھے اور یورپ سے تازہ بتازہ کمک کے ذریعے اسلامی سرحدوں کو مزید پامال کرنے کے لیے آئے دن کسی نہ کسی سرحدی قلعے پر حملے کرتے رہتے تھے۔ لین پول کے بقول:

"صلیبی اسلامی علاقوں میں اس طرح گھس گئے تھے جیسے لکڑی میں پچر ٹھونک دی جائے۔ کچھ عرصے تک یوں لگتا تھا کہ یہ پچر اسلامی سلطنت کے درخت کے پرخچے اڑا دے گی۔"[1]

نجم الدین ایوب کو یقین تھا کہ اگر دربارِ خلافت اور سلجوقی بادشاہت نے صلیبی جارحیت کی اس طوفانی لہر کا رخ بروقت نہ پھیرا تو صلیبیوں کو دریائے دجلہ عبور کرنے میں بھی زیادہ عرصہ نہیں لگے گا تاہم دربارِ خلافت کی حالت عالمِ اسلام کو درپیش بیرونی خطرات کے تحفظ کے حوالے سے نہایت مایوس کن تھی۔ سلجوقی بادشاہ جو کچھ عرصے پہلے تک مسلمانوں کی سطوت وہیبت کا نشان تھے، بری طرح آپس میں گتھم گتھا تھے، الپ ارسلان اور ملک شاہ جیسے اولوالعزم حکمرانوں کے دو بڑے وارث سلطان مسعود اور سلطان محمود ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش اقتدار میں مشغول تھے، یہ کھنچا تانی 525ھ میں اسی وقت رکی جب سلطان محمود دنیا سے رخصت ہوا۔ مگر اب سلطان مسعود کو اپنے چچا سلطان سنجر سلجوق کی جہانگیری سے خطرہ لاحق ہو چکا تھا جو وسط ایشیا اور خراسان کے ایک وسیع علاقے کا حکمران تھا۔

---

[1] صلاح الدین، لین پول، ص: 24

اقتدار کے ان معرکوں کے درمیان بغداد کے خلیفہ مسترشد باللہ نے بڑی پامردی سے اپنے مقبوضات کا دفاع کیا اور ہر موقع پر خلافت کی بچی کھچی آن بان کو قائم رکھا۔ان سیاسی چپقلشوں کے دوران کسی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ شام کے ساحل سے پورے عالم اسلام پر چھاتے ہوئے صلیبی خطرے کو قابل توجہ سمجھتا۔ان حالات میں نجم الدین ایوب جیسے دردمند مسلمانوں کو کسی سے امید تھی تو وہ بصرہ اور واسط کا والی عماد الدین زنگی تھا جو فرنگیوں کو کئی معرکوں میں شکست دے چکا تھا۔اس کی بہادری کی داستانیں عراق اور شام کے ہر فرد کی زبان پر تھیں۔

فصل:3

عمادالدین زنگی

سقوطِ القدس کے بعد تقریباً چالیس سال تک عالم اسلام پر شدید جمود طاری رہا تھا، مگر پھر یکایک ان ساکت لہروں میں اضطراب پیدا ہوا اور عمادالدین زنگی کی شکل میں ایک چٹان عالم اسلام کے دفاع کے لیے ابھر آئی۔ عمادالدین زنگی کے پے در پے حملوں نے عیسائی فاتحین کے دماغ سے تمام اسلامی دنیا کو زیرِ نگین کرنے کا خیال نکال دیا اور وہ فلسطین اور شام کے مقبوضات کے دفاع ہی کو اپنی بڑی کامیابی سمجھنے لگے۔

عمادالدین زنگی کا باپ آق سنقر ملک شاہ سلجوقی کا معتمد ترین غلام تھا، ملک شاہ نے اسے قسیم الدولہ کا خطاب دیا تھا، وہ نہایت شریف، دلیر اور بیدار مغز انسان تھا۔ ملک شاہ نے اسے حلب کا حاکم بنایا تو اس کے عدل وانصاف کی ہر طرف تعریف ہوئی۔ اس نے موصل اور دیار بکر کو بھی ملک شاہ کے جانشین سلطان برکیارق کے لیے مسخر کیا۔ اس کے زیرِ انتظام علاقوں کا امن امان مثالی تھا۔ قافلوں کے راستے نہایت محفوظ تھے، لوگ چین کی زندگی گزار رہے تھے۔

488ھ (1095ء) میں آق سنقر سلجوقی بادشاہت سے وفاداری کرتے ہوئے قتل ہوگیا۔ اس وقت اس کا بیٹا عمادالدین صرف 10 سال کا تھا۔ آق سنقر کے ایک دوست ''کربوقا'' نے جو کہ موصل کا حاکم تھا، اس یتیم بچے کی پرورش کی یہاں تک کہ یہ بچہ کڑیل جوان بن کر موصل کی فوج میں بہادری کے جوہر دکھانے لگا اور اس کی غیر معمولی قابلیت مشہور ہوتی چلی گئی۔ کربوقا کے بعد موصل کے جتنے بھی حاکم تبدیل ہوئے، سب نے عمادالدین زنگی کی جرأت اور معرکہ دانی کو سراہا۔ پھر وہ سلطان محمود سلجوقی کے دربار سے وابستہ ہوگیا جس نے اس کی صلاحیت دیکھتے ہوئے 518ھ (1124ء) اسے واسط اور بصرہ کا جاگیردار بنا دیا، یہاں ایک سردار کی حیثیت سے اس نے خوب شہرت حاصل کی۔ پھر سلطان نے اسے اپنے شہزادوں کا خاص استاد مقرر کر دیا جسے اتالیق یا اتابک کہا جاتا تھا، یوں عمادالدین اتابک کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے سلجوقی بادشاہ کی خدمات انجام دیتے ہوئے حیرت ناک کارنامے انجام دیے۔

520ھ (1126ء) میں سلطان کی خلیفہ بغداد سے چپقلش کے دوران عمادالدین زنگی نے بغداد کی افواج سے واسط کو بڑی خوبی کے ساتھ بچایا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے بغداد پر اس زور کا جوابی حملہ بھی کیا کہ خلیفہ مصالحت پر آمادہ ہو گیا۔ اس واقعے نے سلطان کی نظر میں زنگی کا رتبہ بہت بڑھایا۔ اس نے اسے بغداد کا منتظم اعلیٰ بنا دیا۔ 521ھ (1127ء) میں سلجوقی بادشاہ کے ماتحت موصل کا حاکم امیر برسقی فوت ہوا تو سلطان محمود کو عمادالدین اس عہدے کے لیے موزوں لگا۔ چنانچہ اسے موصل اور دیگر علاقوں کا حاکم بنا دیا گیا۔ یہ موصل کی دولت اتابکیہ کا آغاز تھا۔[۵]

صلیبی خطرے کا ادراک: عمادالدین زنگی صلیبیوں کے خطرے کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا، ادھر الجزیرہ، کردستان اور شام کی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کی خانہ جنگیوں کے باعث مسلمانوں کی طاقت منتشر ہو رہی تھی اور اس طوائف الملوکی کو ختم کیے بغیر صلیبیوں سے بھرپور مقابلہ ممکن نہ تھا چنانچہ زنگی نے موصل کے نظامِ حکومت کو مضبوط کر کے ان بکھری ہوئی آزاد ریاستوں کی طرف پیش قدمی کی جن کی طاقت مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑانے میں صرف ہو رہی تھی۔ اس نے نصیبین، سنجار اور خابور جیسے شہروں پر قبضہ کر کے اپنی عملداری شام کی سرحدوں سے ملا دی۔ 523ھ (1129ء) میں وہ دریائے فرات عبور کر کے عیسائی مقبوضات کی راہ میں حائل مسلم ریاستوں کی طرف بڑھا۔ حصن بزاعہ، حماۃ، حلب اور حمص جیسے اہم شہر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ اب وہ اور عیسائی آمنے سامنے آچکے تھے۔ 524ھ (1130ء) میں اس نے فرنگیوں کے مضبوط ترین قلعے "حصن اثارب" پر حملہ کر دیا اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد فرنگیوں کو شکست فاش دے کر قلعے کو منہدم کرا دیا تاکہ آئندہ نصرانیوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہ ملے۔

نصرانیوں کا دوسرا اہم قلعہ حارم تھا جس کے والی نے صلح کی درخواست کی تھی۔ عمادالدین کی فوج تھک چکی تھی۔ اس لیے اس نے حارم کی سالانہ نصف آمدنی وصول کرنے کے معاہدے پر صلح قبول کر لی۔ عمادالدین کی ان فتوحات سے حلب، حماۃ اور گرد و نواح کے بہت سے شہر نصرانیوں کے مظالم سے محفوظ ہو گئے اور ان علاقوں کے عوام نے مدتوں بعد سکھ کا سانس لیا۔

عمادالدین کی ان مہمات کے بعد اس کے آقائے ولی نعمت سلطان محمود سلجوقی کا انتقال ہو گیا اور اس کے دوسرے بھائیوں میں خانہ جنگی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں عمادالدین زنگی کو بھی حصہ دار بننا پڑا۔[۶]

---

۵ الکامل فی التاریخ: 6/607، ابن خلدون: 5/219_222
۶ الکامل فی التاریخ: 6/620_630، ابن خلدون: 5/223_226

راہِ جہاد کے دو مسافر مشیت الٰہیہ نے نجم الدین ایوب کو عماد الدین زنگی سے ملانا طے کر لیا تھا۔ یہ ملاپ اس لیے ضروری تھا کہ اس سے ایک نئی کہانی وجود میں آنے والی تھی۔

سلطان محمود سلجوقی کی موت کے بعد 526ھ (1132ء) میں عراق وخراسان کی سیاست پر سلطان سنجر سلجوقی پوری طرح چھا گیا۔ اس نے سلطان مسعود کو شکست دے دی اور بغداد کو تابع رکھنے کے لیے عماد الدین زنگی کو دعوت دی کہ وہ بغداد کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے وہاں پہنچے۔ چوں کہ یہ سب کچھ خلیفہ کی مرضی کے خلاف تھا اس لیے اس نے عماد الدین زنگی کو روکنے کی تیاری کر لی۔ 27 رجب 526ھ (13 جون 1132ء) کو عماد الدین زنگی اور بغدادی افواج میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ عماد الدین زنگی کے ساتھ بنو اسد کے سردار دبیس بن صدقہ کے جنگجو بھی تھے جو لشکر کا اہم ترین حصہ تھے۔ جنگ زوروں پر تھی کہ دبیس بن صدقہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا، دیگر امراء بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ عماد الدین زنگی میدان میں تنہا رہ گیا، وہ اپنی عادت کے مطابق جم کر لڑتا رہا مگر جب اس کے ساتھی بہت کم رہ گئے تو اسے بھی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

اس نے بڑی شکستگی کی حالت میں موصل کا رخ کیا۔ راستے میں چند منازل طے کرنے کے بعد اس کے ساتھیوں کا تھکن سے برا حال ہو چکا تھا، وہ مزید سفر کے قابل نہیں تھے، سواریاں بھی جواب دینے لگی تھیں، زخمیوں کو علاج معالجے، سپاہیوں کو خوراک اور سواریوں کو چارے کی سخت ضرورت تھی۔ ایسے میں ان کی نظر دریائے دجلہ کے پار "تکریت" کے قلعے پر پڑی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مشیت خداوندی راہِ جہاد کے دو مسافروں کو ملانا چاہتی تھی۔

قلعہ دار نجم الدین ایوب دریا کے کنارے ٹھہرنے والی اس تباہ حال فوج کی درماندگی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ عام حالات میں شاید وہ اتنی آسانی سے کسی کو پناہ نہ دیتا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ یہ عماد الدین زنگی کا قافلہ ہے تو اس نے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ دریائے دجلہ پر کشتیوں کا پل بنا کر اس نے زنگی کے سپاہیوں کو اس طرف اتارا۔ مسافروں کے لیے خوراک اور سواریوں کے لیے چارے کا فوری بندوبست کیا، زخمیوں کے علاج معالجے کا بہترین انتظام کیا۔

عماد الدین زنگی پندرہ دن تک وہاں ٹھہرا رہا اور نجم الدین ایوب اس کی خدمت گاری کے لیے مستعد رہا۔ جب اتابک زنگی وہاں سے موصل روانہ ہوا تو اس کے دل میں نجم الدین کے لیے بڑی جگہ بن چکی تھی۔[1]

زنگی کی نئی مہمات ان دنوں زنگی کی زیادہ تر توجہ عراق کی سیاست پر تھی۔ چوں کہ ان دنوں خلیفہ

[1] المنتظم:276/5، الکامل فی التاریخ:631/6

مسترشد باللہ سے سلجوقیوں کی کشمکش وقفے وقفے سے جاری تھی لہٰذا خود زنگی بھی بعض مہمات میں بغداد کے خلاف صف آراء ہوا تاہم بعد میں اس نے خلیفہ سے صلح کر لی اور مرکز خلافت کا حسب سابق احترام کرنے لگا۔

خلیفہ مسترشد کے دور میں عماد الدین کو فرنگیوں کے مقابلے کے لیے کوئی نئی مہم شروع کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ وہ کردستان میں اپنی سرحدوں کو وسیع کرتا رہا اور 528ھ (1134ء) میں کردوں کے کئی قلعوں پر قابض ہو گیا۔ دمشق کا حاکم اسماعیل بن بوری شمس الملوک اپنی حکومت کی کمزوری کے باعث فرنگیوں سے خوفزدہ تھا۔ اس نے زنگی کو از خود دمشق پر قبضے کی دعوت دی۔ چنانچہ زنگی نے دمشق پر بھی حملہ کیا مگر شمس الملوک کے درباریوں نے دمشق کو زنگی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ حاکم دمشق اپنے لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ نئے حاکم کے نائب معین الدین انز نے شہر کا دفاع شروع کر دیا۔ زنگی محاصرہ کیے رہا مگر پھر خلیفہ مسترشد کی طرف سے صلح کے دباؤ پر اس نے یہ مہم ترک کر دی۔

<u>نجم الدین پر بہروز کا عتاب</u> ۞ نجم الدین ایوب نے زنگی کو پناہ دیتے ہوئے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہا تھا، اس فیصلے میں کسی بیرونی دباؤ کا دخل نہ تھا۔ مگر جب بغداد میں اس کے سرپرست بہروز کو جس نے اس کردی خانوادے کو تکریت کی قلعہ داری سونپی تھی اس اقدام کی اطلاع ملی تو وہ ناراض ہوا اور اسے عاقبت نااندیشی قرار دیا۔ اس کے باوجود نجم الدین کو اپنے کیے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ تاہم انہی دنوں ایک اور حادثہ پیش آ گیا۔ نشانہ بازی کے دوران نجم الدین کی غلطی سے تیر بہروز کے ایک غلام کو لگا جو مہلک ثابت ہوا۔

نجم الدین کو اس واقعے سے سخت ندامت ہوئی، بہروز کے لیے بھی یہ بات بہت تکلیف دہ تھی مگر چوں کہ ایسا بلا قصد ہوا تھا اس لیے رعایت کی گنجائش نکل آئی۔

چوں کہ تقدیر الٰہی میں اس کردی خاندان اور زنگی خانوادے کے راستے ایک ملے ہو چکے تھے اس لیے کچھ عرصے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ نجم الدین کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موصل کی راہ اختیار کرنا پڑی۔

نجم الدین ایوبی کے صبر وتحمل کے برعکس اس کے چھوٹے بھائی شیر کوہ میں جوش کا عنصر غالب تھا، ایک دن اس نے شہر کے کسی بدقماش افسر کو جان سے مار ڈالا، اس افسر نے کسی لڑکی کو چھیڑا تھا، لڑکی نے آکر شیر کوہ سے فریاد کی وہ غضبناک ہو کر اس افسر کی تلاش میں نکلا اور اسے نیزے کے وار سے موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مقتول نصرانی تھا اور اس نے شیر کوہ سے بے ہودہ گوئی بھی کی تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کے سیاسی واخلاقی تنزل کے باوجود افسران تو کجا حاکم بھی عدالت کی گرفت سے آزاد نہیں تھے۔ اس لیے شیر کوہ کے ہاتھوں اس ماورائے عدالت قتل پر حکومت نے باز پرس کی۔ خود نجم الدین ایوب اس معاملے میں اپنے بھائی سے ناراض تھا، اس نے خون بہا دینے میں بھی بھائی کی مدد سے انکار

کر دیا اور اسے قید کر کے تمام صورتحال بغداد میں اپنے والی مجاہد الدین بہروز کو لکھ بھیجی۔ مجاہد الدین بہروز کو سخت رنج ہوا، اس نے جواباً لکھا:

''تمہارے باپ کا مجھ پر احسان ہے اس لیے میں تم دونوں بھائیوں سے سخت برتاؤ کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تکریت سے نکل جاؤ۔''[1]

ایوب کے ہاں یوسف کی ولادت نو ماہ ہوئے کہ نجم الدین کی اہلیہ اُمید سے تھی، اس دوران اس نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا، کوئی کہہ رہا تھا:

إِنَّ فِي بَطْنِكِ سَيفًا مِن سُيُوفِ اللهِ تعالى

''بلاشبہ تیرے شکم میں اللہ کی ایک تلوار ہے۔''[2]

ادھر نجم الدین ایوب اور اس کا بھائی اب تکریت سے نکل کر اپنی منزل کہیں اور تلاش کرنے پر مجبور تھے۔ وہ عہدوں سے معزولی کا حکم نامہ وصول کرنے کے بعد اپنا ساز و سامان لپیٹ کر نہایت دل شکستگی کے عالم میں کسی نامعلوم ٹھکانے کی طرف روانگی کی تیاری کر رہے تھے کہ انہیں ایک خوشخبری ملی...... گھر میں ایک بچے کی ولادت ہوئی تھی۔

عام حالات میں یہ یقیناً سب کے چہروں کو خوشی سے گلنار کر دینے والی نوید تھی۔ مگر یہاں نجم الدین ایوب کا غم اس مسرت پر غالب تھا۔ اس کی سرکاری نوکری ختم ہو چکی تھی، منصب چھن چکا تھا، سالہا سال کی کوشش اور محنت سے حاصل کردہ مقام خاک میں مل گیا تھا، خاندانی وقار پامال ہو چکا تھا، ایسے میں کوئی اچھی سے اچھی خبر بھی اسے خوش نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مایوسی کے عالم میں اس بچے کو اپنے لیے منحوس تصور کیا جس کی آمد پر اسے اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑ رہا تھا۔ ان پریشان کن خیالات کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے کاتب نے کہا:

''اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔''

نجم الدین نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا:

''معلوم ہوتا ہے آپ اس بچے کی ولادت کو نامبارک تصور کر رہے ہیں۔ مگر جو ہوا اس میں بھلا بچے کا کیا قصور! یہ تو اللہ کی تقدیر تھی۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ کل ایک بہت بڑا بادشاہ بن جائے جس کی ساری دنیا میں شہرت ہو۔''

غمزدہ نجم الدین ایوب اس بہلاوے سے کہاں بہلتا۔ اس نے اس جملے کو محض ایک مذاق خیال کیا

---

[1] الکامل فی التاریخ: 6/643_648

[2] کتاب الروضتین: تحت 583ھ

البتہ اب اسے بچے پر پیار آنے لگا۔ [1]

غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں...... اس کے سوا کون جانتا تھا کہ اس بچے کو دنیا کی تاریخ کے چند عظیم الشان فاتحین کی صف میں جگہ ملنے والی ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ اسلام کا وہ سپوت ثابت ہوگا جس کے کارناموں پر مسلمان ہمیشہ فخر کریں گے۔

یہ ایسا بادشاہ ہوگا جس کی شہرت تا قیامت رہے گی۔ تکریت کے قلعے کی سنگین وادیوں میں جنم لینے والے اس نومولود بچے کا نام ''یوسف'' رکھا گیا، یہی مستقبل کا ''صلاح الدین ایوبی'' تھا جس کے نام سے اس کے پورے خاندان اور ملتِ اسلامیہ کی تاریخ چمکنے والی تھی۔ یہ واقعہ 532ھ (1138ء) کا ہے۔

نجم الدین ایوب کو علم ہوتا کہ وہ کس فرزند کا باپ بنا ہے تو یقیناً اس کا رنج و غم مسرت و شادمانی کی انتہا میں تبدیل ہو جاتا۔ مگر ہر انسان کی طرح وہ بھی کل سے ناواقف تھا۔ وہ صرف آج کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کے لیے کانٹے ہی کانٹے تھے۔ [2]

<u>نجم الدین، زنگی کے در پر</u>: تکریت سے نکلتے ہوئے نجم الدین ایوب کو عماد الدین زنگی کے سوا اور کوئی سہارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اتابک زنگی جس کی بلند ہمتی کا وہ شروع سے گرویدہ تھا، اسے نہیں بھولا ہوگا۔

یہ دور عماد الدین زنگی کے عروج کا تھا۔ ہر زبان اس کی شرافت، دلیری اور عدل و انصاف کا اعتراف کر رہی تھی، اس نے اپنا نظام حکومت اس خوبی سے چلایا کہ نظام الملک طوسی کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس کے فرنگیوں کے خلاف جہادی کارنامے لوگوں میں مشہور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے برسوں بعد عالم اسلام کو جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا تھا۔ نصرانیوں کی وہ طاقت جسے مسلمانوں کے انتشار نے ناقابل شکست بنا دیا تھا، عماد الدین زنگی کے پے در پے حملوں سے اپنا سابقہ رعب و دبدبہ کھونے لگی تھی۔

نجم الدین ایوب جب عماد الدین زنگی کے ہاں پہنچا تو وقت کا یہ شاہین صفت مجاہد شام سے نصرانیوں کو مکمل طور پر بے دخل کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے نجم الدین ایوب جیسے قابل انسان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے فوج میں موزوں عہدہ اور جاگیر عنایت کی۔ عماد الدین زنگی نے آئندہ چند سالوں میں شام کے عیسائی مقبوضات اور وہاں کے ملت فروش مسلمان حکمرانوں کے خلاف زبردست مہمات انجام دیں۔ ذی الحجہ 533ھ (1137ء) میں اس نے بعلبک کا مشہور قلعہ بھی نصرانیوں کے حلیف مسلم امراء سے چھین لیا۔ [3]

---

[1] کتاب الروضتین بحوالہ 568ھ ذی الحجہ 7 عہد نجم الدین ایوب
[2] اتراد بالسلطانیہ: ص 31 ملتان خلدون: 5/275، کتاب الروضتین: 2/254
[3] البدایہ والنہایہ بحوالہ 533ھ کتاب الروضتین: 2 256

بعلبک کا نیا قلعہ دار: قلعے پر قبضہ کے بعد موصل کی فوج کے افسران ان دشمن امراء کو سولی دینے لگے جو ان کے نزدیک نا قابل معافی تھے۔ عام طور پر زنگی اپنے مخالفین سے اتنا سخت سلوک نہیں کرتا تھا مگر بعلبک کے امراء نے قلعے پر اس افواج کے قبضے سے قبل شہر کے مال ومتاع اور ساز وسامان کے تمام ذخائر تباہ کر دیے تھے تا کہ حریف کو کوئی مالی فائدہ نہ ہو، اس لیے زنگی نے برافروختہ ہو کر اس حرکت کے ذمہ داروں کو سزائے موت سنائی تھی اور اب یہ قیدی سولی کے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں ایک خوبصورت سن رسیدہ امیر بھی اپنے لڑکے کے ساتھ سزا کا منتظر تھا۔ لڑکے کا حسن وجمال چاند کو شرماتا تھا، جب اس کی باری آئی تو اس کے بوڑھے باپ نے آگے بڑھ کر زنگی کے سالار، امیر یاغبسانی سے کہا: ''تمہیں تمہارے آقا زنگی کا واسطہ! اس سے پہلے مجھے سولی دے دو تا کہ میں اپنے بچے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتا نہ دیکھوں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

نجم الدین ایوب موصل کی فوج کے ایک افسر کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ وہ یہ دردمندانہ جملہ سن کر تڑپ اٹھا، اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ چوں کہ سولی دینے کا ذمہ دار امیر یاغبسانی تھا، لہٰذا نجم الدین نے اس قیدی کی سفارش کرتے ہوئے اسے کہا کہ اس بے چارے کو رہا کر دیا جائے۔

امیر نے کہا:

''یہ میرے اختیار میں نہیں۔ میں آقا کے حکم پر عمل کر رہا ہوں، حکم عدولی سے ڈرتا ہوں۔''

بے چین نجم الدین عماد الدین زنگی کے پاس جا پہنچا اور اسے یہ قصہ سنا کر قیدی باپ بیٹے کی رہائی کی درخواست کی۔ زنگی اتنا متاثر ہوا کہ اس نے تمام قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا اور ساتھ ہی نجم الدین کی شرافت اور رحم دلی سے خوش ہو کر اسے بعلبک جاگیر کے طور پر دیا۔ [1]

بعلبک میں: ''بعلبک'' لبنان کا ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں قدیم مذاہب کے عبادت خانے اور بلند وبالا ستونوں پر ایستادہ عجیب وغریب محلات انسان کو صدیوں پرانے دور میں لے جاتے تھے۔ مقامی لوگوں کے مطابق ان محلات میں سے ایک حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کردہ تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کی قبر بھی اسی شہر میں بتائی جاتی تھی۔ دمشق سے حمص جانے والی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کی عسکری حیثیت بھی غیر معمولی تھی۔ موسم کے لحاظ سے یہ شام کا سرد ترین علاقہ ہے جو سطح سمندر سے تین ہزار سات سو فٹ بلند ہے۔ اس کی آبادی ایک مضبوط فصیل سے گھری ہوئی تھی جس کے مغربی کونے پر بعلبک کا تاریخی قلعہ تھا۔ شہر کے اطراف میں میلوں دور تک سرسبز کھیتوں اور خوشنما نخلستانوں کا سلسلہ تھا

[1] الکامل فی التاریخ: 7/28، سلاطین حلب ودمشق: 5/275

جنھیں لبنان کے پہاڑوں سے نکلنے والا چشمہ ''راس العین'' سیراب کرتا تھا۔ [1]

نجم الدین ایوب یہاں بہت خوش تھا، اس صحت بخش پرفضا مقام میں اس کا نونہال یوسف خوب پروان چڑھ رہا تھا۔ نجم الدین شروع ہی سے اس کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دے رہا تھا، ادھر عماد الدین زنگی نصرانیوں سے فیصلہ کن جنگ کے لیے دمشق پر قبضہ کرنا ضروری سمجھتا تھا جو بعلبک سے صرف 36 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کا حاکم نصرانیوں کا حلیف تھا۔ زنگی کے نزدیک اس کا وجود نصرانیوں سے کم خطرناک نہیں تھا۔ زنگی اس سے پہلے بھی دمشق پر زور آزمائی کر چکا تھا مگر اس کی مہم ناکامی کا شکار ہوئی تھی۔ تاہم بعلبک جیسے مضبوط قلعے کو اپنی آخر سرحدی چوکی بنانے کے بعد وہ کسی بھی مناسب موقع سے فائدہ اٹھا کر دمشق پر اچانک حملہ کر سکتا تھا۔

دمشق پر زنگی کے حملے: 534ھ (1140ء) میں عماد الدین کو دمشق کے حاکم جمال الدین کی موت کی خبر ملی۔ دمشق میں تھوڑی ہی مدت میں کئی حاکم تبدیل ہوئے تھے، تاج الملک نے 526ھ تک، شمس الملوک اسماعیل نے 529ھ تک اور محمود شہاب الدین نے 533ھ تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد جمال الدین محمد اپنی حکومت کے پہلے ہی سال فوت ہوگیا۔ زنگی کو جونہی اس کی موت کا پتا چلا اس نے کسی پس وپیش کے بغیر دمشق کا محاصرہ کرلیا مگر جمال الدین کے بیٹے مجیر الدین نے اپنے باپ کی مسند پر بیٹھتے ہی زنگی سے مقابلے کے لیے عیسائی قلعہ داروں کو مدد کے لیے بلالیا، زنگی نے نصرانیوں کی آمد کی اطلاع پا کر محاصرہ اٹھالیا۔ اور اس طرح یہ مہم بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اسی سال اس نے دوبارہ دمشق پر حملہ کیا مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

دمشق پر مجیر الدین کی حکومت 549ھ (1154ء) تک برقرار رہی۔ اس کے اور اس کے باپ کے دور میں سارا انتظام نائب معین الدین انز کے پاس رہا جو 544 (1149ء) ھ میں فوت ہوا۔ [2]

رُہا (اڈیسہ) کی فتح: بعلبک پر قبضے کے بعد کئی سال تک عماد الدین زنگی اپنی ریاست کے اندرونی معاملات سلجھانے میں معروف رہا اور اسے نصرانیوں کے خلاف فوج کشی کا موقع نہ مل سکا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس کا کام ادھورا ہے مگر اس سے پہلے عراق کی سرحدوں کو لاحق خطرات کا تدارک ضروری تھا۔ چند سال بعد جب وہ الجھے ہوئے اندرونی مسائل سے فارغ ہوا تو اس کے سامنے سب سے پہلا ہدف اڈیسہ کی عیسائی سلطنت تھی جو شام سے لے کر ایشیائے کوچک اور عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ تمام عیسائی ریاستوں سے وسیع تھی۔ دریائے فرات کے مشرق

[1] کتاب الروضتین: 129/1
[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ: 6/634_635

میں یہ البیرۃ، سروج اور قرادی سے ماردین کے نواح تک پھیلی ہوئی تھی۔ رُہا اس کا مرکز تھا۔ دریا کے مغرب میں یہ تل باشر، عین تاب اور عزاز تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس کا حاکم جوسلین دوئم جو اپنے باپ جوسلین اوّل کی موت کے بعد تخت نشین ہوا تھا، ایک درندہ صفت انسان اور نہایت متشدد عیسائی تھا۔ اسلام دشمنی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کے سپاہیوں کی لوٹ مار اور دہشت گردی سے گردونواح کی اسلامی آبادیاں سخت پریشان رہتی تھیں۔

عمادالدین زنگی نے اڈیسہ کے مرکز "رُہا" پر حملے کے لیے بڑی حکمت عملی سے کام لیا، اس قلعے کی اہمیت اور مضبوطی سے وہ خوب واقف تھا، اس لیے براہ راست وہاں کا رخ کرنے کی بجائے اس نے دیار بکر کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں ایک قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ جوسلین جو کہ عمادالدین کی فوج کی نقل وحرکت کی خبر سن کر پریشان ہوگیا تھا، یہ دیکھ کر بے فکر ہوگیا کہ مسلمان فوج کردستان کی طرف نکل گئی ہے۔ اب وہ بھی رُہا کو چھوڑ کر تفریح کے لیے اپنی جاگیر "تل باشر" چلا گیا۔ جاسوسوں نے فوراً یہ اطلاع زنگی کو پہنچائی اور وہ بجلی کی طرح کردستان سے رُہا کی فصیلوں کے سامنے آن پہنچا۔ زنگی نے فوج کی ہمت بڑھانے کے لیے اعلان کیا:

"میرے ساتھ دسترخوان پر کھانا صرف وہ کھائے گا جو قلعے کے دروازے پر حملہ کرنے میں میرے ساتھ ہوگا۔"۵

سپاہی زنگی کے حملے کی تیزی سے خوب واقف تھے، جانتے تھے کہ امیر کے شانہ بشانہ حملہ آور ہونا ہنسی کھیل نہیں اس لیے سب چپ رہے۔ صرف ایک امیر اور ایک لڑکے نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ کسی نے لڑکے کو جھڑکا کہ تیرا وہاں کیا کام! زنگی نے ٹوک کر کہا:

"رہنے دو۔ بخدا مجھے اس کے چہرے پر لکھا نظر آرہا ہے کہ یہ پیچھے رہنے والا نہیں۔"۵

اگلے دن رہا کے دروازے پر حملہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے زنگی، اس امیر اور اس لڑکے نے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر دھاوا بولا۔ اُدھر سے ایک نائٹ نے پہلو سے آکر زنگی پر وار کیا، مگر امیر نے یکدم سامنے آکر زنگی کو بچالیا اور خود شہید ہوگیا۔ اس کی شجاعت دیکھ کر پوری فوج میدان میں کود پڑی۔ شہر کا سختی سے محاصرہ کرنے کے بعد اٹھائیسویں دن منجنیقوں کے ذریعے فصیل کو توڑ دیا گیا۔ اسلامی فوج رُہا میں داخل ہوگئی اور شدید جنگ کے بعد اس پر قابض ہوگئی۔

---

۵ الکامل فی التاریخ: 7/30۔31

۵ الکامل فی التاریخ: 7/47۔48، الروضتین: 1/138۔140

عمادالدین زنگی نے شہر والوں سے نہایت فیاضانہ سلوک کیا اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ یہ شاندار فتح 6 جمادی الثانیہ 539ھ (23 دسمبر 1144ء) کو نصیب ہوئی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر مورخین اسے ''فتح الفتوح'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عالم اسلام میں اس پر خوشیاں منائی گئیں اور زنگی کا نام بغداد کے خطبے میں داخل کر لیا گیا۔[1]

رہا کے ہاتھ سے نکل جانے پر عیسائی دنیا ششدر رہ گئی تھی۔ عیسائی مورخین نے اسے شام کی صلیبی سلطنت کے زوال کا پہلا قدم قرار دیا ہے۔ مجاؤ لکھتا ہے:

''یورشلم اور دوسرے شہروں کے نصرانیوں نے عزاز کی فتح اور تباہی کی خبر سن کر مایوسی کے اشک بہائے۔ دریائے فرات کے کناروں سے آنے والی منحوس خبروں نے انہیں اور بھی ڈرا دیا۔ حضرت مسیح کی قبر اور پہاڑ سے ان پر بجلی بھی گری۔ ایک دم دار ستارہ نظر آیا اور شدید خوف و ہراس پھیلا۔ مشرق کے نصرانیوں نے یقین کر لیا کہ آسمان ان کا مخالف ہو گیا ہے اور ان پر ہیبت ناک مصائب آنے کو ہیں۔''[2]

اس شکست سے مضطرب ہو کر پادریوں نے ایک نئی صلیبی جنگ برپا کرنے کے لیے جوشیلی تقریریں روع کر دیں۔ شاہان یورپ نے بڑی بڑی قربانیاں دینے کے دعوے کیے مگر فوری طور پر وہ کچھ نہ کر سکے۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: 26/5

[2] صلاح الدین: 36

فصل:4

بعلبک سے دمشق تک

زنگی اپنے حصے کا کام انجام دے چکا تھا۔ اسلامی دنیا پر نصرانیوں کی مزید جارحیت کا راستہ بند کر کے اس نے مسلمانوں کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی ہیئت میں لا کھڑا کیا تھا۔ ساٹھ سال کے تھکے ماندے جسم کو اب آرام کی ضرورت تھی۔ پھر بھی راحت و آرام کا لفظ اس کے لیے اجنبی تھا۔ نصرانیوں کو ایک شدید دھچکا پہنچانے کے بعد وہ اندرونی مہمات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ 5 ربیع الثانی 541ھ (13 ستمبر 1146ء) کی شام وہ جعبر کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک چند غدار غلاموں نے اس کے خیمے میں داخل ہو کر اسے شہید کر دیا۔[1]

زنگی کی شہادت نے مسلمانوں کو جس قدر بے چین کیا، عیسائی اتنے ہی خوش ہوئے۔ مچاڈ کے بقول:

"اس کی موت کی خبر سے نصرانیوں نے اپنی شکستوں کا غم دور کیا اور اس قدر خوشی کا اظہار کیا گویا مسلمانوں کی ساری طاقت یک بارگی زمین بوس ہو گئی ہے۔"[2]

عماد الدین زنگی بڑا بہادر، شریف اور جنگجو انسان تھا۔ اس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن ایک سپاہی اپنی ذمہ داری سے غافل ہو کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو زنگی کو سر پر کھڑے پایا۔ جونہی اس کی نگاہیں اس شیرِ نر سے چار ہوئیں، خوف کے مارے وہیں دم توڑ دیا۔[3] زنگی جو ایک معمولی سپاہی تھا اپنی اولاد کے لیے ایک وسیع ملک چھوڑ گیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے القدس کی آزادی کی راہ ہموار کر دی تھی۔

انقلابِ شام اور نجم الدین ایوب کی دمشق روانگی: عماد الدین زنگی کی موت کی خبر نے بعلبک کے در و دیوار بھی ہلا ڈالے۔ نجم الدین ایوب اس کے عواقب سے بے خبر نہ تھا۔ اپنے اندازے کے عین مطابق اس نے دیکھا کہ اتابک زنگی کی سلطنت فوراً دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: 7/67 تحت 562ھ

[2] مآثر حیات صلاح الدین: ص 55

[3] الروضتین: ج 1، فصل ذکر بعض سیرۃ زنگی

حلب سمیت شام کے صوبے اس کے چھوٹے بیٹے نورالدین محمود زنگی کے پاس آ گئے جبکہ موصل میں اس کا بڑا بیٹا سیف الدین غازی مستقل حکومت کا دعوے دار بن گیا۔ ان دونوں میں اقتدار کی کشمکش کے دوران موقع پا کر دمشق کے حکمران نے بعلبک کا محاصرہ کر لیا۔ نجم الدین نے اپنے آقازادوں سے کمک طلب کی مگر کوئی جواب نہ ملا۔

نجم الدین ایوب کو اتابک زنگی کی موت کا شدید ملال تھا۔ سو اس کے بیٹوں میں تقسیم شدہ سلطنت سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بعلبک کے لیے کسی کمک کا انتظار بے سود ہے کیونکہ اتابک زنگی کے جانشینوں کو باہم محاذ آرائی سے قطعاً فرصت نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو کشت و خون سے بچانے کی خاطر بعلبک حاکم دمشق کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے اس نے دمشق میں ایک مکان اور نواحِ شہر میں دس دیہاتوں کی جاگیر حاصل کر لی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بھائی شیرکوہ کو زنگی خانوادے ہی سے وابستہ رکھنا پسند کیا۔ [1]

نورالدین زنگی - ایک نیا ستارہ: زنگی کے جانشینوں میں نورالدین زنگی یقیناً اپنی ذہانت، شجاعت اور دینداری کے باعث قابل ترجیح تھا۔ چنانچہ شیرکوہ حلب میں نورالدین زنگی کے دربار سے منسلک ہو گیا، یہاں اسے اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں کے اظہار کا خوب موقع ملا اور وہ اسدالدین کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اسے نورالدین زنگی جیسا بلند حوصلہ قائد نصیب ہوا تھا جو مردم شناس بھی تھا اور بہادروں کا قدردان بھی۔

نورالدین سچ مچ مجاہد فی سبیل اللہ تھا۔ 541ھ (1146ء) میں اپنے باپ کے قتل کے بعد سے لے کر اپنی موت تک وہ مسلسل نصرانیوں سے معرکوں میں مشغول رہا۔ سب سے پہلے اسے رُہا کی بازیابی کے لیے جانا پڑا۔ ہوا یہ تھا کہ رُہا کے سابق حاکم کاؤنٹ جوسلین دوئم نے عمادالدین زنگی کی موت کے بعد موقع پا کر مقامی آرمینی باشندوں کو جو کہ مذہباً عیسائی تھے مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ ان سے گٹھ جوڑ کر کے وہ باقاعدہ فوج کے ساتھ رُہا پر حملہ آور ہوا اور (نومبر 1146ء) میں بڑی آسانی سے شہر پر قابض ہو گیا۔ تاہم شہر کے مسلمان قلعے میں محصور ہو گئے جسے جوسلین فتح نہ کر سکا۔ نورالدین نے یہ اطلاع پاتے ہی حلب سے رُہا کی طرف پیش قدمی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس طرح جوسلین کی فوج قلعے کے مسلمانوں اور نورالدین کے سپاہیوں کے درمیان محصور ہو گئی۔ ایک رات نصرانیوں نے جان بچانے کے لیے شہر کے دروازے کھول دیے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر قلعے

[1] ابن خلدون: 235/5

کی فوج نے تعاقب کیا اور نور الدین کے لشکر نے بھی سامنے سے انہیں گھیر گھیر کر مارا۔ کاؤنٹ جوسلین جان بچا کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ رُھا شہر پر قبضے کے بعد اس پوری ریاست کا بچا کھچا علاقہ کچھ نور الدین نے فتح کر لیا اور کچھ پر مسعود بن قلیج ارسلان نے قبضہ جمالیا۔ اس طرح رُھا جو شام میں صلیبیوں کی سب سے پہلی اور سب بڑی ریاست تھی تقریباً پوری کی پوری نصرانیوں کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ [1]

رُھا کی فتح کی خوشی اس وقت دوبالا ہو گئی جب نور الدین کے بھائی سیف الدین غازی نے شام آ کر اس سے ملاقات کی اور اسے گلے لگا کر نصرانیوں کے خلاف متحد رہنے کا اعلان کیا۔

دوسری صلیبی جنگ: مگر جلد ہی نور الدین زنگی کو ایک بہت بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ شام کے عیسائی پادری یورپ پہنچ کر پوپ کو مسلمانوں کی ان فتوحات کی داستان سنا چکے تھے۔ یورپ میں ان خبروں سے ایک آگ سی لگ چکی تھی۔ مچاڈ لکھتا ہے:

> ''نصرانیوں کی سفارت کا بیان سن کر پوپ کے آنسو نکل آئے۔ رُھا کی مصیبتوں اور یروشلم پر آنے والے خطرات کے احساس نے سب میں رنج اور ڈر پیدا کر دیا۔ تمام یورپ میں خوف و دہشت کی پکار مچ گئی۔'' [2]

پہلی صلیبی جنگ کی طرح اس بار بھی لوگوں کو بھڑکانا مشکل ثابت نہ ہوا۔ ایک پادری سینٹ برنارڈ اس اشتعال انگیزی میں پیش پیش تھا۔ (1146ء) میں فرانس کے شہر ویلزلی کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سینٹ برنارڈ کی جوشیلی تقریر نے ایک کہرام مچا دیا۔ شاہ فرانس لوئی ہفتم نے خود سینٹ برنارڈ کے ہاتھ سے صلیب مقدس لی۔ لوگوں کے بے پناہ ہجوم کی وجہ سے اسے قلعے سے نکل کر میدان میں آنا پڑا۔ ایک چوبی مینار پر چڑھ کر اس نے صلیب سینے سے لگا کر سب کو دکھائی اور مجمعے کو جوش سے بے حال کر دیا۔

اب برنارڈ نے جرمنی کا رخ کیا۔ یہاں کے بادشاہ کونراڈ ثالث نے اس مہم میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ مگر برنارڈ نے کوشش جاری رکھی اور ایک دن اس کے سامنے مسلمانوں کے مظالم کی اتنی دردناک منظر کشی کی کہ بادشاہ بے اختیار رونے لگا اور سینٹ کے ہاتھ سے صلیب لے کر فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ یوں فرانس میں دوسری صلیبی جنگ کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ ان گنت لوگ صلیبی جنگ کے لیے روانہ ہونے کو تیار ہو گئے۔ مچاڈ لکھتا ہے:

> ''دیہات ویران اور قلعے خالی ہو گئے۔ سوائے یتیموں اور بیواؤں کے کوئی باقی نہ رہا۔''

[1] الکامل فی التاریخ: 7/57، 58 [2] بحوالہ حیات صلاح الدین، ص: 77

542ھ(1147ء) میں چار لاکھ فرانسیسی سپاہی شاہ فرانس لوئی ہفتم کی قیادت میں یورپ سے ایشیائے کوچک پہنچے اور شام کی طرف بڑھنے لگے، شام کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے ان کی افواج کو قونیہ کے سلجوقی ترکوں نے بری طرح پامال کیا۔ موسم کی سختیوں نے بھی انہیں تباہ کیا۔ جب یہ فوج انطاکیہ پہنچی تو ایک لاکھ یعنی صرف ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔ ادھر شاہ جرمنی کونراڈ ثالث قسطنطنیہ سے بحری راستہ اختیار کر کے شام کے ساحلی شہر عکا پہنچ گیا۔ یہ دونوں بادشاہ یروشلم میں آ کر اکٹھے ہوئے اور راستے کے مصائب پر ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے۔ جنگ کی منصوبہ بندی شروع ہوئی۔ شاہانِ یورپ نے شاہِ یروشلم بالڈون ثانی کے ساتھ مشورہ کر کے سب سے پہلے دمشق کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔

دمشق کے امراء کا نصرانیوں سے صلح کا معاہدہ تھا مگر صلیبی لشکر نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ شہر کی فصیل جو مٹی کی تھی گزشتہ صلیبی حملوں سے خاصی شکستہ ہو رہی تھی تاہم شہر کے باغوں کی گنجانی نے اسے ایک طرف سے محفوظ بنا رکھا تھا۔ بہرحال صلیبی لشکر نے دمشق کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ دمشق کے سالاروں میں نجم الدین ایوب بھی شامل تھا، جس نے نہایت پامردی سے شہر کا دفاع کیا۔ امرائے شہر نے بھی بڑے تدبر کا مظاہرہ کیا۔ دمشق کے نائب حاکم معین الدین انز نے مدد کے لیے سیف الدین غازی کو بلوالیا جو حلب سے نورالدین زنگی کو ساتھ لیتا ہوا حمص پہنچا اور صلیبی افواج سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ صلیبی حکمران امرائے شام کے اتحاد، مقامی فوج کی زبردست مزاحمت اور حاکمِ دمشق کی سیاسی چالوں سے کچھ ایسے سٹپٹائے کہ ایک مدت کے محاصرے اور جھڑپوں کے بعد ناکام واپس لوٹ گئے۔ دمشق سے واپس جاتے ہوئے انہوں نے "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے بمصداق عسقلان کا محاصرہ کرنے کی بھی منصوبہ بندی کی مگر آخر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس جانا پڑا۔[1] مجاؤ لکھتا ہے:

"اس محاصرے کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ ایوب جو خاندانِ ایوبیہ کا سردار تھا دمشق کی افواج کا سالار تھا۔ اس کے ساتھ اس کا لڑکا صلاح الدین بھی تھا جو ایک دن نصرانیوں پر اس طرح غالب آنے والا تھا کہ یروشلم کا مالک ہو جائے۔"[2]

صلیبی جنگجوؤں کی واپسی کے بعد بھی نورالدین زنگی کی یلغار رکنے میں نہ آئی۔ محرم 545ھ (مئی 1150ء) میں اس نے حلب کے شمال میں کاؤنٹ جوسلین کے دوسرے اہم قلعے عزاز کو بھی فتح کر لیا۔ اس مہم میں جوسلین خود بھی گرفتار ہوا اور نو سال قید میں رہنے کے بعد جیل ہی میں مرا۔ یہی جوسلین تھا جس نے نورالدین کے ایک امیر کو گرفتار کر کے اس کی زرہ قونیہ سلجوقی بادشاہ مسعود بن قلج ارسلان کو بھیج کر کہا تھا:

---

[1] الکامل فی التاریخ: 7/67_69 [2] مجموعہ حیات صلاح الدین: ص: 78

''عنقریب نورالدین کو بھی گرفتار کر کے دکھاؤں گا۔''
نورالدین نے اس کی لن ترانی کا عملی جواب دے دیا تھا۔ ❶

نوعمر یوسف: نجم الدین ایوب کا بیٹا یوسف اب چودہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس نے دمشق پر اقوام یورپ کی اس یلغار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور محاصرے کی سختیاں برداشت کی تھیں۔ دمشق جو کہ عالم اسلام کے قدیم علمی مراکز میں سے ایک تھا، بلاشبہ اس بچے کی تعلیم وتربیت کے لیے بہترین مقام تھا۔ صلاح الدین نے یہاں اپنا لڑکپن کس طرح گزارا، تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ درحقیقت اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عام سا سپاہی زادہ آگے چل کر کتنا بڑا انسان ثابت ہوگا۔

بہرصورت یہ بات یقینی ہے کہ صلاح الدین نے یہ دن فقط کھیلنے کودنے میں نہیں گزارے۔ اس کی جوانی میں ظاہر ہونے والے حیران کن کمالات اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ علم دوست انسان تھا۔ مروجہ علوم وفنون اور شعروادب کا اچھا ذوق رکھتا تھا، قرآن مجید سے اسے خاص شغف تھا، اسے تفسیر وحدیث کی کتابوں اور اسلامی تاریخ کے اوراق کھنگالنے کا بھی شوق تھا۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی حربی تربیت بے مثال تھی۔ یقیناً اسے اپنے وقت کے چیدہ استاد ملے تھے، جنہوں نے ایک سنجیدہ اور بردبار لڑکے کو بہت کم وقت میں کامل سپاہی کے روپ میں ڈھال دیا۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر اس میں اسلامی غیرت وحمیت کا وہ مادہ پختہ ہو چکا تھا جو اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اسے بعد میں زہد وتقویٰ میں جو مقام حاصل ہوا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسے دمشق کے اولیاء، صوفیا اور مشائخ کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع بھی ملا ہوگا۔ یہ وہ اوصاف تھے جو صلاح الدین کو بیس برس بعد اسلامی تاریخ کا مایہ ناز جرنیل، مثالی حکمران اور بے نظیر فاتح بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

دمشق پر نورالدین کا قبضہ: دوسری صلیبی جنگ کے چند سالوں بعد تک نجم الدین ایوب اپنی بہترین کارکردگی کے باعث دمشق کی فوج کا سپہ سالار بن چکا تھا جبکہ اس کا بھائی شیرکوہ نورالدین زنگی کی فوج میں بلند مقام حاصل کر چکا تھا۔ نورالدین زنگی اپنے باپ کے ادھورے کام کی تکمیل میں معروف تھا۔ اس نے کئی بڑے دشمنوں کی سرکوبی کی تھی اور کئی محاذوں پر نصرانیوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا مگر باپ کی ایک ادھوری مہم کو وہ اب تک پورا نہیں کر پایا تھا۔ یہ دمشق پر قبضے کا خواب تھا جسے پورا کیے بغیر القدس کی بازیابی تقریباً ناممکن تھی۔

موصل میں نورالدین زنگی کا بھائی سیف الدین غازی 544ھ (1150ء) میں وفات پا گیا تھا اور

❶ کتاب الروضتین: 1/80ص

اس کی جگہ قطب الدین مودود برسر اقتدار تھا۔ نورالدین اور مودود میں کچھ دنوں تک سیاسی چپقلش چلی تھی مگر اب دونوں کے تعلقات بہتر ہو گئے تھے لہٰذا نورالدین کو دمشق پر قبضے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔

اس کا بہترین سالار شیرکوہ جسے اس نے حمص اور رحبہ جیسے علاقے بطور جاگیر بخش دیے تھے، دمشق کو آسانی سے فتح کر سکتا تھا، کیوں کہ دمشق کا سالار اس کا بڑا بھائی نجم الدین تھا۔ دونوں بھائی الگ الگ حکومتوں سے وابستہ ہونے کے باوجود اُمت کے مفاد کے لیے ہم فکر تھے۔

دمشق کی حکومت ان دنوں اتنی کمزور تھی کہ عیسائی کسی بھی وقت اس پر قبضہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ ضابطے کے طور پر دمشق کے حاکم نے اپنے بچاؤ کے لیے فرنگیوں سے صلح کر رکھی تھی مگر اس کے باوجود آس پاس کے علاقوں پر ان کی لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا۔ اگر نجم الدین ایوب جیسا بیدار سالار نہ ہوتا تو فرنگی ان تمام علاقوں کو تاراج کر ڈالتے مگر نجم الدین نہایت ہوشیاری سے دمشق، بعلبک اور دیگر ملحقہ آبادیوں کی مدافعت کرتا رہا۔ 546ھ (1151ء) کے موسم سرما میں جبکہ وہ بعلبک میں تھا اسے فرنگیوں کی ایسی ہی لوٹ مار کی اطلاع ملی۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے شمس الدولہ توران شاہ کو بھیج کر ان ظالموں سے مسلمان قیدیوں کو آزاد کرایا۔ اپنے دوسرے بیٹے صلاح الدین یوسف کو اسی سال اس نے شیرکوہ کے پاس حلب بھیج کر سلطان نورالدین کے دربار سے وابستہ کر دیا تھا۔ یہ صلاح الدین اور نورالدین کے تعلقات کا نقطۂ آغاز تھا۔

نجم الدین کے خاندان سے ان تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صفر 549ھ (اپریل 1154ء) میں نورالدین زنگی نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ حاکم دمشق مجیر الدین میں مزاحمت کی طاقت نہیں رہی تھی اس کا نائب معین انز جو نہایت ہوشیاری سے نظام حکومت چلاتا رہا تھا، پانچ سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ نورالدین نے شیرکوہ کے ذریعے نجم الدین ایوب سے مذاکرات کیے۔ دونوں بھائی اس پر متفق ہو گئے کہ مسلمانوں کے وسیع تر مفاد میں دمشق کو نورالدین زنگی کے حوالے کر دینا بہتر ہے۔ چنانچہ چند دنوں کے اندر دمشق پر نورالدین زنگی کا قبضہ مکمل ہو گیا۔

دمشق پر نورالدین زنگی کا قبضہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ مصر اور شام کے درمیان اہم ترین مورچہ عسقلان صرف ایک برس پہلے نصرانیوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور گردونواح کے تمام اسلامی شہر بالکل غیر محفوظ تھے مگر اب دمشق میں نورالدین کے ہوتے وہ آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔[۹]

صلاح الدین یوسف.....کوتوال شہر ❁- نورالدین زنگی کے دمشق پر قبضے کے بعد دربار زنگی میں نجم

۹ ابن خلکان: 5/239، ض، الروضتین: 1/275، 405، الکامل فی التاریخ: 7/110_111

الدین ایوب کا مرتبہ اپنے بھائی شیر کوہ سے بھی بڑھ گیا۔ ایوب کا بڑا لڑکا توران شاہ دمشق کا کوتوال مقرر کر دیا گیا تھا۔ کئی سالوں بعد نورالدین زنگی نے نجم الدین ایوب کے دوسرے بیٹے یوسف کی صلاحیتوں کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ عہدہ اسے سونپ دیا۔ کوتوال شہر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عرقلہ نامی ایک شاعر اس کا دوست تھا۔ اس کے کوتوال بننے پر اس نے درج ذیل اشعار کہے:

لُصُوْصَ الشَّامِ تُوْبُوْا مِنْ ذُنُوْبٍ تُكَفِّرُهَا الْعُقُوْبَةُ وَالْأَصْفَادُ
لَئِنْ كَانَ الْفَسَادُ لَكُمْ صلاحاً فَمَوْلَانَا الصَّلَاحُ لَكُمْ فَسَادُ

"شام کے چورو! گناہوں سے توبہ کر لو۔ سزا اور بیڑیاں تمہارے گناہوں کا کفارہ بن جائیں گی۔ اگر (تمہارے خیال میں) شر و فسادی سے تمہاری اصلاح ہو سکتی ہے تو اب محترم صلاح الدین تمہارے فساد کا بدلہ دینے آ گئے ہیں۔"

اس نے یہ اشعار بھی کہے:

رُوَيْدَكُمْ يَا لُصُوْصَ الشَّامِ إِنِّيْ لَكُمْ نَاصِحٌ فِيْ مَقَالِ
وَإِيَّاكُمْ وَسَمِيَّ النَّبِيِّ يُوْسُفَ رَبِّ الْحِجَى وَالْجَمَالِ
فَذَاكَ مُقَطِّعُ أَيْدِي النِّسَاءِ وَهٰذَا مُقَطِّعُ أَيْدِي الرِّجَالِ

"شام کے چورو! باز آ جاؤ، میں تمہاری خیر خواہی کی بات کر رہا ہوں۔ تم پیغمبر کے اس ہم نام یوسف سے بچ کر رہنا جو عقل اور حسن کا مالک ہے۔ وہ (یوسف علیہ السلام) تو عورتوں کے ہاتھ قطع کرتے تھے یہ مردوں کے ہاتھ کاٹا کرتا ہے۔"[1]

صلاح الدین نے کچھ مدت بڑی خوش اسلوبی سے کوتوالی اور دیوان (مرکزی دفتر) کے فرائض انجام دیے مگر پھر دیوان کے منتظم ابو سالم ہمام سے اس کا کسی مسئلے پر اختلاف ہو گیا۔ صلاح الدین نے اس قضیے سے بددل ہو کر دمشق چھوڑ دیا اور نورالدین زنگی کے پاس حلب چلا گیا۔ زنگی نے ابو سالم کو قصوروار ٹھہرایا اور اس کی ڈاڑھی مونڈوا کر پورے دمشق میں گشت کروایا جب کہ صلاح الدین کو مستقل طور پر اپنے دربار سے وابستہ کر کے خواص میں جگہ دی۔ مؤرخ ابن ابی طے کہتا ہے کہ نورالدین سفر و حضر ہر موقعے پر صلاح الدین کو ساتھ رکھا کرتا تھا۔

صلاح الدین کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ 552ھ (11157ء) میں شام کے شہر حماۃ میں پیش آیا تھا۔ وہ اور نورالدین زنگی کا ایک غلام عبید جو حماۃ میں سامان کی نقل و حمل پر مامور تھا کسی اہم ذمہ داری

[1] کتاب الروضتین: 1/310

کے سلسلے میں وہاں ٹھہرے ہوئے تھے کہ زبردست زلزلہ آیا جس سے پورا حماۃ شہر تباہ ہوگیا، تاہم وہ مکان جس میں صلاح الدین اور عبید تھے بالکل محفوظ رہا۔ ظاہر ہے اس وقت کون تصور کرسکتا تھا کہ قدرت خداوندی نے صلاح الدین کو کس عظیم کام کے لیے بچا کر رکھنا طے کیا ہوا ہے تاہم صلاح الدین کے مدح خواں شاعر عرقلہ نے اس بارے میں یہ ضرور کہہ دیا:

قُل لِصَلاحِ الدِّیْنِ رَبِّ النِّدیٰ   بَلِّغْ عُبَیْداً کُلَّ ما أَمَّلَه

بِثِقْلِهِ لَمَّا تَصَاحَبْتُمَا   سَلَّمَكَ اللهُ مِنَ الزَّلْزَلَة

"محفل کے صدر صلاح الدین سے کہو کہ غلام کو اس کے سامان سمیت ہر اس جگہ پہنچا دو جہاں جانے کا اسے ارمان ہو۔ کیونکہ جب تم نے ایک دوسرے کا ساتھ نبھایا تو اللہ نے تمہیں زلزلے سے محفوظ رکھا۔"[1]

اس واقعے کے دو سال بعد موصل کے کسی شخص نے مقامی بزرگ شیخ عمر ملا کو کہا: "رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک اجنبی سرزمین خنزیروں سے بھری ہے۔ ایک شمشیر زن انہیں مارتا کاٹتا چلا جارہا ہے۔ لوگ یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا مہدی؟ جواب ملا: یہ یوسف ہے۔" علماء نے تعبیر دی کہ عن قریب یوسف نامی کوئی شخصیت نصرانیوں کا قلع قمع کردے گی۔ عام خیال تھا کہ خواب کا یہ اشارہ نئے عباسی خلیفہ مستنجد باللہ کے لیے ہے جو اسی سال مسند خلافت پر بیٹھا تھا۔[2] کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سعادت حلب کے چوبیس سالہ یوسف کے نصیب میں لکھی ہے جو ابھی ایک عام سرکاری افسر ہے۔

زنگی کو چوگان کا بے حد شوق تھا۔ وہ جہاد کی نیت سے یہ کھیل باقاعدگی سے کھیلتا اور کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرتا۔ بعض اوقات رات کو شمعوں کی روشنیوں میں بھی چوگان کا مقابلہ منعقد کیا جاتا۔ صلاح الدین اور اس کا باپ نجم الدین دونوں اس کھیل کے ماہر تھے۔ اس لیے زنگی کے ہاں قدرتی طور پر ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔[3]

زنگی کے ساتھ صلاح الدین کی زندگی کے گیارہ بارہ سال ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئے۔ اس مرد انسان شناس نے صلاح الدین کی کارکردگی سے متاثر ہوکر 563ھ (1167ء) میں اسے حلب اور کفرطاب میں جاگیریں بھی دیں۔ یہی سال تھا جب زنگی اور صلاح الدین دونوں چوگان کھیل رہے

[1] کتاب الروضتین: 1/339
[2] کتاب الروضتین: تحت 583ھ
[3] کتاب الروضتین: 1، 313_2/36

تھے کہ صلاح الدین کا گھوڑا پھسل کر گر پڑا اور وہ زخمی ہوگیا۔ کاتب عماد اصفہانی نے اس موقع پر صلاح الدین کے لیے چند تعریفی اشعار بھی کہے۔ ①

حکومتی نظم و نسق اور جاگیرداری نظام پر ایک نگاہ ❁ یہاں یہ اہم حقیقت پیش نظر رہے کہ اس دور میں مسلمان حکمرانوں کی طرف سے کسی شخص کو کسی علاقے کا حاکم بنانے، کوئی قلعہ یا شہر سپرد کرنے یا کوئی جاگیر کسی کے نام کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ وہ زمین اس کی ملکیت ہوگئی ہے، وہ اسے خرید یا بیچ سکتا ہے، یا اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرسکتا ہے۔ جاگیریں نام کرنے کا یہ نیا مفہوم انگریز دور کا ہے جس میں جاگیردار کو زمین کی ملکیت دیدی جاتی تھی۔

اسلامی دور میں جاگیریں یا علاقے سپرد کرنے میں ملکیت نہیں تولیت مراد ہوتی تھی یعنی جاگیردار یا نائب اس علاقے کی آمدن وخرچ اور دیگر امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل کسی کو کسی مسجد کا متولی، مدرسے کا مہتمم یا کسی ٹرسٹ ادارے کا ذمہ دار بنا دیا جائے۔ مسلم سلاطین کے ماتحت جاگیرداری اور نیابت کا منصب ایک ٹھیک ٹھاک آمدن کا ذریعہ تھا کیونکہ جاگیردار کو اپنے زیرِ انتظام علاقے کی پیداوار کے محصولات کا ایک طے شدہ حصہ بطورِ اجرت یا تنخواہ ملا کرتا تھا۔ یہ طے شدہ حصہ پانچ فی صد، دس فی صد یا زائد بھی ہوسکتا تھا۔ اگر کسی علاقے کی سالانہ پیدوار پانچ لاکھ دینار کے مساوی ہوتی، اور اس سے محصولات کی مد میں پچاس ہزار دینار وصول ہوئے تو دس فی صد اجرت کے لحاظ سے جاگیردار کو سالانہ پانچ ہزار دینار (آج کل کے پچاس ساٹھ لاکھ روپے) آرام سے مل جاتے تھے جو ایک خوشحال زندگی گزارنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن اس منصب کو نبھانا آسان نہیں تھا۔ جاگیردار اور نائبین سلطنت اپنے علاقوں کے تمام امور کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ حکومتی اخراجات کے لیے ذرائع آمدن پیدا کرنا، ان کا پورا حساب رکھنا اور آمدن کو طے شدہ مصارف میں خرچ کرنا ان کا اوّلین کام تھا۔ آمدن کا بڑا حصہ مختلف سرکاری اداروں کے اخراجات نیز عوام کی فلاح وبہبود، شفاخانوں، تعلیم گاہوں، مساجد، خانقاہوں، سڑکوں، قلعوں، سراؤں اور حفاظتی چوکیوں کی تعمیر مرمت اور دیکھ بھال میں خرچ کیا جاتا تھا۔ وقف اداروں کے اخراجات میں تعاون کرنا، مفلسوں، غریبوں اور ضرورت مندوں کو حسب استحقاق مالی تعاون فراہم کرنا بھی حاکم یا جاگیردار کی ذمہ داری تھی۔ اس کے ساتھ مقامی فوج کے جملہ اخراجات اور سرکاری ملازموں کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی حاکم یا جاگیردار کے سپرد ہوتی تھی۔ علاقے کی آمدن کا ایک طے شدہ حصہ، مرکز کو بھیجنا ضروری ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اشد ضرورت کے وقت مرکز قرض بھی طلب کرسکتا تھا۔

① کتاب الروضتین: 30/2، 36/2

سرحدی علاقے میں سرحد کی حفاظت اور اس کے جملہ مصارف بھی جاگیردار کے سر ہوتے۔ سپاہیوں کی بھرتی اور تربیت کے علاوہ جب مرکز کو اضافی فوج کی ضرورت ہوتی تو سپاہیوں کی فراہمی اور بروقت روانگی کے امور بھی حاکم انجام دیتا۔

یہ تمام مصارف مرکز کو بھی درپیش ہوتے تھے مگر اس کے علاوہ بھی کچھ اخراجات کی مدیں تھیں جو صرف مرکز پر لاگو ہوتی تھیں جن میں قابل افراد کی مالی حوصلہ افزائی کرنا، اہل علم ودانش اور عسکری کارناموں کے حامل لوگوں کو تحائف دینا، بیرونی وفود کا اعزاز واکرام کرنا، مخالفین کی وفاداریاں پانے یا کسی حریف سے صلح کرنے کے لیے انہیں حسب طلب مال فراہم کرنا وغیرہ سرفہرست ہیں۔ یہ تمام اخراجات سرکاری خزانے سے دیے جاتے تھے اور ملکی قانون میں یہ طے شدہ تھا کہ حکمران امور مملکت کی بہتری، سلطنت کی ساکھ، سرحدوں کی حفاظت، حکومتی انتظام اور دربار کے وقار کے لیے سرکاری رقم استعمال کرسکتا ہے۔ بڑے عہدے داروں، مثلاً وزراء، قاضیوں اور سپہ سالاروں کی تنخواہوں اور ان کے لیے اعزاز واکرام کے خرچوں کی ادائیگی بھی مرکزی خزانے سے ہوتی تھی۔ شاہی خاندان کے جملہ اخراجات کی مد بہت اہم تھی جو شاہی خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔ اگر بادشاہ محتاط ہوتے تو مناسب حد تک ہی لیتے۔ اگر اسراف پسند یا ظالم ہوتے تو بے دریغ خزانہ اپنے خاندان پر لٹاتے۔ تاہم خزانہ یا بیت المال بہرحال ایک عوامی وسرکاری امانت ہوتا تھا جو قانونی طور پر قاعدے ضابطے کے تحت آتا تھا۔ اس کے حساب کتاب کے لیے خازن، نائب خازن اور منشیوں کا پورا عملہ ہوتا تھا۔

صوبوں اور مرکز کے یہ مصارف لاکھوں دینار اور کروڑوں دراہم کو پہنچ جاتے تھے۔ صوبوں اور شہروں میں محصولات علاقے کی پیداوار سے حاصل کیے جاتے تھے۔ حاکم کے کارندے زمینداروں، کاشت کاروں، گلہ بانوں اور تاجروں سے زکوۃ وعشر وصول کرتے تھے۔ تجارتی قافلے بھی ٹیکس ادا کر کے کسی سرحد کو عبور کرتے تھے۔ بعض جگہ ان کے علاوہ بھی ٹیکس عائد کیے جاتے تھے تاہم شریعت پر پختہ حکمران زائد ٹیکس عائد کرنے سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے۔ کبھی کبھی مرکز کو بیرونی فتوحات اور جہاد کے ذریعے یکدم لاکھوں کروڑوں کی آمدن ہوجاتی تھی۔ لیکن مہم ناکام رہتی تو کروڑوں کا خسارہ بھی ہوجاتا تھا۔

یہ خیال غلط ہے کہ اس دور کے مسلمان بادشاہ مملکت، شہروں اور صوبوں کو ذاتی جاگیر بنائے ہوئے تھے۔ جسے چاہے جب چاہے کوئی شہر بخش دیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا، بلکہ تخت شاہی بھی ایک منصب تھا جس کے قواعد وضوابط تھے۔ اسی طرح شہروں اور صوبوں کی سپردگی بھی ایک منصب اور ذمہ داری کے

طور پر ہی ہوتی تھی جو قاعدے اور قانون کے تحت ہوا کرتی تھی۔ حکمران جب مناسب سمجھتے منصب دار کو معزول بھی کر دیتے تھے یا اس کا تبادلہ کر دیتے تھے۔ ان سیاسی و انتظامی امور، حکومتی معاملات اور قواعد وضوابط پر اس دور کے اہل علم ودانش نے باقاعدہ کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں علامہ الماوردی کی الاحکام السلطانیہ، ابن الازرق کی بدائع السلک، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی السیاسۃ الشرعیہ، علامہ قلقشندی کی مآثر الانافۃ، ابوبکر طرطوشی کی سراج الملوک اور قاضی ابن فراء کی الاحکام السلطانیہ قابل مطالعہ ہیں۔

اسباقِ تاریخ

آپ نے پہلے حصے کا مطالعہ کیا جو پہلی صلیبی جنگ سے شروع ہوتا ہے اور عماد الدین زنگی اور نور الدین کی جہادی مہمات سے گزر کر نجم الدین ایوب کی سپہ سالاری اور اس کے بیٹے یوسف کے کوتوال (تھانے دار) بننے تک آتا ہے۔ بغور مطالعہ کرنے سے اس میں بہت سے اسباق ملتے ہیں مثلاً:

- حق و باطل کی کشمکش ہر دور میں چلی آئی ہے۔ کوئی دور آزمائشوں سے خالی نہیں گزرا۔
- اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کی انتشار سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتی رہی ہیں۔
- اہلِ تشیع نے نازک حالات میں القدس پر قبضہ کر کے امت کے مفادات سے بے اعتنائی کا ثبوت دیا۔ اہلِ سنت نے ان کی ضد میں القدس پر صلیبی حملہ دیکھتے ہوئے بھی دفاع میں کوئی خاص حصہ نہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ایک صدی کے لیے دونوں ہی القدس سے محروم ہو گئے۔
- جب بھی آزمائشوں کی رات طویل ہوئی ہے اللہ نے مسلمانوں میں ایسے اولوالعزم لوگ پیدا کر دیے جو اسلام کی پکار پر لبیک کہنے میں توقف نہیں کرتے تھے۔ عماد الدین زنگی اور نور الدین ایسے ہی لوگ تھے۔
- اللہ کا نظام تدریجی طور پر کام کرتا ہے۔ اس کی کڑیاں چپکے چپکے ملتی چلی جاتی ہیں۔ کہاں کردستان کا دہقان شاذی اور کہاں دمشق کی سپہ سالاری۔ کہاں عماد الدین زنگی اور کہاں نجم الدین ایوب۔ کس کا کس سے ملاپ کہاں ہوا۔ کچھ بھی اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ داستان کہاں بل کھا کر کدھر نکل جائے اور دس بیس سال یا پچاس ساٹھ سال بعد اس کے نتائج کیا نکلیں۔ یہ کاتبِ تقدیر ہی جانتا ہے۔
- مسلمانوں کو حالات کی ابتری سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تاریکی کو طویل زمانہ بھی گزر چکا ہو، پھر بھی صبح ضرور آتی ہے۔ بدترین حالات کے بعد اچھے حالات کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں، چھوٹی چھوٹی خوشخبریوں اور اچھی باصلاحیت شخصیات کی صورت میں۔
- فوج، پولیس اور سیاست کا شعبہ بہرحال بہت اہم ہے۔ جب ان شعبوں میں اچھے لوگ نمایاں

نظر آنے لگیں تو سمجھئے اب کایا پلٹنے کو ہے۔ شرفاء کو سیاسی اور عسکری میدانوں میں آنا چاہیے تاکہ وہ حالات کا رخ بدلنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

نوٹ: ہر حصے میں دیے گئے اسباقِ تاریخ بطور مثال ہیں۔ ان کے علاوہ مزید بہت سے اسباق سوچنے اور غور کرنے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

باب:2

مصر کا یوسف

558ھ(1163ء)

......تا......

569ھ(1174ء)

شخصیات

خلیفہ مستنجد باللہ	....	عباسی خلیفہ
ایلمرک	....	القدس کا نصرانی حکمران
نورالدین زنگی	....	سلطان شام
عاضد	....	مصری حکمران، بنو عبید کا خود ساختہ خلیفہ
شاور	....	مصری وزیر اعظم
کامل	....	شاور کا بیٹا
شیرکوہ	....	شام کا سپہ سالار
قطب الدین مودود	....	نورالدین زنگی کا بھائی، حاکم موصل
سیف الدین غازی دوئم	....	مودود کا بیٹا، نورالدین کا بھتیجا، حاکم موصل
نجم الدین ایوب	....	صلاح الدین کا والد
یوسف صلاح الدین	....	نجم الدین کا بیٹا، سالار شام ومصر
عزالدین جوردیک	....	صلاح الدین کا ساتھی
شہاب الدین حارمی	....	صلاح الدین کا ماموں
توران شاہ	....	صلاح الدین کا بڑا بھائی
فقیہ عیسیٰ ہکاری	....	صلاح الدین کے دوست
شیخ عماد اصفہانی	....	نجم الدین ایوب کے دوست
قاضی فاضل	....	صلاح الدین کے وزیر
ابن نجیہ	....	صلاح الدین کے درباری عالم
طواشی	....	سوڈانی خواجہ سراؤں کا سردار
عمارہ الیمنی	....	مشہور شاعر ـ بغاوت کا مجرم

فصل 1:

شاور اور شیر کوہ

تاریخ میں صلاح الدین یوسف ایوبی کا نام سب سے پہلے اس وقت مشہور ہوا جب نورالدین زنگی نے مصر کی سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور وہاں کے وزیر شاور کی درخوست پر اپنے معتمد امیر شیر کوہ کے ذریعے وہاں مداخلت کا آغاز کیا۔ نورالدین زنگی کی مصر میں مداخلت کی وجوہات سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور میں مصر کے حکمران خاندان بنوعبید کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لینا ہوگا۔

دولتِ بنوعبید ❊ عبیدی خاندان دوسوسال سے مصر پر حکومت کر رہا تھا۔ عقائد کے لحاظ سے یہ لوگ اسماعیلی شیعہ تھے۔ اس خاندان کے جد امجد عبیداللہ نے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں مراکش اور شمالی افریقہ کے بہت بڑے علاقے میں اپنے ہم نواؤں کا جال پھیلا دیا تھا، اس کی دعوت نے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ اس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے 297ھ (911ء) میں ''فاطمی خلافت'' کے نام سے ایک نئی خلافت کی بنیاد ڈالی جو عقائد و نظریات میں اہل سنت والجماعت سے متصادم ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے سیاسی مرکز وحدت خلافت عباسیہ کی بھی مخالف تھی۔ اس خلافت کے ورثاء کو عبیداللہ کی نسبت سے بنوعبید کہا جاتا تھا۔ عبیداللہ ''فاطمی سادات'' ہونے کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر خود کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اصل وارث باور کراتا رہا۔ بنوعبید کے نسب کے بارے میں مؤرخین ہمیشہ حیرت کا شکار رہے ہیں۔ اس دور کے علماء کی تحقیق کے مطابق اس خاندان کا جد امجد عبیداللہ شام کے علاقے سلمیہ کا یہودی تھا۔ اس کا اصل نام سعید تھا۔ مراکش پہنچ کر اس نے اپنا نام عبیداللہ رکھ لیا اور خود کو ''علوی فاطمی'' قرار دے دیا مگر اس کا بیان کردہ شجرہ نسب ماہرینِ انساب کے نزدیک کسی طرح صحیح نہیں بیٹھتا۔ انساب کے علماء میں سے کسی نے اس نسب نامے کا ذکر نہیں کیا۔ یہی عبیداللہ بعد میں مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے لگا۔ افریقہ کا شہر مہدیہ اسی جعلی مہدی کی طرف منسوب ہے۔ ۵

۵ کتاب الروضتین: 2/214_224، النجوم الزاہرہ: 5/34

عبیداللہ کے مبلغ لوگوں کو مختلف طریقوں سے ورغلاتے اور گمراہ کرتے۔ بعض کو بتاتے کہ عبیداللہ ''مہدی'' اور ''ابنِ رسول اللہ'' ہے۔ کسی کو یہ عقیدہ سکھاتے کہ وہ خود رسول اللہ ہے۔ خواص کو یہ یقین دلاتے کہ مہدی خدا ہے۔ عبیداللہ کی بدبختی کا یہ عالم تھا کہ اپنی کفریات کی مخالفت کرنے والے علماء اور فقہاء کو دربار میں طلب کرتا اور قالین پر اپنے سامنے ذبح کراتا۔ اس کا جانشین القائم بے دینی میں اس سے کہیں بڑھ کے تھا۔ اس کے نمائندے کھلے عام توہینِ رسالت کا ارتکاب کرتے اور بازاروں میں آوازیں لگاتے پھرتے:

اِلْعَنُوْا عَائِشَةَ وَبَعْلِهَا اِلْعَنُوْا الْغَارَ وَمَنْ حَوىٰ

''عائشہ اور اس کے شوہر پر لعنت کرو۔ غار پر اور جو غار میں تھے ان پر لعنت کرو۔''

نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... مصر کے مسلمان یہ ناپاک کلمات سن کر خون کے آنسو روتے مگر کچھ کر نہ پاتے۔

قائم کے بعد اس کا بیٹا منصور سربراہ بنا۔ ابو یزید مخلد نامی ایک بزرگ نے ان کفریات کے خلاف احتجاج کیا تو منصور نے حق گوئی کے جرم میں ان کی کھال اتروادی اور سولی پر لٹکا دیا۔ عبیداللہ مہدی، قائم اور منصور تینوں نے افریقہ میں حکومت کی۔ مگر 358ھ (969ء) میں عبیداللہ کے جانشین مصر پر بھی قابض ہو گئے۔ ان ممالک کی اکثر آبادی اہلِ سنت تھی اور مسلکا امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کی فقہ پر عمل پیرا تھی۔ تاہم عبیدی اقلیت ہوتے ہوئے بھی بزورِ شمشیر سنی اکثریت پر حکومت کرتے رہے۔ مصر میں عبیدیوں کے گیارہ خلفاء ہوئے، جن کے نام معز، عزیز، حاکم، ظاہر، مستنصر، مستعلی، آمر، حافظ، ظافر، فائز اور عاضد تھے۔ معز کے مبلغین لوگوں کو یہ عقیدہ سکھاتے تھے کہ عبیدی سربراہ ہی سورج کو مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ معز نے شام کے مشہور فقیہ ابن نابلسی کو گرفتار کرا کے ایک لکڑی کے پنجرے میں اپنے پاس طلب کیا تھا اور اپنے سامنے زندہ حالت میں ان کی کھال اتروا کر سولی پر چڑھایا تھا۔

معز کے پوتے حاکم کے دور میں بازاروں، سڑکوں، دیواروں، خطوط کی ابتداء میں اور جامع مساجد کے دروازوں پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف گالم گلوچ لکھنا عام ہو گیا۔ ایک بزرگ ابوالقاسم الواسطی نے بیت المقدس میں اذان دیتے ہوئے عبیدیوں کی رسم کے مطابق حی علیٰ خیر العمل کی جگہ حی علیٰ الفلاح کہہ دیا۔ حاکم نے ان کی زبان کٹوادی۔ سرکاری کارندے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف کرنے والوں کو گرفتار کرتے اور سرِعام گردن اڑا کر کہتے:

''ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرنے والوں کا انجام یہ ہوتا ہے۔''

بنوعبید کی یہ حکومت اس دور میں اتنی طاقتور تھی کہ خلفائے بنوعباس اور اندلس کے مسلم حکمران تک اس سے خائف تھے۔ان کا دائرہ حکومت پھیلتے پھیلتے جزیرہ صقلیہ (سسلی) تک جا پہنچا تھا۔بحیرہ روم میں ان کا بحری بیڑا سب سے زیادہ طاقتور تصور کیا جاتا تھا۔شام کا بہت بڑا علاقہ بھی ان کے زیرنگین تھا۔[1]

قاہرہ کے عشرت کدے: مصر میں عبیدیوں کی سب سے بڑی یادگار ان کا بسایا ہوا عظیم الشان شہر قاہرہ ہے جو آج دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔اس کی بنیاد معز کے نائب جوہر نے رکھی تھی۔تاہم ان دنوں قاہرہ اتنا وسیع نہ تھا۔یہ دریائے نیل کے کنارے مضبوط فصیلوں سے گھرا ہوا ایک قلعہ نما شہر تھا جہاں صرف شاہی گھرانہ، امراء اور سرکاری لوگ رہتے تھے۔عام آبادی قاہرہ سے متصل قدیم شہر فسطاط میں رہتی تھی جو فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آباد کیا تھا، تین صدیوں تک یہ مصر کا دارالحکومت رہا تھا۔قاہرہ کو اس وقت ''المدینہ'' اور فسطاط کو ''مصر'' کہا جاتا تھا۔

قاہرہ میں بنوعبید کے دو بڑے محل تھے جو قصر شرقی اور قصر غربی کہلاتے تھے۔دونوں محلات کے درمیان ایک بڑا میدان تھا اور ایک زیرزمین سرنگ ان دونوں محلوں کو ملاتی تھی۔قصر غربی درحقیقت عبیدیوں کا عشرت کدہ تھا جہاں وہ تفریح کی ہر نوع سے مزے لیتے تھے۔اس سے متصل ''گلشن کافور'' نامی باغ تھا جس میں قصر غربی کے دروازے کھلتے تھے۔نزدیک ہی بنوعبید کا آبائی قبرستان تھا۔اس شہر میں بڑے بڑے کتب خانے تھے جو کہ قرطبہ کے علمی خزانوں کے ہم پلہ شمار کیے جاتے تھے۔قصر شرقی عبیدی سربراہ کی قیام گاہ تھا۔وہ اپنے اہل وعیال غلاموں، نوکروں اور باندیوں سمیت اس طلسم خانے میں رہتا تھا۔یہیں اس کا دربار لگتا تھا۔بنوعبید کی دولت وثروت کا یہ عالم تھا کہ قصر شرقی میں عبیدی حکمران کی نشست خالص سونے کے تخت پر ہوا کرتی تھی، جس کے آگے سونے کی جالی آویزاں تھی۔شاہی ایوان مکمل طور پر سونے سے ملمع کیا گیا تھا۔بنوعبید کا یہ قصر چار ہزار کمروں پر مشتمل تھا۔اس عمارت میں ایک بالاخانہ تھا جہاں ہر شام عبیدی سربراہ عوام کو اپنا دیدار کراتا تھا۔اس سے کچھ دور وہ اندھا کنواں تھا جس کی تہہ میں بنوعبید کے بے شمار مخالفین کے پنجر پڑے تھے۔بنوعبید کے خزانے میں دنیا بھر کے بے مثل اور نادر ونایاب جواہر کا انبار تھا۔دنیا کا سب سے بڑا زمرد جس کی پیمائش ایک بالشت تھی اسی خزانے میں تھا۔یہاں جبلِ نور نامی ایک بے نظیر یاقوت بھی تھا جس کا وزن دو ہزار چار سو کیرٹ تھا۔

بنوعبید نے ابتداء ہی میں جبر وتشدد کے ذریعے اپنے ہر مخالف کو اس طرح کچل دیا تھا کہ ان کے آخری دور تک مقامی طور پر ان کے خلاف کوئی مضبوط مخالف تحریک برپا نہ ہو سکی۔انہوں نے شروع میں بے

[1] النجوم الزاہرہ ج: 4_5

شار سنی فقہاء اور علماء کو قتل کرایا اور عوام کے جذبہ مقاومت کو بالکل دبا دیا۔ دو صدیوں تک ان کا رعب دبدبہ لوگوں پر چھایا رہا۔ اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر بنوعبید نے مصر کو تعمیری لحاظ سے اوج کمال تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر اس کے ساتھ ساتھ اہل سنت کے حقوق غصب کرنے میں وہ ہر حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بار بار اسلام دشمن طاقتوں سے گٹھ جوڑ کیا جس سے دشمنانِ اسلام کو بحیرۂ روم کے ساحلوں پر تسلط کا موقع ملتا رہا اسی لیے ان علاقوں میں مسلم ریاستیں روز بروز کمزور ہو رہی تھیں۔

اس امن وامان، راحت وآسائش، بے پناہ ثروت اور فارغ البالی نے رفتہ رفتہ حکمران طبقے کو سست اور آرام پسند بنا دیا اور آخر کار بنوعبید تمام کاروبار حکومت وزراء کے کاندھوں پر ڈال کو خود محض عیش وعشرت کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ وزراء کی من مانیوں نے کچھ ہی عرصے میں حکومت کو کمزور تر کر دیا۔ عوام اور حکام کا برائے نام رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ یہ کمزور حکومت محض اسی لیے باقی تھی کہ اس کے کئی ہمسائے دوسرے ملکوں میں مداخلت کے عادی نہ تھے۔

پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں ملک شاہ سلجوقی کے شام پر حملوں کے بعد عبیدی حکومت کا خاتمہ یقینی نظر آتا تھا مگر ملک شاہ شام کی مہمات کو ادھورا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پھر نصرانیوں کے شام کے ساحلوں پر دھاوے اور القدس کے سقوط کے بعد سلجوقیوں میں اتنا دم خم ہی نہ رہا کہ وہ مصر کی طرف توجہ دے سکتے۔ اس طرح بنوعبید کا مصر سلجوقی حکمرانوں اور ان کے ورثاء سے مکمل طور پر محفوظ ہو گیا۔ مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ خود عبیدی حکمرانوں نے اقوام یورپ کو شام پر حملے کی ترغیب دی تھی تا کہ وہ سلجوقیوں کی توجہ مصر سے ہٹا سکیں۔ اگرچہ شام کے ساحلوں پر قبضے کے بعد عیسائی سورما مصر پر حملے کے لیے پر تولنے لگے تھے مگر بنوعبید نے بے شمار دولت بطورِ خراج ادا کر کے ان کے فوری حملے کا خطرہ ٹال دیا تھا۔[1]

<u>پانچویں صدی ہجری اور مصر کی صورتحال</u>: پانچویں صدی ہجری کے وسط کے اس نازک زمانے میں ہم تین طاقتوں کو مشرق وسطیٰ کے سنگم پر آمنے سامنے دیکھتے ہیں۔ ایک طرف ساحل شام اور القدس پر قابض عیسائی تھے، دوسری جانب شام کا جواں حوصلہ حکمران نورالدین زنگی تھا۔

ان دونوں باہم متحارب طاقتوں کے سامنے تیسری طاقت خلافتِ مصر کی تھی جو اس وقت ان دونوں کی بہ نسبت عسکری لحاظ سے کمزور تر اور مالی اعتبار سے بالاتر تھی۔ نصرانی اور نورالدین زنگی دونوں یہ جانتے تھے کہ جس نے مصر پر پہلے قبضہ کر لیا وہی پورے شام کا مالک ہوگا۔

[1] الکامل فی التاریخ: 7/218_219، صلاح الدین لیلین پول: ص: 43_44

مصر کے عبیدی حکمران جو کہ اس وقت اپنے وزراء کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے مگر حکومت کے سیاہ وسپید پر قابض ان کے وزراء اس صورتحال کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ نت نئی چالوں سے کبھی فرنگیوں اور کبھی نورالدین زنگی کو فریب دیتے رہے۔ مگر سیاسی شطرنج کی اس بازی میں ایک موقع پر مصری کھلاڑی ایسی فاش غلطی کر بیٹھے جس نے ان کی پوری حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

شاور...... دربار نورالدین میں: ان دنوں مصر کا حکمران عاضد نامی ایک نوعمر اور ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اس کا ماتحت شاور سعدی نامی ایک ہوشیار عرب وزیر تھا جو سارے نظام حکومت پر حاوی تھا۔ اصولی طور پر وہ مصر کے بالائی علاقے کا گورنر تھا مگر عملاً پورے مصر پر اس کا راج تھا۔ 558ھ (1163ء) میں اس کی وزیر اعظم زریک بن طلائع سے چپقلش شروع ہوئی جس کا انجام یہ ہوا کہ شاور نے وزیر اعظم کو قتل کر کے خود مصر کا قلمدان وزارت سنبھال لیا۔ اس صورتحال سے اس کے سیاسی مخالفین انگاروں پر لوٹنے لگے۔ انہوں نے "برقیہ" کے نام سے ایک مسلح گروہ بنایا جس کا لیڈر ضرغام نامی ایک سالار تھا۔ ضرغام نے چند ماہ بعد دارالوزارت پر بزور شمشیر قبضہ کر کے شاور کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ضرغام دولتِ بنو عبید سے اتنا متنفر تھا کہ عبیدی امراء اور عمائد کو چن چن کر قتل کراتا جا رہا تھا۔ بظاہر وہ مصر کا وزیر اعظم تھا مگر درحقیقت اس مملکت کا مطلق العنان حکمران بن چکا تھا۔

شاور اپنی جان بچا کر مصر سے بھاگا تو اسے نورالدین زنگی کے سوا کہیں جائے پناہ دکھائی نہ دی۔ اس نے نورالدین زنگی سے درخواست کی کہ اسے مصر کی وزارت عظمیٰ واپس دلوائی جائے۔ وہ اس مہم کے سارے اخراجات برداشت کرے گا اور ہر سال مصر کی تہائی آمدنی دربارِ زنگی میں پیش کرتا رہے گا۔

نورالدین کو مصر میں سیاسی و عسکری مداخلت کا بیٹھے بٹھائے ایک مثبت اور قانونی موقع مل رہا تھا جو نہ صرف آگے چل کر یہاں اہل سنت کے حقوق کے تحفظ کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا بلکہ مصر میں اہل سنت کو غالب بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ نورالدین نے اس پیش کش پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس دوران اطلاع ملی کہ مصر کے نئے آمر ضرغام نے القدس کے نئے عیسائی بادشاہ کو بھاری خراج ادا کرنے کے وعدے پر ایک دفاعی معاہدہ کر لیا ہے۔ نورالدین کے لیے مصر اور عیسائی حکمرانوں کا اتحاد کسی طرح بھی قابل برداشت نہ تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ یہ اتحاد درحقیقت اسی کے خلاف تشکیل دیا گیا تھا۔ اس نے فوراً شاور کی پیش کش قبول کر لی۔ مصر پر حملے کے لیے اس نے اپنے معتمد جرنیل اسدالدین شیرکوہ کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا اور اسے ترکمانوں کا ایک لشکر دے کر مصر روانہ کر دیا۔ صلاح الدین ایوبی بھی اس فوج

میں شامل تھا۔ درحقیقت یہ لشکر مصر میں ایک نئی تاریخ رقم کرنے جارہا تھا۔ [1]

شیرکوہ کی مصر میں پہلی مہم: جمادی الاولیٰ 559ھ (اپریل 1164ء) میں جب اسدالدین شیرکوہ مصر کی طرف روانہ ہوا تو اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی مصر پر حکومت کرے گا۔ وہ تو بس سلطان نورالدین زنگی کے حکم کے مطابق شاور کو اس کا عہدہ واپس دلانے جارہا تھا۔ اس فوج کو صحرائے سینا عبور کر کے مصر پہنچنا تھا۔

مصر میں ضرغام کو شامی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ بلبلا اٹھا، اس کی اپنی طاقت زیادہ نہیں تھی اور اس کا واحد سہارا عیسائی تھے، وہ ان سے مدد لینا چاہتا تھا لیکن اس دوران نورالدین زنگی نے دمشق کے گردونواح میں نصرانیوں کے مقبوضہ شہروں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی تاکہ عیسائی اس کی طرف متوجہ رہیں اور شیرکوہ کی مہم میں کوئی رخنہ نہ ڈال سکیں۔ شیرکوہ کا لشکر سب سے پہلے سرحدی شہر بلبیس پہنچا جہاں ضرغام کے بھائی ناصرالدین نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر قاہرہ کی طرف بھاگ نکلا۔ جمادی الثانیہ کی آخری تاریخوں میں اسدالدین شیرکوہ قاہرہ کی فصیلوں کے سامنے پہنچا۔ ضرغام مجبور ہو کر مقابلے کے لیے نکلا اور ایک معمولی مقابلے کے بعد قتل ہوگیا۔ شاور کی دلی مراد بر آئی تھی۔ شیرکوہ نے اپنے سلطان کا وعدہ پورا کرتے ہوئے اسے یکم رجب (24 مئی 1164ء) کو دوبارہ مصر کا وزیر اعظم بنا دیا۔ اس نے پہلے کی طرح کاروبارِ حکومت سنبھال لیا۔

شاور کی پہلی بدعہدی: شیرکوہ چند دن قاہرہ سے باہر پڑاؤ ڈالے رہا تاکہ شاور حکومتِ شام کو تہائی آمدنی کا خراج دینے کا وعدہ پورا کرے یا اس بارے میں کوئی یقین دہانی کرائے۔ مگر شاور بلا کا فریبی تھا، وہ وقت گزارتا رہا تاکہ شیرکوہ مایوس ہو کر لوٹ جائے۔ شیرکوہ اس بدعہدی پر بڑا جھنجلایا۔ اس نے شاور کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی اور واپس جانے سے انکار کر دیا۔ شاور نے یہ صورتحال دیکھی تو عیسائی حکمرانوں سے مدد مانگی۔ ان دنوں بیت المقدس کی ریاست کا بادشاہ ایمرک تھا جو شام کے تمام عیسائی حکمرانوں میں سب سے طاقتور اور باعظمت شمار ہوتا تھا۔ شاور نے اسے لکھا کہ اگر اس نے مصر کی فوری مدد نہ کی اور نورالدین زنگی کی فوجوں کو سبق نہ سکھایا تو نورالدین مصر پر قابض ہو جائے گا جس کے نتائج خود نصرانیوں کے لیے تباہ کن ہوں گے۔

شاور نے نصرانیوں کو یہ پیغام دے کر محسن کشی کی ایک بدترین مثال قائم کر دی تھی۔ اس کا پیغام پا کر بیت المقدس کے عیسائی حکمران چونک اٹھے۔ مصر پر شامی مسلمانوں کے قبضے کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ

[1] ابن خلدون: 5/276،275

دونوں طرف سے جنگجو ترکمانوں کے درمیان گھر جائیں گے۔ چنانچہ ایلمرک ایک بڑا لشکر لے کر مصر کی طرف روانہ ہوگیا۔ نورالدین نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ مصر کے محاذ کو اہم ترین سمجھتے ہوئے ہر رکاوٹ کو پار کرتے گئے۔ اس دوران یورپ کے نصرانیوں کے بہت سے گروہ القدس کی زیارت کے لیے شام کے ساحلوں پر اتر رہے تھے۔ ایلمرک نے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ چانچہ ان کے بہت سے لوگ القدس کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور باقی مصر جانے والے لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے۔

<u>شیرکوہ کچے قلعے میں</u> ❊ شیرکوہ کو نصرانیوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ قاہرہ کے نواح سے کوچ کر کے "بلبیس" آ گیا، کیوں کہ اسے اپنے دفاع کے لیے ایک قلعے کی فوری ضرورت تھی۔ اگرچہ بلبیس کا قلعہ مٹی کا تھا اور زیادہ مضبوط نہ تھا۔ دیواریں بلند نہ تھیں اور فصیل کے اردگرد کوئی خندق بھی نہیں تھی۔ مگر اس کے سوا اور کوئی قریب ترین پناہ گاہ میسر نہ تھی۔ شیرکوہ کے بلبیس میں مورچہ زن ہوتے ہی فرنگی لشکر مصری فوجوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور سختی سے محاصرہ کرلیا۔

اب صورتحال نہایت خطرناک ہوگئی تھی۔ ایک کمزور سے قلعے میں شامی فوج کے بہترین افراد گھر گئے تھے، ان کا خاتمہ نورالدین زنگی کے لیے بہت بڑا دھچکا ثابت ہوتا۔ تاہم شیرکوہ، اس کا بھتیجا صلاح الدین یوسف اور شامی سپاہی بڑی پامردی سے اتحادی دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ ہر صبح و شام قلعے سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ آور ہوتے اور مختصر سی جھڑپ کے بعد تیزی سے واپس آجاتے۔ [1]

دن گزرتے رہے اور محصورین کی حالت نازک تر ہوتی گئی۔ ان کی آخری امید سلطان نورالدین زنگی سے وابستہ تھی۔ نورالدین کو اپنے وفاداروں کو اس تکلیف دہ حالت کا پورا پورا احساس تھا۔ اب اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ عیسائی حکمرانوں کی پشت پر زوردار ضرب لگائی جائے۔

<u>حارم پر نورالدین کا قبضہ</u> ❊ نورالدین زنگی کی افواج نے فرنگیوں کے شہروں پر زوردار حملے شروع کردیے۔ ان کا سب سے بڑا نشانہ حارم تھا جس کی دفاعی اہمیت کے لحاظ سے عیسائی اسے القدس کا دروازہ سمجھتے تھے۔ اس سے پہلے بھی نورالدین نے دوبار حارم پر فوج کشی کی تھی مگر قبضے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس بار "ابھی یا کبھی نہیں" کے اصول کے مطابق مسلمانوں نے بھرپور حملہ کیا، وہ جانتے تھے کہ اس کامیابی سے بلبیس کے محصور مسلمانوں کی زندگیاں وابستہ ہیں۔ حارم کو بچانے کے لیے شام کی تمام عیسائی ریاستوں کے حکمران اور امراء اپنی فوجوں کے ساتھ پہنچ گئے تھے، تین مہینے تک خوں ریز جھڑپیں جاری رہیں آخر کار نصرت خداوندی شامل حال ہوئی اور رمضان 559ھ (اگست

[1] الکامل فی التاریخ: 173_172/7

1164ء) میں حارم مسلمانوں کی جھولی میں آ گرا۔ اس معرکے میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے۔ انطاکیہ اور طرابلس کے عیسائی حاکموں سمیت ممتاز عیسائی امراء اور سینکڑوں نائٹ گرفتار ہوئے۔ یہ نصرانیوں کی بہت بڑی شکست تھی۔

بلبیس سے مجاہدین کا انخلا:۔ ادھر بلبیس کے مجاہدوں کو بھی لڑتے لڑتے تین مہینے ہو گئے تھے، وہ کمال مردانگی کا ثبوت دیتے ہوئے اب تک ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ انہیں باہر کی کچھ خبر نہیں تھی، ان کا سامان رسد ختم ہونے کو تھا، خوراک کی شدید کمی سے ہر سپاہی متاثر ہو رہا تھا۔

ایک دن اچانک انہوں نے دیکھا کہ عیسائی فوجوں کی صفوں میں خاموشی طاری ہے گویا ان کا حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، ان کے ساتھ ساتھ مصری فوجیں بھی چپ سادھے کھڑی ہیں، مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ سلطان نورالدین نے قلعہ حارم فتح کرنے کے بعد اب بانیاس کا محاصرہ کیا ہوا ہے اور دشمن اسی صدمے سے ساکت دجامد ہے۔

وہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ فرنگیوں کی جانب سے ایک سفیر آیا۔ اس نے شیر کوہ کو صلح کی پیش کش کرتے ہوئے کہا کہ وہ محاصرہ ختم کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ مصر کو مصریوں کے لیے چھوڑ دیا جائے، نہ اس پر عیسائی قبضہ کریں نہ مسلمان۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ جائیں۔ شیر کوہ نے اس پیش کش کو نعمت غیر مترقبہ تصور کیا اور محاصرے کی سختیوں سے جاں بلب مجاہدین کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا۔

کچھ دیر بعد شامی مجاہدین بلبیس کے کچے قلعے سے قطار باندھے نکل رہے تھے، باہر میدان کے دونوں طرف عیسائی اور مصری سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ شیر کوہ اپنے سپاہیوں کو روانہ کر رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔ وہ اپنے سب سپاہیوں سے پیچھے تھا تاکہ سب کو دیکھ بھال سکے۔ اس کے چہرے کا وقار اور شجاعانہ تیور دیکھ کر ایک یورپی عیسائی افسر آگے بڑھا اور کہنے لگا:

"آپ کو خوف محسوس نہیں ہوتا کہ کہیں یہ عیسائی اور مصری آپ سے وعدہ خلافی نہ کر بیٹھیں...... آپ سب کو گھیر کر اس طرح مار دیں کہ نام و نشان تک نہ رہے۔"

شیر کوہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا:

"کاش کہ وہ ایسا کر گزریں! ان کی طرف سے وعدہ خلافی کی ابتدا ہوتی تو میں ان کا وہ حشر کرتا جو دنیا دیکھتی۔ اللہ کی قسم! میں تلوار لے کر پل پڑتا، ہمارا کوئی آدمی ان کے کئی کئی آدمیوں کو قتل کیے بغیر نہ مرتا۔ پھر سلطان عادل نورالدین ان کی خبر لیتے۔ ان کے ملک پر قبضہ کر لیتے اور ان کے باقی ماندہ لوگوں کو مار ڈالتے۔ اللہ کی قسم! میرے یہ سپاہی مجھے منع کرتے رہے ورنہ میں تو پہلے ہی

دن تم سب سے نمٹ لیتا۔"

یورپی افسر گھبرا کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا اور پھر بولا:

"میں شام کے نصرانیوں کو آپ کے بارے میں حیرت انگیز باتیں کرتے سنتا تھا۔ انہیں آپ سے ڈرتا دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ آپ کی اتنی ہیبت میں کوئی مبالغہ ہوگا۔ مگر اب میں جان گیا ہوں کہ وہ درست کہتے ہیں۔"[۵]

یہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔ شیر کوہ مجاہدین کو لے کر بلبیس سے روانہ ہوا، اگلی بستیوں میں اسے حارم کی فتح کی خبر مل گئی۔ شیر کوہ خشکی کے راستے سفر کر رہا تھا جبکہ بلبیس کا محاصرہ اٹھانے والی عیسائی فوج نے ساحل کے ساتھ ساتھ واپسی اختیار کی تھی۔ اس میں کرک کا عیسائی حاکم ریجی نالڈ (برنس ارناط) بھی تھا۔ بلبیس سے انخلاء کے معاہدے میں یہ طے تھا کہ شیر کوہ کا تعاقب نہیں کیا جائے گا مگر ریجی نالڈ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحری جہازوں کے ذریعے اپنی فوج کو تیزی سے ایک دن کے اندر اندر عسقلان لے آیا اور وہاں سے کرک پہنچ کر شیر کوہ کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ جب کسی نے اسے معاہدہ کا پاس یاد دلایا تو وہ استہزائیہ انداز میں بولا:

"شیر کوہ سے خشکی میں تعاقب نہ کرنے کا معاہدہ تھا، میں نے تو سمندر کے راستے سے اس کا تعاقب کیا ہے۔"

ممکن تھا کہ ریجی نالڈ بے خبری میں شیر کوہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا مگر کرک سے کچھ فاصلے پر آ کر شیر کوہ کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلا دیا اور وہ عام راستہ چھوڑ کر ایک غیر معروف راستے پر چل پڑا۔ یوں مسلمان صحیح سلامت شام پہنچ گئے۔

اس دوران سلطان نور الدین نے نصرانیوں کے دوسرے اہم قلعے بانیاس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ شیر کوہ اور اس کے مجاہدین کی آمد سے اس فتح کی خوشخبری دوگنی ہوگئی۔ شیر کوہ کے نوجوان بھتیجے صلاح الدین کو اس کٹھن مہم میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ کسی ملک کی سیاسی، عسکری اور اخلاقی خوبیوں یا خامیوں کو پرکھنے اور سمجھنے کا عملی موقع اس جاں سوزی کے بغیر یقیناً نہیں مل سکتا تھا۔[۶]

---

۵ الکامل فی التاریخ: 7/174_175   ۶ کتاب الروضتین: 2/93

فصل: 2

شیرکوہ اور یوسف مصر میں

مصر سے لوٹنے کے بعد شیرکوہ جو کہ شاور کو اس کے کرتوتوں کا مزا چکھانے کے لیے بے چین تھا، سلطان نورالدین زنگی سے بار بار درخواست کرتا رہا کہ مصر پر فوج کشی کی جائے۔ چوں کہ اس وقت زنگی حکومت کے بنو عبید سے اچھے تعلقات تھے اس لیے سلطان نورالدین کو کسی خاص مجبوری کے بغیر مصر پر ہاتھ ڈالنا پسند نہ تھا۔ بہر کیف شیرکوہ نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ آخر کار تین سال بعد سلطان کو منانے میں کامیاب ہو گیا۔

ربیع الثانی 562ھ (فروری 1167ء) میں شیرکوہ ایک بار پھر دو ہزار برق رفتار شہ سواروں کی فوج لے کر مصر روانہ ہوا تاکہ شاور کو بدعہدی اور نصرانیوں سے دوستی کی سزا دی جائے۔ یہ زنگی کی طرف سے مصر میں ایک سوچی سمجھی عسکری مداخلت تھی جس سے بہت سے سیاسی و عسکری فائدوں کی امید تھی۔ شیرکوہ شامی عیسائی ریاستوں کو دائیں ہاتھ پر چھوڑتا ہوا صحرائے سینا میں داخل ہو گیا۔ اس خطرناک علاقے سے گزر کر وہ مصر کی حدود میں پہنچا اور قاہرہ سے تقریباً چالیس میل جنوب کی سمت اطفیح (عطفیہ) کے مقام سے دریائے نیل کو عبور کر کے مغربی کنارے پر اتر گیا۔ یہاں اس نے "جیزہ" میں کوئی دو ماہ قیام کیا اور مغربی مصر میں اپنے قدم مضبوط جما لیے۔[1]

<u>ایملرک شیرکوہ کے تعاقب میں</u> ✽ اس دوران شاور فرنگیوں سے مدد طلب کر چکا تھا، چنانچہ اس کا پرانا دوست ایملرک اپنی فوج لے کر دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر آن پہنچا۔ اب ٹکراؤ ناگزیر ہو چکا تھا۔ دونوں لشکر دریائے نیل کے کنارے کنارے شمال کی طرف چلے، فرنگی مشرقی کنارے پر اور مسلمان مغربی کنارے پر آگے بڑھتے گئے۔[2]

---

[1] الکامل فی التاریخ: 7/188، کتاب الروضتین: 2/18

[2] الکامل فی التاریخ: 7/188-189، سوانح صلاح الدین ایوبی ص 48

آگے چل کر ایلمرک نے فسطاط کے قریب پڑاؤ ڈالا اور شاور پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ عسکری امداد کے بدلے شاور نے مراعات اور مال دینے کا جو معاہدہ کیا تھا وہ اس وقت تک معتبر نہیں ہوگا جب تک کہ خود حکومت کے سربراہ عاضد اس کی تصدیق نہیں کرے گا۔ عاضد نے یہ بات مان لی اور عیسائی سفیروں کو خود اپنے پاس حاضری کی اجازت دے کر نصرانیوں سے دوستی اور معاہدے کی تصدیق کی۔ [۴]

ایلمرک اب جری ہو کر شیرکوہ پر حملے کے لیے پر تولنے لگا۔ دونوں حریفوں کے درمیان حائل دریائے نیل کو عبور کرنے کے لیے پہلے اس نے پل بنانے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران شامی فوج مصر کے بالائی علاقے ''صعید مصر'' پہنچ چکی تھی۔ ایلمرک نے آگے چل کر دریا کو ڈیلٹائی علاقے سے پار کیا اور مسلمانوں کو گھیرنے کی کوشش کی۔ شیرکوہ کے پاس صرف دو ہزار سپاہی تھے۔ اس نے اپنا پہلو بچاتے ہوئے ''بابین'' نامی مقام میں پڑاؤ ڈال دیا۔ فرنگیوں کے ساتھ اب مصری افواج بھی شیرکوہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ شیرکوہ کے جاسوسوں نے جو تازہ اطلاعات فراہم کی تھیں ان کے مطابق عیسائی اور مصری دونوں بہت بڑی تعداد میں تھے اور وہ ہر قیمت پر شامی فوج کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ باعزت صلح کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا۔ [۵]

بہترین رائے یہی ہے ☆ شیرکوہ لڑائی سے گھبرانے والا نہیں تھا، مگر اسے اپنے ساتھیوں کی فکر تھی۔ اس معرکے میں بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔ جان بچانے کی صرف ایک صورت تھی کہ کسی طرح دریا پار کر کے راہِ فرار اختیار کی جائے۔ مگر دریا عبور کرنا بھی اس وقت اتنا آسان نہیں تھا۔ فرنگی اور مصری فوج پوری طرح چوکس تھے۔

ایسی حالت میں شیرکوہ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ اکثر ساتھیوں نے یہی رائے دی کہ بہر صورت دریا عبور کر کے جان بچانے کی کوشش کی جائے۔ انہوں نے کہا:

''لڑائی کی صورت میں زیادہ امکان یہی ہے کہ ہم شکست کھائیں گے۔ اس صورت میں ہم پسپا ہو کر کہیں پناہ بھی لیں گے تو کہاں؟ کون ہماری مدد کرے گا؟ ان علاقوں میں ہر سپاہی، ہر کسان اور ہر عام آدمی ہمارے خلاف ہے۔''

ان کا یہ کہنا غلط بھی نہیں تھا، ظاہری نقشہ یہی بتا رہا تھا کہ لڑائی سے گریز کیا جائے مگر شیرکوہ کے دو خاص آدمیوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ یہ شرف الدین بزغش اور صلاح الدین یوسف تھے۔ شرف الدین نے اپنی تقریر میں کہا:

---

[۴] سوانح الدین لین پول: 46
[۵] الکامل فی التاریخ: 7/159، سوانح الدین: 47

"جو قتل ہونے یا گرفتاری سے ڈرے اسے بادشاہوں کی ملازمت کی بجائے گھر میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھنا چاہیے۔ اگر ہم اس حالت میں سلطان کے پاس لوٹے کہ نہ ہم فاتح ہوں اور نہ ہی کسی معذور کر دینے والی مصیبت سے مجبور ہوں تو سلطان ہم سے ہمارا مرتبہ اور مال و دولت سب کچھ چھین لیں گے۔ انہیں یہ کہنے کا پورا حق ہوگا کہ تم مسلمانوں سے ٹیکس تو وصول کرتے ہو مگر ان کے دشمنوں کو دیکھ کر بھاگ جاتے ہو اور مصر جیسے اسلامی ملک کو کفار کے ہاتھ میں دے کر آ جاتے ہو۔"

نوجوان صلاح الدین ایوبی نے بھی اس طرح کے جذبات کا اظہار کیا۔ یہ سن کر شیر کوہ نے کہا:

"بہترین رائے یہی ہے۔"

اب محفل مشاورت کا رنگ بدل گیا اور سب مسلمان لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

وادیٔ نیل کا معرکہ ﷺ 26 جمادی الثانی 562ھ (18 اپریل 1167ء) کو دونوں فوجیں ایک کھلے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آئیں۔ شیر کوہ نے قلب میں اپنی جگہ صلاح الدین یوسف کو مقرر کیا اور کہا:

"دشمن مجھے قلب لشکر میں گمان کر کے سارا زور اس طرف ڈالے گا...... مگر تم ان سے بھرپور مقابلہ کرنے کی بجائے نمائشی جنگ کرنا اور جلد ہی تیز تر پسپائی اختیار کر لینا۔ جب دشمن تمہارا پیچھے کرتے کرتے تھک جائے اور واپس لوٹنے لگے تو تم اس کی پشت پر حملہ کر دینا۔"

شیر کوہ نے خود دائیں ہاتھ کے دستوں کو سنبھالا، اس کے لیے اس نے اپنے بہترین جانباز اور سخت جان سپاہیوں کو چنا تھا۔ شیر کوہ کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ فرنگیوں اور مصری فوجوں نے طبل جنگ پر چوٹ پڑتے ہی شامیوں کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ صلاح الدین یوسف کی قیادت اور شجاعت کی آزمائش کا غیر معمولی موقع تھا جس کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے۔ صلاح الدین نے خود کو قیادت کا اہل ثابت کر دکھایا، اتحادیوں کے اس ریلے کے سامنے کچھ دیر اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کو لڑانے کے بعد وہ منظم انداز میں پسپا ہوتا دکھائی دینے لگا۔ عیسائی سپاہی خوشی سے دیوانے ہو کر ان کا پیچھا کرنے لگے مگر تیز رفتار گھوڑوں پر سوار یہ چند سو سپاہی ان کے ہاتھ نہ آئے۔

پیچھے میدان میں اب زیادہ تعداد مصری سپاہیوں کی رہ گئی تھی۔ شیر کوہ کے اشارے پر شامیوں کا دایاں بازو آگے بڑھا اور ان پر پل پڑا۔ اس اچانک طوفانی حملے سے اہلِ مصر کے چھکے چھوٹ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی بہت بڑی تعداد گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ گئی جبکہ باقی بھاگ نکلے۔

ادھر صلاح الدین کے تعاقب میں جانے والی فرنگی فوج ناکام ہو کر واپس لوٹ آئی۔ مگر یہاں میدان کو اپنے میزبانوں کی لاشوں سے بھرا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ املرک پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ

سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ دو ملکوں کی مشترکہ فوجوں کو شکست فاش دینا شیر کوہ کا حیرت انگیز کارنامہ تھا، جس میں صلاح الدین ایوبی کی شجاعت اور بیدار مغزی کا بھی بڑا حصہ تھا۔ [1]

نصرانیوں اور مصریوں کی پسپائی کے بعد شامی مجاہدین کو دشمن پر نفسیاتی برتری حاصل ہوگئی تھی۔ یہ محض اللہ جل شانہ کا لطف و کرم تھا کہ ان تھوڑے سے سپاہیوں کا رعب دو ملکوں کی افواج پر طاری ہوگیا تھا ورنہ اب بھی فرنگی اور مصری قوت کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ دوبارہ انہیں گھیر سکیں۔ مگر انہیں اس کی ہمت نہ ہوسکی، وہ کسی توقف کے بغیر قاہرہ پہنچ گئے اور نئے سرے سے تیاریاں کرنے لگے۔ شیر کوہ بابین کے معرکے کا فاتح بن کر وہاں سے چلا تو اسکندریہ پہنچ کر دم لیا۔

شیر کوہ کا اسکندریہ پر قبضہ ٭ سکندریہ کے لوگوں نے شامی فوج کو خوش آمدید کہا۔ وہ مصری حکومت کی زیادتیوں سے نالاں اور فرنگیوں کے ان بحری بیڑوں سے خوفزدہ تھے جو کسی بھی وقت اسکندریہ کے ساحلوں پر حملہ آور ہوسکتے تھے۔ شیر کوہ نے اسکندریہ کے حالات اطمینان بخش دیکھے تو وہاں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا اور صلاح الدین کو وہاں بطور نائب مقرر کر کے خود بالائی مصر چلا گیا۔

اسکندریہ جیسے تاریخی، تجارتی اور عسکری لحاظ سے قدیم شہر میں صلاح الدین کا تقرر کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے بزرگ اس میں قیادت کے جوہر چمکتے دیکھ رہے ہیں۔ اب تک صلاح الدین کی خوبیاں میدان جنگ میں ظاہر ہوئی تھیں مگر سیاسی اور انتظامی امور سے نبرد آزما ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ مستقبل کے اس فاتح نے اس میدان میں بھی خود کو ہر لحاظ سے قابل ثابت کر دکھایا۔ رمضان شریف کا مہینہ اس طرح گزرا کہ صلاح الدین بدستور اسکندریہ میں اور شیر کوہ بالائی مصر کے انتظامی معاملات میں مصروف رہے۔ [2]

صلاح الدین اسکندریہ کے محاذ پر ٭ ادھر قاہرہ میں مصری اور عیسائی فوجوں نے از سر نو تیاری کر لی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ شامیوں کی دو ہزار فوج بھی دو حصوں میں تقسیم ہوچکی ہے اور شیر کوہ اسکندریہ سے خاصے فاصلے پر چلا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے تیزی سے پیش قدمی کی اور اسکندریہ پہنچ کر شہر کا نہایت سختی سے محاصرہ کرلیا۔ خوراک و رسد کے راستے مسدود ہوئے تو شہر میں قحط کی سی صورتحال پیدا ہوگئی۔ صلاح الدین نے اپنے ساتھیوں کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنے چچا کو پیغام بھیجا کہ وہ جلد از جلد مدد کو پہنچے۔ لین پول اس معرکے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''عیسائی اور مصری افواج نے مشترکہ طور پر اسکندریہ کو نرغے میں لے لیا۔ ساحل پر نصرانیوں کے

[1] الکامل فی التاریخ: 189/7
[2] ابن خلدون: 277/5

بحری جہاز تیار کھڑے تھے۔ صلاح الدین کے لیے آزادانہ کمان کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس نے نہایت خوش اسلوبی سے اسکندریہ کی مدافعت کی۔''

صلاح الدین نے اڑھائی ماہ گزر جانے کے باوجود ہتھیار نہ ڈالے اور اسکندریہ کی بلند و بالا فصیلوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس امید پر دفاع جاری رکھا کہ جلد یا بدیر شیر کوہ باقی سپاہیوں کے ساتھ ان کی مدد کو ضرور پہنچے گا۔

ادھر شیر کوہ کو اسکندریہ کی نازک صورتحال کا پورا اندازہ تھا، وہ صلاح الدین کا پیغام ملتے ہی بالائی مصر سے چل پڑا۔ لین پول نے لکھا ہے کہ اس موقع پر اس نے اسکندریہ کی بجائے قاہرہ کا رخ کیا اور اسے گھیر لیا جس کے باعث اسکندریہ پر حملہ آور فوجیں گھبرا گئیں اور انہیں اسکندریہ کا محاصرہ اٹھانا پڑا۔ مگر یہ روایت درست نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ سیدھا اسکندریہ ہی کی طرف آیا۔ گو اس کی اپنی حالت اتنی مضبوط نہ تھی، اس کی فوج کے بعض امراء بھی شاور کے بہکاوے میں آکر اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے مگر خوش قسمتی سے اس کے باوجود شیر کوہ کی کوئی کمزوری اسکندریہ کا محاصرہ کرنے والے عیسائی حکمران اطمرک اور اس کے مصری اتحادیوں پر عیاں نہ ہو سکی۔ وہ بدستور نفسیاتی دباؤ میں رہے۔ اور آخر کار صلح کے پیغام کی ابتداء انہی کی طرف سے ہوئی جو کہ شامی لشکر کی برتری کی دلیل تھی۔ اتحادیوں نے پیش کش کی تھی کہ اگر شیر کوہ صلح کر لے تو وہ پچاس ہزار دینار ادا کریں گے۔ شیر کوہ نے نفسیاتی برتری برقرار رکھتے ہوئے صلح نامے میں یہ شرائط بھی عائد کر دیں کہ عیسائی مصر سے فوراً نکل جائیں گے، یہاں کسی شہر میں نہیں رہیں گے، کسی ایک گاؤں پر بھی قبضہ باقی نہیں رکھیں گے۔ اس نے شاور کو بھی صلح نامے میں اس بات کا پابند کیا کہ وہ اسکندریہ کے عوام کو شامیوں کی حمایت کے بدلے کوئی اذیت نہیں دے گا۔

اتحادیوں نے یہ تمام شرائط قبول کر لیں۔ اطمرک نے انہیں قبول کرنے میں سب سے زیادہ تیزی دکھائی کیوں کہ وہ جلد واپس جا کر اپنے ملک کی خبر لینا چاہتا تھا جہاں سلطان نور الدین نے مزید کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ماہ شوال 562ھ (جولائی 1167ء) کے وسط میں اس صلح نامے پر عمل ہوا اور صلاح الدین نے اسکندریہ خالی کر دیا۔ شامی فوجوں نے ایک بار پھر ہاری ہوئی جنگ جیت لی تھی۔ یورپی مؤرخ لین پول خود اس کی گواہی دیتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

''نصرانیوں کا بیان ہے کہ اس جنگ میں انہیں فتح حاصل ہوئی تھی، اسکندریہ کے انخلاء کو وہ ہتھیار ڈالنے سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اگر عرب مؤرخین کی یہ روایت درست ہے کہ اطمرک نے شیر کوہ

کو واپسی کے عوض پچاس ہزار اشرفیاں بھی دی تھیں، تو پھر برتری مسلمانوں کی نظر آتی ہے۔''[4]

ایک اللہ والے کی بشارت ❁ نجم الدین کے بیٹے یوسف نے تین ماہ تک اسکندریہ میں محصور رہ کر جس دلیری، بلند ہمتی اور ہوشیاری سے شہر کا کامیاب دفاع کیا تھا اس کے چرچے ہر طرف ہو رہے تھے۔ اس دوران دمشق میں نجم الدین ایوب خود ہر آنے جانے والے سے مصر اور خصوصاً اسکندریہ کی خبریں بڑی بے چینی سے معلوم کیا کرتا تھا۔

شعبان کے مہینے میں جبکہ محاصرے کو ایک ماہ گزر چکا تھا، نجم الدین کو معلوم ہوا کہ بغداد کے مشہور عالم شیخ عماد اصفہانی دمشق آگئے ہیں اور قاضی القضاۃ کمال الدین شہروری نے انہیں مدرسہ نوریہ شافعیہ میں ٹھہرایا ہے۔ شیخ عماد کوئی معمولی انسان نہیں تھے، وہ ایک ادیب، شاعر اور مورخ کی حیثیت سے عالم اسلام میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ نجم الدین نے ان کی آمد کی خبر سنتے ہی صبح سویرے مدرسہ نوریہ شافعیہ کا رخ کیا۔ سرکاری طور پر ان کی خدمت میں سب سے پہلے حاضر ہونے کی سعادت نجم الدین ہی کو حاصل ہوئی۔ شیخ عماد سے نجم الدین ایوب کے گھرانے کی شناسائی اس زمانے سے تھی جب وہ تکریت میں رہتے تھے۔ اب مدتوں بعد یوں دمشق میں جمع ہو جانا ان کے لیے نہایت مسرت کا باعث تھا۔ شیخ عماد، نجم الدین سے مصر کے حالات معلوم کرتے رہے۔ شامی افواج کی فتوحات سے آگاہ ہو کر ان کے دلی جذبات اشعار کی صورت میں ظاہر ہوئے اور انہوں نے بے ساختہ فرمایا:

وَيَسْتَقِرُّ بِمِصْرَ يُوسُفُ وَبِهِ   تَقَرُّ بَعْدَ التَّنَائِيْ عَيْنُ يَعْقُوْبِ
وَيَلْتَقِي يُوسُفُ فِيْهَا بِإِخْوَتِهِ   وَاللهُ يَجْمَعُهُمْ مِنْ غَيْرِ تَثْرِيْبِ

''مصر میں یوسف مستحکم ہو جائے گا اور جدائی کے بعد یعقوب کی آنکھ وہیں ٹھنڈی ہوگی۔ وہیں یوسف اپنے بھائیوں سے ملے گا۔ اللہ انہیں کسی خدشے کے بغیر اکٹھا کر دے گا۔''[5]

شیخ نے ان اشعار میں امید ظاہر کی تھی کہ نجم الدین کا فرزند یوسف مصر کا بادشاہ بنے گا جیسے اللہ نے یوسف علیہ السلام کو یہ منصب دیا تھا۔ یہ بات حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ چند سالوں بعد یوسف کو مصر میں حکومت بھی ملی اور نجم الدین ایوب کا پورا خاندان وہاں جمع ہو گیا۔

شیخ عماد کو بعد میں نجم الدین کی کوششوں کی بدولت سلطان نور الدین کے دربار میں کتابت و انشاء نگاری کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اس کے باعث وہ عماد الکاتب کے لقب سے مشہور ہوئے۔[6]

---

[4] الکامل فی التاریخ: 7/190؛ مفرج الکروب: 47؛ کتاب الروضتین: 2/19
[5] البدایہ والنہایہ، تحت 562ھ
[6] الکامل فی التاریخ: 7/190، 191

معاہدہ اسکندریہ کی خلاف ورزی: معاہدہ اسکندریہ کے بعد ذی قعدہ کے وسط (ستمبر 1167ء) میں شیرکوہ اور صلاح الدین یوسف سپاہیوں سمیت واپس شام چلے گئے۔ ایملرک بھی لوٹ گیا۔ مگر فرنگیوں کے اصل لشکر کی واپسی کے باوجود طے شدہ معاہدے کے برخلاف عیسائی افسران اور ان کے بہت سے سپاہی مصر میں موجود رہے جو اہل مصر کو دھمکانے کے لیے کافی تھے۔ انہوں نے مصریوں پر دباؤ ڈال کر اپنا ایک انتظامی افسر قاہرہ میں مقرر کر دیا، شہر کے پھاٹکوں پر اپنے گھڑسوار تعینات کر دیے اور سالانہ خراج کی شرح بڑھا کر ایک لاکھ دینار کر دی۔ یہ تمام معاملات وہ شاور کے ساتھ طے کر رہے تھے جبکہ عاضد بے بس قیدی کی طرح دولتِ عبیدیہ کی رسوائی کا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

بد باطن شاور کا بیٹا کامل ایک نیک بخت نوجوان تھا، وہ اپنے باپ کی اس سیاہ سیاست سے تنگ آ چکا تھا، اس نے مصر کے تازہ ترین حالات سے یہ محسوس کر لیا کہ اس کا وطن نصرانیوں کا غلام بنتا جا رہا ہے۔ اس نے سلطان نورالدین کو خط لکھ کر اس صورتحال سے آگاہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ مصر میں سلطان کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرے گا تاکہ سلطان کی فوج انہیں نصرانیوں سے نجات دلا سکے۔ [1]

فرنگیوں کی مشاورت: معاہدہ اسکندریہ کے بعد ایک سال گزر گیا۔ گنتی کے چند عیسائی افسران اور سپاہی پورے مصر کو لاٹھی سے ہانک رہے تھے۔ ان کے مظالم کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ ایک سال کے اندر اندر عیسائی افسران پر مصریوں کی بے بسی پوری طرح عیاں ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر اس وقت فوج کشی کر کے ملک کو باقاعدہ فتح کر لیا جائے تو کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں ہوگی، چنانچہ وہ ایملرک کو مصر پر حملے کی دعوت دے چکے تھے۔ القدس میں ایملرک اب اس معاملے پر مشورہ کر رہا تھا کہ آیا مصر کو مکمل طور پر فتح کر لیا جائے یا اسی حال پر رہنے دیا جائے۔ تقریباً تمام مشیر وہاں حملہ کرنے کے حق میں تھے۔ تاہم ایملرک بہت دور اندیش اور محتاط تھا۔ اس کو موجودہ صورتحال میں تو یہ اطمینان تھا کہ بیٹھے بٹھائے مصر کا خراج اسے مل رہا ہے۔ مگر وہاں باقاعدہ قبضے کی صورت میں اسے کئی خدشات تھے۔ اس نے اپنے مشیروں سے کہا:

''میرا خیال ہے کہ ہم مصر پر فوج کشی نہ کریں۔ وہ ہمارے لیے لقمۂ تر ہے، اس کی ساری آمدن ہمیں خود بخود یہاں پہنچ رہی ہے جس کے ذریعے ہم نورالدین زنگی کے خلاف اپنی فوج کو مضبوط تر کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے مصر پر قابض ہونے کی کوشش کی تو وہاں کے حکام اور عوام ہمارے مخالف بن جائیں گے اور ہمارا خوف انہیں نورالدین کی وفاداری پر آمادہ

(1) الکامل فی التاریخ: 196/7

کر دے گا۔ پھر ایسی صورتحال میں اگر شیر کوہ جیسا کوئی مرد میدان وہاں پہنچ گیا تو یقیناً یہ نصرانیوں
ں ہلاکت اور ان کے شام تک سے بے دخل ہونے کا باعث ہوگا۔''

ایلمرک کی اس تقریر کا امرائے فوج پر کوئی خاص اثر نہ ہوا اور انہوں نے جواب دیا:

''مصر کا کوئی محافظ ہے نہ مددگار، جب تک نورالدین لشکر تیار کر کے وہاں روانہ ہوگا ہم وہاں قبضہ کر چکے ہوں گے اور نورالدین جب وہاں آئے گا تو اس کا بچ کر نکلنا مشکل ہوگا۔''

ایلمرک کی مصر پر یلغار: سب کو متفق دیکھ کر ایلمرک نے مصر پر حملے کا فیصلہ کر لیا مگر اس کے دلی خدشات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور لشکر کشی کی ظاہری ہیئت ایسی رکھی کہ مسلمانوں کو ان کی پیش قدمی کی صحیح سمت کا اندازہ نہ ہو۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ لشکر حمص پر حملے کے لیے جا رہا ہے تا کہ مسلمان دھوکے میں رہیں۔ [۹]

محرم 564ھ (اکتوبر 1168ء) کے وسط میں ایلمرک اپنی فوج کے ساتھ عسقلان سے مصر کی طرف روانہ ہوا، اس دوران اسے مصر کے بعض ایسے امراء کے پیغامات وصول ہوئے تھے جو شاور سے تنگ اور فرنگیوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے، وہ فرنگیوں کے ذریعے شاور کو اقتدار سے ہٹانا چاہتے تھے۔ ان پیغامات سے نصرانیوں کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔ اگرچہ نصرانیوں نے اپنی فوج کشی کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر نورالدین زنگی کو خبر مل گئی۔ اس نے مختلف صوبوں کے حکام کو فوراً لشکر تیار کر کے اپنے پاس آنے کا حکم دے دیا۔

ادھر ایلمرک یکم صفر 564ھ (3 نومبر 1168ء) کو مصر کے سرحدی قصبے بلبیس پہنچ گیا۔ اب اس کے چہرے سے شرافت و مروت کا وہ نقاب بھی اتر چکا تھا جو وہ اہل مصر کے سامنے پہن کر خود کو ان کا نجات دہندہ باور کراتا تھا۔ اب وہ استعمارانہ عزائم کا حامل ایک جلاد نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک درندے کی طرح بلبیس پر حملہ کیا اور وہاں قتل عام کر کے پوری آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا، پانچ دن تک وہاں ظلم و ستم کا بازار گرم رہا۔

مگر اس غارت گری کا نتیجہ فرنگیوں کے حق میں بدتر ثابت ہوا۔ مصر کے کئی امراء جو ایلمرک کو اپنی حمایت کا یقین دلا چکے تھے، بلبیس کے باشندوں کا انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ پہلے وہ شہروں کے دروازے کھول کر نصرانیوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھے مگر اب انہیں اپنے انجام کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دفاع کا فیصلہ کر لیا۔

---

۹ کتاب الروضتین: 2/46تا47، الکامل فی التاریخ: 7/198

چند دن بعد عیسائی لشکر قاہرہ کی طرف روانہ ہوا۔ قاہرہ کے قریب تاریخی شہر فسطاط واقع تھا جو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بسایا تھا۔ عام بول چال میں شہرِ مصر سے یہی مراد لیا جاتا تھا۔ بنوعبید نے اپنے دور میں اس کے بالمقابل قاہرہ تعمیر کر کے اسے دارالحکومت قرار دے دیا تھا مگر اس کے باوجود مصر کی گنجان آبادی فسطاط ہی میں تھی۔

فسطاط جل کر راکھ ❁ ایمرک مسلمانوں کو اتنا دہشت زدہ محسوس کر کے بے حد جری ہو چکا تھا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ اس کے مشیروں کی رائے صحیح تھی اور وہ کسی دقت کے بغیر مصر فتح کر سکتا ہے۔ اس نشے میں وہ تیزی سے قاہرہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور شاور اس کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس موقع پر شاور نے نصرانیوں سے دفاع کے لیے ایک نہایت قابلِ نفرت تدبیر اپنائی۔ اس نے یہ سوچ کر کہ کہیں عیسائی قاہرہ پر حملے کے لیے فسطاط میں مورچے نہ بنالیں فسطاط کی آبادی کو شہر سے نکال کر قاہرہ کی طرف ہانک دیا اور اس ساڑھے پانچ سو سالہ تاریخی شہر کو آگ لگا دی۔ شہر میں ہر طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ دھویں کے مہیب بادل میلوں دور سے نظر آتے تھے، کہا جاتا ہے کہ فسطاط کو آگ لگانے کے لیے دس ہزار مشعلیں اور تیل کے بیس ہزار کنستر استعمال کیے گئے تھے۔ یہ اتنی بڑی آتش زدگی تھی کہ شہر 54 دن تک سلگتا رہا۔ جب آگ کے شعلے ٹھنڈے ہوئے تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بسایا ہوا شہر خاکستر ہو چکا تھا۔ شاور کی اس مجنونانہ تدبیر کے باوجود ایمرک کو کوئی نہ روک سکا۔ وہ دس صفر کو قاہرہ تک پہنچ گیا۔

عاضد اور شاور کی فریاد ❁ نصرانیوں کو قاہرہ کا محاصرہ کرتے دیکھ کر عاضد لرز گیا، مصری محل میں ماتم برپا ہو گیا، عاضد نے اپنی عورتوں کے کچھ نوچے ہوئے بال برق رفتار قاصد کے ذریعے نورالدین زنگی کے پاس حلب روانہ کر دیے اور ساتھ ہی ایک خط بھی بھیجا جس میں حالات کی منظر کشی کے بعد لکھا:

> ''میری مدد کرو، میری عورتوں کو فرنگیوں سے بچاؤ۔ یہ شاہی محل کی خواتین کے بال ہیں جو تمہیں مدد کے لیے پکارتی ہیں۔''

نورالدین یہ خط پڑھ کر مصر کے بارے میں بے حد فکر مند ہو گیا۔ ادھر قاہرہ کا محاصرہ سخت سے سخت تر ہوتا جارہا تھا تاہم شہر کی بلند فصیل کافی دنوں تک حملہ آوروں کو روک سکتی تھی۔ مصری وزیر شاور سفارت کاری کا ماہر تھا۔ اس نے ایمرک کو پیغام بھیج کر اپنی سابقہ دوستی یاد دلائی اور اسے سمجھایا کہ اس معاملے کو صلح وصفائی سے ''کچھ لو کچھ دو'' کے مطابق طے کر لینا بہتر ہے ورنہ دونوں کا مشترکہ دشمن نورالدین مصر پر قابض ہو جائے گا۔

یہ سفارت کاری کامیاب رہی...... ایمرک نورالدین کے نام سے یوں چونکا جیسے کسی بھیانک خواب

ـ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ہو، اسے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر قاہرہ کی فتح میں تاخیر ہوئی تو نور الدین اپنے لشکر سمیت یہاں پہنچ جائے گا اور پھر اس کے لیے زندہ واپس جانا آسان نہیں ہوگا۔ شاور نے صلح کے بدلے اسے دس لاکھ دینار دینے کا وعدہ کیا جن میں سے ایک لاکھ نقد اور بقیہ کی ادائیگی نصرانیوں کے واپس لوٹنے کے بعد طے پائی۔ ①

نصرانیوں کے جانے کے بعد شاور نے بقیہ نو لاکھ دینار جمع کرنے کے لیے قاہرہ اور دوسرے شہروں میں کارندے متعین کر دیے مگر پورا ملک معاشی زبوں حالی کا شکار تھا، عوام کا بہت کچھ عیسائی پہلے ہی لوٹ چکے تھے، سب سے بڑا شہر فسطاط جل کر کوئلہ ہو چکا تھا، اس لیے لاکھ کوششوں کے باوجود شاور پانچ ہزار دینار سے زیادہ جمع نہ کر چکا۔ آخر تنگ آ کر وہ بھی نور الدین زنگی سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے دہائی دی کہ اگر اہل شام نے مدد میں تاخیر کی تو مصر کفار کے پاس چلا جائے گا۔

چچا کو بلاؤ ❊ سلطان نور الدین نے مصر سے نصرانیوں کو نکالنے کے لیے ایک بھرپور حملے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ عاضد نے نور الدین زنگی کو مصر کے تہائی علاقوں کی حکومت دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آخر نور الدین نے حملے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مہم پر شیر کوہ کا جانا بھی ضروری تھا کیوں کہ مصر کے نشیب و فراز کو اس سے بہتر کوئی اور نہیں سمجھ سکتا تھا۔ خود عاضد نے اسی کے مصر میں تعینات کیے جانے پر اصرار کیا تھا۔

شیر کوہ ان دنوں اپنی جاگیر حمص کی دیکھ بھال کے لیے گیا ہوا تھا۔ سلطان نور الدین نے صلاح الدین یوسف کو جسے ان دنوں دمشق کے منتظم کی حیثیت حاصل تھی، فوراً اپنے پاس حلب بلوایا۔ وہ حاضر ہوا تو سلطان نے کہا:

"اپنے چچا شیر کوہ کے پاس حمص جاؤ اور اسے کسی تاخیر کے بغیر جلد از جلد میرے پاس آنے پر آمادہ کرو۔"

صلاح الدین یوسف سلطان کے خصوصی قاصد کے ساتھ اس وقت حمص کی طرف روانہ ہو گیا...... لیکن ابھی وہ ایک میل چلے تھے کہ انہوں نے شیر کوہ کو آتے دیکھا۔ ایلچی نے اسے سلطان کا پیغام دے دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سلطان کے سامنے تھا۔ سلطان کو اس کی اتنی جلد آمد پر حیرت ہوئی۔ شیر کوہ نے عرض کیا:

"مصر کے حالات پر مبنی بعض مصری عمائد کے خطوط پہنچے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ اس تازہ صورتحال پر مشورے کے لیے سلطان کی خدمت میں حاضری ضروری ہے چنانچہ صرف ایک رات میں نہایت تیزی سے سفر کر کے حمص سے حلب آیا ہوں۔"

① کتاب الروضتین: 52/2، الکامل فی التاریخ: 198/7

اب شیر کوہ اور سلطان کے درمیان مشورہ شروع ہوا۔ شیر کوہ ضرورت محسوس کرنے کے باوجود مصر کی مہم کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس نے سلطان سے لشکر کے مصارف کی کمی کا عذر کیا اور اہل مصر کی غداری بار بار آزمانے کے بعد ان پر اعتبار ناممکن قرار دیا۔ سلطان نے مصارف اور لشکر کشی کے سارے انتظامات کا یقین دلایا اور ساتھ ہی کہا:

''دیکھو شیر کوہ! اگر تم اس مہم پر نہیں جاؤ گے تو پھر اس کی اہمیت کے پیش نظر مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ میں خود یہ لشکر لے کر جاؤں کیوں کہ اگر ہم نے اس معاملے کو سرسری سمجھا تو فرنگی مصر پر قابض ہو جائیں گے اور پھر ہم شام میں بھی کہیں رہ نہ پائیں گے۔''

میں مصر نہ جاؤں گا ؎ شیر کوہ یہ سن کر مصر جانے پر آمادہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کی مشاورت کے بعد نورالدین زنگی نے شیر کوہ کو چھ ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ مصر روانگی کا حکم دے دیا۔ سلطان کا یہ حکم سن کر شیر کوہ نے صلاح الدین کی طرف دیکھا اور کہا:

''چلو یوسف! تم بھی میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔''

یہ سن کر صلاح الدین کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے کہا:

''چچا جان! اللہ کی قسم اگر مجھے مصر کی بادشاہت بھی دی جائے تب بھی میں مصر نہیں جاؤں گا...... میں نے اسکندریہ کے محاصرے میں جو تکالیف جھیلی ہیں، وہ میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔''

سخت کوش چچا کے لیے بھتیجے کی فریاد پریشان کن تھی۔ اس نے سلطان سے کہا:

''مصر کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے یوسف کا ساتھ جانا ضروری ہے۔ آپ ہی اسے حکم دیجیے۔''

اب سلطان نے یوسف کو بذات خود حکم دیا مگر جواب میں وہی معذرت تھی۔ یہ مجلس ختم ہو گئی اور شیر کوہ نے کوچ کی تیاری شروع کر دی۔ اس لشکر میں دو ہزار سپاہی جو نورالدین کے خاص منتخب جانبازوں پر مشتمل تھے مزید شامل کر دیے گئے۔ شیر کوہ کے ساتھ ناصرالدین خمارتگین، قطب الدین ینال حسان، عین الدولہ یاروقی، شرف الدین بازغش، عزالدین قلیج اور دوسرے جنگ آزما سرداروں کو متعین کیا تھا۔ لشکر کے اکثر افراد ترکمان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

صلاح الدین نے آخر تک اس مہم میں شرکت پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی مگر سلطان نورالدین نے بار بار اصرار کیا اور کہا:

''تمہارا اپنے چچا کے ساتھ جانا ضروری ہے۔''

صلاح الدین نے بہانے کے طور پر آخری حربہ آزماتے ہوئے مالی حالت کی تنگی اور زاد سفر تیار نہ

ہونے کا عذر کیا، سلطان نے فوراً ایک خطیر رقم سے ان تمام چیزوں کا انتظام کردیا۔ اب صلاح الدین کے پاس کوئی عذر نہ تھا لہٰذا وہ بھی مجبوراً مصر کی جانب روانہ ہونے والے اس لشکر میں شامل ہوگیا۔ اس لشکر کا ہر شخص نہایت شاداں و فرحاں تھا۔ اگر کوئی چہرہ افسردہ اور کبیدہ خاطر تھا تو صلاح الدین یوسف کا، جسے مصر جانے کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ یہ کردی نوجوان اس مہم میں بادلِ نخواستہ جارہا تھا۔

بعد میں ایک موقع پر خود صلاح الدین نے اس وقت کی اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مجھے موت کی طرف ہانک کرلے جایا جارہا ہو۔

اصل بات یہ تھی کہ مصر میں صلاح الدین کے لیے دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اہل مصر کی فریب سے بھرپور سیاست سے تنگ آچکا تھا۔ شامی فوجوں کا بار بار وہاں جانا، حالات کی اصلاح کے لیے کبھی شاور اور کبھی فرنگیوں سے الجھنا، خود کو موت کے منہ میں ڈالنا اور پھر کسی حتمی فیصلے کے بغیر واپس لوٹ آنا اس کے لیے ایک کارِ عبث تھا۔

گزشتہ مہمات میں صلاح الدین نے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مصر کی حکومت انہیں بے وقوف بنارہی ہے لہٰذا اس کا خیال تھا کہ اہل مصر کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ عاضد کا داویلا بھی اس کے نزدیک شاور کی چیخ و پکار کی طرح ایک ڈھونگ تھا اور بار بار اس ڈھونگ پر اعتبار کرنا صلاح الدین جیسے ہوشیار آدمی کے لیے ناممکن تھا...... مگر سلطان نورالدین کی نگاہیں اس سے بہت آگے مصر کی دم توڑتی حکومت کے افق پر ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہوتا دیکھ رہی تھیں۔ آنے والے وقت نے بتادیا کہ سلطان نورالدین کا فیصلہ بالکل درست تھا...... صلاح الدین جس سفر کو فضول تصور کررہا تھا وہی اس کی اقبال مندی اور مسلمانوں کی سعادت کا بہت بڑا سبب بنا۔ [9]

لشکر روانہ ہوا تو سلطان نے اس کی ہمت افزائی کے لیے خود دمشق سے ایک منزل دور "راس الماء" تک ساتھ دیا۔ اس دوران مصر سے خبر اطلاع پہنچی کہ فرنگیوں کا لشکر شامی فوج کی آمد کا شہرہ سن کر قاہرہ سے رفوچکر ہوگیا ہے۔ اس خبر سے نورالدین کو مزید اطمینان ہوگیا۔ پھر بھی اس نے وسطِ ربیع الاول 564ھ (دسمبر 1168ء) میں اس لشکر کو راس الماء کی خیمہ گاہ سے مصر روانہ کردیا۔ دلجوئی کے لیے ہر سپاہی کو اضافی طور پر بیس بیس اشرفیاں بھی عنایت کیں۔

---

[9] کتاب الروضتین: 2/49_52، الکامل فی التاریخ: 7/198، البدایہ والنہایہ: تحت 564ھ

فصل:3

مصر کا انقلاب

وسط ربیع الاول میں دمشق سے چل کر یہ لشکر سات جمادی الاخری 564ھ کو قاہرہ پہنچا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر ایلمرک اپنے بزدل سپاہیوں سمیت پہلے ہی رفوچکر ہو چکا تھا۔

عبیدی سربراہ عاضد نے شیرکوہ کی آمد پر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور اسے خلعتِ خاصہ سے نوازا۔ مصر کے باشندوں نے بھی شیرکوہ اور شامی لشکر کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔

جہاں تک شاور کا تعلق ہے اسے یہ تو اطمینان ہوا کہ وہ ایلمرک کو ناقابل برداشت تاوان دینے سے بچ گیا ہے تاہم عوام وخواص کا شیرکوہ کی طرف میلان اسے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ وہ بظاہر شیرکوہ سے اچھی طرح ملتا رہا مگر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ وہ وعدے کے مطابق سلطان نورالدین کو مصر کے تہائی علاقوں کی حکومت اور طے شدہ رقم دینے پر بھی تیار نہ تھا مگر اس میں شامیوں سے لڑنے کی طاقت نہیں تھی اسی لیے وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا تھا جو ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' کا مصداق ہو۔

شاور کی سازش اور کامل کی دینی حمیت آخر اس نے ایک ترکیب سوچ لی...... اس نے شیرکوہ اور اس کے خاص ساتھیوں کو ضیافت پر مدعو کر کے اچانک گرفتار کرنے کا منصوبہ بنالیا...... اس کا خیال یہ تھا کہ وہ اتنے بڑے مسلم جرنیلوں کو نصرانیوں کے حوالے کر کے ان کو تاوان ادا کرنے سے بچ جائے گا یا انہیں یرغمال بنا کر دوسرے سیاسی فوائد حاصل کرتا رہے گا۔ شاید شاور کا یہ ناپاک منصوبہ کامیاب ہو جاتا مگر اس کے نوجوان بیٹے کامل کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے اپنے باپ کو سختی کے ساتھ اس فعلِ بد سے منع کیا اور کہا:

''اگر آپ ایسا کرنے سے باز نہ آئے تو میں پہلے ہی شیرکوہ کو سب کچھ بتادوں گا۔''

شاور نے کہا:

"اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو شیرکوہ کے ہاتھوں ہم سب مارے جائیں گے۔"

کامل نے جذبات سے بھرپور انداز میں کہا:

"آپ سچ کہتے ہیں مگر اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے قتل کر دیے جانے سے یہاں کے مسلمان مسلمان رہیں اور یہ ملک مسلمانوں کا رہے تو مجھے یہ سودا منظور ہے مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمیں قتل کر کے فرنگی یہاں کے مالک بن جائیں۔ ابا جان! یاد رکھیے اگر آپ نے شیرکوہ کو گرفتار کر لیا تو پھر اس ملک کو نصرانیوں کے قبضے میں جاتے ہوئے ذرا بھی دیر نہیں لگے گی اور اس کے بعد اگر خلیفہ عاضد خود بھی پاپیادہ سلطان نورالدین کے پاس جا کر مدد مانگے گا تو سلطان ایک سپاہی بھی نہیں بھیجے گا اور عیسائی اس پورے ملک پر قبضہ کر لیں گے۔"

کامل کی اس حقیقت کشا تقریر کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ شاور اس منحوس ارادے سے باز آ گیا۔[1]

شاور کا انجام: ادھر شیرکوہ اور اس کے رفقاء پر شاور کی بدنیتی ظاہر ہو چکی تھی۔ شاور عبیدی حکومت کی طرف سے طے شدہ تہائی آمدن کا خراج ادا کرنے کے بارے میں بھی ٹال مٹول کر رہا تھا۔ تاہم شیرکوہ درگزر کرتا رہا جبکہ صلاح الدین یوسف، عزالدین اور دیگر سردار اس کے خلاف سخت کارروائی کے حق میں تھے۔ وہ اپنے جذبات سے شیرکوہ کو آگاہ کر چکے تھے مگر اس نے کسی کارروائی سے منع کر دیا تھا۔

ایک دن صلاح الدین یوسف اور یہ ترکمان سردار اپنی لشکر گاہ میں تھے کہ شاور شیرکوہ سے ملنے آیا۔ یہ اس کی عام عادت تھی کہ وہ موقع بموقع شامیوں کی لشکر گاہ میں آتا رہتا تھا اور شیرکوہ سے مختلف موضوعات پر بات چیت کیا کرتا تھا۔ اس دن وہ آیا تو شیرکوہ لشکر گاہ میں موجود نہ تھا۔ وہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے مزار کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ صلاح الدین اور دیگر شامی امراء نے شاور کا اعزاز و اکرام کیا اور اسے شیرکوہ کے مزارِ شافعی پر جانے کی اطلاع دی۔ وہ بولا:

"ہم بھی وہیں چلے چلتے ہیں۔"

صلاح الدین، عزالدین جوردیک اور ان کے چند ساتھی شاور کے ساتھ مزارِ امام شافعی کی طرف چل پڑے۔ شاور کا حفاظتی دستہ حسبِ معمول اس کے ساتھ تھا، اس لیے اسے کوئی خطرہ نہ تھا مگر صلاح الدین اور دیگر شامی امراء راستے میں ایک دوسرے کو اشارہ کر چکے تھے کہ شاور کو پکڑنے کا یہی وقت ہے۔

ایک کھلی جگہ سے گزرتے ہوئے صلاح الدین اور عزالدین جوردیک نے جو گفتگو کرتے ہوئے شاور کے دائیں بائیں چل رہے تھے اسے گھڑدوڑ کی پیش کش کی۔ شاور نے اسے تفریح کے طور پر قبول

[1] الکامل فی التاریخ: 7/198_199

کرلیا۔ تینوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور باقی لوگوں سے بہت آگے نکل گئے۔ اب شاور تنہا تھا۔ صلاح الدین اور عزالدین نے اسے یکدم پکڑ کر زمین پر گرادیا...... یہ منظر دیکھ کر شاور کے تمام محافظ جو کچھ فاصلے پر تھے بھاگ گئے۔ شاور کو گرفتار کر کے شیرکوہ کو اس کارروائی کی خبر دی گئی۔

اس دوران عاضد کو بھی یہ اطلاع مل گئی۔ وہ شاور کی دست درازیوں سے پہلے ہی نالاں تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور پے در پے کئی قاصد بھیج کر شیرکوہ پر زور دیا کہ شاور کا سر کاٹ کر اسے پیش کر دیا جائے۔ اب شیرکوہ کو کیا تامل ہوسکتا تھا۔ اس نے شاور کو قتل کرا کے اس کا سر عاضد کے پاس بھجوا دیا۔ یہ واقعہ 17 جمادی الثانیہ 564ھ (19 مارچ 1169ء) کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاور کی گردن کاٹنے کا کام عزالدین جوردیک نے انجام دیا تھا۔ [۵]

شاور کے قتل سے عاضد کو ایک ایسے شخص سے نجات مل گئی تھی جو ماتحت ہو کر بھی اس پر حکومت کر رہا تھا۔ عوام نے بھی خوشی منائی کیونکہ وہ نہ صرف شاور کے واسطے سے نصرانیوں کو ناقابل برداشت ٹیکسوں کی ادائیگی سے تنگ تھے بلکہ شاور کے ہاتھوں فسطاط کی آتش زدگی سے بھی بے حد برہم تھے۔ شیرکوہ واقعی ان کا نجات دہندہ ثابت ہوا تھا۔

شیرکوہ...... چند دن کا وزیر: شیرکوہ عاضد سے ملنے قاہرہ میں داخل ہوا تو اس کا شاندار استقبال ہوا۔ عاضد نے اسے نہ صرف خلعتِ فاخرہ دی بلکہ شاور کی جگہ وزارتِ مصر کا عہدہ بھی سونپ دیا اور ''الملک المنصور'' کے لقب سے نوازا۔ شیرکوہ محل سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں عبیدی سربراہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پروانہ حکومت تھا۔ اس کی رہائش قصرِ وزارت میں طے کر دی گئی جہاں پہلے شاور رہتا تھا۔ شیرکوہ کا رخ اسی طرف تھا۔ اچانک اسے سڑک پر عوام کا بے پناہ ہجوم نظر آیا۔ یہ لوگ شاور کے محل کی طرف دوڑتے جارہے تھے۔ عاضد نے شاور کے خلاف عوام کے غم و غصے کی نکاسی کے لیے یہ اجازت دے دی تھی کہ شاور کا محل جو چاہے لوٹ لے۔ منادی کی یہ پکار سنتے ہی لوگوں کا انبوہ قصرِ وزارت پر ٹوٹ پڑا تھا۔ شیرکوہ جب ہجوم سے بچتے بچاتے قصر وزارت میں پہنچا تو وہاں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ محل کا تمام ساز و سامان عوام تھوڑی دیر میں لوٹ کر لے گئے تھے۔ کوئی قالین، دری یا کرسی تک باقی نہیں رہی تھی کہ شیرکوہ اس پر بیٹھ سکتا۔

اس وقت اسے شاور کے بیٹے کامل کا خیال آیا۔ اسے اپنے ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ایک بار اس نوجوان نے اپنے باپ کو اس کے خلاف خفیہ کارروائی سے روکا تھا۔ شیرکوہ نے اپنے اس محسن کے

۵ ابن خلدون: 5/278، الکامل فی التاریخ: 7/190، کتاب الروضتین: 2/57، 58

بارے میں تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ آخری بار اسے اپنے بھائیوں کے ساتھ اسی محل میں لوگوں کے ہجوم سے پناہ لیتے ہوئے دیکھا گیا تھا، اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ غالباً وہ بلوے میں مارا گیا تھا۔ شیرکوہ بار بار کفِ افسوس مل کر کہتا تھا:

''کاش وہ بچ جاتا...... آج میں اس قابل تھا کہ اسے اس کے احسان کا صلہ دیتا۔''[۸]

اب شیرکوہ مصر کے وزیرِ اعظم کے روپ میں عملاً ایک بڑی سلطنت کا حاکم بن چکا تھا۔ یہ اس کے اقتدار کا آغاز تھا جو خود مختاری میں بھی بدل سکتا تھا۔ مگر عین اس وقت جبکہ اس کی مہارت، سیاست، مقبولیت اور شہرت کا زمانہ عروج پر تھا، اس کا وقت آن پہنچا۔ اسے مصر پر حکومت کے صرف دو ماہ پانچ دن نصیب ہوئے۔ ہفتہ 22 جمادی الثانیہ 564ھ (23 مارچ 1169ء) کو یہ نامور سپہ سالار ایک ناگہانی بیماری میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔[۹]

عزیزِ مصر، یوسف صلاح الدین رحمہ اللہ: عاضد، شیرکوہ کی موت کے بعد وزارتِ مصر اس کے کسی ساتھی کو دینے کا پابند تھا۔ ادھر شامی فوج میں کئی سردار اس کے منتظر تھے کہ یہ منصب ان کے حصے میں آئے۔ ان میں صلاح الدین کا ماموں شہاب الدین محمود الحارمی، سیف الدین مشطوب الہکاری، قطب الدین اور عین الدولہ پیش پیش تھے مگر عاضد نے ان میں سے کسی کو پسند نہ کیا کیوں کہ ذاتی طور پر وہ صلاح الدین یوسف کی قابلیت اور سمجھ بوجھ سے زیادہ متاثر تھا۔ اس کے علاوہ اس کے درباریوں نے بھی اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا:

''اگر آپ یوسف کو وزیر بنا دیں تو وہ ہمارا ہر لحاظ سے فرماں بردار ہوگا۔ کیوں کہ شامی امراء میں سے وہ سب سے کم عمر ہے۔ بعد میں ہم شام کے دیگر امراء کو حکومتِ مصر میں ان کی افواج سمیت شامل کر کے اپنی حالت مضبوط کر سکتے ہیں۔ پھر اُس وقت ہم چاہیں تو یوسف کو وزارت سے بلا تردد معزول کیا جا سکتا ہے۔''

اس مشورے کے بعد عاضد نے یوسف کو اپنے محل میں طلب کیا اور خلعتِ وزارت سے نوازا۔ سرکاری طور پر نئے وزیرِ اعظم کے لیے ''الملک الناصر'' کے لقب کا اعلان کیا گیا۔[۱۰]

ایک 33 سالہ وجیہ و حسین جوان کا مصر میں وزارتِ عظمیٰ کا منصب پانا ایک ایسا حیران کن واقعہ تھا جس کا کچھ دنوں پہلے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ خود صلاح الدین کو اس کا کوئی اندازہ نہ تھا اور نہ وہ مصر

۸ الکامل فی التاریخ: 199/7، 200؛ ابن خلدون: 279/5
۹ ابن خلدون: 279/5؛ الکامل فی التاریخ: 200/7؛ کتاب الروضتین: 68/2
۱۰ الکامل فی التاریخ: 201/7؛ ابن خلدون: 279/5

آنے کے لیے اتنا کبیدہ خاطر نہ ہوتا۔ یوسف کا یوں مصر کا حکمران بن جانا ہمیں ہزاروں برس قبل فرعونوں کے دور میں لے جاتا ہے جب شام سے ایک قافلہ مصر پہنچا تھا جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے لخت جگر یوسف علیہ السلام کو غلام بنا کر لایا گیا تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعلیم وتربیت کی اور پھر نبوت عطا فرمائی۔ مختلف آزمائشوں کی بھٹی سے گزار کر انہیں کندن بنایا اور سخت رکاوٹوں کے باوجود مصر کی وزارت عظمیٰ تک اس شان سے پہنچایا کہ مصر کا بادشاہ صرف برائے نام امور کا مختار تھا، سارا انتظام حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ اس سے ملتی جلتی داستان ایک بار پھر وجود میں آگئی تھی۔ یوسف ایک ماتحت کی حیثیت سے مصر آیا تھا، یہاں کی کٹھن مہمات نے اس کی تربیت کی تھی پھر تمام تر ناموافق حالات کے باوجود یہ نوجوان مصر کی وزارت عظمیٰ کے عہدے پر اس طرح فائز ہوا کہ بادشاہ سے زیادہ اختیارات اس کے پاس تھے..... عوام سے براہ راست رابطہ رکھنے والا وہی تھا۔

<u>فقیہ عیسیٰ کی کامیاب حکمت عملی</u>: صلاح الدین کے لیے نئے وزیر اعظم کی حیثیت سے ابتدائی چند دن بڑے نازک تھے۔ شامی امراء میں سے ہر ایک خود اس منصب کا امیدوار تھا۔ کوئی ایک بھی اپنے اس کم عمر ساتھی کا ماتحت بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ یوسف کو اتنے بلند منصب پر فائز دیکھ کر وہ حسد میں جلا ہو گئے تھے۔ ان ناراض امراء میں سیف الدین مشطوب، قطب الدین ابن تلیل، صلاح الدین کا ماموں شہاب الدین حارمی اور عین الدولہ پیش پیش تھے۔

اس موقع پر صلاح الدین کے مخلص ایک کرد بزرگ ضیاء الدین عیسیٰ الہکاری رحمہ اللہ نے شامی امراء کو منانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بہت بڑے فقیہ، سپاہی اور سیاست دان تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے ہم قوم امیر مشطوب الہکاری سے علیحدگی میں ملاقات کر کے اسے کہا:

''تم خواہ مخواہ صلاح الدین کے مقابلے میں وزارت کے دعوے دار مت بنو۔ کیوں کہ جب تک عین الدولہ، ابن تلیل اور شہاب الدین حارمی جیسے مضبوط امیدوار میدان میں ہیں تمہیں اس معاملے میں کسی کی حمایت نہیں ملے گی۔''

امیر مشطوب یہ سن کر وزارت کی تمنا سے باز آگیا اور صلاح الدین کی وزارت قبول کر لی۔

اس کے بعد فقیہ نے صلاح الدین کے ماموں شہاب الدین حارمی کو سمجھایا اور کہا:

''یوسف تمہارا بھانجا ہے، اس کی عزت تمہاری عزت ہے، اس کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ تم اسے گرانے میں پہل مت کرو۔''

اسے منا کر فقیہ الہکاری نے قطب الدین ابن تلیل کو جا پکڑا اور اسے کہا:

''عین الدولہ اور تمہارے سوا باقی سب نے صلاح الدین کی سیادت قبول کر لی ہے حالات کا تقاضا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ مل جاؤ کہ وہ کرد ہے۔ اس طرح حکومت ترکوں کے پاس نہیں جائے گی۔''

اس طرح فقیہ الہکاری نے تمام امراء کو الگ الگ انداز سے سمجھا کر قائل کر لیا۔ ان کے دلائل سے سب ہی مان گئے سوائے عین الدولہ کے۔ اس نے بھنا کر کہا:

''میں یوسف کا خادم نہیں بن سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ شام روانہ ہو گیا۔ [1]

یوسف نے خود کو اپنے منصب کا صحیح حق دار ثابت کیا، ابتداء میں عوام کو اپنے سے مانوس رکھنے کی پالیسی اپنا کر کھلے دل سے ان پر مال و دولت خرچ کیا، ان کی شکایات کی دادرسی کی، خواص کو انعام واکرام اور عزت و احترام کے ساتھ اپنا ہمنوا بنایا۔ اگرچہ مصر میں دو سو سال تک دولتِ بنو عبید کے اثرات نے عوام میں شیعیت کے رجحانات پیدا کر دیے تھے مگر اس کے باوجود ایوان حکومت اور سرکاری عمال کے دائرے سے باہر عام معاشرے میں نہ صرف یہ کہ اہل سنت سے بغض وعناد ایک حد کے اندر اندر تھا بلکہ نسلی سنی مسلمان اب بھی مصر کی آبادی کا غالب حصہ تھے جو صرف سرکاری سرپرستی کے ماتحت شیعی اثرات سے متاثر تھے۔ صلاح الدین نے نہایت سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی تفریق کے بغیر ہر طبقے اور نظریے کے لوگوں سے فراخدلانہ سلوک کیا جس سے سب کو نئے وزیر اعظم کی وسعت ظرفی کا یقین ہو گیا اور عوام میں اس کی حمایت بڑھنے لگی۔

<u>نجم الدین ایوب کی مصر آمد</u>: اب صلاح الدین نے اپنے والد بھائیوں اور اہل خانہ کو مصر بلانے کی ضرورت محسوس کی، کیوں کہ یہاں اتنے بڑے ملک کا نظام چلانے کے لیے اپنے خاندان کے ایسے افراد کے بغیر چارہ کار نہ تھا جن پر ہر وقت اعتماد کیا جا سکے۔ اسے اپنے بزرگوں کے مشوروں کی ضرورت بھی تھی۔

صلاح الدین کی جانب سے یہ بلاوا شام پہنچا تو نجم الدین ایوب نے سلطان نورالدین سے اجازت طلب کی۔ سلطان نے بادل نخواستہ اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ وہ مصر جا کر بھی حکومت شام کے وفادار رہیں گے اور ہر مرحلے پر مدد کے لیے مستعد ہوں گے۔ سلطان نے نجم الدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ مصر پہنچ کر وہاں خلفائے بنو عبید کی جگہ خلفائے بنو عباس کے نام کا خطبہ شروع کرائیں۔ اصل میں یہ

[1] الکامل فی التاریخ: 7/202، کتاب الروضتین: 2/71

خواہش خلیفۂ بغداد کی تھی جس نے نورالدین سے یہ مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ عالم اسلام کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے مصر میں بھی عباسی خلافت کا خطبہ رائج کیا جائے۔ نورالدین زنگی نے صلاح الدین ایوبی کو مراسلے میں اس کی تاکید کردی تھی مگر صلاح الدین کو اتنے بڑے اقدام کے لیے شاید کسی مناسب وقت کا انتظار تھا اس لیے اب تک مصر میں عبیدیوں ہی کے نام کا خطبہ پڑھا جارہا تھا۔

اس موقع پر سلطان نورالدین کی دوراندیشی، حسنِ انتظام اور صلاح الدین ایوبی کے لیے خیر خواہی کی ایک عجیب مثال سامنے آئی جسے المقدسی رحمہ اللہ نے کتاب الروضتین میں ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''صلاح الدین کے پاس جانے والوں میں ان کا بڑا بھائی شمس الدولہ توران شاہ بھی شامل تھا۔ سلطان نورالدین نے اسے کہا: 'اگر تم یہ سوچ کر مصر جارہے ہو کہ وہاں تمھیں وہی یوسف ملے گا جو تمھارے سامنے ادب سے کھڑا ہوتا تھا اور تم بیٹھے ہوتے تھے، تو ایسی سوچ کے ساتھ وہاں مت جاؤ ورنہ تم وہاں نظام مملکت خراب کردو گے اور تب میں تمھیں بلاکر قرار واقعی سزا دوں گا۔ ہاں اگر تم اسے میرا قائم مقام تصور کرتے ہوئے اس کی ویسے ہی خدمت کرو جیسی میری کرتے ہو تو جاؤ، اس کی کمر مضبوط کرو اور اسکے مقاصد میں اس کے ہاتھ مضبوط کرو۔' یہ سن کر توران شاہ نے عرض کیا: 'میں اس کی ایسی خدمت اور اطاعت کروں گا کہ انشاء اللہ اس کا چرچا آپ تک پہنچے گا۔' توران شاہ نے جو کہا وہ کرکے دکھایا۔''[1]

سلطان نورالدین کو نجم الدین ایوب کی حفاظت کی اتنی فکر تھی کہ وہ خود سرحد تک ساتھ چلنے کے لیے آمادہ تھے۔ اس دوران نجم الدین ایوب کے مصر جانے کی خبر سن کر شام کے کئی رؤساء اور تجار جو اس کے گرویدہ تھے، ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔ سلطان نورالدین کو مزید اندیشہ ہوا کہ کہیں اتنے اہم افراد پر مشتمل اس قافلے کو راستے میں فرنگی یرغمال نہ بنالیں، اس سلسلے میں سب سے زیادہ اندیشہ ''کرک'' کے بدفطرت عیسائی حاکم ریجی نالڈ سے تھا جس کا علاقہ شام سے مصر کے راستے پر تھا چنانچہ نورالدین نے آگے بڑھ کر ''کرک'' کا محاصرہ کرلیا اور نجم الدین اپنے قافلے کے ساتھ سلامتی کے ساتھ مصر کی طرف نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نورالدین نے محاصرہ اٹھالیا۔

نجم الدین ایوب 27 رجب 564ھ (27 اپریل 1169ء) کو اپنے خاندان کے ساتھ قاہرہ پہنچا، صلاح الدین یوسف نے اپنے امراء اور حشم وخدام کے ساتھ شہر سے باہر آکر باپ کا تاریخی استقبال کیا۔ صدیوں پہلے حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی طرح مصر سے باہر آکر اپنے باپ اور بھائیوں کا

[1] کتاب الروضتین: 72/2

استقبال کیا تھا۔ تاریخ اس دن پھر خود کو دہرا رہی تھی۔ سلطان ایوبی کے سوانح نگار قاضی ابن شداد نے بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اپنے والد کو مصر مدعو کرنے سے صلاح الدین کا مقصد یہ تھا کہ ان کی مسرت دوبالا ہو جائے اور یوسف علیہ السلام کے قصے سے ان کی مشابہت پوری ہو جائے۔ نجم الدین عبیدیوں کے دارالحکومت میں اس سج دھج سے داخل ہوا کہ اس کا بیٹا صلاح الدین اور امرائے مصر اس کے دائیں بائیں پاپیادہ چلے جا رہے تھے۔

عاضد کو صلاح الدین کے باپ کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھی خلافِ دستور استقبال کے لیے باب الفتوح سے باہر نکل کر شجرۃ الاھلیج تک چلا آیا۔ نجم الدین کو الملک الافضل کا لقب دیا اور بہت سے تحائف سے نوازا۔ ایوب نے اپنے بیٹے کو سلطان زنگی کی طرف سے بھیجے گئے عمدہ تحائف کے ساتھ ایک خط بھی دیا جس میں زنگی نے لکھا تھا:

''مصر میں خلیفۂ بغداد کا خطبہ شروع کرانا ایسا کام ہے جس میں جلدی کرنا ضروری ہے تاکہ ہم اس عظیم فضیلت اور بڑی سعادت کو موت آنے اور موقع نکل جانے سے پہلے حاصل کر لیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ خلیفۃ المسلمین خود بھی ان حالات سے مطلع ہیں اور یہ ان کی اہم ترین خواہش ہے۔''[1]

اس موقع پر صلاح الدین نے باپ سے کہا:

''اب یہ حکومت یہ سب کچھ آپ کا ہے، ہم آپ کے ماتحت ہیں۔''

بیٹے کی اس سعادت مندی پر نجم الدین ایوب کے دل سے دعائیں نکلیں۔ اس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا:

''پیارے بیٹے! اللہ نے تمہیں اس منصب کے لائق سمجھ کر ہی یہ اعزاز بخشا ہے۔ یہ سب کچھ تمہیں مبارک ہو۔''[2]

تاہم صلاح الدین نے مصر کے خزانے کا نظام اپنے والد ہی کے سپرد کیا اور اس بارے میں پھر کبھی پوچھ گچھ نہیں کی۔[3]

مصر میں اب سب صلاح الدین کی وزارت تسلیم کر چکے تھے۔ میدان ہر طرح صاف تھا۔ یہاں سے صلاح الدین کی زندگی ایک نیا موڑ لیتی نظر آتی ہے۔ کردستان کے ایک شمشیر زن کو دنیا حکمران کے روپ میں دیکھتی ہے...... مگر یہ تبدیلی صرف عہدے، لقب، کرسی اور ذمہ داریوں ہی میں نہیں تھی......

---

[1] کتاب الروضتین: 152/2، النوادر السلطانیہ، ص 85
[2] النجوم الزاہرۃ: 6/7
[3] النجوم الزاہرۃ: 6/7، الکامل فی التاریخ: 7/208

صلاح الدین یوسف کی پوری زندگی یکسر ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی......وہ سانچا جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت اور اپنے عمل سے تیار کیا تھا اور امت کے ہر حاکم کے لیے اسے بطور نمونہ پیش کیا......صلاح الدین نے اس کی پیروی کو اپنا سب سے پہلا فرض قرار دے دیا۔اس تبدیلی نے صلاح الدین کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ مسلمان اپنے اس رہنما کو"سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

اس سچی تاریخی داستان کی آئندہ سطور میں ہم بھی سلطان کو اسی ادب واحترام کے ساتھ یاد کریں گے جس کا سلطان نے اپنی آئندہ زندگی کے ہر ہر قدم پر خود کو حق دار ثابت کیا ہے۔

فصل:4

نیا حکمران، نئے انداز و اطوار

صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ اب عملی لحاظ سے مصر کے خود مختار حکمران تھے جو رقبے، آبادی اور دولت وثروت کے لحاظ سے عالم اسلام کے چند بڑے ممالک میں سے ایک تھا۔ یہاں عظیم دریائے نیل تھا جس کی وادی زرخیزی میں بے مثال تھی۔ ملک کی دو اہم ترین بندرگاہیں اسکندریہ اور دمیاط ہر وقت تجارتی جہازوں سے آباد رہتی تھیں۔ مصر کے علامتی حکمران بنوعبید کے خزانے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ شہر آبادی سے بھرپور تھے۔ اتنی بڑی مملکت کا نظام اور خزانہ ہاتھ میں آجانے کے بعد صلاح الدین ایوبی کے لیے دنیا میں میسر ہر راحت وآرام، عیش وعشرت اور لذت کوشی کے اسباب جمع کر لینا آسان تر تھا۔ وہ راگ رنگ، رقص وسرود اور ناؤنوش میں منہمک ہوکر فکرِ دین ودنیا سے آزاد رہ سکتے تھے۔ ان کے لیے مصر کا وہ حسن قدم قدم پر چشم براہ تھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے حسن پرستوں نے عمریں گزار دیں۔ وہ مال ودولت کے اتنے انبار کسی روک ٹوک کے بغیر سمیٹ سکتے تھے جو ان کی سات پشتوں کے لیے کافی ہوتے۔ ان کے ایک اشارے پر دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں پر نچھاور ہوسکتی تھی۔

صلاح الدین یوسف کے رجحانات میں حیران کن تبدیلی: مگر حیرت انگیز طور پر جوں ہی وہ مصر کی حکومت کے مالک بنے ان کی طبیعت میں دنیا سے زہد اور بے رغبتی کا رجحان پیدا ہوگیا۔ بلاشک وشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی اس خاص مشیت کا کرشمہ تھا جس نے اس بندے کے نصیب میں اسلام کی ایک بے مثال خدمت لکھ دی تھی ورنہ اس سے پہلے نجم الدین ایوب کا یہ ہونہار بیٹا نیک اور شریف ہونے کے باوجود ایسا عابد وزاہد نہ تھا۔ آزاد منش سپاہیوں کی سی بعض بے اعتدالیاں ان سے سرزد ہوتی رہتی تھیں مگر حکومت سنبھالتے ہی ان کے رجحانات یکدم تبدیل ہوگئے۔ ان کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی...... ان کے سوانح نگار قاضی بہاؤالدین شداد تحریر کرتے ہیں:

''حکومت مصر کی زمام ہاتھ میں لینے کے بعد ان کی نگاہ میں دنیا ہیچ ہوگئی۔ تشکر کے جذبات نے

ان کے دل میں تلاطم پیدا کیا۔ انہوں نے ناؤنوش سے توبہ کی، عیش وآرام اور تفریحات سے منہ پھیر لیا، ایک سنجیدہ اور سخت کوش زندگی اپنالی، جس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔''[1]

صلاح الدین ایوبی کی زندگی کی یہ تبدیلی بلاشبہ ایک حیران کن چیز تھی۔ حکومت اپنے ساتھ عیش وعشرت کے جو اسباب لاتی ہے ان کی کشش سے اچھے اچھوں کا پیمانہ ضبط چھلک اٹھتا ہے۔ دیکھا یہی جاتا ہے کہ بڑے بڑے پرہیزگار حکومت کے کوچے میں پہنچ کر بہک جاتے ہیں اور پھر تخت فرمانروائی پر براجمان ہونے کے بعد تو حالت ہی کچھ اور ہوجاتی ہے، انسان اپنی اوقات بھول کر خدائی پر اتر آتا ہے، اس کا ہر ہر لمحہ تکبر اور نفس پرستی میں گزرتا ہے۔ اس لحاظ سے صلاح الدین ایوبی کی طبیعت کا یہ انقلاب تاریخ کے نوادر واقعات میں سے ہے۔ اس سے پہلے ایسی مثال ہمیں قرن اول میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی میں نظر آتی ہے جو خلیفہ بننے سے پہلے نہایت ناز ونعمت میں پل رہے تھے مگر خلیفہ بنتے ہی انہوں نے فقر وفاقہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

ذہنی انقلاب کا سبب، احساس ذمہ داری ﷫ صلاح الدین ایوبی میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟ اس کی اصل وجہ تو مشیتِ خداوندی تھی جسے پورا ہونا تھا۔ مگر ظاہری اسباب میں اس کی بڑی وجہ وہ سوچ اور فکر تھی جو مسندِ حکومت پر بیٹھ کر ان کے قلب وذہن پر حاوی ہوگئی۔ انہیں اس طرح غیر متوقع طور پر حکومت ملی تھی کہ انہیں وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ وہ جو کہ طبعی شرافت اور مروت کے جواہر سے آراستہ تھے، اس نعمت غیر مترقبہ پر شکر کے جذبات سے سرشار ہوگئے۔ وہ سوچنے لگے کہ اتنی بڑی نعمت کا شکر کیسے ادا کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں حضور نبی اکرم ﷺ کی پاک سیرت، خلفائے راشدین کے حالات اور سلف صالحین کی زندگیاں ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھیں۔

اسلام کے اس فرزند نے محسوس کیا کہ ان کی کامیابی انہی کامیاب لوگوں کی مکمل پیروی میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت کسی خاص مقصد کے تحت انہیں عطا کی ہے اور اس اہم مقصد کے حصول کے لیے غیر معمولی ایثار وقربانی اور مجاہدے کی ضرورت ہوگی۔ وہ جان گئے کہ سپاہیوں جیسی خودسری اور افسروں جیسی بے لگامی وعیش پسندی کا کسی عظیم مقصد کے لیے جینے سے کوئی میل نہیں۔

وہ شروع ہی سے ایک دلیر اور غیرت مند انسان تھے، القدس پر صلیبیوں کے تسلط، شام کے ساحلوں پر ان کے قبضے، اسلامی شہروں میں ان کی غارت گری اور مصر سمیت متعدد اسلامی ممالک کی سیاست میں

---

[1] النوادر السلطانیۃ والمحاسن الیوسفیۃ: 81، کتاب الروضتین: 69/2

ان کے نل دخل سے وہ یقیناً پہلے بھی متاثر تھے اور اس صورتحال کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔
اپنے لڑکپن میں دمشق پر صلیبیوں کے حملے کا انہوں نے بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا اور پھر مصر کی مہمات میں ان کی بے رحمی، مکاری اور مسلمانوں سے ان کے کھلے بغض وعناد کو وہ عملاً پرکھ چکے تھے۔ ایسے میں وہ مسلم حکمرانوں کی بے عقلی وبے جہتی پر اکثر کڑھا کرتے تھے۔ خصوصاً مصر کے حکمران طبقے کی فریب کاری نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی باحمیت مسلمان مصر کا کاروبارِ حکومت سنبھالے جو کہ صلیبیوں پر کاری ضرب لگانے میں حکومتِ شام کا مخلص معاون ثابت ہو۔

اب جبکہ قدرتِ خداوندی نے یہ منصب انہی کو عطا کر دیا تھا وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ امتِ مسلمہ ان سے بڑی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہے۔ پھر جب انہوں نے ان امیدوں پر پورا اترنے کا فیصلہ کر لیا تو انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کوئی خاص کام لینے کا ارادہ کر چکا ہے۔ وہ کتنی ناگواری کے ساتھ یہاں آئے تھے مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تختِ حکمرانی تیار کر رکھا تھا۔
برسوں بعد اسلام کے اس عظیم فاتح نے اپنے ساتھیوں کو اپنے مصر آنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا:

"جب میرے چچا شیرکوہ نے مجھے کہا کہ مصر چلنے کی تیاری کرو تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل میں ایک خنجر اتار دیا گیا ہے۔"[۵]

اسی طرح اُنہوں نے قاضی بہاؤالدین شداد سے کہا:

"میرا مصر آنا قطعاً میری رضامندی سے نہیں ہوا۔ بلکہ ایسا ہے جیسے قرآن مجید میں یوں کہا گیا ہے:

﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

"ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔"[۶]

ایسی حالت میں مصر آنے کے بعد یہاں حکومت مل جانے کو خدا تعالیٰ کی جانب سے کسی خاص مقصد کی تکمیل کا پیش خیمہ خیال کرنا بالکل درست تھا۔ وہ مقصد کیا تھا؟ صلاح الدین ایوبی پر جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی، انہوں نے اس مقصد کو پہچان لیا۔ یہ کام تھا "القدس اور دیگر اسلامی علاقوں کو نصرانیوں کے ناجائز تسلط سے آزاد کرانا"

ایک بار صلاح الدین ایوبی ﷫ نے خود کہا:

---

۵ کتاب الروضتین: 52/2
۶ وفیات الاعیان، سورۃ البقرۃ، آیت نمبر: 216، النوادر السلطانیۃ: 81، کتاب الروضتین: 51/2

"جب اللہ تعالیٰ نے مجھے مصر کی حکومت عطا کی تو میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فلسطین بھی مجھے دینے کا ارادہ کیا ہے۔"۵

یہ تھا وہ جذبہ اور وہ عزم جس کے ساتھ اسلام کے اس جانباز کی حکومت کا آغاز ہوا۔ جب جڑ عمدہ، پاکیزہ اور مضبوط ہو تو درخت بہترین پھل دیتا ہے اور کوئی آندھی اسے جھکا نہیں سکتی۔ صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کی حکومت جس کی بنیاد جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے پر رکھی گئی تھی، عالم اسلام کے لیے ایک ایسا ہی "شجرۂ طوبیٰ" ثابت ہوئی جسے بڑے بڑے طوفان اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور امت اس کے پھلوں سے صدیوں تک فیض یاب ہوتی رہی۔

---

۵ کتاب الروضتین: 2/95 [illegible]

فصل:5

اندرونی مہمات اور بیرونی جارحیت کا مقابلہ

صلاح الدین ایوبی کے اقتدار کے ساتھ ہی ان کی صلاحیتوں کی آزمائش شروع ہو گئی تھی۔ کئی کڑے امتحانات ان کے سامنے تھے۔ سب سے پہلا مسئلہ دولت عبیدیہ کے امراء کی اس مخالفت پر قابو پانا تھا جس کا لاوا اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔

صلاح الدین نے عوام کو سخاوت، دادرسی اور کشادہ روئی کے ساتھ اپنا ہم نوا بنالیا تھا مگر دولتِ عبیدیہ کی سرکاری مشینری جو شیعیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ عبیدی امراء صلاح الدین کو بحیثیت وزیر اپنا ملازم بنانا چاہتے تھے جبکہ یہاں معاملہ برعکس تھا، انتظام مکمل طور پر صلاح الدین کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی مرضی کے خلاف عاضد بھی کچھ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

خواجہ سراؤں کا فتنہ ⁂ صلاح الدین ایوبی کے خلاف بنوعبید کا یہ بغض رنگ لا کر رہا۔ انہوں نے صلاح الدین کے خلاف خفیہ طور پر سازشیں شروع کر دیں۔ دولتِ عبیدیہ میں شاہی محلات کے داروغہ کو 'مؤتمن الخلافۃ' کہا جاتا تھا، یہ منصب نہایت بااختیار اور مؤثر تھا جو عموماً سیاہ فام خواجہ سراؤں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں یہ عہدہ ایک حبشی ''جوہر'' کے پاس تھا جس کا اصل نام ''طواشی'' تھا۔ اسے مصر پر صلاح الدین کا تسلط ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس نے عبیدی امراء کے ساتھ مل کر نصرانیوں کو مصر پر چڑھائی کی دعوت دینے کا منصوبہ بنایا اور انہیں خط لکھا کہ وہ یکا یک مصر پر ٹوٹ پڑیں۔ مقصد یہ تھا کہ جب صلاح الدین اپنے ترکمان سپاہیوں کے ساتھ نصرانیوں سے مقابلے کے لیے قاہرہ چلے گا تو پیچھے سے دولتِ عبیدیہ کی فوجیں اور حبشی خدام قاہرہ میں رہ جانے والے باقی ماندہ شامیوں کو قتل کر دیں گے۔ اس کے بعد وہ عقب سے سلطان صلاح الدین کی فوج پر اس وقت حملہ آور ہوں گے جبکہ وہ نصرانیوں کے بالمقابل پہنچ چکی ہوگی اور یوں دو طرفہ حملے سے شامی فوج تباہ ہو جائے گی۔

ممکن تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جاتی مگر تقدیر صلاح الدین ایوبی کے ساتھ تھی۔ طواشی نے یہ خفیہ

پیغام ایک یہودی کے ہاتھوں لکھوایا جس نے خط کو جوتوں کے تلے میں سلوا کر ایک شخص کے حوالے کیا اور اسے شام کے نصرانیوں کے پاس روانہ کر دیا۔ یہ قاصد قاہرہ سے چل کر بلبیس کے قریب ''بئر بیضاء'' کی بستی پہنچا۔ وہاں چوکی کے ایک ذہین ترکمان سپاہی نے اس کے پاس نئے جوتے دیکھے تو ٹھٹک گیا کیوں کہ قاصد درویشانہ لباس میں تھا۔ سپاہی نے سوچا اگر یہ جوتے اس کے اپنے استعمال کے ہوتے تو انہیں بوسیدہ ہونا چاہیے تھا۔ اس نے قاصد کو حراست میں لے کر صلاح الدین کے پاس پہنچا دیا اور اپنے شبہے کی اطلاع دی۔ صلاح الدین ایوبی نے جوتوں کو پھاڑ کر دیکھا تو ان کے تلے سے فرنگیوں کے نام تحریر کردہ خط برآمد ہو گیا۔ خط نویس کا نام پوچھا گیا تو قاصد نے اس یہودی کا پتا بتایا۔ سرکاری اہلکار اس یہودی کو پکڑ لائے۔ اس کی تحریر کا خط کی تحریر سے موازنہ کیا گیا تو دونوں ایک ہی ہاتھ کی تھیں۔

یہودی نے اس سازش کے انکشاف کو مسلمانوں کے ساتھ خدا کی خاص مدد کی علامت مانتے ہوئے اسی وقت اسلام قبول کر لیا اور صلاح الدین ایوبی کو بتایا کہ اس نے یہ خط خواجہ سرا طواشی کے حکم سے لکھا ہے۔ یوں اس سازش کا سارا حال افشا ہو گیا۔ یہ 5 ذیقعدہ 564ھ (31 جولائی 1169ء) کا واقعہ ہے۔ [۸]

صلاح الدین ایوبی نے نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیا اور خط کے پکڑے جانے کے معاملے کو دبا کر خاموشی سے طواشی کی نگرانی شروع کرا دی۔ طواشی کو اس نگرانی کی بھنک پڑ گئی اور اس نے خود کو شاہی محل میں محدود کر لیا۔ کچھ عرصے بعد جب اسے کچھ اطمینان ہوا کہ اس کی نگرانی ختم کر دی گئی ہے تو ایک دن وہ شکار اور سیر و تفریح کی غرض سے قاہرہ کی نواحی بستی ''خرقانیہ'' چلا گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شامی جاسوس برابر اس کی ٹوہ میں ہیں۔ جوں ہی انہوں نے صلاح الدین ایوبی کو یہ اطلاع دی تو حکم ملا کہ اسے گرفتار کر کے سر قلم کر دیا جائے۔ خفیہ اہلکاروں کا ایک گروہ فوراً وہاں پہنچا اور بلا پس و پیش طواشی کو قتل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی صلاح الدین ایوبی نے شاہی محل کا سارا خدمت گار عملہ یکسر تبدیل کر دیا۔ حبشیوں کو محل سے نکال دیا گیا اور ایک وفادار خواجہ سرا بہاؤ الدین قراقوش کو نئے خدمتگاروں کا نگران بنا دیا گیا۔

طواشی کا قتل اس کے ہم قوم حبشیوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ صلاح الدین ایوبی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ قاہرہ کے شاہی قلعے میں دائیں بائیں دو محل تھے جو قصر شرقی اور قصر غربی کہلاتے تھے۔ ان دونوں کے بیچ میں ایک وسیع میدان تھا۔ حبشی قلعے میں گھس کر اس میدان میں جمع ہونے لگے۔ ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ شامی فوج نے انہیں کسی رعایت کے قابل نہیں سمجھا اور حملہ کر دیا۔ اس طرح قلعے کے میدان میں ایک زوردار لڑائی کا آغاز ہو گیا، دونوں

[۸] الکامل فی التاریخ: 7/202، کتاب الروضتین: 2/69 بروایۃ قاضی ابن شداد، النجوم الزاہرۃ: 6/18

طرف کے بے شمار افراد مارے گئے۔

عبیدی سربراہ عاضد جو کہ قصر شرقی میں رہتا تھا اپنے بالاخانے سے یہ ہولناک منظر دیکھ رہا تھا۔ جب لڑائی طول پکڑ گئی تو صلاح الدین ایوبی نے حریف کے نازک پہلو پر چوٹ لگانے کا فیصلہ کیا اور فوج کے ایک دستے کو بھیج کر حبشیوں کے محلے المنصوریہ کو آگ لگوادی۔ حبشیوں کو اپنی رہائش گاہوں کی آتش زدگی کی خبر ملی تو گھبراہٹ کے مارے ان کے قدم اکھڑ گئے۔ اب شامی فوج نے ان کی خوب خبر لی۔ آخر حبشیوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ صلاح الدین ایوبی نے انہیں جیزہ اور بالائی مصر کے علاقوں میں بھیج دیا۔ اس طرح وقتی طور پر یہ فتنہ دب گیا۔ بعد میں کسی موقعے پر صلاح الدین ایوبی کے بھائی توران شاہ نے ان کے خلاف فوج کشی کی اور ان کا مکمل طور پر قلع قمع کر دیا۔ [1]

دمیاط پر فرنگیوں کا حملہ: صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کو حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد نصرانیوں کی بہت بڑی یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔ حبشیوں کا فتنہ فرو ہوا تو انہیں اچانک اطلاع ملی کہ القدس کا حاکم ایلمرک سپاہیوں کی بھاری تعداد کے ساتھ دمیاط کی بندرگاہ کے سامنے پہنچ چکا ہے اور اس کی مدد کے لیے یورپ سے بھی بحری بیڑہ آ گیا ہے۔

ایلمرک کی یلغار کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ مصر کو اپنے سخت ترین حریف کے قبضے میں دیکھ کر ہراساں تھا۔ اس کے سامنے سلطان نورالدین کی افواج تھیں اور پشت پر مصر کا فاتح صلاح الدین۔ یہ صورتحال شام کی تمام عیسائی ریاستوں خصوصاً یروشلم کے لیے چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں آ جانے کے مترادف تھی۔ ایلمرک کو یہ بھی تشویش تھی کہ پہلے اس خطے کے مسلمانوں کی بحری طاقت نہ ہونے کے برابر تھی، ساحلی علاقے اور تمام بندرگاہیں نصرانیوں کے قبضے میں تھیں مگر اب اسکندریہ اور دمیاط جیسی اہم بندرگاہوں پر ایوبی کا قبضہ تھا۔ اب مسلمان کسی بھی وقت اپنے بحری بیڑے کے ذریعے شام کی عیسائی ریاستوں پر سمندر کے راستے سے حملہ آور ہو سکتے تھے اور ضرورت پڑتے ہی یورپ سے نصرانی کمک کا راستہ مسدود کر سکتے تھے۔

ایلمرک حالات کے اس منظر نامے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چند ماہ پہلے شیر کوہ کے وزیر مصر بننے پر یونان، سسلی اور اسپین کے عیسائی حکام کو خطوط لکھ کر نئے خطرات سے آگاہ کر دیا تھا اور انہیں احساس دلایا تھا کہ اگر وہ مدد کو نہ پہنچے تو ان کا مرکز بیت المقدس دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ ایلمرک نے خطوط کے علاوہ اپنے پادریوں اور راہبوں کے کئی وفود یورپ کے مختلف ملکوں

[1] الکامل فی التاریخ: 203/7، کتاب الروضتین: 130/2_133

میں بھیجے اور شاہان یورپ کو مصر پر حملے کے لیے اکسایا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے وزیر بن جانے کے بعد یہ سلسلہ اور تیز ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے حکمران القدس کی حفاظت کے نام پر ایلمرک کے ساتھ مل کر مصر پر حملے کی تیاری کرنے لگے۔ اس مقصد کے لیے مصر کی بندرگاہ دمیاط کو پہلے ہدف کے طور پر چنا گیا۔ طے پایا کہ ایلمرک اپنی افواج لے کر نہایت خاموشی سے دمیاط کے ساحل پر پہنچے گا اور وہاں یورپی بیڑے کا انتظار کرے گا۔ بیڑے کے آجانے پر دونوں فوجیں مل کر دمیاط پر حملہ کریں گی۔

صفر 565ھ (اواخر اکتوبر 1169ء) میں ایلمرک اپنی فوج کے ساتھ دمیاط کے ساحل پر پہنچ چکا تھا۔ فصیل شہر اور ساحل سمندر کے درمیان کھلی جگہ پر پڑاؤ ڈال کر وہ یورپی فوج کا انتظار کرنے لگا۔ یورپی بیڑہ جو کہ دو سو بیس جہازوں پر مشتمل تھا، موسم کی خرابی اور مخالف ہواؤں کے باعث مقررہ وقت سے تین دن بعد دمیاط پہنچا اور کھلے سمندر میں خاصی دور ٹھہر گیا کیونکہ دمیاط کی حفاظت کے لیے سمندر میں لوہے کی ایک نہایت مضبوط دیوپیکر زنجیر تنی ہوئی تھی۔ بہرحال ایلمرک نے دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے یہ تشویش ناک خبر نہایت حوصلے کے ساتھ سنی۔ دمیاط نہایت اہم بندرگاہ تھی۔ دریائے نیل اسی جگہ بحیرۂ روم میں جا گرتا ہے۔ دمیاط پر قابض فوج دریائے نیل کے راستے قاہرہ سمیت مصر کے ہر شہر تک یلغار کر سکتی تھی اس لیے اس پر فرنگیوں کا حملہ ایک غیر معمولی خطرہ تھا۔ صلاح الدین ایوبی کو اقتدار سنبھالتے صرف سات ماہ ہوئے تھے اور وہ ابھی ابھی سیاہ فام غلاموں کے فتنے سے فارغ ہوئے تھے مگر اب اس سے بڑا چیلنج ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے پورے ہوش وحواس سے کام لیا۔ سب سے پہلے عاضد کو اس خطرے سے آگاہ کر کے فوج کے نظم ونسق اور دمیاط کی مدافعت کے لیے خطیر اخراجات طلب کیے۔ عاضد نے فیاضی کا مظاہرہ کیا اور دس لاکھ اشرفیوں کی بھاری رقم خزانے سے دلوائی۔ اس کے علاوہ کپڑوں، کھانے پینے کے سامان اور دیگر اجناس کا الگ انتظام کیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ اتنی بڑی دولت اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی مگر انہوں نے نہایت ایمان داری کے ساتھ اس رقم کو فوج کے انتظامات پر خرچ کیا۔ وہ عاضد کی سخاوت کے بھی معترف رہے۔ سیاسی رقابت اور مذہبی اختلاف کے باوجود مدتوں بعد کسی موقع پر انہوں نے عبیدیوں کے اس آخری حکمران کے بارے میں کہا:

"میں نے عاضد سے بڑھ کر کوئی سخی آدمی نہیں دیکھا۔"

صلاح الدین ایوبی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ قاہرہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے جہاں عبیدی امراء سمیت کئی سیاسی مخالفین ان کے اقتدار کے خلاف اب بھی اندرون خانہ سازشوں میں

معروف تھے۔ اگر صلاح الدین ایوبی قاہرہ کے حالات سے مطمئن ہوتے تو اس وقت تک اپنی فوج سمیت ساحل کی طرف کوچ کر چکے ہوتے کہ دمیاط میں فرنگی انہیں للکار رہے تھے مگر جانے کی صورت میں قاہرہ میں بغاوت کا خطرہ لاحق تھا۔

ان حالات میں اسلام کے اس جرنیل نے دو کام کیے، انہوں نے سب سے پہلے فوج کو اپنے ماموں شہاب الدین، اپنے بھتیجے تقی الدین اور امیر بہاء الدین قراقوش جیسے تجربہ کار سرداروں کی قیادت میں ہر قسم کے سامان رسد کے ساتھ دریائے نیل کے راستے دمیاط روانہ کر دیا۔ دمیاط کی فصیل کا ایک حصہ دریائے نیل کی جانب تھا جو اب تک نصرانیوں کے محاصرے سے محفوظ تھی۔ صلاح الدین نے ان افواج کو ہدایت کی تھی کہ شہر میں خوراک و رسد کی کمی پوری کر دیں اور مقامی فوج کے ساتھ مل کر فرنگیوں کا بھرپور مقابلہ کریں...... دوسری طرف انہوں نے اپنے سرپرست سلطان نورالدین زنگی کو بھی اس نازک صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنے خط میں لکھا:

''میں دمیاط سے بہت دور ہوں جہاں عیسائی محاصرہ کر چکے ہیں، اگر میں خود اس محاذ پر جاؤں تو مصریوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بھاری جانی و مالی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ خطرہ یہ ہے کہ وہ میرے پس پشت بغاوت کر کے اپنی پوری طاقت کے ساتھ میرا تعاقب کریں گے اور اس حالت میں جبکہ میں فرنگیوں کے مدمقابل کھڑا ہوں گا وہ عقب سے مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو مصر میں ہمارا نام و نشان مٹ جائے گا۔''[1]

<u>دمیاط کی کامیاب مدافعت</u>: سلطان نورالدین نے یہ پیغام ملتے ہی یکے بعد دیگرے کئی فوجیں مصر روانہ کر دیں تاکہ وہ فرنگیوں کے مقابل مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسری طرف اس نے خود اپنی فوج کے منتخب دستوں کے ساتھ شام کے عیسائی مقبوضات پر چھاپہ مار حملے شروع کر دیے۔ چوں کہ شام کے بیشتر عیسائی دمیاط پر حملے کے لیے جا چکے تھے اس لیے سلطان نورالدین زنگی کے ان چھاپوں سے عیسائی مقبوضات میں کھلبلی مچ گئی اور وہاں کے لوگ ایلمرک کو دمیاط کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے واپس بلانے لگے۔

ادھر دمیاط میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا نائب شمس الدین الخواص منکبرس بڑی دلیری سے شہر کی مدافعت کر رہا تھا، بعد میں اسے ان فوجوں کی کمک بھی مل گئی جو قاہرہ سے روانہ کی گئی تھیں۔ اب محصور مسلمانوں کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے بھرپور جوابی حملے شروع کر دیے۔

[1] الکامل فی التاریخ: 7/207، کتاب الروضتین: 2/140_142، صلاح الدین لین پول: ص: 53

ایلمرک کو محاصرہ کیے ہوئے دوسرا مہینہ شروع ہوگیا۔ وہ یورپی بحری بیڑے سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاسکا تھا، جواب تک ساحل سے دور لنگر انداز تھا۔ اس کے برعکس محصور مسلمانوں نے بحری بیڑے پر حملہ کر کے اس کے کئی جہازوں کو جلا ڈالا تھا۔ ایلمرک کی قیادت میں جو فوج منجنیقوں اور دبابوں کے ساتھ قلعے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کررہی تھی اس پر بھی شدید حملے ہوئے اور اسے بار بار پسپا ہونا پڑا۔ کئی منجنیقیں تباہ ہوگئیں۔

محاصرے کے چالیس دن پورے ہونے پر حملہ آور فوجیں خوراک ورسد کی کمی کا شکار ہوچکی تھیں۔ ایلمرک کے ساتھی اور بحری بیڑے پر موجود یورپی سپاہی بھی فاقے کرنے لگے تھے جبکہ دمیاط کے محصورین کو خوراک ورسد کے نئے ذخائر مل چکے تھے۔ یورپی سپاہیوں کو یقین تھا کہ ایلمرک طے شدہ معاہدہ کے مطابق ان کی خوراک ورسد کے سارے اخراجات برداشت کرے گا مگر ایلمرک اب اپنی بے بسی ظاہر کر کے خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے رہا تھا۔ اس سے یورپی افواج سخت بد دل ہوگئیں۔ ادھر ایلمرک بھی یورپی سپاہیوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا کہ کہیں وہ دمیاط پر قبضے کے بعد اس شہر کو براہِ راست روم کی بازنطینی بادشاہت کا حصہ نہ بنادیں، اس لیے کہ مصر ماضی میں رومی سلطنت کا حصہ رہا تھا اور اب بھی بازنطینی اسے اپنی جاگیر تصور کرتے تھے۔ الغرض یورپی اور شامی نصرانیوں میں روز بروز غلط فہمیاں بڑھ رہی تھیں اور وہ بد دلی کا شکار ہورہے تھے۔

جنگ کے ان دنوں میں صلاح الدین ایوبی محاذ سے سینکڑوں میل دور رہ کر بھی ہر لمحہ تازہ صورتحال سے باخبر رہتے تھے، پل پل کی خبریں انہیں ملتیں اور وہ ان کے مطابق نئے احکام جاری کرتے، دن رات میں انہیں آرام سے سونے کا کوئی وقت نہیں ملتا تھا، وہ گویا عملاً محاذ پر موجود تھے اور قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ بارگاہِ الٰہی میں بے تابانہ دعاؤں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

آخر کار قدرت خداوندی نے اس جنگ کے فیصلے کے لیے موسم کا رخ بدل دیا...... زوردار بارشیں شروع ہوئیں، طرح طرح کی موسمی بیماریوں نے کھلے آسمان تلے پڑے حملہ آوروں کی ہمت پست کردی...... ادھر دریائے نیل میں سیلاب آگیا، محاصرہ کرنے والی افواج جس میدان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں وہ پانی کی جھیل میں تبدیل ہوگیا، عیسائی افواج اپنے خیمے اور سامان کے بنڈل پانی پر تیرتے دیکھ رہی تھیں، سمندر میں زبردست طوفان اٹھ رہا تھا اور یورپ کے دو سو بیس بحری جہاز جو بڑے کروفر سے مصر پر قابض ہونے آئے تھے، یکے بعد دیگرے ڈوب رہے تھے۔ اس دوران ایلمرک کو اپنے علاقوں میں سلطان نورالدین کے حملے کی اطلاع بھی مل گئی تھی۔ اس نے مجبور ہوکر محاصرہ اٹھالیا اور

القدس روانہ ہو گیا۔

جنگ کے انجام کے بارے میں علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''فرنگی ناکام واپس شام لوٹ گئے، انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، جب وہ اپنے شہروں میں پہنچے تو انہیں (سلطان نورالدین زنگی کے ہاتھوں) ویران پایا، ان کے لوگ قتل ہو چکے تھے یا گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان پر یہ مثل صادق آئی کہ: خرجت النعامة تطلب القرنين فرجع بلا اذنين (شتر مرغ سینگوں کی تلاش میں نکلا مگر جب واپس آیا تو اس کے دونوں کان بھی غائب تھے)''[1]

21 ربیع الاول 565ھ (12 دسمبر 1169ء) کو فرنگی واپس ہوئے تھے یوں دمیاط کا محاصرہ کم وبیش پچاس دن جاری رہا تھا۔ اس دوران اس محاذ پر لڑنے والی فوج کے لیے صلاح الدین ایوبی نے بے اندازہ مال خرچ کیا۔ مجاہدین کی ثابت قدمی کے بعد جب نصرتِ خداوندی غزوۂ احزاب کی طرح موسم کی تبدیلی کی شکل میں نازل ہوئی تو کفار کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ یورپی بیڑہ جو ایملرک کا اتحادی بن کر اس جنگ میں شرکت کے لیے آیا تھا جس انجام سے دوچار ہوا تھا؟ اس کے بارے میں لین پول لکھتا ہے:

''طوفانی بارش اور آندھی سے تقریباً پورا یونانی بحری بیڑا تباہ ہو گیا اور اس ساحل پر جسے وہ فتح کرنے آیا تھا، یونانیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔''[2]

شام کا زلزلہ:۔ ربیع الاول 565ھ (دسمبر 1169ء) میں انجام کو پہنچنے والی اس لڑائی کے بعد تقریباً ایک سال تک مصر میں تلواروں کی جھنکار سنائی نہ دی۔ 12 شوال 565ھ (28 جون 1170ء) کو شام میں ایک بڑا ہولناک زلزلہ آیا جس سے شام کے اکثر شہر متاثر ہوئے۔ ہزاروں مکانات پیوند خاک ہو گئے۔ حلب، بعلبک اور حمص جیسے بڑے بڑے شہروں میں ان گنت مکانات ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ سلطان نورالدین زنگی نے انہیں دوبارہ آباد کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اپنے افسران کے ساتھ دن رات ایک کر کے تمام متاثرہ فصیلیں اور قلعے دوبارہ تعمیر کرائے کہ کہیں عیسائی اچانک حملہ کر کے ان پر قابض نہ ہو جائیں۔

ادھر عیسائی مقبوضات بھی اسی طرح زلزلے کا شکار ہوئے تھے۔ وہاں بھی زلزلہ زدگان کی بحالی کا کام جاری تھا، ایسے حال میں وہ کوئی جنگ مول نہیں لے سکتے تھے۔ سلطان نورالدین کے ڈر سے وہ اپنی فصیلوں اور قلعوں کو جلد از جلد دوبارہ تعمیر کر رہے تھے۔ تاہم مصر اس زلزلے سے محفوظ رہا تھا۔[3]

[1] الکامل فی التاریخ: 7/207، 208۔ النجوم الزاہرۃ: 6/7۔ نورالدین محمود از ڈاکٹر حسین مؤنس: ص: 325۔ صلاح الدین: 53

[2] صلاح الدین۔ لین پول: ص 55

[3] کتاب الروضتین تحت 565ھ، 569ھ

فصل:6

عیسائی ریاستوں پر جارحانہ حملوں کا آغاز اور دولتِ عبیدیہ کا خاتمہ

مصر میں اچھی طرح قدم جمانے اور عوام وخواص کا دل جیتنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نصرانیوں کے خلاف اقدامی جہاد شروع کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان کے نزدیک یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت اور قیادت سے نوازا تھا۔ ویسے بھی دمیاط پر فرنگیوں کے حملے نے عیسائی ریاستوں پر جارحانہ حملوں کا جواز پیدا کر دیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے اس موقع محل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ربیع الاول 566ھ (نومبر 1170ء) میں جہاد فی سبیل اللہ کی اس عظیم مہم کا آغاز کر دیا جس نے ان کی زندگی کو ہر آنے والے مسلم فاتح کے لیے قابل رشک بنا دیا۔

عسقلان پر حملہ ❊ صلاح الدین ایوبی کے ان حملوں کا آغاز مصر اور شام کے درمیان انتہائی اہم نقطے پر واقع شہر عسقلان سے ہوا۔ ابتدائی مرحلے کے یہ حملے کسی بڑی فوج کے ساتھ نہ تھے۔ دراصل ان میں کسی شہر پر قبضہ کرنا پیش نظر نہیں تھا بلکہ یہ تیز رفتار دستوں کے ذریعے کی جانے والی چھاپہ مار کارروائیاں تھیں جن کا مقصد دشمن کا جانی و مالی نقصان کر کے اسے مرعوب کرنا اور اس کی قوت کا اندازہ لگانا تھا۔

کڑاکے کی سردی تھی، طوفانی ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، نصرانی قلعہ دار بند کمروں میں انگیٹھیوں پر بدن تاپ رہے تھے کہ صلاح الدین ایوبی راتوں رات ان کے سروں پر آن پہنچے، انہوں نے پہلے عسقلان پر حملہ کیا اور دشمن کے سنبھلنے سے پہلے رملہ کی طرف نکل گئے۔ اس کے بعد مزاحمت کرنے والے عیسائی دستوں کو پسپا کرتے ہوئے غزہ پر دھاوا بول دیا۔ فرنگیوں کا بادشاہ اطرک جو اپنے شہروں کو بچانے کے لیے تیزی سے ادھر آ رہا تھا مجاہدینِ اسلام سے نبرد آزما ہوا مگر اسے شکست ہوئی، وہ خود گرفتار ہوتے ہوتے بچا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

فاتح لشکر اس شاندار مہم کے بعد 11 ربیع الثانی 566ھ (21 دسمبر 1170ء) کو قاہرہ واپس لوٹ آیا۔ مصر کے حکمران بننے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ صلاح الدین کو اس اطمینان کے ساتھ قاہرہ سے نکلنا نصیب ہوا کہ پیچھے کسی شرانگیزی کا خطرہ نہیں تھا۔ نصرانیوں کے خلاف صلاح الدین کی اس پہلی جارحانہ مہم پر اس دور کے مشہور رزمیہ شاعر اسامہ بن منقذ نے مبارکباد کے یہ اشعار ارسال کیے۔

لَا تَسْتَقِلَّ الَّذِیْ صَنَعْتَ فَقَدْ قُمْتَ بِالْفَرْضِ الْجِهَادِ مُجْتَهِدًا
وَمَا رَاَیْنَا غَزَا لُفَرَنْجَ مِنْ آلِ مُلُوْكٍ فِیْ عَقْرِدَارِهِمْ اَحَدًا
فَسِرْ اِلَی الشَّامِ فَاِنْ مَلَائِکَةُ الْاَبْرَارِ تَلْقَاكَ جَمْعُهُمْ مَدَدًا

"آپ نے جو کچھ کیا ہے اسے کم نہ سمجھیں کہ آپ نے تو جہاد کا فریضہ پوری جانفشانی سے انجام دیا ہے۔ ہم نے کسی حکمران کو نہیں دیکھا جس نے فرنگیوں کی سلطنت کے بیچوں بیچ جا کر جہاد کیا ہو۔ اب آپ شام کا رخ کریں کہ مقرب فرشتے اپنی فوجوں کے ساتھ آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔"[۵]

ایلہ کی فتح ❊ کچھ دنوں بعد صلاح الدین نے خلیج عقبہ کے سرے پر واقع نصرانیوں کی اہم عسکری و تجارتی بندرگاہ ایلہ پر حملہ کیا اور اس مقصد کے لیے عجیب وغریب تدبیر اپنائی۔ خلیج عقبہ پر بحری راستے سے حملہ کرنا زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتا تھا مگر مصر کو ایسا کوئی راستہ میسر نہیں تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے انجینئروں کو ایسے بحری جہاز تیار کرنے کا حکم دیا جو کئی ٹکڑوں میں ہوں اور انہیں کھولا اور جوڑا جاسکے۔ انجینئروں نے رات دن کام کر کے یہ کارنامہ انجام دے دیا۔ صلاح الدین ایوبی نے ان جہازوں کو اونٹوں پر لدوا کر خشکی کے راستے خلیج عقبہ پہنچادیا۔ یہاں ساحل پر ٹکڑوں کو جوڑ کر جہازوں میں تبدیل کردیا گیا۔ مجاہدین نے بحری جہازوں کو سمندر میں اتارا اور ان پر سوار ہو کر ایلہ کی طرف بڑھے جبکہ لشکر کا ایک حصہ خشکی کی طرف سے ایلہ کا محاصرہ کرچکا تھا۔ بری اور بحری دونوں راستوں سے گھر جانے کے بعد ایلہ جیسا محفوظ ترین شہر بہت جلد فتح ہوگیا۔ یہ صلاح الدین کی نصرانیوں کے خلاف پہلی فتح تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسلام کا یہ شمشیرزن آئندہ چل کر صلیبیوں کے مقابلے میں کس کس طرح پینترے بدل بدل کر لڑے گا۔

عیسائی ریاستوں کے خلاف یہ حملے اچانک یلغار اور تیزی سے واپس پلٹ آنے کے اصول کے تحت کیے جارہے تھے کہ صلاح الدین کا زیادہ دنوں تک مصر سے باہر رہنا بہرحال غیر مناسب تھا۔ 26 جمادی الاولیٰ (14 فروری 1170ء) کو ایوبی قاہرہ واپس آگئے۔ وہ جارحانہ حملوں اور اقدامی جہاد کا یہ سلسلہ

[۵] الروضتین: 1/255ش

جاری رکھنا چاہتے تھے مگر ایلہ کی مہم کے بعد وہ پہلے مصر کے اندرونی مسائل اور پھر شام کی سیاست میں ایسے پھنسے کہ برسوں تک دوبارہ عیسائی مقبوضات کو فتح کرنے کا وقت نہ مل سکا۔ اس کام کا بھرپور موقع انہیں بارہ سال بعد نصیب ہوا۔[1]

بہر کیف، عسقلان، رملہ اور ایلہ کی مہمات میں صلاح الدین ایوبی کی کامیابیوں نے ان کی قائدانہ اور عسکری صلاحیتوں کا سکہ بٹھادیا تھا۔ مسلمانوں کو ان کی ذات میں ایک نیا خورشید طلوع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ مصر کے عوام جو بنوعبید کے مارے باندھے تھے اب صلاح الدین پر پورا اعتماد کرنے لگے۔

__موصل نورالدین زنگی کی سرپرستی میں__ ✽ اُدھر سلطان نورالدین شام میں اپنے اقتدار کو روز بروز مستحکم کرتے جارہے تھے، دشمنوں کے مقابلے میں انہیں لگاتار کامیابیاں حاصل ہورہی تھیں، یہ ایک دوسال ان کے لیے غیر معمولی سیاسی فتوحات کا پیغام لائے تھے۔ ذی الحجہ 565ھ (ستمبر 1170ء) میں موصل کے حکمران نورالدین زنگی کے بھائی قطب الدین مودود نے اکیس برس کی حکمرانی کے بعد وفات پائی۔ اس کا بیٹا سیف الدین غازی دوئم جو اپنے چچا کا ہم نام تھا، تخت نشین ہوا۔ وہ ناتجربہ کار آدمی تھا۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فخرالدین عبدالمسیح نامی ایک نصرانی افسر نے جو قطب الدین مودود کے زمانے کے بھی حکومتی نظام پر حاوی تھا، کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر عوام اس کی بدسیرتی، کرخت مزاجی اور مظالم سے تنگ تھے اس لیے سلطان نورالدین نے براہ راست موصل کی سیاست میں دخل دینے کا فیصلہ کیا اور فوج کشی کر کے 13 جمادی الاولیٰ 566ھ (21 جنوری 1171ء) کو موصل پر قبضہ کرلیا۔ موصل کے امراء نے سلطان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا اور فخرالدین عبدالمسیح ملکی سیاست سے بے دخل ہوگیا۔ سلطان نورالدین نے حکومت اپنے بھتیجے سیف الدین غازی ہی کے پاس رہنے دی مگر یہ حکومت اب سلطان کی سرپرستی میں کام کرنے کی پابند تھی، یہ نورالدین کی بہت بڑی سیاسی فتح تھی۔[2]

__خلیفہ مستنجد باللہ کی وفات__ ✽ موصل پر زنگی کی فوج کشی کے دنوں ہی میں عالم اسلام کی سیاست میں ایک اور بڑی تبدیلی آئی۔ بغداد میں عباسی خلیفہ مستنجد باللہ 9 ربیع الثانی 566ھ (19 دسمبر 1170ء) نے 56 سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کیا۔ گیارہ برس تک عالم اسلام کے روحانی پیشوا کی حیثیت سے حکومت کرنے والے اس خلیفہ کو شدید بیماری کے دوران باغی امراء نے حمام میں بند کردیا تھا اور دم نکل جانے کے بعد ہی حمام کا دروازہ کھولا۔[3]

---

(1) الکامل فی التاریخ: 216/7

(2) الکامل فی التاریخ: 214/7، 215

(3) الکامل فی التاریخ: 212/7

بغداد کے سیاست نامے کا یہ منظر شام و مصر میں فرنگیوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کرنے والے دونوں مسلمان جرنیلوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ تاہم یہ عالم اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے فوراً بعد انہیں المستضی باللہ کی شکل میں ایک بہتر خلیفہ میسر آ گیا جس نے عباسی خلافت کے دورِ زوال میں اس کی سابقہ آن بان کے احیاء کی کوشش کی۔ اس نے سلطان نورالدین کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کی اور خلیفہ بنتے ہی انہیں خلعت فاخرہ سے نوازا۔

عقیدے اور نظریے پر محنت ❁ مصر میں اب عبیدی حکمران کی حیثیت عملی طور پر کچھ بھی نہیں تھی اس لیے اس کا سایہ اتنا ناگوار نہیں رہا تھا کہ اسے ہٹانے میں عجلت کی جاتی۔ صلاح الدین نے اس سے پہلے لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ دی اور نظریاتی محنت کو فروغ دیا۔ دو صدیوں سے مصر پر حکومت کرنے والے عبیدی حکمرانوں کے مذہبی رجحانات نے عوام کی اکثریت کو بڑی حد تک متاثر کیا تھا، لوگ شعائرِ سنت کی جگہ بدعات کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کی ذہنی تطہیر وقت کی اہم ضرورت تھی۔ صلاح الدین ایوبی نے اس مقصد کے لیے جگہ جگہ دینی مدارس قائم کیے۔ قاہرہ اور فسطاط میں کسی سابق ناظمِ شہر نے دو قید خانے تعمیر کرائے تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے انہیں منہدم کرا کے وہاں فقہ شافعی کے دو مدارس قائم کر دیے۔ ایسا ہی ایک اور بڑا مدرسہ "دارالعدل" کے نام سے تعمیر کیا۔ ایوبی کے نوجوان اور پرجوش بھتیجے تقی الدین عمر نے بھی قاہرہ میں کچھ مکانات خرید کر ایک شافعی مدرسہ کھولا اور اس کی آمدن کے لیے جائداد بھی وقف کر دی۔

مصر کی عدالتوں میں شیعہ فقہ کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے۔ اکثر قاضی شیعہ تھے۔ صلاح الدین نے عوام کے دل جیتنے اور ان کی ذہنی تربیت کرنے کے بعد اگلے قدم کے طور پر تمام شیعہ قاضیوں کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ شافعی مسلک کے اہل سنت علماء کو قاضی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چوں کہ اس اقدام کے ردِ عمل کا خطرہ بہرحال موجود تھا، اس لیے سب سے پہلے ایک شافعی عالم شیخ صدرالدین عبدالملک بن درباس کو جج مقرر کیا گیا۔ جب عوام و خواص نے اسے خاموشی سے قبول کر لیا تو 20 جمادی الثانیہ 566ھ (27 فروری 1171ء) کو پورے ملک میں سنی فقہاء کو قاضیوں کے عہدے دے دیے گئے۔ یہ اتنا بڑا انقلاب اس طرح چپ چاپ آیا کہ کسی کونے سے کوئی آواز نہ اٹھی۔ یقیناً یہ صلاح الدین ایوبی کی کامیاب حکمت عملی کا اثر تھا کہ وہ اس سے قبل جہاد اور علم دین کے فروغ کے ذریعے لوگوں کے رجحانات بڑی حد تک تبدیل کر چکے تھے۔[1]

[1] الکامل فی التاریخ: 7/209_216

شرعی قوانین کے نفاذ اور دینی مدارس کے قیام کے بعد صلاح الدین کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ وہ مصر سے عبیدیوں کے اقتدار کو ختم کر دیں مگر وہ اس کے لیے زیادہ مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

صلاح الدین کی دیگر مصروفیات ❁ 566ھ (1171ء) میں صلاح الدین نے شہروں کے حفاظتی انتظامات پر خطیر رقم خرچ کی۔ 23 شعبان کو وہ اپنے دورِ حکومت میں پہلی بار اسکندریہ گئے اور اس کی فصیل کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اسی سال قاہرہ کی فصیل کو بھی مستحکم کرایا۔

ان پر امن دنوں میں سلطان کو بالائی مصر میں بدوؤں کی لوٹ مار اور شر انگیزی کی اطلاع ملی تھی۔ اس مہم کو سلطان کے بھائی توران شاہ نے بڑی مستعدی سے انجام دیا اور ان کی سرکشی کا زور توڑ دیا۔ یہ مہم جمادی الثانیہ میں شروع ہوئی اور دس رمضان 566ھ (17 مئی 1171ء) کو توران شاہ کی قاہرہ واپسی ہوئی۔ صلاح الدین نے اسی سال توران شاہ کو بوش، جیزہ اور سمنود کی جاگیریں دیں۔ [1]

مصر سے عبیدی حکومت کا خاتمہ ❁ نئے ہجری سال 567ھ میں عالم اسلام کی سیاست میں ایک غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ دو صدیوں سے مصر میں جمعہ کے خطبے میں نام نہاد "عبیدی خلیفہ" کے لیے دعا کی جاتی تھی جبکہ باقی عالم اسلام میں عباسی خلیفہ کے لیے دعا کا دستور تھا۔ اب چونکہ بنو عبید کی خود ساختہ خلافت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور عاضد کا امورِ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اس لیے مناسب تھا کہ باقی اسلامی ملکوں کی طرح وہاں بھی جمعے کے خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں مصر اپنی سیاسی و روحانی وابستگی بنو عبید سے ختم کر کے بنو عباس سے قائم کر لے۔ یہی عباسی خلیفہ کی مرضی تھی اور اس کے حکم پر نور الدین زنگی نے صلاح الدین کو اس اقدام کی تاکید کر دی تھی۔ سلطان نور الدین کو یقین تھا کہ مصر میں صلاح الدین ایوبی کے قدم اتنے جم چکے ہیں کہ مصر کا سفینۂ سیاست کسی بھنور میں پھنسے بغیر اس مقام سے گزر جائے گا۔ اس خیال کے تحت نور الدین زنگی نے صلاح الدین ایوبی کو حکم نامہ ارسال کیا کہ مصر کی جامع مسجد میں عاضد کی جگہ آئندہ سے عباسی خلیفہ المستضیء کا نام لیا جائے۔

صلاح الدین ایوبی ان تاکیدی حکم ناموں سے شش و پنج میں پڑ گئے، وہ جانتے تھے کہ مصر میں ایسی تبدیلی ناگزیر ہے اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ عبیدی حکومت کا یہ دم واپسیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ابھی مزید انتظار کرنا چاہتے تھے۔ اتنا بڑا قدم اس قدر جلد اٹھا لینا ان کے نزدیک دانش مندی نہ تھی۔ اس سے مصری امراء کی بدظنی کے علاوہ رائے عامہ کی مخالفت کا بھی اندیشہ تھا۔ وہ کم از کم اس اقدام کو عاضد کی موت تک مؤخر کرنا چاہتے تھے۔ مگر نئے خلیفہ المستضیء کی جانب سے نور الدین زنگی پر دباؤ تھا کہ مصر

---

[1] الروضتین: 2/180_183

میں عباسیوں کا خطبہ جاری کر دینا چاہیے۔ اس سے قبل جب سلطان نور الدین نے نجم الدین ایوب کو مصر روانہ کیا تھا تو ساتھ ہی صلاح الدین ایوبی کے نام اس مضمون کا مراسلہ بھیجا تھا کہ مصر میں عباسی خلفاء کا خطبہ شروع کیا جائے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے درمیان اختلاف رائے ہوا تھا۔ دونوں اپنے اپنے طور پر امت کی بہتری چاہتے تھے مگر ان میں سے زیادہ درست رائے کس کی تھی؟ آنے والے وقت نے واضح کر دیا کہ اگر صلاح الدین ایوبی کی رائے پر عمل کیا جاتا اور ''عبیدی خلافت'' کو ختم کرنے میں تدریجی انداز اختیار کیا جاتا تو بعد میں ان شورشوں اور بغاوتوں سے پالا نہ پڑتا جو بنو عبید کے حامی برپا کرتے رہے۔

بہر کیف سلطان نور الدین واضح طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مصر پر شامیوں کے تسلط کا لازمی نتیجہ ''خلافت بنو عبید'' کے خاتمے کی صورت میں نکلنا چاہیے اور یہ کام جتنی جلد انجام پائے بہتر ہے۔

جب صلاح الدین ایوبی کی جانب سے حکم کی تعمیل میں تامل ہوتا رہا تو سلطان نور الدین نے پے در پے اس قسم کے تاکیدی خطوط بھیجے اور اس سلسلے میں صلاح الدین کو کسی تاخیر کی اجازت نہ دی۔ صلاح الدین ایوبی کے لیے مصر کی وزارت ویسے بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیوں کہ وہ ایک ہی وقت میں دو ایسے عہدوں پر فائز تھے جن میں ان کی باگ دو متضاد نظریات رکھنے والی شخصیات کے ہاتھ میں تھی۔ بقول لین پول ''ایک طرف وہ شیعہ حکمران کے وزیر اعظم تھے تو دوسری طرف سنی بادشاہ کے نائب''...... تاہم عبیدی سربراہ کی کمزوری کے پیش نظر صلاح الدین کے لیے اس سے معاملات کو نبھانا اتنا مشکل نہ تھا مگر اپنے طاقتور بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے کسی سرکاری حکم کو مسترد کرنا ان کے لیے بہت ہی دشوار تھا۔

آخر کار صلاح الدین ایوبی نے اس بارے میں اپنے امراء سے مشورہ کیا۔ وہ بھی کسی فیصلے پر متفق نہ ہو سکے۔ بعض نے مصریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سلطانی حکم نافذ کر دینے کا مشورہ دیا اور بعض نے مصری عوام وخواص کے منفی ردعمل کا خوف ظاہر کیا۔ تاہم یہ بات سب پر عیاں تھی کہ اس قدر تاکید وتکرار سے آنے والے شاہی حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ صلاح الدین ایوبی نے عاضد کے نام کا خلافتی خطبہ منسوخ کرا کے عباسی خلیفہ کے خطبے کا اجراء کرا دیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پہل کون کرے۔ شہر کے بڑے بڑے خطیب اور علماء دو سو سال قدیم رسم کی مخالفت کرتے ہوئے جھجک رہے تھے، حسن اتفاق سے انہی دنوں ایک غیر ملکی عالم ابو عبداللہ محمد البعلبکی مصر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی بے باکی سے کہا: ''اس کام کی ابتداء میں کرتا ہوں۔''

نیا ہجری سال شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے محرم 567ھ (ستمبر 1171ء) کے پہلے جمعے کو ایک مسجد میں جمعے کا خطبہ دیا اور اس میں عبیدی حکمران کی جگہ عباسی خلیفہ کے لیے دعائے خیر کی۔ حاضرین حیران تو ہوئے مگر کسی نے برا نہیں مانا۔ یہ دیکھ کر دیگر خطیبوں کو بھی ہمت ہوئی اور اگلے جمعے سے قاہرہ کی تمام مساجد میں سرکاری حکم کے مطابق عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ رائج پڑھا جانے لگا۔ جلد ہی پورے ملک میں یہی خطبہ رائج ہو گیا اور کوئی بحران پیدا نہ ہوا۔ عالم اسلام میں اس خبر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بغداد میں تو باقاعدہ چراغاں ہوا۔ خلیفہ المستضی نے پورے دارالخلافہ کو دلہن کی طرح سجا کر جشن منایا۔ سلطان نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور مصر کی جامع مساجد کے خطیبوں کے لیے خلعتیں اور سیاہ عمامے روانہ کیے گئے۔ صلاح الدین ایوبی کو خوشی ہوئی کہ تمام خدشات کے برعکس یہ معاملہ بھی خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ ہاں اگر خلش تھی تو عاضد کی خفگی کی..... مگر یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا۔[۵۸]

عاضد کی موت بے چارہ عاضد اس وقت شاہی محل میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ چند دن سے شدید بیمار تھا۔ جب اس کے اہل خانہ کو معلوم ہوا کہ ان کی رسمی خلافت کا دور بھی ختم ہو چکا ہے اور خطبے میں دعا کا اعزاز بھی عباسیوں کو مل گیا ہے تو انہیں شدید صدمہ ہوا مگر یہ بات عاضد کو نہ بتائی گئی۔ ڈر تھا کہ اس دھچکے سے اس کی جان ناتواں جسم کا ساتھ ہی نہ چھوڑ دے۔ گھر والوں نے سوچا اگر یہ صحت یاب ہو گیا تو اس حادثے سے آگاہ کر دیا جائے گا اور اگر اس کی موت طے ہو چکی ہے تو مرتے مرتے مزید دکھ کیوں اٹھائے؟ انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ 10 محرم کو عاضد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے سے چند دن پہلے اس نے صلاح الدین ایوبی کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے بچوں کو جو نابالغ تھے، مستقبل کے اس فاتح اعظم کے حوالے کرتے ہوئے ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی وصیت کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کے انجام کا پورا پورا اندازہ کر چکا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے ایک ایماندار مسلمان کی طرح اس وعدے کو نبھایا اور عاضد کی اولاد کا ہمیشہ خاص خیال رکھا۔

عاضد کی موت پر صلاح الدین ایوبی نے مملکت کے والی کی حیثیت سے تعزیتی رسم ادا کی، اور حسرتناک لہجے میں کہا:

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس بیماری میں مرجائے گا تو اس کی زندگی میں اس کا خطبہ بند نہ کراتا۔"[۵۹]

بنوعبید کے خزانے عاضد کی رسومات سے فارغ ہو کر صلاح الدین ایوبی بنوعبید کے شاہی محل میں

---

۵۸ کتاب الروضتین: 19/2، 199؛ النجوم الزاہرۃ: 21/2

۵۹ الکامل فی التاریخ: 218/7، 219؛ النجوم الزاہرۃ: 22/6؛ کتاب الروضتین: 200/2

داخل ہوئے جس کے کتنے ہی مالک تین صدیوں کے ان مول خزانے، تاج وتخت اور عیش وعشرت کے بے پناہ سامان چھوڑ چھاڑ کر تہِ خاک جا سوئے تھے۔

صلاح الدین نے اس سارے ساز وسامان، اموال اور خزانوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔ اپنی ذات کے لیے ایک درہم تک نہ الگ کیا۔ خزانے کے نفیس ترین جواہر خلیفہ المستضیٔ اور سلطان نورالدین زنگی کو ہدیہ کے طور پر بھیج دیے۔ ایک بڑا حصہ امراء فوج اور مجاہدین کو بخش دیا۔ کتب خانہ جس میں کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار کتابیں تھیں اپنے وزیر قاضی فاضل کو سونپ دیا۔ ہیرے جواہرات، اشرفیوں اور نقد مال ودولت کے علاوہ انواع واقسام کا سامان تھا جس میں سونے چاندی کے فریموں والے آئینے، دیدہ زیب زرتار ریشمی کپڑے، زرنگاری سے مزین نایاب قسم کے قیمتی ظروف، عمدہ مشک وکافور سے بھری ہوئی صراحیاں، اعلیٰ ترین سنگی فرنیچر، ہاتھی دانت اور صندل کا سامانِ آرائش وزیبائش، بہترین چینی کے برتن، خوبصورت الماریاں اور طلائی صندوق شامل تھے۔ یہ تمام چیزیں فروخت کردی گئیں اور ان کی قیمت بیت المال میں جمع کردی گئی۔ غلاموں اور باندیوں میں بہت سوں کو آزاد کردیا گیا اور بہت سوں کو بیچ کر قیمت بیت المال کو دے دی گئی۔

شاہی محلات بھی اب اس نئی حکومت کے تصرف میں تھے جس میں عبیدیوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ لہٰذا عاضد کے اہل وعیال کو محل سے نکال کر الگ آرام دہ رہائش گاہ دے دی گئی اور ان کے خرچ کا معقول انتظام کردیا گیا۔

ذی الحجہ 399ھ میں افریقہ کے شہر سجلماسہ میں ظہور پذیر ہونے والی عبیدی حکومت اپنے اقتدار کے 272 سال مکمل کر کے محرم 567ھ میں ایک تاریخی داستان بن چکی تھی۔ قصرِ شرقی کے چار ہزار کمرے کسی قبرستان کی مانند ویران ہو چکے تھے اور قصرِ غربی کی نشاط گاہ کسی صحرا کی طرح بے رونق۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے آباد کرنے کے لیے کئی سرکاری امراء کو ان کے خاندانوں سمیت یہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ اپنے والد نجم الدین ایوب اور اپنے بھائی الملک العادل کو بھی یہاں رہائش دے دی۔[1]

بنو عبید کے ایک مداح عمارۃ الیمنی نے اپنے اشعار میں اس خاندان کی بربادی پر اظہارِ غم کرتے ہوئے کہا:

یَاعَاذِلِیْ فِی هَوَیٰ اَبْنَاءِ فَاطِمَه ... لَکَ الْمَلَامَةُ اِنْ قَصَّرْتَ فِیْ عَذَلِیْ

[1] کتاب الروضتین: 2/ 205_211

’’مجھے اولادِ فاطمہ کے عشق میں ملامت کرنے والے! اگر تو مجھے ملامت کرنے میں کمی کرے تو قابلِ ملامت ہوگا۔‘‘

بِاللهِ زُرْسَاحَتَا لُقَصْرَيْنِ وَابْكِ مَعِيْ ۔۔۔ عَلَيْهِمَالاعَلَى الصِفِيْنِ وَالْجَمَلِ

’’خدارا دونوں محلات کے صحن میں گھوم پھر کر میرے ساتھ ان پر ایسا نوحہ کر جو جمل اور صفین پر بھی نہ کیا گیا ہو۔‘‘

وَقُلْ لِاَهْلِهِمَا وَاللهِ مَا الْتَحَمَتْ ۔۔۔ فِيْكُمْ قُرُوْحِيْ وَلَاجُرحِي بِمُنْدَمِلِ

’’ان کے سابقہ ساکنوں سے کہہ بخدا تمہاری یاد میں لگے زخم اور ناسور کبھی مندمل نہ ہوں گے۔‘‘[1]

یہ وہ اشعار تھے جو بنوعبید کے حامیوں کو آٹھ آٹھ آنسو رُلاتے رہے اور وہ اندر ہی اندر اس نئی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے مضطرب رہے جس نے بنوعبید کا خاتمہ کیا تھا۔

نوٹ: بنوعبید کی حکومت یا دولتِ عبیدیہ کو بہت سے تاریخ نگار حضرات عموماً ’’فاطمی خلافت‘‘ کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں کیونکہ عبیدیوں نے سرکاری طور پر اپنا اور اپنی حکومت کا یہی نام مشتہر کر رکھا تھا مگر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ لوگ اولادِ فاطمہ سے تھے نہ مسلمانوں کے جائز خلیفہ۔ بلکہ ان کی خلافت خود اہلِ تشیع کے ہاں بھی متفقہ نہیں تھی۔ صرف شیعوں کا اسماعیلی فرقہ اسے خلافت مانتا تھا۔ باقی امامیہ، اثناعشری وغیرہ انہیں بے دین اور گمراہ جماعت تصور کرتے تھے۔ اس لیے انصاف کی بات یہی ہے کہ ایسی متنازعہ اور مبنی بر دروغ حکومت پر ’’خلافت‘‘ کا اطلاق نہ کیا جائے اور بنوعبید کو فاطمی کہہ کر یاد نہ کیا جائے۔

---

[1] کتاب الروضتین: 205/2

فصل:7

صلاح الدین ایوبی اور نورالدین زنگی کے تعلقات

دولتِ عبید کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد سلطان نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے درمیان بعض معاملات میں اختلاف رائے کی وجہ سے کچھ کدورت پیدا ہوگئی جسے بعض مؤرخین نے ذاتی اقتدار کی کشاکشی، قومی بغض وعناد اور قبائلی دشمنی کا رنگ بھی دیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات عقل وفہم سے بعید ہے کہ سلطان نورالدین اور صلاح الدین ایوبی جو اُمت کے لیے انتہائی مخلص تھے، محض ذاتی اقتدار اور مال وجاہ کے لیے ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے۔ حقیقت کیا تھی؟ وہ اگلی سطور میں واضح کی جارہی ہے۔

شوبک کے محاصرے کا واقعہ ❊ ہوا یہ کہ صفر 567ھ (اکتوبر 1171ء) میں صلاح الدین ایوبی k مصر سے اپنے برق رفتار دستوں کے ساتھ شام کی سرحد کی طرف نکلے۔ ان کا ہدف نصرانیوں کا مضبوط قلعہ ''شوبک'' تھا جو انہی کے ایک اور فتنہ انگیز مرکز ''کرک'' سے صرف ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ ان دونوں مورچوں سے نصرانیوں کی تاخت وتاراج جاری رہتی تھی جس سے تجارتی وسفارتی قافلوں کو سخت خطرات کا سامنا رہا کرتا تھا۔

صلاح الدین ایوبی نے ''شوبک'' کا محاصرہ کرلیا۔ محصورین کمک سے مایوس ہوئے تو انہوں نے امان طلب کی اور قلعہ حوالے کرنے کے لیے دس دن کی مہلت مانگی۔ صلاح الدین ایوبی نے اسے قبول کرلیا۔ ادھر سلطان نورالدین زنگی کو بھی مصری افواج کے عیسائی ریاستوں پر حملے کی خبر مل گئی تھی۔ انہوں نے دشمن کو دونوں طرف سے گھیرنے کے لیے مشرق سے عیسائی ریاستوں کا رخ کیا۔ ان کا ارادہ یہ بھی تھا کہ محاذ پر مصری فوجوں اور اپنے قابل فخر سالار صلاح الدین ایوبی سے ملاقات کرلیں جسے وہ اب اپنے ہر خط میں ''اسفہسالار'' (سپہ سالار) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

ادھر صلاح الدین ایوبی ''شوبک'' کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک انہیں مصر میں عبیدی امراء کی سازشوں کی اطلاع ملی۔ خطرہ تھا کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں بغاوت کردیں گے۔ صلاح الدین ایوبی مصر کی

حکومت کے استحکام کو ہر معاملے پر ترجیح دیتے تھے کیوں کہ ان کے نزدیک مصر کے بغیر القدس کی بازیابی ناممکن تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے مربی سلطان نورالدین زنگی ان سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں مگر انہوں نے مزید رکنا نقصان دہ سمجھا اور سلطان زنگی کو ایک مراسلے میں مصر کے حالات کی نزاکت کا احساس دلا کر اپنی واپسی کی اطلاع دی اور ملاقات نہ ہونے پر معذرت کی۔ اس موقع پر صلاح الدین ایوبی کے بعض امراء نے واپسی کے ارادے کو پختہ کرنے اور انہیں اپنے آقا سے بدگمان کرنے کے لیے کہا:

''اگر سلطان نورالدین زنگی اس حالت میں عیسائی ریاستوں میں داخل ہوئے کہ ایک طرف سے آپ اور دوسری طرف سے وہ دشمن پر حملہ آور ہوں تو ظاہر ہے کہ دونوں کے یکجا ہونے پر تمام افواج انہی کی کمان میں ہوں گی اور آپ مکمل طور پر ان کے تابع ہوں گے۔ وہ چاہیں تو آپ کو مصر کی حکومت پر برقرار رکھیں اور چاہیں تو معزول کر دیں۔ ایسے میں آپ کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔''

اگرچہ ایسی باتیں صلاح الدین ایوبی کو زنگی سے بدگمان نہیں کر سکتی تھیں مگر وہ پہلے ہی واپسی کا ارادہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ''شوبک'' کا محاصرہ چھوڑ کر وہ مصر روانہ ہو گئے۔

ادھر سلطان زنگی کو صلاح الدین ایوبی کے اس طرح اچانک واپس چلے جانے سے حیرت ہوئی، وہ مصر کی سیاست کی اہمیت کو سمجھتے تھے مگر ان کے نزدیک مصر کی حکومت القدس کی آزادی کا ایک ذریعہ تھی، اصل مقصد نہیں۔ مصر کے حکومتی معاملات کو اتنی اہمیت دینا کہ اس کے لیے ایک سرنگوں ہوتے ہوئے قلعے کو چھوڑ دیا جائے ان کے نزدیک ناقابل فہم بات تھی۔ وہ تو یہ سوچ رہے تھے کہ صلاح الدین سے مل کر تمام عیسائی مقبوضات کو دوطرفہ یلغار کی زد میں لینے کی ترتیب طے کریں گے اور جلد از جلد ارض مقدس کو کفار کے پنجے سے آزاد کرا لیں گے کیوں کہ شام کی عیسائی ریاستیں اس وقت بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ یورپ کے حکمران اپنے سیاسی مسائل میں الجھ کر ان کی مدد سے قاصر تھے۔ ایسے میں اگر شام و مصر کی افواج مل کر چند زوردار حملے کرتیں تو نصرانیوں کو مکمل شکست دے کر القدس سمیت تمام شامی مقبوضات کو ان کی گرفت سے آزاد کرانا مشکل نہ تھا۔ اس لیے سلطان نورالدین نے صلاح الدین ایوبی کے یوں واپس چلے جانے کو سخت ناپسند کیا اور ان کی توجیہہ و معذرت کو قبول نہ کیا حالانکہ صلاح الدین ایوبی اپنے طور پر مصر کو اہمیت دینے میں پوری طرح مخلص تھے۔

بہرحال طبائع اور صلاحیتوں کے فرق کی طرح اختلاف آراء بھی ایک قدرتی چیز ہے۔ رائے کا یہی اختلاف اسلام کے ان دو نامور فاتحین کے مابین وقتی ناراضی کا سبب بن گیا تھا۔ حاشیہ برداروں نے

یقیناً غلط فہمیوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہوگی۔ تاہم اس کے بعد جلد ہی دونوں کے تعلقات معمول پر آ گئے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دونوں میں سے کسی ایک نے دوسرے کے خلاف فوج کشی یا اس کی تیاری کی ہو۔ بس غلط فہمیوں نے وقتی طور پر فضا کو آلودہ کر دیا۔

مؤرخین نے اس موقع پر سلطان نورالدین کی جانب سے مصر پر حملہ کر کے سلطان صلاح الدین ایوبی کو معزول کرنے کے ارادے کا ذکر ضرور کیا ہے مگر اس کی اصل حقیقت شاید اس سے زیادہ نہ ہو کہ صلاح الدین کے سلطان سے ملے بغیر اچانک واپس چلے جانے کے بعد نورالدین زنگی کے دربار میں اس صورتحال پر بحث ہوئی ہوگی اور مصر پر فوج کشی کی تجویز پر بھی غور کیا گیا ہوگا۔ مگر کیا اس کے بعد سلطان نورالدین نے ایسا کوئی اقدام کیا؟ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔[1]

نجم الدین ایوب کی دور اندیشی ﷫ زیادہ سے زیادہ جس بات کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ دن کے بعد مصر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سلطان نورالدین مصر پر حملے کے لیے فوج بھیج رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس خبر میں صداقت کتنے فیصد تھی؟ مصر کے دربار میں ایسی کوئی صورتحال پیدا ہو جانے کے بعد تمام امکانی پہلوؤں پر گفتگو شروع ہوگئی۔ جوش وخروش میں مجلس کا رنگ ایسا ہو گیا جس سے امت کے اتحاد پر زبردست زد پڑ سکتی تھی۔ اس مجلس میں صلاح الدین ایوبی کے جہاں دیدہ باپ نجم الدین ایوب نے نہایت سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی اور ایک ایسی رائے دی جس سے تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی تھیں۔ اس سے پہلے مجلس میں صلاح الدین ایوبی کے نوجوان بھتیجے تقی الدین عمر نے پرجوش انداز میں کہا تھا:

''اگر سلطان ہم پر حملہ آور ہوا تو ہم اس سے لڑیں گے۔ اسے اس ملک پر قبضہ کرنے سے روک دیں گے۔''

یہ سن کر دیگر امراء بھی اس رائے کی تائید کرنے لگے تھے۔ نجم الدین ایوب نے یہ ہنگامہ دیکھا تو ڈانٹ کر سب کو خاموش کرا دیا اور صلاح الدین کی طرف رخ کر کے کہا:

''میں تیرا باپ اور یہ تیرے ماموں شہاب الدین حارمی یہاں موجود ہیں۔ ہم سب لوگوں سے زیادہ تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اللہ کی قسم اگر میں اور تیرا ماموں سلطان کو آتا دیکھ لیں تو اس کے استقبال میں زمین کو بوسہ دیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اگر وہ ہمیں حکم دے کہ تیری گردن اڑا دیں تو ہم ایسا بھی کر گزریں گے۔ اور یہ تمام امراء اور وزراء سلطان کو سامنے دیکھ کر اپنی

[1] الکامل فی التاریخ: 7/220، 221۔ ابن خلدون: 5/282

سواریوں کی زینوں پر نہیں ٹک سکیں گے۔ یہ سارے شہر سلطان کے ہیں۔ ہم اس کے غلام اور نائب ہیں۔ اگر وہ تجھے معزول کرنا چاہے تو ہم یقیناً اس کی اطاعت کریں گے۔"

نجم الدین ایوب کی اس گفتگو نے سب کے دلوں سے جذبات کے غبار اور مرکز گریزی کے وسوسوں کو دھوڈالا۔ اس کے بعد نجم الدین ایوب نے اپنے بیٹے کو مشورہ دیتے ہوئے کہا:

"تم سلطان کو خط لکھ کر عرض کرو..... عالی مرتبت! میں نے سنا ہے کہ آپ میرے خلاف فوج کشی کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ آپ ایک غلام بھیج دیں جو میرے گلے میں پٹا ڈال کر مجھے آپ کے پاس لے جائے۔ یہاں اسے کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔"

فرماں بردار بیٹے نے باپ کے مشورے کے عین مطابق اس مضمون کا خط شام روانہ کر دیا۔

بعد میں نجم الدین ایوب نے تنہائی میں بھی اپنے بیٹے کو سلطان کے خلاف کسی قسم کی سوچ رکھنے سے منع کرتے ہوئے مرکز سے خادمانہ تعلقات برقرار رکھنے کی تاکید کی اور ایسے امراء کی باتوں پر توجہ دینے سے منع کیا جو مصر کو شام سے لڑانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دانش مند بوڑھے نے زمینی حقائق، امت کے اتحاد کی ضرورت اور مصلحت وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے نوجوان بیٹے کو سمجھایا:

"اگر ہم سلطان سے مزاحمت اور لڑائی پر تل گئے تو ہم ہی ان کا ہدف بن جائیں گے جبکہ درحقیقت ہم ان سے ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں اب جبکہ انہیں ہماری طرف سے اطاعت کا اطمینان ہوگا تو وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر دیگر مہمات میں مشغول رہیں گے...."

تاریخ بتاتی ہے کہ صلاح الدین ایوبی کا مذکورہ خط پڑھ کر سلطان زنگی کو اطمینان ہو گیا۔ غلط فہمیوں کی فضا ختم ہو گئی اور آخر تک سلطان اور ایوبی کے تعلقات مثالی رہے۔

اس موقع پر مورخین نے نجم الدین ایوب کی صلاح الدین کو نصیحت کے ضمن میں اس کا یہ جملہ بھی نقل کیا ہے:

"اگر سلطان اس ملک سے ایک گنا بھی لے تو میں اس سے لڑوں گا۔"

مگر اس جملے کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ پدرانہ شفقت کا ایک بلیغ اظہار تھا تاکہ بیٹا باپ کو بہر طور اپنا خیر خواہ سمجھے، مخالف خیال نہ کرلے۔ اگر یہ جملہ حقیقت پر مبنی ہوتا تو نجم الدین، سلطان زنگی کی اطاعت پر اتنا زور کیوں دیتا؟ اپنے بیٹے اور امرائے مصر کو سلطان سے خادمانہ تعلقات رکھنے کی تاکید کیوں کرتا۔ ۵

۵ الکامل لابن اثیر: 7/221، البدایہ والنہایہ: 7/288، کتاب الروضتین: 2/228

غلط فہمیوں کا ازالہ: ڈاکٹر حسین مؤنس اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''نورالدین محمود'' میں سلطان نورالدین اور صلاح الدین کے مابین محاذ آرائی کی روایات پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ صلاح الدین مصر میں اپنے قدم جماتا چلا گیا حتی کہ اس نے خودمختاری کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور نورالدین کے خلاف لشکر کشی کی تیاری کرنے لگا حالاں کہ یہ بات درست نہیں، اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان دونوں کے درمیان نفرت پیدا ہوئی اور اتنی بڑھتی چلی گئی کہ نورالدین نے مصر پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ اپنے نائب کو تابعدار بنا سکے۔ یہ سب باتیں عقل سے ماوراء ہیں۔''[1]

صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے قلعۂ شوبک کی مہم کو ادھورا چھوڑ کر سلطان نورالدین سے ملے بغیر مصر واپس آجانے کے واقعے سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے ڈاکٹر مؤنس تحریر کرتے ہیں:

''اس موقع پر کوئی شے ایسی نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ صلاح الدین نورالدین سے ملنے سے گریز کر رہے تھے۔ اگرچہ اکثر مؤرخین نے یہی تحریر کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صلاح الدین ایوبی جانتے تھے کہ سلطان نورالدین ایسی ہستی نہیں جس سے دھوکا کیا جا سکے یا اس سے بدمعاملگی درست ہو۔ صلاح الدین کو سلطان نورالدین کے کریمانہ اوصاف کے ساتھ ساتھ یہ بھی علم تھا کہ وہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتا ہے..... تو یہ بات عقل میں کیسے آسکتی ہے کہ صلاح الدین جیسا ذہین اور دانا انسان سلطان نورالدین سے یہ خطرہ محسوس کرتا کہ وہ اسے تکلیف دیں گے یا اسے مصر کی حکومت سے معزول کر دیں گے۔''[2]

آخر میں سلطان نورالدین کے آخری دور میں ان کے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ ایک خط کا اقتباس پیش خدمت ہے جو انہوں نے شام کے مشہور عالم دین قاضی ابن ابی عصرون کو مصر بھیجتے ہوئے لکھا تھا۔ اس کے ایک ایک جملے سے زنگی کا صلاح الدین ایوبی پر کامل اعتماد عیاں ہوتا ہے۔

''میں آپ کو مصر بھیج رہا ہوں، اس تقرری پر میرا اور صلاح الدین کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے توفیقِ خیر عطا کرے۔ میں اس کا بہت بہت بہت قدردان ہوں۔ (مراسلے کے الفاظ یہ ہیں: فانا منہ شاکراً کثیراً کثیراً کثیرا) اللہ اسے جزائے خیر دے اور باقی رکھے۔ ایسے اچھے اور نیک لوگوں کی بقا میں اہل اسلام کی بڑی بہتری اور نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں اور خیر کے مددگاروں کی تعداد اور بڑھائے۔''[3]

---

[1] نورالدین محمود، ص: 332 [2] نورالدین محمود، ص: 344 [3] کتاب الروضتین: 120/2

اب قارئین پر یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ عالم اسلام کے ان دو عظیم مجاہدین کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے آخر وقت تک محبت، اکرام اور احترام کے جذبات قائم رہے۔ اگر کوئی غلط فہمی تھی تو وہ عارضی تھی جو جلد ہی دور ہو گئی۔

کرک کا محاصرہ: اس واقعے کے کچھ عرصے بعد سلطان نور الدین نے ساحل شام کی تابعض عیسائی ریاستوں کو دوطرفہ حملوں کی زد میں لینے کے لیے ایک بار پھر مشترکہ مہم کا آغاز کرنا چاہا۔ انہوں نے صلاح الدین ایوبی کو خط و کتابت کے ذریعے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ طے یہ پایا کہ شام اور مصر کی افواج ایک متعین دن میں کرک کے قریب باہم مل جائیں گی۔ وہاں دونوں قائدین کی ملاقات ہو گی اور جنگی وسیاسی امور پر مشورہ بھی ہو گا۔

شوال 567ھ (جون 1172ء) میں صلاح الدین ایوبی مصر سے روانہ ہوئے، اس سے قبل انہوں نے اپنی روانگی کی اطلاع شام بھیج دی تھی۔ صحرا کا پر خطر راستہ طے کر کے جب وہ کرک پہنچے تو ابھی سلطان زنگی کی افواج راستے میں تھیں۔ صلاح الدین ایوبی نے کرک کا محاصرہ کر لیا۔ وہ سلطان نور الدین کا انتظار کر رہے تھے جو دو دن کی مسافت پر تھے، اچانک انہیں اطلاع ملی کہ قاہرہ میں ان کے والد نجم الدین کی حالت نازک ہے اور وہ بستر مرگ پر ہیں۔ صلاح الدین اپنے والد کو مصر کے تمام کاروبار کا ذمہ دار بنا کر آئے تھے۔ اس خبر سے انہیں ایک بار پھر خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں کسی نائب کی عدم موجودگی میں مصر بغاوت کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ انہوں نے فوراً مصر واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ محاصرہ اٹھا کر وہ تیزی سے اپنے دارالحکومت کی طرف پلٹے مگر اس سے پہلے انہوں نے فقیہ عیسیٰ الہکاری کو سلطان زنگی کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ مصری سپہ سالار کی واپسی کا یہ معقول عذر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں۔

فقیہ عیسیٰ الہکاری سلطان کے پاس پہنچے۔ اپنے آقا کی جانب سے بھیجے گئے گراں قدر تحائف نذر کیے اور معذرت کا پیغام گوش گذار کیا۔ سلطان نور الدین جو کہ اپنے باصلاحیت سپہ سالار سے ملنے کے لیے بے چین تھے رنجیدہ ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے قابل ترین مصاحب نجم الدین کی حالت پر بھی نہایت تشویش ہوئی۔ تاہم انہوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے صلاح الدین کی معذرت قبول کی اور ان کے فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے کہا: ''واقعی مصر کی حفاظت ہمارے نزدیک بھی باقی تمام کاموں سے زیادہ اہم ہے۔''

نجم الدین ایوب کی وفات: ادھر صلاح الدین قاہرہ پہنچے تو انہیں یہ افسوس ناک خبر ملی کہ ان کے سر سے والد ماجد کا سایہ شفقت اٹھ گیا ہے۔ زمانے کا سرد و گرم چشیدہ یہ دانش مند بوڑھا گھڑسواری کے

دوران گھوڑے کے بدک جانے سے گر پڑا تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ نجم الدین ایوب کو چوگان اور گھڑ سواری کا بے حد شوق تھا اور وہ اتنی تیز گھوڑا دوڑاتے تھے کہ لوگ دیکھ کر گھبرا جاتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ کہیں وہ گھوڑے سے گر نہ پڑیں۔ بعض لوگ یہاں تک کہا کرتے تھے کہ شاید تیز رفتاری ہی ایوب کی موت کا بہانہ بنے۔ ایسا ہی ہوا۔ گھوڑے سے گرنے کے بعد زخمی ایوب چند دن تک زیر علاج رہ کر 27 ذوالحجہ 567ھ (19 اگست 1172ء) کو دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

صلاح الدین ایوبی کے لیے یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ والد کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہر قدم پر ان کے لیے تقویت کا باعث تھی۔ اب وہ اس سہارے سے محروم ہو گئے تھے۔

نجم الدین ایوب کا شام کی سیاست میں نہایت اہم کردار تھا۔ سلطان نورالدین کے دربار میں ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ سلطان کے سامنے کسی درباری کو بلا اجازت از خود بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر نجم الدین ایوب نے کبھی یہ تکلف نہ کیا اور وہ جب بھی سلطان کے پاس آتے تو پوچھے بغیر بیٹھ جاتے۔ اور سلطان نے کبھی اس کا برا نہیں منایا۔[4]

ابن اثیر کا بیان ہے:

"نجم الدین ایوب خوبیوں سے آراستہ، عقلمند، نیک سیرت، شریف الطبع اور فیاض انسان تھا۔ درویشوں اور صوفیاء کی بکثرت خدمت کیا کرتا تھا، ان کے پاس اکثر حاضر ہوتا تھا۔"[5]

اپنے آخری ایام میں وہ مصر کی سیاست کا مضبوط ترین ستون بن چکے تھے۔ اس ستون کے گرتے ہی مصر کی پر امن سیاسی فضا میں ایک نئی ہل چل مچ گئی اور صلاح الدین ایوبی پر امتحانات کی کڑی دھوپ آ گئی۔[6]

غیر شرعی ٹیکس کا خاتمہ ❁ 567ھ میں صلاح الدین ایوبی نے سلطان نورالدین زنگی کے کہنے پر تاجروں سے لیا جانے والا چنگی ٹیکس جسے علماء نے غیر شرعی قرار دیا تھا، بند کر دیا۔ حکومت کو اس ٹیکس سے سالانہ بیس لاکھ دینار (آج کل کے اربوں روپے) کی آمدن ہوا کرتی تھی۔

---

[4] کتاب الروضتین: 2/240، الکامل فی التاریخ: 7/235_236
[5] کتاب الروضتین: 1/406
[6] ابن خلدون: 5/282، کتاب الروضتین: 2/248_249

فصل:8

ناکام سازش

نجم الدین ایوب کی وفات کو چھ سات ماہ گذرے ہوں گے کہ صلاح الدین ایوبی کے خلاف زیر زمین سازشیں اور بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ پہلی بغاوت 568ھ (1172ء) میں ہوئی جو سوڈان کے حبشیوں اور غلاموں نے کی تھی۔ انہوں نے غنڈوں اور اوباشوں کی بڑی تعداد کو ساتھ ملا کر مصری سرحد پر یلغار کی تیاری کر لی تھی، وہ بلاد النوبہ سے نکل کر اسوان کی بستی اور نواحی دیہاتوں کو لوٹنے آ رہے تھے کہ سرحد کے نگران کنز الدولہ نے قاہرہ میں اس خطرے کی بروقت اطلاع دے دی جس کے نتیجے میں سلطان نے شجاع بعلبکی کو کمک دے کر بھیجا مگر شجاع کے آنے تک سوڈانی اسوان کو تباہ کر کے واپس جا چکے تھے۔ بہر حال کنز الدولہ اور شجاع بعلبکی لشکر لے کر ان کے تعاقب میں نکلے، اس دوران سوڈانی باغی سرحدی علاقے "صعید" پر قابض ہو گئے تھے۔ فریقین میں خونریز لڑائیاں جاری رہیں مگر حبشیوں کا زور ٹوٹ نہ سکا۔ شجاع یہ صورتحال بتانے خود قاہرہ گیا تو صلاح الدین کو اندازہ ہوا کہ صعید میں باغیوں کی طاقت بہت بڑھ چکی ہے۔ تب صلاح الدین نے جمادی الاولیٰ 568ھ (جنوری 1173ء) میں اپنے بھائی توران شاہ کو ایک بڑا لشکر دے کر وہاں بھیجا۔ آخر کار گھمسان کی جنگوں کے بعد سوڈانی پسپا ہو کر نوبہ کے علاقوں کو لوٹ گئے۔ توران شاہ نے ان کا تعاقب کر کے نوبہ کے مضافات میں چھاپے مارے، ان کے قلعۂ ابریم کو مسخر کیا اور بہت سے قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ [1]

مگر اس فتنے کی روک تھام ہوتے ہی ایک اور بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں جسے سابق حکومت کے وفادار امراء اور مبلغین ہوا دے رہے تھے۔ وہ موجودہ سنی حکومت کو ختم کر کے ایک بار پھر "دولتِ عبیدیہ" کا احیاء چاہتے تھے۔ ان کا سربراہ عبیدیوں کا داعی الدعاۃ حاجی ابن عبدالقوی (عبدالجبار بن اسماعیل بن عبدالقوی) تھا۔ اسے بنوعبید کے محلات میں مدفون خزانوں کا پتا بھی معلوم تھا۔ دوسرا اہم رکن عبدالصمد

[1] کتاب الروضتین: 2/245_248

کاتب تھا جو صلاح الدین کی حکومت کا اہم عہدے دار تھا۔ تیسرا قاضی عویرس تھا جو سرکاری دفاتر کا منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ محکمہ قضا میں بھی اہم عہدے پر تھا۔ چوتھا رکن قاضی ابن کامل تھا جو بنو عبید کے دور میں قاضی القضاۃ رہا تھا۔ سازشیوں میں شبری نامی ایک افسر بھی تھا جو ''کاتب السرّ'' (انٹیلی جنس کے خفیہ ریکارڈ کا سیکرٹری) تھا۔ ایک عیسائی نجومی بھی اس گروہ کا رکن تھا جس نے علم نجوم سے حساب لگا کر دعویٰ کیا تھا کہ بغاوت کامیابی سے ہم کنار ہوگی۔ ایک اور شخص نجاح الحمامی بھی ان میں شامل تھا۔ [1]

ان کے علاوہ ان سازشی عناصر میں عمارہ نامی ایک یمنی دانشور بھی پیش پیش تھا جو فصیح و بلیغ شاعر اور گفتگو میں بڑا ماہر تھا۔ حقیقت میں وہ علوم شرعیہ کے میدان کا فرد تھا اور عقیدے کے لحاظ سے سنی اور شافعی المسلک تھا۔ بعد میں شعراء کے ساتھ نشست و برخاست کی وجہ سے شعر و شاعری کے کوچے میں قدم رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس فن کا استاذ شمار ہونے لگا۔ [2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وہ یمنی اور شافعی المسلک تھا۔ اس کا دیوان مشہور ہے۔ 515ھ میں پیدا ہوا۔ زبید میں علم فقہ حاصل کیا۔''

نیز فرماتے ہیں:

''حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اس کا اعتقاد واضح تھا۔ صالح بن رزیک نے اس سے پوچھا: آپ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ عمارۃ نے کہا: اگر وہ نہ ہوتے تو اسلام باقی نہ رہتا۔'' [3]

ابن واصل نے عمارۃ کی بنوعبید سے دوستی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ یمن سے مصر آیا تو بنوعبید نے اس کی بہت قدردانی کی اور بڑا مرتبہ دیا اس لیے وہ ان کا وفادار بن گیا کیونکہ انسان احسان کا غلام ہوتا ہے مگر وہ ان کا ہم مذہب نہیں بلکہ سنی اور شافعی تھا۔ [4]

عمارۃ نے بنوعبید کے بارے میں کہا تھا:

اَفَاعِيلُهُمْ فِي جُوْدِ اَفْعَالِ سُنَّةٍ وَاِنْ خَالَفُوْنِي فِي اعْتِقَادِ التَّشَيُّعِ

''سخاوت میں ان کے کارنامے اہل سنت کی طرح ہیں اگرچہ وہ شیعہ عقیدے کی وجہ سے میرے مخالف ہیں۔''

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: حالات 568ھ
[2] الاعلام للزرکلی: 1/ 216
[3] سیر اعلام النبلاء: 20/592
[4] مفرج الکروب: 1/212

بنوعبید کی سیادت کے خاتمے پر عمارة نے بڑے دردناک اشعار کہے تھے جن کا ایک نمونہ یہ ہے:

أَسَفِي عَلَىٰ زَمَنِ الْإِمَامِ الْعَاضِدِ   أَسَفُ الْعَقِيمِ عَلَى الْفِرَاقِ الْوَاحِدِ

"مجھے عاضد کا زمانہ یاد کر کے ایسا ہی افسوس ہوتا ہے جیسا کہ کسی بانجھ عورت کو اکلوتے بچے کی جدائی پر۔"

جَالَسْتُ مِنْ وُزَرَائِهِ وَصَحِبْتُ مِنْ   أُمَرَائِهِ أَهْلَ الثَّنَاءِ الْخَالِدِ

"میں اس کے وزیروں اور اس کے ایسے امراء کا ہم نشین رہا جو ہمیشہ مدح وثنا کے قابل ہیں۔"

لَهْفِي عَلَىٰ حُجُرَاتِ قَصْرِكَ إِذْ خَلَتْ   يَا ابْنَ النَّبِيِّ مِنَ ازْدِحَامِ الْوَافِدِ

"اے آل نبی! مجھے آپ کے محل کے وہ خالی کمرے دیکھ کر رنج ہوتا ہے جو کبھی ملاقاتیوں سے بھرے رہتے تھے۔"

ان سازشی عناصر نے سیاہ فام سوڈانیوں، شاہی محل کے ملازموں اور سب سے بڑھ کر خود صلاح الدین ایوبی کے سالاروں اور سپاہیوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد کو اپنا ہم نوا بنالیا تھا۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ منصوبے کی تفصیلات سے سب کو یکساں طور پر آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

تو<u>ران شاہ کی یمن روانگی</u>: اس منصوبے کے پہلے مرحلے میں عمارہ نے صلاح الدین کے معرکہ آزما بھائی توران شاہ سے تعلقات بڑھائے اور اس کے سامنے اپنے آبائی وطن یمن کی عمدہ آب وہوا، سرسبزی وشادابی اور قدرتی حسن وجمال کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ وہاں کے شہروں کی وسعت، بازاروں کی رونق اور باشندوں کی خوبیوں کو اس شمشیرزن کے سامنے بار بار اس طرح بیان کیا کہ توران شاہ بے اختیار اس ملک کو فتح کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔

رفتہ رفتہ عمارہ نے توران شاہ کو وہاں لشکر کشی پر آمادہ کرلیا اور اسے یقین دلایا کہ یمن پر قابض ہوجانے سے مصر کو بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔ خود توران شاہ بھی یہ محسوس کررہا تھا کہ بہترین بحری راستوں اور مضبوط قلعوں کی یہ سرزمین ہاتھ لگ جانے سے انہیں مستقبل میں کسی بھی خطرے سے مدافعت کے لیے ایک مضبوط مورچہ مل جائے گا۔

اس نے صلاح الدین سے اس مہم کے بارے میں مشورہ کیا۔ گزشتہ سال جمادی الاولیٰ میں جب اس نے اسوان سے آگے بلاد النوبہ تک یلغار کی تھی تو فوج کے طویل سفر اور جنگی مہمات کے بھاری اخراجات برداشت کرنے کے باوجود مہم اس لحاظ سے امید افزا نہیں نکلی تھی کہ ان علاقوں سے کچھ معاشی یا عسکری مفادات ہاتھ نہیں آئے تھے۔ توران شاہ ان علاقوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر صرف مال غنیمت

کے غلاموں اور باندیوں کو لے کر واپس قاہرہ آ گیا تھا۔ اس تجربے کے بعد اب اس کا اتنی دور کسی نئی مہم پر نکل جانا مصلحت کے خلاف تھا۔ اگر ان کا باپ ایوب زندہ ہوتا تو وہ غالباً اس کی اجازت نہ دیتا۔ بہر حال تقدیر غالب آئی۔ ایوبی نے آسانی سے اجازت دے دی جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں یمن پر عبدالنبی بن مہدی نامی ایک مرتد کا تسلط تھا جو خود کو تمام بنی نوع آدم کا نجات دہندہ باور کراتا تھا۔ صلاح الدین ایوبی کو جب سے یہ حالات معلوم ہوئے تھے وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس بد بخت کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ جب توران شاہ نے یمن جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے فوراً اس مہم کی تائید کی۔ رجب 569ھ (مارچ 1174ء) کے آغاز میں توران شاہ قاہرہ سے یمن کی طرف نکل گیا۔ پہلے وہ حجاز پہنچا اور مکہ معظمہ میں حاضری دے کر عمرہ ادا کرتے ہوئے یمن کا رخ کیا۔ اس کا لشکر بری اور بحری دونوں راستوں سے آ رہا تھا۔

شوال میں توران شاہ نے مہدی کے مرکز ''زبید'' پر قبضہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔ جلد ہی مصری فوج عدن اور صنعا جیسے اہم شہروں پر بھی قابض ہو گئی۔

غرض چند ماہ کی تھکا دینے والی مہمات کے بعد مصری فوج نے یمن کے تمام شہروں، قلعوں اور بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ ان فتوحات کی خبر مصر، شام اور بغداد میں پھیل گئی اور ہر طرف توران شاہ کے کارناموں کی تعریف ہوئی۔ اس نومفتوحہ ملک میں سلطان نورالدین اور خلیفۂ بغداد کے نام کا خطبہ شروع کر دیا گیا۔ اس کے باوجود یمن مصر کی حکومت کے لیے کسی غیر معمولی فائدے کا ذریعہ نہ بن سکا۔ توران شاہ کو بھی جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ یمن اتنا پر کشش نہیں جتنا عمارہ نے بیان کیا تھا اور یہاں پر قبضہ کرنا اتنا ضروری نہ تھا جتنا کہ اسے سمجھایا جا رہا تھا۔[1]

تاہم اسے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کے پیچھے مصر میں کیا ہو رہا ہے؟ جو اسے مصر سے بھگانے کا اصل مقصد تھا۔

قاہرہ میں زیر زمین باغیانہ سرگرمیاں: اس دوران جبکہ توران شاہ لشکر کے ایک بڑے حصے کے ساتھ یمن کی فتوحات میں مشغول تھا سازشی عناصر صلاح الدین کو اکیلا دیکھ کر اس کے خلاف بغاوت کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ وہ سلطنت کے کئی امراء، فوج کے کئی سالاروں اور فوج کے ایک حصے کو پہلے ہی ساتھ ملا چکے تھے۔

توران شاہ کے جانے کے صرف ایک ماہ بعد بغاوت کی ساری تیاریاں آخری مرحلے میں پہنچ چکی

[1] الکامل فی التاریخ: 7/238_239؛ صبح الاعشیٰ: 2/270_273

تھیں۔ سازشی امراء شام کی عیسائی ریاستوں اور سسلی کے حکمران کو خطیر معاوضے کے عوض مصر پر فوج کشی کی دعوت بھی دے چکے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ پہلے نصرانی باہر سے سرحدوں پر حملہ کریں گے۔ ان کی روک تھام کے لیے مصری لشکر قاہرہ سے باہر جائے گا تو باغی سالار اپنے سپاہیوں کے ساتھ صلاح الدین کو گھیر کر قتل کر دیں گے۔ چوں کہ اس کے بعد اس کا کوئی جانشین موجود نہیں ہوگا اس لیے قاہرہ میں دولتِ بنوعبید کے احیاء کا خواب آسانی سے شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔

عمارہ شاعر جو اس تحریک کے مرکزی کرداروں میں شامل تھا خوش ہو کر کہہ رہا تھا:

''میں نے توران شاہ کو اسی لیے یمن بھجوایا ہے تاکہ صلاح الدین کو ختم کرنے کے بعد اس کی جگہ سنبھالنے اور اس کے وفاداروں کی شیرازہ بندی کرنے والا کوئی بھی شخص موقع پر موجود نہ ہو۔''

ان سازشیوں کی شام کے عیسائی حکمرانوں اور سسلی کے بادشاہ سے خط و کتابت باقاعدہ جاری تھی۔ عیسائی حکومتوں کے قاصد ویسے تو اپنے معمول کے مطابق صلاح الدین ایوبی کے پاس حاضر ہوتے رہتے تھے اور رسمی خیر سگالی وغیرہ کے پیغامات لاتے اور لے جاتے تھے مگر ان دنوں ان کی آمد و رفت کا اصل مقصد سازشی عناصر سے مل کر بغاوت کی منصوبہ بندی کرنا تھا۔ چنانچہ عیسائی سفیر خفیہ مجالس میں سازشی امراء کے ساتھ سر جوڑ کے بیٹھتے تھے۔ انہوں نے یہ تک طے کر لیا تھا کہ اگلا ''خلیفہ'' کون ہوگا، وزیر اعظم کون بنے گا، قاضی کا عہدہ کسے ملے گا اور داعی الدعاۃ کا منصب کس کے حصے میں آئیگا؟

یہ سازش اتنی خفیہ تھی کہ شعبان تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کی بھلائی منظور تھی اس لیے راز طشت از بام ہو گیا۔ ہوا یوں کہ شام کی ایک عیسائی ریاست کا قاصد سازشیوں سے مشاورت کے لیے مصر آیا۔ پہلے وہ حسب معمول صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ اس پر شک نہ کیا جا سکے۔ بعد میں وہ قاہرہ میں قیام کے دوران سازشیوں سے ملنے جلنے لگا۔ اس دوران صلاح الدین ایوبی کے ان جاسوسوں نے جو شام میں موجود تھے خبر بھیجی کہ یہاں سے مصر پر فوج کشی کی تیاریاں ہو رہی ہیں لہٰذا چوکنا رہا جائے۔ اس خبر سے صلاح الدین ایوبی ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کو جس پر عیسائی بہت اعتماد کرتے تھے عیسائی سفیر کی جاسوسی پر مقرر کر دیا۔ یہ شخص سفیر سے گھل مل گیا اور جلد ہی اس کے خفیہ رابطوں اور اس کی آمد کے پس پردہ مذموم مقاصد سے آگاہ ہو گیا۔ اس نے پوری رپورٹ تیار کر کے صلاح الدین کے گوش گذار کر دی۔ اس رپورٹ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ عیسائی سفیر مقامی امراء سے مل کر بغاوت اور بیرونی حملے کی سازش تیار کر رہا ہے مگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ کون کون سے امراء اس سازش میں شریک ہیں۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں سازشیوں سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی

جو سلطان کے وزیر اعظم قاضی فاضل کی دور بین نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکی۔ ہوا یہ کہ سازش کا ایک اہم مہرہ عبدالصمد کاتب جو قاضی فاضل سے بہت اچھے مراسم رکھتا تھا، ان دنوں سازش کی ادھیڑ بن کی وجہ سے کچھ بدحواس سا رہنے لگا تھا۔ ایک دن سر راہ اس کا قاضی فاضل سے آمنا سامنا ہو گیا۔ قاضی صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے مگر وہ خلاف توقع منہ پھیر کر [illegible] یا۔ قاضی صاحب بے حد ذہین آدمی تھے۔ سوچا کہ سلطنت کا اتنا بڑا عہدے دار جو سلطان کا [illegible] مجھ سے بلاوجہ تو بے رخی نہیں برت رہا۔ ممکن ہے اندر ہی اندر صلاح الدین کو مجھ سے خفگی ہو، لہٰذا ملاز [illegible] وں پر بھی اس کا اثر پڑا ہو۔

قاضی صاحب نے فوراً علامہ ابن نجیہ (زین الدین علی ابن نجا الواعظ) سے جو بڑے ہوشیار درباری تھے، ملاقات کی اور انہیں عبدالصمد کاتب کی بے رخی کی اصل وجہ معلوم کرنے کا کہا۔ ابن نجیہ نے پہلے صلاح الدین ایوبی کو ٹٹولا اور اطمینان کر لیا کہ وہ قاضی صاحب سے خفا نہیں۔ پھر عبدالصمد کاتب سے راہ و رسم بڑھا کر اسے شیشے میں اتار لیا۔ جلد ہی ان کو عبدالصمد کے واسطے سے سازشی عناصر میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ سازشیوں نے انہیں صلاح الدین کا مخالف جان کر اپنے منصوبے میں حصے دار بنانے کی کوشش کی۔ ابن نجیہ حقیقت جاننے کی نیت سے ان کی مجلسوں میں شریک رہے مگر موقع ملتے تفصیلات قاضی صاحب کے سامنے پیش کر دیں اور انہیں کہا:

''آپ فوراً آقا سے ملیں اور انہیں اس صورتحال سے آگاہ کریں۔''

قاضی فاضل نے یہ سب کچا چٹھا اپنے مربی کو کہہ سنایا۔ اب کسی رعایت کی گنجائش نہیں رہی تھی تا صلاح الدین ایوبی کے حکم سے ابن نجیہ مزید کئی دنوں تک دشمنوں کی صفوں میں رہ کر خبریں پہنچا۔ رہے۔ اس دوران ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ [1]

2 رمضان 569ھ (5 مئی 1174ء) کو عمارہ اور دیگر سرکردہ افراد کو جن میں عو عویرس، ابن عبدالقوی اور قاضی ابن کامل، نمایاں تھے، صلاح الدین ایوبی کے و نے اچانک گرفتار کر لیا۔ ان سب سے پوچھ گچھ کی گئی، انہوں نے سازش کا اقرار کر لیا۔ اس سے ان کا جرم ثابت ہو گیا۔ ابن عبدالقوی جسے بنو عبید کے خفیہ خزانوں کا علم تھا، سخت تفتیش سے گیا۔ صلاح الدین کے افسران نے تشدد سمیت ہر حربہ آزما کر اس سے عبیدیوں کے مدفون خزانوں کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی مگر اس نے زبان نہ کھولی اور مار کھاتے کھاتے مر گیا۔ اس کے بعد باقی سب سازشیوں کو بھی اسی دن شہر میں الگ الگ مقامات پر ان کے گھروں کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ سب

[1] الکامل فی التاریخ: 240/7

سے پہلے قاضی ابن کامل کو قتل کیا گیا۔ (1)

عمارہ شاعر اور قاضی فاضل میں شروع سے چپقلش چلی آتی تھی مگر جب اس بدقسمت کو تختۂ دار پر لے جانے کا فیصلہ ہوا تو قاضی صاحب انسانی ہمدردی کی بنیاد پر صلاح الدین ایوبی کی طرف متوجہ ہوئے اور عمارہ کی جان بخشی کی سفارش کرنے لگے۔ عمارہ دور ہونے کے باعث یہ گفتگو نہیں سن سکا تھا، اس نے یہی اندازہ لگایا کہ قاضی صاحب اس کے خلاف ایوبی کو بھڑکا رہے ہیں، وہ چلا کر بولا: ''حضور! میرے بارے میں اس شخص کی کسی بات پر کان نہ دھریں۔''

قاضی صاحب عمارہ کی اس بدگمانی سے جھنجھلا گئے اور مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔ صلاح الدین نے عمارہ سے کہا: ''قاضی صاحب تو تمہاری سفارش کر رہے تھے۔'' عمارہ سخت پشیمان ہوا۔ اب اس کی جان بخشی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس نے آخری امید کے طور پر کہا کہ قتل سے پہلے اسے قاضی صاحب کے پاس لے جایا جائے۔ اس کی خواہش کے مطابق سرکاری کارندے تختۂ دار پر لے جانے سے پہلے اسے قاضی صاحب کے گھر کی طرف لے گئے مگر قاضی صاحب نے گھر کا دروازہ بند کر لیا، قاضی صاحب کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ عمارہ نے بے ساختہ کہا:

عبد الرحيم قد احتجب　　　ان الخلاص هو العجب

''رحیم کے بندے نے بھی دروازہ بند کر لیا۔ اب تو چھٹکارا پا جانا یقیناً عجیب ہی بات ہوگی۔'' (2)

غرض عمارہ سمیت سب باغی سولی پر چڑھا دیے گئے۔ ساتھ ہی بغاوت میں شریک مصر کے مقامی سپاہیوں اور حبشیوں کا بالائی مصر کے دور دراز علاقوں میں تبادلہ کر دیا گیا۔ البتہ ترکمان سپاہیوں اور افسران پر ہاتھ نہ ڈالا گیا۔ انہیں اس خوش فہمی میں رہنے دیا گیا کہ ان کے بغاوت میں شریک ہونے کا کسی کو علم نہیں۔ ان کی وفاداریوں کو مزید پراگندہ ہونے سے بچانے کا یہی بہترین راستہ تھا۔ (3)

شام کے نصرانیوں کو سازش کی ناکامی کا بروقت پتہ چل گیا تھا اس لیے انہوں نے مصر پر فوج کشی نہ کی۔ البتہ سسلی اور یورپ کے فرمانرواؤں کو اس حقیقت کی کوئی خبر نہ تھی۔ چنانچہ وہ دو سو سے زائد بحری جہازوں کا زبردست بیڑا مصر پر حملے کے لیے روانہ کر چکے تھے جس کا رخ اسکندریہ کی طرف تھا۔ (اس حملے کی تفصیل آئندہ آئے گی)

<u>سلطان نور الدین کی وفات</u>: یورپی حملہ آوروں کی اس یلغار سے پہلے وہ مجاہدِ اعظم دنیا سے

(1) المختصر: 2/266
(2) نہایۃ الارب، تحت 569ھ
(3) ابن خلدون: 5/284، الکامل فی التاریخ: 7/240، کتاب الروضتین: 2/282-285

رخصت ہو گیا جس نے اس دور زوال میں فریضۂ جہاد کو ایک نئی آن بان کے ساتھ زندہ کیا تھا۔ سلطان نورالدین محمود زنگی جنہوں نے شریعت اور سنت کے چمن کی آبیاری کر کے ایک بار پھر عہد گزشتہ کے مثالی مسلم حکمرانوں کی یاد تازہ کر دی تھی، کئی ماہ تک خناق کی موذی بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار 12 شوال 569ھ (14 جون 1174ء) کو دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ شام کے ساحلوں سے نصرانیوں کو مکمل طور پر بے دخل کرنے کے لیے دن رات ایک کر دینے والا یہ جفاکش سپاہی اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے سے پہلے ہی موت کے سامنے زندگی کی بازی ہار گیا۔

موت سے صرف دس دن پہلے وہ ایک وفادار امیر سے زندگی کی بے ثباتی اور موت کی حقیقت پر بات چیت کر رہے تھے۔ امیر نے عرض کیا: "معلوم نہیں ہم اگلے سال پھر مل پائیں گے یا نہیں؟......" سلطان زنگی نے کہا: "یوں نہ کہو۔ پاک ہے وہ ذات جسے علم ہے کہ ہم اگلے ماہ بھی مل پائیں گے یا نہیں۔" اس گفتگو کے گیارہویں روز سلطان زنگی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ وفات سے قبل انہوں نے اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ابن شداد لکھتے ہیں: "نورالدین زنگی نے اپنے لڑکے الملک الصالح کو جانشین چھوڑا تھا۔"[1]

سلطان زنگی عالم اسلام کے ان گنے چنے رہنماؤں میں سے ایک تھے جن کے کردار میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی جھلک نمایاں تھی۔ بلاشبہ وہ دن کے شہسوار اور شب کے عبادت گذار تھے۔ دراز قامت، سانولی رنگت، کشادہ پیشانی اور دلکش نقوش والے اس مجاہد پر پہلی نظر پڑتے ہی ہر شخص یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس شخص کا پیکر شرافت و مروت کی مٹی سے تعمیر کیا گیا ہے۔

سلطان زنگی کی نگاہوں میں کسی فاتح کا قہرمانہ تاثرات میں کسی کشور کشا کا تکبر۔ دیکھنے والوں کو ان کے رویے میں شفقت اور مٹھاس گھلی دکھائی دیتی۔ ان کا چہرہ قدرتی طور پر تقریباً بے ریش تھا۔ صرف تھوڑی پر چند بال تھے جو وقار و حلم کے اس مجسمے پر بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اس کے باوجود رعب و دبدبے کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء ان کے سامنے گنگ ہو جاتے تھے۔ دشمن سینکڑوں میل دور پر ہوتا تب بھی زنگی کے نام سے تھر تھراتا تھا۔

اس دور میں سلطان زنگی کی سلطنت چند بڑی اسلامی سلطنتوں میں سے ایک تھی۔ شام کے علاوہ حرمین شریفین کے خطبوں میں بھی ان کا نام لیا جاتا۔ آخری سال میں یمن پر توران شاہ کے قبضے کے بعد وہاں عباسی خلفاء کا خطبہ شروع ہوا تو سلطان کا نام بھی شامل کر لیا گیا۔ حقیقت میں یہ درویش منش حکمران تمام مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہر مسجد اور ہر گھر میں ان کے لیے دن رات دعائیں کی جاتی

[1] النوادر السلطانیہ: ص 88، 91

تھیں۔ دلیری کا یہ عالم تھا کہ جنگوں میں بذات خود بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے۔ دو کمانیں ہاتھ میں لے کر اور دو ترکش کمر میں باندھ کر دشمن پر تیروں کا مینہ برساتے چلے جاتے۔ علامہ ابن اثیر الجزری نے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا ہے:

''میں نے گذشتہ بادشاہوں میں خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کسی حکمران کو نورالدین محمود سے زیادہ اچھی سیرت کا حامل اور عدل وانصاف کے قیام کے لیے کوشاں نہیں پایا۔''

نیز علامہ فرماتے ہیں:

''وہ رات کو کثرت سے نوافل پڑھا کرتے۔ اس میں اذکار و وظائف کا اہتمام کرتے ۔۔۔۔ وہ امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق فقہ سے اچھی طرح واقف تھے ۔۔۔۔ حدیث پاک دوسروں سے سنتے اور ثواب کی نیت سے خود بھی سناتے تھے۔''

سلطان کے زہد کا یہ عالم تھا کہ بیت المال سے صرف ضرورت کے مطابق وظیفہ لیتے تھے۔ ان کی اہلیہ رضیع خاتون نے خرچ کی تنگی کی شکایت کی تو حمص میں اپنی ملکیت کی تین دکانیں اس کے نام کر دیں جن سے سالانہ بیس دینار ملنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد بیوی نے اس پر بھی حالات کی تنگی کا شکوہ کیا تو سلطان نے کہا:

''میرے پاس یہی کچھ ہے۔ باقی جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے مسلمانوں کا ہے، میں صرف اس کا خزانچی ہوں۔ تمہاری خاطر خیانت کر کے جہنم کی آگ میں نہیں جلنا چاہتا۔''

اس مرتبے اور ان کمالات کے باوجود جہاد میں اپنی جان کے بے قیمت ہونے کا احساس اتنا جاگزیں تھا کہ بلاتردد حریف کی صفوں میں گھس جاتے۔ ایک دن فقیہ قطب نشاوی نے کہا:

''خدا کا واسطہ! اپنے آپ کو خطرے میں مت ڈالا کریں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو مسلمانوں کو دشمن کی تلوار سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

یہ سن کر سلطان نورالدین محمود نے تلخ لہجے میں کہا: ''محمود کی کیا حیثیت جو اس قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ میرے ذریعے ان شہروں اور اسلامی شعائر کی حفاظت کون کر رہا ہے؟ صرف وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''[۸]

سوز قلب کا یہ عالم تھا کہ نصرانیوں کے ناقابل تسخیر مرکز حارم پر حملے کے دوران وہ بے چین ہو کر اکیلے ایک ٹیلے پر چڑھ گئے تھے۔ یہاں سجدے میں سر رکھ مضطربانہ انداز میں چہرہ مٹی پر رگڑتے رہے۔ زبان سے کہہ رہے تھے:

''یا اللہ! یہ ہے تیرا بندہ اور یہ ہیں تیرے دوست۔ یا اللہ! یہ ہے تیرا بندہ اور وہ ہیں تیرے

۸ الکامل فی التاریخ: 7/242، 243، البدایہ والنہایہ: 7/789، 205، ... : 2/503، 306

دشمن۔ بس تو اپنے دوستوں کی اپنے دشمنوں کے خلاف مدد کر۔ یہ فضول محمود بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ الٰہی! چاہے محمود کی مدد نہ کر لیکن اپنے دین کی تو نصرت کر۔ بھلا محمود کتے کی کیا حیثیت کہ اس کی مدد کی جائے۔"[1]

مطلب یہ تھا کہ اگر میں اپنے اعمال کی وجہ سے نصرت کا حق دار نہیں تو میری وجہ سے مسلمانوں کو محروم مت فرما۔

جب فرنگیوں نے دمیاط پر حملہ کیا تھا تو نورالدین زنگی کی بے تابی انتہاء کو پہنچ گئی تھی۔ جب صلاح الدین ایوبی نے دشمن کو پسپا کر دیا تو اسی رات دمشق کے ایک امام مسجد نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "نورالدین کو بتا دو کہ آج رات فرنگی دمیاط سے واپس ہو گئے ہیں۔"

امام نے خواب ہی میں عرض کیا: "اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی نشانی بتا دیجیے جس سے وہ میری بات پر یقین کر سکیں۔" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "نشانی یہ ہے کہ وہ حارم کے ٹیلے پر سجدہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا، الٰہی! محمود کی مدد نہ کر لیکن اپنے دین کی نصرت کر۔ بھلا محمود کتے کی کیا حیثیت کہ اس کی مدد کی جائے۔"

یہ تہجد کا وقت تھا۔ امام صاحب نیند سے بیدار ہو کر سیدھے مسجد چلے آئے۔ نورالدین زنگی روزانہ اس وقت مسجد آ کر صبح صادق تک نوافل ادا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ آ گئے۔ امام صاحب نے خواب کہہ سنایا مگر اس میں کتے کا لفظ دہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔ تب زنگی نے کہا: "مجھے پوری بات سناؤ" امام صاحب پس وپیش کرتے رہے لیکن پھر زنگی کے شدید اصرار پر پورے الفاظ دہرا دیے اور نورالدین کے آنسو بہہ نکلے۔[2]

اسلام کے اس سپوت نے 58 برس عمر پائی۔ اتوار 17 شوال 511ھ (10 فروری 1118ء) کا سورج طلوع ہوتے وقت جنم لینے والا یہ مجاہد 11 شوال 569ھ کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔[3]

ان کی وفات کی خبر سے پورے عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ خصوصاً شام اور مصر کے مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی جو سلطان زنگی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اب ان کی نظریں سلطان کے کسی جانشین کو تلاش کر رہی تھیں جو ان جیسی قوت ایمانی، جہانداری اور جہانگیری کا نمونہ دکھلائے اور جہاد کی اس شمع کو روشن رکھے جسے سلطان مرحوم جلا کر گئے تھے۔

---

[1] الروضتین: 1/194 [2] الروضتین: تحت 569ھ [3] الکامل: تحت 569ھ

اسباقِ تاریخ

آپ نے دوسرے حصے کا مطالعہ کیا جو نورالدین کی جہادی مہمات کا ذکر کرتے ہوئے سالار شیرکوہ کے مصر جانے سے شروع ہوتا اور نوجوان یوسف کے الملک الناصر صلاح الدین بننے پر ختم ہوتا ہے۔ بغور مطالعہ کرنے سے ان واقعات میں بہت سے اسباق ملتے ہیں مثلاً:

- مسلم حکمرانوں کو ہمسایہ مسلم ممالک سے خیر خواہانہ تعلقات رکھنے چاہییں۔ اس سلسلے میں مسلکی تضادات اور مذہبی اختلافات کو بھی نظر انداز کرنا چاہیے۔ اگر نورالدین زنگی نے مصر کے بنوعبید کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا تو آگے چل کر خود شام بھی فرنگیوں کی زد سے نہ بچ پاتا۔
- بار بار عہد کی خلاف ورزیاں کرنے والے غدار اور مکار دشمن پر قابو پانے کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ صلاح الدین نے شاور کو موقع پاتے ہی اچک لیا اور شیرکوہ نے اس کا قضیہ نمٹا کر مصر کی سیادت حاصل کر لی۔
- مصلحتِ وقت کے تحت دوسرے مسلک و مذہب کے حاکم کی ماتحتی اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس سے مسلمانوں کا مفاد وابستہ ہو۔ اگر صلاح الدین نے مذہبی بنیاد پر عاضد کی نیابت اختیار کرنے سے احتراز کیا ہوتا تو بہت مشکل تھا کہ اگلے سو برسوں میں بھی مصر میں اہل سنت کا اقتدار قائم ہو پاتا۔
- سیاسی تدبیر اور موقع شناسی قابلِ تعریف ہے......اور بد عہدی مسلمان کی شان کے خلاف۔ مصر میں قدم رکھنے سے لے کر وہاں اپنی حکومت بنانے تک صلاح الدین نے کسی ایک موقعے پر بھی بدعہدی، مکروفریب یا دھوکہ دہی سے کام نہیں لیا۔ کامیاب سیاست وہی ہے جو اصولوں پر مبنی ہو۔
- حکومت ملنے کے بعد اللہ کی طرف توجہ اور اپنے اعمال کے احتساب کی توفیق ملنا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ اس حکمران سے کوئی بہت بڑا کام لینا چاہتے ہیں۔
- بدترین حکومتوں کا تسلسل دیکھ کر بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مصر کے مسلمانوں نے تین صدیاں

ظالم حکام کے چنگل میں گزار دیں۔ پھر ایک دن انصاف کی صبح طلوع ہوئی۔

- بعض اوقات ایک بات بہت ناگوار محسوس ہوتی ہے مگر اللہ نے اسی میں خیر رکھی ہوتی ہے۔ اگر اس میں کوئی خلافِ شریعت پہلو نہ ہو اور دوسروں کا فائدہ نظر آرہا ہو تو صرف اپنی مشقت کو دیکھ کر اس سے انکار نہیں کر دینا چاہیے خصوصاً جب وہ کوئی اجتماعی، خاندانی، ادارہ جاتی، معاشرتی، یا قومی بھلائی کا کام ہو۔ یوسف نے دل پر پتھر رکھ کر ایسی ناگوار مہم کو قبول کر لیا۔ اللہ نے بدلے میں اسے مصر کا تاج وتخت دے دیا۔
- اللہ کسی ایسے شخص سے بھی کام لے لیتے ہیں جس کا ماضی اتنا شاندار نہیں ہوتا مگر منصب دے کر اللہ اس کے دل کو بھی بدل دیتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے بعد صلاح الدین ایوبی کی حکومت بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔
- بعض اوقات دو مخلص قائدین میں بھی رنجش ہو جاتی ہے۔ ایسے میں چھوٹوں کو چھوٹا بن کر ہی رہنا چاہیے۔
- مخلص قائدین میں رنجش کی وجہ اکثر کوئی غلط فہمی ہوا کرتی ہے جسے بڑھانے میں حاشیہ بردار اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے خوشامدیوں اور لگائی بجھائی کرنے والوں سے چوکنا رہنا چاہیے۔ اگر خلوص، صاف گوئی اور درگزر کے اوصاف ہوں تو ایسی کدورتیں جلد مٹ جاتی ہیں اور اتحاد کا ماحول قائم رہتا ہے۔ زنگی اور ایوبی کے تعلقات اس کی مثال ہیں۔
- حکمران کو خفیہ اطلاعات کا شعبہ بہت فعال رکھنا چاہیے۔ عام افسران اور ماتحت بھی ایسے رکھنے چاہئیں جو ہوشیار اور چوکنا ہوں۔ صلاح الدین ایوبی کے خلاف سازشیں بروقت اطلاعات کی وجہ سے ناکام ہوتی رہیں۔
- بغاوت کے مرتکب لوگ اگر عقیدے اور نظریے کی بناء پر یہ اقدام کر رہے ہوں، کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں...... تو ان کی اصلاح بہت مشکل ہوتی ہے۔ ایسے خطرناک حریفوں کو مٹا دینا بہتر ہوتا ہے جیسا صلاح الدین نے طواشی، عمارۃ الیمنی اور دوسرے باغی امراء کے ساتھ کیا۔

باب:3

امرائے شام سے کشمکش

ذوالحجہ 569ھ (جولائی 1174ء)

......تا......

ربیع الاول 578ھ (20 جولائی 1182ء)

شخصیات

الناصر .... عباسی خلیفہ

الملک الصالح .... سلطان نور الدین زنگی کا جانشین

شمس الدین ابن دایہ .... حلب کا وزیر

سابق الدین ابن دایہ .... حلب کا پولیس افسر

بدر الدین حسن ابن دایہ .... حلب کا امیر

عز الدین جوردیک .... حاکم حماۃ، صلاح الدین کا پرانا دوست

ابن الخشاب .... حلب کا شیعہ رئیس

ن المقدم .... دمشق کا حاکم

ش تگین .... حارم کا امیر، الملک الصالح کا مشیرِ خاص

سیف الدین غازی دوئم .... مودود کا بیٹا، نور الدین زنگی کا بھتیجا، حاکم موٗ

عز الدین مسعود .... سیف الدین کا بھائی اور ا؟

عماد الدین .... سیف الدین کا بھائی، حاَ

ذُلفندار .... سیف الدین غازی کا سالار

الملک العادل .... صلاح الدین کا چھوٹا بھائی

توران شاہ .... صلاح الدین کا بڑا بھائی

سیف الاسلام طغت گین .... صلاح الدین کا چھوٹا بھائی

فرخ شاہ .... صلاح الدین کا بھتیجا، شام میں ان کا سپہ سالار اد

تقی الدین عمر .... صلاح الدین کا بھتیجا، سالار شام

ناصر الدین محمد .... صلاح الدین کا چچازاد بھائی

جاولی .... صلاح الدین کا سالار
شہاب الدین حارمی .... صلاح الدین کا ماموں
قطب الدین ینال بن حسان .... صلاح الدین کا مخالف شامی امیر
امیر مسعود زعفرانی .... صلاح الدین کا مخالف شامی امیر
سنان .... باطنیوں کا شامی پیشوا
بالڈون .... القدس کا نیا بادشاہ
ہمفری .... شام کا نصرانی سپہ سالار
ریمنڈ (قومص) .... طرابلس کا نصرانی حاکم
ریجی نالڈ (پرنس ارناط) .... کرک کا نصرانی حاکم

فصل:1

شام کی سیاسی ابتری اور صلاح الدین ایوبی کا کردار

نورالدین زنگی کے جانے کے بعد بھی خواہانِ ملت کو محسوس ہورہا تھا کہ اس مجاہد کے ادھورے کام کو وہی رجل رشید پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے جو شام کی بجائے مصر میں برسرِ اقتدار ہے، جو سلطان سے نسبی تعلق نہیں رکھتا مگر سلطان کے مقاصد اور اہداف کو ان کے بیٹوں، بھتیجوں اور دیگر رشتہ داروں سے زیادہ سمجھتا ہے۔

بلاشبہ مصر کے حکمران صلاح الدین ایوبی کے لیے اب وقت آگیا تھا کہ وہ اس ادھورے کام کی تکمیل کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیں جسے سلطان نورالدین شروع تو کر گئے تھے مگر ان کا کوئی خاندانی وارث اس کی تکمیل کا اہل نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ سلطان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے بیٹے الملک الصالح اسماعیل کو دمشق میں امرائے سلطنت کے ایک اجلاس میں جس میں ابن المقدم، قاضی کمال الدین ابوصلاح اور جمال الدولہ ریحان جیسے عمائد موجود تھے، نیا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا تھا مگر یہ گیارہ سالہ جانشین بھلا خود کیا کرسکتا تھا۔ اگر امراء اس سے پورا تعاون نہ کرتے تو اس کی حکومت ایک دن بھی نہیں چل سکتی تھی۔

شام کے امراء کے لیے سب سے مشکل سوال یہ تھا کہ دولتِ نوریہ کے طاقتور ترین ستون صلاح الدین ایوبی کو اب کیا حیثیت دی جائے۔ بہت سے امراء ایوبی کو شام کی سیاست سے باہر رکھنا چاہتے تھے۔ ابن المقدم اور حسام الدین حسین جیسے چند امراء کا کہنا تھا کہ صلاح الدین کو اپنے مشوروں میں شریک رکھا جائے اور ارکانِ سلطنت کی صف سے بے دخل نہ کیا جائے ورنہ وہ خودمختاری کا اعلان کر کے الملک الصالح کی حلقہ بگوشی سے آزاد ہوجائے گا یا مصر کی طاقت کے بل بوتے پر سب کو دبا کر الملک الصالح کا سرپرست بن جائے گا۔

مگر صلاح الدین کے ذہن میں ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ ہر مسلمان کی طرح صلاح الدین ایوبی نے بھی سلطان نورالدین کی وفات کی خبر نہایت غم کے ساتھ سنی۔ ان کو سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی

تھی کہ امراء الملک الصالح کی کم عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھائیں گے اور شام ایک نئی خانہ جنگ کا شکار ہو جائے گا۔ صلاح الدین کی خواہش تھی کہ اس موقع پر امرائے شام متحد ہو کر الملک الصالح کی اطاعت کریں اور خانہ جنگی سے دامن بچائیں۔

انہوں نے نورالدین زنگی کی وفات پر اپنے تعزیتی مراسلے میں امرائے شام کو تحریر کیا:

''اس حادثے سے کمر ٹوٹ گئی ہے۔ صبر اور ثبات کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ اللہ کی پناہ۔ اگر یہ امر واقع ہو گیا ہے اور موت کا عام حکم آقا نورالدین پر نافذ ہو گیا ہے تو اب حوادث اور مصائب ٹوٹ کر رہیں گے۔ بادشاہ اپنی مملکت کو اپنی اولاد کے لیے مستحکم کرتے ہیں اور اچھے پھل کے لیے اچھی زمین میں بیج ڈالتے ہیں۔ اللہ سے ڈرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے دلوں میں پھوٹ پڑ جائے اور دشمن کامیاب ہو جائے اور وہ نعمتیں جو زمانے نے تھک ہار کر حق داروں کو دے دی تھیں چھن جائیں۔ تم یکجان ہو جاؤ۔ ایک دوسرے کے دست و بازو بنو۔ ایسے دل بن جاؤ جو محبت سے جڑے ہوں۔ ایسی شمشیریں بن جاؤ جو ایک نیام میں جمع ہو جائیں۔ تنازعہ مت کرو ورنہ عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارا رعب جاتا رہے گا۔ عداوت ہر جگہ سے تمہاری گھات میں ہے۔ کفر ایمان پر حملہ کرنے کے لیے متحد ہے۔ ہم اس خانوادے کے حامی و مددگار ہیں۔ اس کی حفاظت کریں گے اور اسے کمزور نہ ہونے دیں گے۔ آقا نورالدین کی وصیت کی خبر ہمیں مل چکی ہے کہ ان کا بیٹا ان کا جانشین اور سعدالدین کمشتگین اس کا مشیر ہے۔ اگر اس وصیت کا اعلان ہو چکا ہے اور اسے قبول کر لیا گیا ہے اور تمام حاضرین اور غائبین نے اطاعت کر لی ہے تو بہتر ہے۔ یہی ہمارا مقصد ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم خود صاحبزادے کی نصرت کے لیے کمر بستہ ہیں۔ جو اس سے دشمنی کرے گا وہ ہمیں تلوار کی شکل میں پائے گا۔ اگر مجھے صاحبزادے اور آقا مرحوم کے وزراء اور امراء کے درمیان ہم آہنگی کی خبر پہنچی تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔''[۵]

صلاح الدین کی امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ امرائے شام نے ان کے مراسلے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ سلطان زنگی کے امراء اور گورنروں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے جن میں ایک طرف حلب کے شمس الدین ابن دایہ اور سعدالدین کمشتگین اور دوسری جانب دمشق کے شمس الدین ابن مقدم اور کمال الدین شہرزوری پیش پیش تھے۔

تجربے اور سن رسیدگی کے لحاظ سے حلب کے ابن دایہ کو سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا مگر وہ فالج میں مبتلا

۵ کتاب الروضتین: 220/2

تھا، اس لیے دمشق کے ابن مقدم کو مرکزی کردار مل گیا۔ ان امراء میں سے ہر ایک الملک الصالح کی کمزوری اور کم سنی سے فائدہ اٹھا کر یہ چاہتا تھا کہ الملک الصالح اس کی سرپرستی میں رہے اور وہ وزیر اعظم کے طور پر پورے ملک پر حکومت کرے۔ [1]

<u>سلطان ایوبی کی وفادارانہ روش</u>: صلاح الدین ایوبی اب بلا شک وشبہ مصر کے مطلق العنان حکمران تھے، وہ چاہتے تو زنگی خانوادے کی اطاعت کا رسی بجوابھی اپنی گردن سے اتار سکتے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ امرائے شام کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر اس سرسبز وشاداب ملک پر آسانی سے قبضہ کر سکتے تھے۔ الملک الصالح جیسے ناتجربہ کار اور کم سن حکمران کو شام سے بے دخل کر دینا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا، مگر وہ احسان فراموش نہ تھے۔ اپنے محسن سلطان نورالدین کے جانشین کی اعانت وحفاظت کرنا وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ سلطان نورالدین کی وفات نے ان کے دل میں زنگی خاندان کی بالادستی سے چھٹکارے کا لالچ پیدا نہیں کیا بلکہ اس کی بجائے انہوں نے زنگی کے جانشین کو سیاسی طالع آزماؤں سے بچانا اور اس کے تخت کے پائے مضبوط کرنا اپنی ذمہ داری تصور کیا۔ انہوں نے الملک الصالح کی اطاعت اور وفاداری کو اپنے لیے لازم سمجھا اور اس کا اظہار کرنے میں بھی دیر نہ لگائی۔

دمشق میں الملک الصالح کی تخت نشینی کی اطلاع ملتے ہی صلاح الدین نے اس کی اطاعت وفرمانبرداری کا اعلان کرتے ہوئے مصر میں اس کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا اور اپنے سفیر کو سلطان نورالدین کی وفات پر تعزیت اور نئے حکمران کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے دمشق روانہ کر دیا۔ سفیر نے اپنے آقا کے مراسلے کے ساتھ مصر میں ڈھالے جانے والے نئے سکے بھی بطور نمونہ پیش کیے جن پر الملک الصالح کا نام کندہ کر دیا گیا تھا۔ ایوبی نے اپنے مراسلے میں الملک الصالح کو اپنی اطاعت وخیرخواہی کا یقین دلاتے ہوئے لکھا تھا:

> ''4 ذی قعدہ بروز جمعہ آپ کے نام نامی پر خطبہ شروع کر دیا گیا ہے۔ بابرکت مقام اور سنجیدہ وصالح اجتماع (نماز جمعہ) میں آپ کے لیے دعائیں مانگی گئی ہیں۔ اس خادم نے اسلام کے نام پر اتحاد واتفاق قائم رکھا ہے کیونکہ اجتماعیت میں برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ آقا الملک الصالح کی بادشاہت کو قائم ودائم رکھے اور سلطنت کو ان کے ذریعے ان کے ہاتھوں ترقی عطا فرمائے۔ یہ خادم جس کام کی نیت کیے ہوئے ہے، یعنی آقا زادے کی حکومت کی نصرت وحمایت اور اس کی سلطنت کی توسیع کرنا، اللہ اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔'' [2]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: تحت 569_570ھ [2] کتاب الروضتین: 220/2

اس طرح صلاح الدین نے زنگی خاندان سے اپنی وابستگی برقرار رہنے کا عملی ثبوت پیش کر دیا تھا۔ "

حلب اور دمشق کے درباروں میں سیاسی جوڑ توڑ ❊ نورالدین زنگی کی وفات کے بعد حلب کا تختِ شاہی خالی تھا کیوں کہ الملک الصالح وہاں سے بہت دور دمشق میں تھا۔ حلب میں موجود امراء میں شمس الدین ابن دایہ سب سے عظیم المرتبہ تھا۔ اس کا بڑا بھائی مجد الدین ابن دایہ نورالدین زنگی کا رضاعی بھائی اور وزیر اعظم رہا تھا۔ رمضان 564ھ (جون 1169ء) میں وہ فوت ہوا تو زنگی نے شمس الدین ابن دایہ کو یہی مقام دے دیا۔ اس کے دو بھائی اور بھی تھے، ایک سابق الدین عثمان ابن دایہ جو حلب کا پولیس افسر تھا۔ دوسرا بدرالدین حسن ابن دایہ۔ یہ بھی چوٹی کے امراء میں شمار ہوتا تھا۔ شمس الدین ابن دایہ اگرچہ ضعفِ پیری اور فالج کا شکار تھا، مگر اسے حلب کے گورنر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ زنگی مرحوم کا سچا وفادار تھا اس لیے الملک الصالح کی حکومت کو ہر قیمت پر مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے الملک الصالح کو اپنے پاس حلب بلوانا چاہا۔ حلب، مرحوم سلطان زنگی کا دارالحکومت تھا اور اس کے بیٹے کا وہیں تخت نشین ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ابن دایہ نے دمشق کے گورنر امیر ابن مقدم کو کہلوا دیا کہ وہ الملک الصالح کو جو اس وقت اپنی ماں کے ساتھ دمشق میں تھا، حلب بھیج دے تاکہ اسے تخت پر بٹھایا جاسکے۔ بلاشبہ الملک الصالح کو فوراً حلب پہنچ کر باپ کی مسند سنبھالنا چاہیے تھی مگر دمشق کے گورنر ابن مقدم کو ڈر تھا کہ کہیں ابن دایہ الملک الصالح کا سرپرست بن کر سیاہ وسپید پر قابض نہ ہوجائے چنانچہ وہ الملک الصالح کی حلب روانگی میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہا۔ اس دوران زنگی مرحوم کا بھتیجا سیف الدین غازی دوئم جو کہ موصل کا حاکم تھا، شام پر قبضے کے لیے چڑھ دوڑا اور الجزیرہ تک کے علاقوں پر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر حاوی ہوگیا۔ الملک الصالح خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھا جب کہ اس کے امراء باہم اختلافات کے باعث اپنی قوت کھو چکے تھے اور سیف الدین غازی سے مدافعت کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

شروع میں سلطان ایوبی کو توقع تھی کہ امرائے شام الملک الصالح کے دست وبازو بن کر شام کو سنبھال لیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو سلطان کو خوشی ہوتی مگر اب صورتحال ڈانواں ڈول دیکھ کر انہوں نے بے ساختہ کہا:

"عہد و پیمان پورے کرانے اور خوش اسلوبی سے نظام مملکت چلانے کا سب سے زیادہ اہل میں ہوں۔ اگر شام میں یہی سیاست دان بااختیار رہے تو وحدتِ ریاست پارہ پارہ ہوجائے گی، مصر شام سے کٹ جائے گا اور اہل کفر کی امیدیں برآئیں گی۔"

❶ الکامل فی التاریخ: 7/243، 244

صلاح الدین ایوبی نے اپنے آقا زادے کی اس کسمپرسی پر اظہار رنج کرتے ہوئے ایک شکایت آمیز خط لکھ کر کم سن بادشاہ سے پوچھا کہ اس موقع پر مصر کے خدام کو کیوں یاد نہ کیا گیا کہ وہ حاضر ہو کر سیف الدین کی دست درازی کی روک تھام کرتے۔ انہوں نے دمشق کے امیر ابن المقدم کو خط لکھ کر شکایت کی کہ امرائے شام ایسے اقدامات کیوں کر رہے ہیں جن سے تفرقہ پھیل رہا ہے۔ شام کے ممتاز سیاست دانوں کو ان کے اہل خانہ اور بھائیوں سمیت کیوں حراست میں لیا جا رہا ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ شام کے معاملات اور نفع نقصان کا اثر براہ راست مصر پر پڑتا ہے اس لیے وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ سلطان کے اس شکایتی خط سے ابن مقدم سمجھا کہ سلطان نے شام پر فوج کشی کی تیاری کر لی ہے، اس نے سلطان کو تنبیہ کرتے ہوئے جواباً لکھا:

"ایسا نہ ہو کل آپ کے بارے میں کہا جائے کہ جس نے آپ کی نشو نما کی، آپ کو پالا، بنیاد فراہم کی، حکومت مصر عنایت کی آپ اسی کے گھر پر ڈاکا مارنا چاہتے ہیں۔ آپ کے اخلاق اور شرافت سے بعید ہے کہ آپ ایسا کوئی اقدام کریں۔"

سلطان نے اس کا تفصیل سے جواب دیا اور اپنے مراسلے میں لکھوایا:

"ہم اسلام اور مسلمانوں کے لیے صرف اتحاد اور وحدت قومی چاہتے ہیں۔ خانوادہ اتابک زنگی کا شجر سایہ دار سلامت رہے، ہم اس کی جڑوں اور پھلوں کی حفاظت کے خواہش مند ہیں اور اسے ضرر و شر سے بچانا چاہتے ہیں، کسی سے سچی وفاداری کا اظہار اس کے چلے جانے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کسی سے محبت کا مظاہرہ اس کے دشمنوں کی سازشوں کے کھل جانے پر ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میں الگ راہ کا مسافر ہوں اور بدگمانی کرنے والے کسی اور دنیا کے لوگ ہیں۔ ہمارا اصلاح احوال کرنا ایک خاص مقصد کے لیے ہے اور جو لوگ ہمیں اپنے سے دور کرنا چاہتے ہیں ان کا ایک الگ مقصد ہے۔ صلح جوئی کرنے والے کو جھگڑالو کہنا درست نہیں اور ہتھیار ڈالنے والے کو حملہ آور قرار دینا انصاف نہیں۔"[۵]

بہرحال اتابکی امراء نے اپنی اغراض اور ہوس اقتدار کی خاطر صلاح الدین ایوبی جیسے ہمدرد کو شام کے سیاسی معاملات سے الگ رکھنے کی پالیسی اپنائے رکھی حالاں کہ ان مشکلات میں صلاح الدین ایوبی ہی وہ واحد شخص تھے جو ان کے سب سے زیادہ کام آسکتے تھے مگر اتابکی امراء نے ان سے صلاح و مشورہ تک کرنا گوارہ نہ کیا۔ صلاح الدین ایوبی کی اس پر برہمی فطری بات تھی چنانچہ انہوں نے شام کے کم ہمت امراء کے نام اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا:

۵ کتاب الروضتین: 1/251 ج

"اگر سلطان نور الدین نے آپ میں سے کسی کو میرے برابر قابلِ اعتماد سمجھا ہوتا تو یقیناً اپنا سب سے بڑا صوبہ مصر اسی کے حوالے کرتے۔ اگر سلطان کی عمر دراز ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے لیے مجھے ہی اتالیق منتخب کرتے۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میرے آقا زادے کو مجھ سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال میں بہت جلد اس کی سرکار میں حاضر ہو کر اس کے والد کے احسانات کا بدلہ ایسی خدمت کے ذریعے دوں گا جو سب پر ظاہر ہو گی۔ اور میں تمہیں اپنے آقا کے شہروں کی حفاظت میں بدترین کوتاہی برتنے پر سزا بھی دوں گا۔"[۵]

یاد رہے کہ دمشق کے عمائد میں دو افراد، ایک قاضی کمال الدین شہروزی اور دوسرے حاکمِ شہر ابن المقدم سب سے زیادہ بااثر تھے۔ قاضی شہروزی صلاح الدین کو شام کی سیاست میں شامل کرنے کے خواہش مند تھے جبکہ ابن المقدم جو الملک الصالح کا اتالیق بن گیا تھا اس کا مخالف تھا۔ وہ اکثر امرائے شام کی طرح صلاح الدین سے خوف محسوس کرتا تھا اور الملک الصالح پر کسی اور کا سایہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ امرائے شام چاہتے تھے کہ مصر والے شام کے معاملات سے الگ ہی رہیں۔

<u>نصرانیوں کی بانیاس پر چڑھائی</u> ٭ ان دنوں شام کی عیسائی ریاستیں خاصا اطمینان محسوس کر رہی تھیں اور سلطان نور الدین کی موت سے فائدہ اٹھا کر اسلامی مقبوضات پر تازہ یلغار کے لیے اپنی قوت مجتمع کرنا چاہتی تھیں مگر ان کے اپنے حالات دگرگوں تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ القدس کا حاکم اطمرک جو کہ ان کا مرکزی قائد تھا، مر گیا تھا۔ ان پریشان کن حالات میں عیسائی مسلم مقبوضات پر کوئی بھرپور حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے موقع سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کرنے کے لیے دمشق کے نواحی قلعے بانیاس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر دمشق کے حاکم ابن المقدم نے جو ایک طرف سیف الدین غازی اور دوسری طرف صلاح الدین ایوبی کی فوجوں سے خوفزدہ تھا، محاصرہ کرنے والے نصرانیوں سے مذاکرات کیے اور کہا: "واپس چلے جاؤ ورنہ ہم موصل سے سیف الدین غازی اور مصر سے ایوبی کو بلوالیں گے، ان سے صلح کر کے تمہیں ہر طرف سے اس طرح گھیر لیں گے کہ تمہارے پاس مقابلے کی طاقت نہیں رہے گی۔" یہ سن کر عیسائی سوچ میں پڑ گئے۔ آخر انہوں نے دمشق والوں سے بھاری مال وزر لے کر اور اپنے بہت سے قیدی رہا کرا کے واپسی اختیار کر لی۔[۶]

اُدھر صلاح الدین ایوبی کو الملک الصالح کے قاصد سے بانیاس پر نصرانیوں کے حملے کی خبر ملی تو امدادی لشکر کے ساتھ فوری طور پر شام کی طرف روانہ ہو گئے مگر چار منازل طے کرنے کے بعد انہیں اطلاع ملی کہ عیسائی کچھ شرائط منوا کر واپس چلے گئے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی کو امرائے دمشق کا نصرانیوں کے

[۵] الکامل فی التاریخ: 7/243، 244، کتاب الروضتین: 2/334

[۶] الکامل فی التاریخ: 7/244، 245

سامنے اس قدر دب جانا سخت ناگوار گذرا۔ انہوں نے گیارہ ذی الحجہ 569ھ (12 جولائی 1174ء) کوفاقوس کے پڑاؤ سے دمشق کے بزرگ عالم دین علامہ ابن ابی عصرون کے نام اپنے خط میں لکھا:

''جونہی فرنگیوں کے حملے کی بابت الملک الصالح کا مراسلہ وصول ہوا، میں لشکر تیار کر کے امداد کے لیے روانہ ہوگیا۔ چار منازل طے کر چکا تھا کہ اہل دمشق اور فرنگیوں کے درمیان صلح کی خبر ملی جبکہ باقی اسلامی شہر اس صلح میں داخل نہیں ہیں حالانکہ ان کا دشمن ایک ہے۔ یہ مال اللہ کی امانت ہے جو کہ اطاعت اور امت کی مصلحت کے کاموں میں خرچ ہونا چاہیے، اسے ایسے گناہ کے مصرف پر لگانا جس سے اللہ، اللہ کا رسول اور صالحینِ امت کو ناراضی ہو، کیسے درست ہوگا۔ طبریہ کے قیدی اور سوار جو مسلمانوں کے سخت خطرناک دشمن ہیں فرنگیوں کو دے دیے گئے ہیں اور صلح کا ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ جب سے یہ اطلاع ملی ہے ہم آنے اور نہ آنے کے درمیان متذبذب ہیں، اگر ہم اپنا عزم پورا کر کے شام آتے ہیں تو لوگ ہمارے بارے میں بدگمانیاں کریں گے، اگر بیٹھے رہتے ہیں تو جن علاقوں (مصر وغیرہ) کو اس صلح میں داخل نہیں کیا گیا ان پر فرنگیوں کا حملہ کوئی بعید نہیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ شام آ کر امیر شمس الدین علی ابن دایہ اور ان کے بھائیوں کے پاس حاضری دیں جو کہ اس وقت کے ان خطرات سے باخبر ہیں جن کی تلافی کا وقت بعد میں نہیں رہے گا، کیوں کہ دشمن ہوشیار اور تیار ہے۔ اگر کچھ لوگ اس موقع پر ناراض ہوں تو ان کی ناراضی کی کیفیت بھی سامنے آجائے گی۔ آغاز میں غفلت نہ کی جائے ورنہ آخر میں پریشانی ہوتی ہے خصوصاً ایسے موقع پر۔ ہماری غیرت اللہ کے لیے ہے اور ہم صرف یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمان صحیح حکمت عملی اور مناسب لائحہ عمل پر جمع ہو جائیں۔ ہم نے اپنے لشکر کو بکھیرنے سے احتراز کیا ہے کہ کہیں دشمن حارم پر حملہ نہ کر دے کیوں کہ مسلمانوں سے مال وصول کرنے سے اس کی طاقت بڑھ گئی ہے۔ مگر جب تک اسے یہ علم ہے کہ ہم متحد ہیں تو اس کے قدم اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے اور وہ پیش قدمی نہیں کر سکتا۔'' [1]

انہوں نے الملک الصالح اور دیگر شامی امراء کو بھی مراسلے لکھ کر اس کمزور پالیسی پر احتجاج کیا جس سے کفار کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اپنے آقازادے کو یقین دلایا کہ اگر مصری افواج کو موقع دیا جائے تو وہ عیسائی حملہ آوروں کی قوت وشوکت کا زور توڑ کر رکھ دیں گی۔

ان خطوط سے شام کے بارے میں ایوبی کی پالیسی بہت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شام پر جبراً قبضے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے مگر وہاں نصرانیوں کی بالادستی کو برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ [2]

[1] کتاب الروضتین: 330/2

[2] کتاب الروضتین: 333/2_334

فصل:2

اِسکندریہ کا معرکہ

صلاح الدین ایوبی کے لیے اب شام کی سیاست سے لاتعلق رہنا ممکن نہ تھا لہٰذا وہ دمشق روانگی کے بارے میں سوچ بچار کر رہے تھے۔ مگر انہی دنوں انہیں نصرانیوں کے تازہ حملے سے پالا پڑ گیا جو بحیرہ رُوم کی جانب سے ہوا تھا۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ کچھ مدت پہلے عمارہ اور اس کے ساتھی اپنی سازش بے نقاب ہونے سے پہلے شام اور سسلی کے عیسائی حکمرانوں کی مصر پر حملہ کی دعوت دے چکے تھے۔ سازش کا راز افشا ہونے پر جب عمارہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا گیا تو شام کے نصرانیوں کو بروقت اس کی خبر ہوگئی لہٰذا وہ محتاط ہو گئے اور مقابلے پر نہ نکلے مگر سسلی کے بادشاہ کو اس کی اطلاع نہ مل سکی۔

صقلیہ کا بحری بیڑہ: شاہِ سسلی نے طے شدہ منصوبے کے مطابق مصر پر حملہ کرنے کی تیاری زور و شور سے جاری رکھی اور پھر ایک بہت بڑا لشکر لے کر بحیرہ رُوم کی لہروں کو چیرتا ہوا اِسکندریہ کی جانب بڑھا۔ اس بیڑے کے دو سو جہازوں میں صرف سپاہی، جب کہ 36 جہازوں میں گھوڑے، 40 میں خوراک و رسد کا سامان اور 6 میں جنگی ہتھیار اور آلات لادے گئے تھے۔ یہ بیڑہ پوری شان و شوکت سے 26 ذوالحجہ 569ھ (27 جولائی 1174ء) کو اسکندریہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔[۵]

پچاس ہزار پیادے اور ڈیڑھ ہزار گھڑ سوار منجنیقوں، دبابوں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ اسکندریہ کی فصیل اور سمندر کے درمیان پھیلے ہوئے میدان میں اترنے لگے تاکہ شہر کا محاصرہ کر لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمارہ کی سازش سے آگاہ ہو جانے کے باوجود مسلمانوں کو سسلی کے اس لشکر کی روانگی کا کوئی علم نہ تھا۔ اس لیے بحری قلعوں کی حفاظت کے انتظامات ناکافی تھے۔ اسکندریہ کی فوج بھی معمول سے زیادہ نہ تھی۔ پھر بھی اسکندریہ کے بہادر سپاہیوں نے باہر نکل کر حریف کو محاصرے سے روکنا چاہا مگر شہر

۵ کتاب الروضتین: 334/2

کے حاکم نے دشمن کی بھاری تعداد کے پیش نظر کھلے میدان کی لڑائی کی جگہ قلعہ بند جنگ کا فیصلہ کیا اور کمک کے لیے برق رفتار قاصد قاہرہ روانہ کردیے۔

اہل اسکندریہ کی بھرپور مزاحمت: آخر فرنگی سپاہیوں نے شہر کا محاصرہ کر کے حملہ شروع کردیا۔ پہلے دن زبردست لڑائی کے باوجود وہ فصیل کے قریب نہ آسکے۔ اسکندریہ کے مورچہ بند سپاہیوں نے تیراندازی، سنگ باری اور آتش زنی کے ذریعے انہیں فصیل سے دور رکھا۔ دوسرے دن فرنگیوں نے نئے جوش وخروش سے دھاوا بولا اور پے در پے حملے کرتے ہوئے دبابوں کو فصیل کے قریب لانے میں کامیاب ہوگئے۔ اسکندریہ کے مجاہدوں نے اس کے باوجود انہیں فصیل سر کرنے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ تعداد کی کمی کے باوجود وہ اس مہارت اور بے جگری سے لڑے کہ سسلی کے سپاہیوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

اس دوران مصر کے دیگر ساحلی قلعوں سے کئی دستے مسلمانوں کی مدد کے لیے پہنچ گئے جس سے ان کی ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے تیسرے دن باہر نکل کر فرنگی لشکر پر حملہ شروع کردیے۔ ان کے دستے مختلف گوشوں سے فرنگیوں کی صفوں پر حملے کر کے انہیں خاک وخون میں لوٹا رہے تھے۔ محاصرہ کرنے والے اب اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے اور ان کی بے ہنگم چیخ وپکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مسلمانوں نے آتش گیر مادے سے ان کے دبابے جلا ڈالے اور یوں ان کے محاصرے کی سب سے کارآمد چیز کو ختم کردیا۔ نصرانیوں نے اپنی عددی برتری کی بنا پر دن بھر جاری جنگ جاری رکھی مگر وہ مسلمانوں کے دباؤ کو ختم نہ کرسکے۔[1]

ایوبی کی یلغار: ادھر صلاح الدین ایوبی فرنگیوں کے حملے کی خبر سن کر قاہرہ سے تازہ دم فوج کے ساتھ بذات خود روانہ ہوچکے تھے اس کے ساتھ ہی احتیاطاً انہوں نے ایک فوج دمیاط کی حفاظت کے لیے بھی بھیج دی تھی۔

اسکندریہ کے لیے نکلتے ہی انہوں نے محصورین کی ہمت بندھانے کے لیے ایک ایلچی کو تین برق رفتار گھوڑے دے کر آگے روانہ کردیا تھا۔ ایلچی باری باری گھوڑے بدلتا ہوا دم لیے بغیر عصر کے وقت اسکندریہ پہنچا تو لڑائی کسی حتمی فیصلے کے بغیر رک چکی تھی۔ مسلمان زبردست جنگ جوئی کا مظاہرہ کرنے کے بعد شہر کی طرف لوٹ آئے تھے جبکہ عیسائی اپنے پڑاؤ کا رخ کرچکے تھے مگر جونہی ایلچی نے شہر میں داخل ہوکر قاہرہ سے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں امدادی فوج کی آمد کا اعلان کیا مسلمانوں نے دوبارہ ہتھیار سنبھال لیے۔ اس خوشخبری سے ان کی دن بھر کی تکان ایک لمحے میں دور ہوگئی۔ طبل جنگ

[1] الکامل فی التاریخ: 248/7

پر ایک بار پھر چوٹ پڑنے لگی اور اسکندریہ کے سپاہی شہر سے نکل کر فرنگیوں کی طرف لپکے۔ اسی اثناء میں صلاح الدین ایوبی کی آمد کی خبر نصرانیوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ صبح سے شام تک سخت ترین معرکے کے بعد ان میں دوبارہ لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ وہ تیزی سے اپنے بحری جہازوں کی طرف بھاگے۔

مغربی افق پر پھیلا سرخ شفق مسلمانوں کو فرنگیوں کے خیمے لوٹنا اور ان کے اسلحے کے ذخائر پر قابض ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے کو آڑ بنا کر بھاگنے والے فرنگیوں پر مسلمانوں کے پے در پے حملوں نے ہر طرف موت کے جال بچھا دیے تھے۔ فرنگیوں نے اپنی کشتیاں ساحل کے قریب منگوالی تھیں، ان کی آخری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ان میں سوار ہو کر اپنے بیڑے تک پہنچ جائیں مگر اس ہنگامۂ دارو گیر میں بیشتر فرنگی کشتیوں میں سوار نہ ہو سکے۔ اب کچھ دوبارہ ساحل کی طرف بھاگے اور کچھ سمندر میں غرق ہو گئے تاہم ان کی ایک اچھی خاصی تعداد کشتیوں میں بیٹھ چکی تھی۔ جب یہ کشتیاں ان سپاہیوں کو لے کر ساحل سے دور ہونے لگیں تو مسلم غوطہ خوروں نے کمال کر دیا۔ وہ زیرِ آب تیرتے ہوئے کشتیوں کے نیچے پہنچ گئے اور کئی کشتیوں کے پیندے پھاڑ ڈالے۔ بدقسمت کشتیاں سواریوں سمیت ڈوب گئیں۔ یہ دیکھ کر وہ فرنگی جو کشتیوں میں بیٹھنے کی امید لے کر ساحل پر جمع تھے مختلف سمتوں میں بھاگ نکلے۔[1] تاہم مسلمانوں نے انہیں جلد گھیر لیا۔ اب فرنگیوں نے بھی فرار کا خیال چھوڑ کر منظم انداز میں اپنا دفاع شروع کر دیا۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی اور اگلے دن دوپہر کو جا کر معرکہ تھما۔ سسلی کے سورماؤں کی بڑی تعداد قتل یا گرفتار ہو چکی تھی، جبکہ بحری جہازوں کے ذریعے جان بچا کر نکل جانے والوں کو اس رات کی دہشت انگیزی مدتوں نہ بھولی۔ یہ واقعہ یکم محرم 570ھ کا ہے۔[2]

اسوان میں کنز کی بغاوت اور سرکوبی: اسکندریہ کے اس معرکے کے بعد صلاح الدین ایوبی کو بالائی مصر کے علاقے اسوان کی طرف توجہ دینا پڑی جہاں ایک بااعتماد مصری افسر کنز الدولہ نے جو خفیہ طور پر دولتِ عبیدیہ کے احیاء کی تحریک چلا رہا تھا، بغاوت کر دی تھی۔ یہ بڑا ہوشیار شخص تھا اور مصر کے سوڈان کے ساتھ لگنے والے سرحدی علاقوں "بلاد النوبہ" کا نگران تھا۔ ایک سال قبل جب سوڈان کے لوگوں نے مصری سرحدات پر یلغار کی تیاری کی تھی تو کنز الدولہ نے شجاع بعلبکی کے ساتھ مل کر ان کے خلاف کارروائی شروع کی تھی۔ اس فتح یابی میں کنز الدولہ کا کردار نمایاں تھا۔ اس کی یہ خدمات صلاح الدین ایوبی کے ہاں اس کے اعتماد کو بڑھا رہی تھیں، کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر دولتِ عبیدیہ کا داعی ہے اور گلہ بانوں، کسانوں، بدوؤں، حبشیوں اور اوباش لوگوں کی بڑی تعداد اس کے ساتھ مل چکی ہے۔ ابن شداد لکھتے ہیں:

[1] البدایۃ والنہایۃ: تحت 569۔570ھ، تاریخ ابن خلدون: 5/285
[2] الکامل فی التاریخ: 7/250، الروضتین تحت 570ھ

''مصریوں کا ایک ممتاز شخص تھا جسے اسوان بھیجا گیا وہ وہاں کے امور انجام دیتا رہا، اس نے سوڈانیوں کی بھاری تعداد کو اپنے گرد جمع کرلیا اور انہیں امید دلاتا رہا کہ وہ ملک پر قابض ہو کر مصر کی (سابق) حکومت کو بحال کردے گا، ان لوگوں کے دلوں میں مصریوں کی عقیدت اس قدر تھی کہ انہیں کچھ بھی کرنا آسان لگتا تھا۔''

آخر کار 569ھ (1174ء) کے اواخر میں اس نے کھلم کھلا بغاوت کردی۔ اس کی جرأت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کے ایک امیر کو قتل کرڈالا جو ایک نامور سرکاری مصاحب ابوالہیجاء کا بھائی تھا۔ سلطان نے کنز کی سرکوبی کے لیے پہلے ابوالہیجاء کو اور پھر اپنے بھائی الملک العادل کو بھیجا۔ کنز ''قوص'' تک کے علاقوں کو تاراج کرچکا تھا مگر الملک العادل اور ابوالہیجاء نے بروقت پہنچ کر زبردست لڑائی کے بعد اسے شکست فاش دے دی۔ اس کارروائی کا آغاز 569ھ کے اواخر میں اور خاتمہ 7 صفر 570ھ (6 ستمبر 1174ء) کو ہوا تھا۔ یوں عبیدیوں کے رہے سہے وفاداروں کا بھی خاتمہ ہوگیا اور صلاح الدین ایوبی کو شام کے مسائل پر پوری توجہ دینے کی فرصت مل گئی۔ [1]

نوٹ: انہی دنوں میں مصری سرحدی علاقے ''صعید مصر'' میں بھی ایک شخص نے بغاوت کرکے ''قوص'' کو تاراج کردیا تھا۔ ابن ابی طے نے اس کا نام عباس بن شاذی بتایا ہے۔ اس کے خلاف بھی الملک العادل نے کارروائی کی تھی۔ بظاہر یہ کنز سے الگ کوئی شخص تھا۔ [2]

---

1. النوادر السلطانیہ ص 89، البدایہ والنہایہ تحت 569_570ھ، الکامل فی التاریخ: 7/751، کتاب الروضتین: 2/335_337
2. کتاب الروضتین: 2/339

فصل:3

صلاح الدین اور الملک الصالح

صلاح الدین ایوبی نے شام کی سیاسی ابتری پر قابو پانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اس کام میں تاخیر کی گئی تو سلطان نورالدین زنگی کی انیس سالہ جہادی کاوشوں پر پانی پھر جائے گا اور حلب کی وہ سلطنت جو بیت المقدس کو بازیاب کرانے کی طاقت حاصل کر چکی تھی، طوائف الملوکی کا شکار ہوکر نصرانیوں کے تازہ دم حملوں کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہ جائے گی۔ قاضی بہاؤالدین شداد شام کے سیاسی بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلطان نورالدین زنگی کا جانشین بچہ تھا، نہ ملک کا انتظام سنبھال سکتا تھا نہ اللہ کے دشمنوں سے اسلامی شہروں کا دفاع کرسکتا تھا۔ لہٰذا سلطان صلاح الدین ایوبی نے شام کی جانب کوچ کی تیاری کی کیوں کہ وہ اسلامی ممالک کا مرکزی علاقہ تھا۔"[5]

حلب کی صورتحال: شام کے دارالحکومت حلب کی سیاسی صورتحال بہت سنگین تھی۔ سلطان نورالدین زنگی کا تخت ابھی تک خالی تھا، ولی عہد شہزادہ الملک الصالح پایۂ تخت سے دور دمشق کے امراء کے ہاتھوں یرغمال تھا۔ تخت کے خالی ہونے کی وجہ سے دارالحکومت کے امراء کی باہمی چپقلش شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ زنگی کے سب سے پرانے نمک خوار شمس الدین ابن دایہ نے قائم مقام حاکم کے طور پر پایۂ تخت کا انتظام سنبھال لیا تھا مگر وہ شہر میں امن و امان کو پوری طرح برقرار رکھنے میں ناکام تھا۔ امرائے شہر شیعہ سنی فسادات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ شہر کے شیعہ رئیس ابن الخشاب نے شیعوں کو اپنے گرد جمع کرلیا تھا جس کے ردعمل میں اہل سنت اولادِ دایہ کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ اس طرح شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھے، شیعوں نے کئی ممتاز سنی شہریوں کی املاک، وقف جائدادیں اور رفاہی سامان کے گودام لوٹ لیے۔ شمس الدین ابن دایہ نے یہ دیکھا تو شہر کے منتظم شاد بخت سے کہہ

[5] النوادر السلطانیہ: ص 92

کر شیعوں کے خلاف پولیس کو متحرک کر دیا اور عام سنیوں کو حکم دیا کہ ابن الخشاب کا گھر لوٹ لیں۔

گمش تگین شام کی بساطِ سیاست کا نیا کھلاڑی ☸ یہ تو پایہ تخت کے اندرونی حالات تھے مگر ایک اور خطرہ بھی سر پر تھا۔ موصل کا حاکم سیف الدین غازی حلب پر قبضے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس صورتحال میں حلب کے حاکم شمس الدین ابن دایہ نے فیصلہ کیا کہ امرائے دمشق کو حلب پر سیف الدین غازی کے حملے کے خطرے سے ڈرا کر رضامند کیا جائے کہ وہ اب بلا تاخیر الملک الصالح کو حلب روانہ کر دیں تاکہ تخت نشینی کی رسم ادا کی جائے۔ شمس الدین ابن دایہ نے امرائے دمشق کو سمجھانے کے لیے اپنے طور پر موزوں ترین انسان کو چنا۔ یہ سعد الدین گمش تگین نامی ایک خواجہ سرا تھا۔ نور الدین زنگی کا خادم خاص اور انتہائی ذہین و فطین انسان۔ مگر ابن دایہ کو اندازہ نہ تھا کہ گمش تگین پر اعتبار کر کے وہ کتنی بڑی غلطی کر رہا ہے۔

گمش تگین جب حلب سے دمشق روانہ ہوا تو وہ محسوس کر رہا تھا کہ قسمت اسے شام کا سب سے بڑا سیاسی کھلاڑی بننے کا موقع دے رہی ہے اور وہ اس موقعے سے باآسانی فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ ولی عہد کو اپنی مٹھی میں لے سکے اور پھر اس کے ذریعے حلب کے ان سرکردہ امراء کو بساطِ سیاست سے ہٹا سکے جو اس کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔

گمش تگین اسی عزم کے ساتھ دمشق پہنچا۔ اپنی ذہانت اور طاقتِ لسانی کی بدولت وہ امرائے دمشق کو سیف الدین غازی کے خطرے کا احساس دلانے میں کامیاب رہا اور انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ الملک الصالح کو حلب جانے دیں۔ اس دوران اس نے الملک الصالح کو بھی اپنی وفاداری اور خلوص کا پختہ یقین دلا دیا تھا۔

الملک الصالح، اپنی ماں سمیت 23 ذی الحجہ 569ھ کو (4/اگست 1173ء) دمشق سے حلب روانہ ہو گیا۔ اس قافلے میں خاندان دایہ کا ایک فرد سابق الدین ابن دایہ اور فوجی جرنیل عز الدین جوردیک بھی تھے۔ گمش تگین راستے میں سائے کی طرح الملک الصالح کے ساتھ رہا، اس نے حلب کے دو بڑے سیاسی کھلاڑیوں شمس الدین ابن دایہ اور ابن الخشاب کا پتا صاف کرنے کے لیے شہزادے کے کان خوب بھرے اور اسے بتایا کہ حلب کے شیعہ سنی فسادات میں یہ دونوں برابر کے شریک تھے۔ اس نے الملک الصالح کو باور کرا دیا کہ اولادِ دایہ رعایا کے جان و مال پر دست درازی کر رہی ہے اور ابن الخشاب شیعوں کو شہ دے رہا ہے، لہٰذا دونوں پر قابو پانا ضروری ہے۔ الملک الصالح نے اس کی باتوں میں آ کر فیصلہ کر لیا کہ وہ حلب پہنچتے ہی اولادِ دایہ اور ابن الخشاب دونوں کا قصہ تمام کر دے گا، اس نے امیر عز الدین جوردیک کو سمجھا دیا کہ حلب پہنچتے ہی اولادِ دایہ کو قابو کر لے۔ جب یہ قافلہ حلب کی فصیل کے

سامنے پہنچا تو حسن ابن دایہ اپنے آقازادے کے استقبال کے لیے پاپیادہ آگے بڑھا مگر عزالدین جوردیک نے اسے روک کر ڈانٹا اور حراست میں لے لیا۔ اولادِ دایہ میں سے سابق الدین ابن دایہ اسی قافلے میں شامل تھا۔ اسے بھی گرفتار کر لیا گیا۔

الملک الصالح حلب کے قلعے میں داخل ہوا تو شمس الدین ابن دایہ کو جو فالج کی حالت میں بستر پر پڑا تھا گھسیٹ کر حاضرِ خدمت کیا گیا۔ الملک الصالح کے ایک خادم نے آگے بڑھ کر اس زور کی ٹھوکر رسید کی کہ وہ منہ کے بل زمین پر جا گرا اور پیشانی سے خون جاری ہو گیا۔ اس کے ضعف، بیماری اور بڑھاپے پر رحم کیے بغیر اسے اس کے پورے خاندان سمیت قلعۂ حلب کے اندھے کنوئیں میں پھینکوا دیا گیا۔ یہ سب کچھ گمشتگین کے اشارے پر ہو رہا تھا۔

اولادِ دایہ کے بعد اس نے بلا تاخیر شیعہ رئیس ابن الخشاب کو ٹھکانے لگانے کا بھی منصوبہ بنا لیا۔ ابن الخشاب فسادات کے بعد حکومتی کارروائی کے ڈر سے روپوش تھا۔ اسے الملک الصالح کی انگوٹھی بھیج کر جان کی امان دینے کا وعدہ کر لیا گیا۔ ابن الخشاب نے مطمئن ہو کر روپوشی ختم کر دی اور شیعوں کے ایک جتھے کے ساتھ الملک الصالح سے ملنے قلعے کے سامنے آیا۔ مگر قلعے میں داخل ہوتے ہی اسے قتل کر دیا گیا اور اس کا کٹا ہوا سر نیزے پر ٹانگ کر قلعے کے برج زیتون پر نصب کر دیا گیا۔ [1] یوں گمشتگین کے راستے کے تمام کانٹے نکل گئے۔ یہاں سے اس کا دورِ عروج شروع ہوتا ہے۔ اولادِ دایہ کو قید کرا دینے کے بعد ریاست حلب کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ حلب کے سیاہ و سپید کا مالک اور الملک الصالح کا سرپرست بن گیا۔ اس کی ناپاک سیاست سے زنگی مرحوم کے اکثر وفادار معتوب بن گئے یا پس منظر میں چلے گئے۔ [2]

ایوبی کا سفرِ شام ❊ گمشتگین کا یہ ہولناک روپ دیکھ کر دمشق کا گورنر ابن مقدم کانپ گیا، یہ نیا شکاری اسے بھی نشانہ بنا سکتا تھا اور دمشق پر کسی بھی وقت قبضہ کر سکتا تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر اس نے بہتر سمجھا کہ دمشق کو موصل کے حاکم سیف الدین غازی دوئم یا سلطان صلاح الدین ایوبی کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ گمشتگین سے بدلہ لے سکیں اور الملک الصالح کو اس کے پنجے سے چھڑا لیں۔ [3]

جب یہ پیش کش سیف الدین غازی دوئم کو موصول ہوئی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید یہ اس کی زندگی کا سب سے سنہرا موقع تھا جب شام کی حکومت ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اگر وہ یہ دعوت

---

1. تاریخ اسلام ذہبی: 67/40 ش
2. الکامل فی التاریخ: سن 569ھ کے حالات
3. کتاب الروضتین: 342/2

قبول کر لیتا تو صلاح الدین ایوبی کے شام میں داخلے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور شاید تاریخ میں ایوبی کا نام صرف مصر کے ایک حکمران کے طور پر نظر آتا مگر سیف الدین غازی کے دربار میں بڑے بڑے احمق موجود تھے جن میں سے ایک اس کی فوج کا سپہ سالار عز الدین محمود زُلفندار تھا۔ اس پیش کش پر اس کے کان کھڑے ہو گئے اور اس دعوت کو سازش سمجھ کر اس نے سیف الدین کو خبردار کیا کہ وہ ہرگز دریائے فرات سے پار نہ جائے ورنہ حلب اور دمشق والے مل کر اسے گھیر لیں گے۔ سیف الدین غازی ٹھٹک گیا اور اس نے ابن مقدم کی دعوت کا کوئی مثبت جواب نہ دیا۔ اس کی بجائے اس نے حلب والوں سے صلح کر لی تاکہ کم از کم وہ ان کی طرف سے کسی خطرے سے بے فکر ہو جائے۔

اب ابن مقدم اور دمشق کے امراء کا یہ اندیشہ مزید بڑھ گیا کہ گمشتگین کسی بھی وقت دمشق پر چڑھائی کر دے گا چنانچہ انہوں نے صلاح الدین کو خط لکھا کہ وہ آکر دمشق کا اقتدار سنبھال لے۔ صلاح الدین ایوبی پہلے ہی شام کے بارے میں فکر مند تھے۔ یہ پیغام ملتے ہی وہ صرف سات سو سپاہیوں کے تیز رفتار دستے کے ساتھ قاہرہ سے شام روانہ ہو گئے۔ [1] ......شیخ عماد کاتب کا بیان ہے کہ سلطان ایوبی یکم صفر 570ھ (/31 اگست 1174ء) کو قاہرہ سے نکلے اور برکہ میں پڑاؤ کر کے ایک ماہ تیرہ دن ٹھہر کر فوج جمع کرتے رہے، پھر 13 ربیع الاول (/11 اکتوبر) کو بلبیس کی طرف کوچ کیا اور دمشق جانے کے لیے صدر، ایلہ، سرئی اور بصریٰ کا راستہ اختیار کیا تھا۔ نصرانیوں کے حملوں کے خطرات کے باوجود وہ خطرناک صحرا اور سنسان راستوں کو تیزی سے پھلانگتے ہوئے شام کے سرحدی شہر بصریٰ پہنچ گئے۔ درحقیقت انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ ان کے پاس گنتی کے سپاہی اور معمولی سی رقم تھی۔ ان کی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بصریٰ کے حاکم کو صلاح الدین ایوبی کے وزیر باتدبیر قاضی فاضل سے حیرت زدہ لہجے میں کہنا پڑا:

''تمہارے ساتھ کوئی فوج نظر نہیں آتی جب کہ یہ ملک کسی بڑے لشکر کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ فرض کرو! اگر مقامی امراء تمہیں شہروں میں داخل ہونے سے ایک دن کے لیے بھی روک دیں تو تمہیں دیہات کے لٹیرے ہی لوٹ لیں گے۔ ہاں اگر تم مال و دولت کی کافی مقدار ساتھ لائے ہو تو لشکر کے بغیر بھی کام نکل سکتا ہے۔''

قاضی فاضل نے مسکرا کر کہا:

''ہمارے پاس مال کی کمی نہیں۔ ہم پورے پچاس ہزار دینار ساتھ لائے ہیں۔''

[1] کتاب الروضتین: 342/2

چوں کہ یہ رقم امراء کو خریدنے کے لیے بہت کم تھی اس لئے قاضی فاضل کا جواب سن کر بُصریٰ کا حاکم ہکا بکا رہ گیا اور پھر اپنا سر پیٹ کر چلایا:

''ارے تم خود بھی مرے اور ہمیں بھی مروا دیا۔''

حقیقت یہ تھی کہ قاضی فاضل نے پچاس ہزار دینار بھی زیادہ بتائے تھے۔ صلاح الدین ایوبی کے پاس اخراجات کے لئے صرف دس ہزار دینار تھے۔ [1]

صلاح الدین ایوبی کے نیک مقاصد ✵ صلاح الدین ایوبی نے اب تک شام پر قبضے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ وہ صرف شام کی سیاست کو سدھارنا اور اسے ان نقائص سے پاک کرنا چاہتے تھے جو فرنگیوں کی بالادستی اور مضبوطی کا باعث بن سکتے تھے۔ تاہم حالات کا بے لاگ تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شام کو فرنگیوں سے بچانے کا اصل اور پائیدار حل یہی تھا کہ وہاں منتشر اور رُو بہ زوال اتابکی سلطنت کا خاتمہ کر کے ایک نئی مضبوط حکومت قائم کی جاتی کیوں کہ ابھی تک شام کے ساحلوں پر نصرانیوں کی متعدد مضبوط ریاستیں موجود تھیں، القدس بدستور ان کے قبضے میں تھا اور پورا یورپ ان کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ ان سے شام کا دفاع ایک مضبوط و متحد بڑی حکومت کے بغیر ناممکن تھا جبکہ یہاں زنگیوں کی سلطنت موصل، حلب اور دمشق کے تین بڑے خود مختار ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ان کے علاوہ خود مختاری کے دعوے دار چھوٹے چھوٹے قلعہ دار بھی کم نہ تھے جن میں سے ہر ایک خود کو مستقبل کا ''شاہ'' تصور کیے ہوئے تھا۔

سیف الدین خود اپنے ہم مذہبوں کے شہروں کو تاراج کر رہا تھا اور فرنگیوں کو مال و زر دے کر ان سے دوستی گانٹھ رہا تھا۔ دیگر امراء بھی اپنی اپنی اغراض اور مفادات کے تحفظ میں مشغول تھے۔ ارضِ مقدس کو بازیاب کرانے کا جذبہ فراموش ہو چکا تھا۔ الملک الصالح جیسے کم عمر اور بھولے بھالے حکمران کی آڑ میں سیاست بازیچۂ اطفال بنا دی گئی تھی، پس جعل سازی کے پرتوں میں لپٹی اس کمزور حکومت کو ختم کیے بغیر شام میں نصرانیوں کے خلاف جہاد ناممکن تھا۔

یہ تمام حالات سلطان صلاح الدین ایوبی کے سامنے تھے اور وقت کا تقاضا بھی یہی تھا مگر اس کے باوجود وہ امرائے شام کو اپنی اصلاح کا موقع دے کر ان پر اتمام حجت کر دینا چاہتے تھے۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہوتی تو پھر آخری راستہ نئی حکومت کے قیام کے سوا کچھ نہ تھا۔ مذکورہ حالات کے پیش نظر شام کی سیاست کے بارے میں سلطان کی پالیسی پر اس بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی کہ سلطان نے حب جاہ اور ہوس اقتدار کے تحت شام میں دخل اندازی کی۔ اس بارے میں سلطان اس قدر نیک نیت تھے کہ اس

[1] الکامل فی التاریخ: 261/7

کا خود یورپی مؤرخین کو اعتراف ہے۔ لین پول لکھتا ہے:

''جب تک صلاح الدین کو یقین نہ ہو جاتا کہ مسلمانوں کے عام مفادات خصوصاً ان کے دین کی حفاظت کے لیے مداخلت ضروری ہے وہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے سے احتراز کرتا۔ اسے ایک ایسے شخص (الملک الصالح) کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ حاصل کرنے کی ہوس نہ تھی جس سے قریبی تعلقات تھے اور اس کا باپ صلاح الدین ایوبی کا آقا اور سرپرست رہ چکا تھا۔ شام کی حالت ایسی تھی کہ جو کچھ صلاح الدین ایوبی نے کیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔''[5]

دمشق میں استقبال: 29 ربیع الاول 570ھ (27/ اکتوبر 1174ء) کو صلاح الدین ایوبی دمشق پہنچے جو چند سال پہلے تک ان کا وطن تھا۔ انہیں بلانے والے امراء نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ صلاح الدین نے اپنے والد کی حویلی دار العقیقی میں قیام کیا۔ انہوں نے امراء کو زنگی خانوادے کے لیے اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا، علماء اور اہل فضل کی عزت و تکریم کی۔ انہوں نے تجارتی ٹیکس کی معافی کا اعلان کر کے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔

دمشق کے قلعے کے نگران جمال الدولہ ریحان نے قلعہ حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سلطان نے اسے پیغام بھیجا اور کہا:

''میں ملک الصالح کا غلام ہوں، ان کی مدد و نصرت کے لیے آیا ہوں۔ میں چھینے گئے شہر انہیں واپس دلاؤں گا۔''

دمشق کے قاضی کمال الدین شہرزوری نے بھی قلعہ دار کو سمجھایا اور آخر کار قلعے کے دروازے بھی کھل گئے۔ صلاح الدین ایوبی نے دمشق سے مصر مراسلہ بھیجا تو اس میں لکھا:

''ہمارے بصریٰ پہنچنے کے دن اور اس سے پہلے ترکوں اور کردوں کی افواج، امراء، عرب بدو اور سردار نیز گرد و نواح کے لوگ بکثرت جمع ہو گئے۔ دمشق سے خطوط پر خطوط آ رہے تھے۔ مراسلہ نگار اگرچہ خود موجود نہ تھے مگر پیغام دے کر کہتے تھے کہ شہر اطاعت کے لیے تیار ہیں اور کامیابی قریب ہے۔''

دوسرے مراسلے میں لکھتے ہیں:

''24 ربیع الاول کو ہم نے بصریٰ سے کوچ کیا۔ والیٔ بصریٰ نے ہر طرح سے خدمت کی۔ ہفتہ 27 ربیع الاول کو چچا اسد الدین شیرکوہ کے بیٹے ناصر الدین اور امیر سعد الدین بن انر کے لڑکے

[5] صلاح الدین (لین پول)، ص:65

سے ملاقات ہوئی۔ اتوار کو دمشق کے چوبی پل پر پہنچے جبکہ دمشق کے سپاہی استقبال کے لیے آرہے تھے۔ پیر 29 ربیع الاول کو ہم سوار ہوئے اور دمشق پہنچے۔ چند افراد نے مزاحمت کی جن کو لشکر نے قرار واقعی سزادی۔ دمشق میں داخل ہو کر ہم اپنے والد کی حویلی میں ٹھہرے۔ لوگوں کے دل خوش کرنے کے لیے محصول تجارت معاف کرنے کی منادی کرادی۔ پہلے یہاں حکومت ابتر اور مسرف تھی۔ ظالموں کے ہاتھ دراز تھے۔ اب ہم نے احکامِ شرعیہ کی پابندی شروع کرادی ہے اور امت کو ان مظالم سے بچالیا ہے۔"[1]

<u>حلب کے سفیر کی سخت کلامی</u> ✿ حلب میں الملک الصالح کے گرد جمع ہونے والے امراء کو صلاح الدین ایوبی کے دمشق پر قابض ہونے کی اطلاع ملی تو وہ سخت مشتعل ہوئے اور انہوں نے چند دنوں بعد امیر قطب الدین ینال بن حسان کو ایک دھمکی آمیز مکتوب دے کر دمشق بھیجا۔ یہ نامی گرامی امیر شیر کوہ کے ساتھ مصر کی فتح میں شریک رہا تھا۔ صلاح الدین کو اس کی آمد کی خبر ملی تو خود اس کا استقبال کیا اور اعزاز واکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ تیسرے دن اسے باقاعدہ ملاقات کا موقع دیا۔ ینال بن حسان کے نزدیک صلاح الدین کی حیثیت ایک نوعمر معاصر کی تھی۔ اس نے حلب والوں کا مراسلہ پڑھ کر سناتے ہوئے کہا:

"تم نے جن تلواروں سے مصر فتح کیا ہے وہ ہمارے ہاتھوں کی تھیں، جن نیزوں سے اہل مصر کے ایوانوں پر قبضہ کیا ہے وہ ہمارے کاندھوں پر تھے، جن سپاہیوں کو تم لے کر آئے ہو وہی کل کو تمہارے خلاف کھڑے ہوں گے۔ تم جس چیز کے درپے ہو وہی تم کو ہلاک کرے گی۔ تم نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے، اپنے اختیارات کی مقررہ حد عبور کی ہے، تم فقط نورالدین زنگی کے غلام ہو، تمہارا کام صرف یہ تھا کہ زنگی کے جانشین کی حفاظت اور اطاعت کرتے۔"

صلاح الدین نے اس دُرشت کلام کو صبر و تحمل سے سنا، کچھ دیر سر جھکائے رکھا اور ان باتوں کی سختی کو نظر انداز کر کے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا:

"دیکھو بھائی! میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی وحدت برقرار رہے، امورِ حکومت درست رہیں، رعایا کے حقوق کی نگہداشت ہو، سرحدوں کی حفاظت کی جائے، سلطان زنگی کے لڑکے کی صحیح تربیت ہو اور زیادتی کرنے والوں کی زیادتیوں کا ازالہ کیا جائے۔"

ابن حسان نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا:

[1] کتاب الروضتین: 241/2

''تم صرف اس لیے آئے ہو کہ اپنی ذاتی حکومت قائم کرو اور اپنے اقتدار میں اضافہ کرو۔ ہم اس بارے میں ہرگز تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ تم نے جو منصوبے بنائے ہیں، ان کا پورا ہونا مشکل ہے، اس کے لیے تم کو کانٹوں میں گھسنا پڑے گا، جگر چھلنی کرانا ہوگا، بچے یتیم کرانے ہوں گے۔''

ایوبی نے ان کڑوی باتوں کو مسکرا کر سنا اور خدام کو اشارہ کیا کہ ان بزرگوار کو لے جائیں کیونکہ خطرہ تھا وہ ہاتھا پائی پر نہ اتر آئیں۔ ¹

امیر زعفرانی کا رنگ ٭ دمشق میں صلاح الدین ایوبی سے اظہار وفاداری کرنے والوں میں نورالدین زنگی کا ایک امیر فخرالدین مسعود زعفرانی بھی شامل تھا۔ حمص، حماۃ، قلعہ بعرین، سلمیہ، تل خالد اور رہا جیسے علاقے اس کی جاگیر میں شامل تھے۔ ان تمام مقامات پر سلطان نورالدین زنگی کے مختلف قلعہ دار اس کی نیابت میں کام کرتے تھے۔ زعفرانی بڑا سخت گیر انسان تھا، رعایا اس کی زیادتیوں سے نالاں تھی۔ نورالدین زنگی کی وفات کے بعد زعفرانی کے قلعہ دار تو اپنے اپنے قلعوں میں جمے رہے کیونکہ وہ فوجی ملازم تھے مگر زعفرانی کا اپنی جاگیروں میں رہنا دوبھر ہوگیا کیوں کہ وہ لوگوں کے احتجاج سے خوفزدہ تھا۔ چنانچہ زعفرانی تو دمشق چلا آیا اور پیچھے تمام قلعہ دار اپنی اپنی جگہ آزاد ہو گئے۔

جب صلاح الدین ایوبی یہاں آئے تو زعفرانی کوئی بڑا منصب پانے کی خاطر ان سے ملا مگر اس رجل رشید کو اللہ نے مردم شناسی کی خاص صلاحیت دی تھی اس لیے وہ اس کے مرتبے، وجاہت اور اظہار اطاعت سے ذرا متاثر نہ ہوئے اور اسے کوئی عہدہ نہ دیا۔ اس پر یہ تلملا کر واپس چلا گیا اور بعرین کے قلعے میں مورچہ بند ہوگیا۔

حمص کا محاصرہ ٭ چند دنوں بعد صلاح الدین ایوبی نے دمشق میں اپنے بھائی سیف الاسلام طغتگین کو نائب کے طور پر چھوڑا اور خود یکم جمادی الاولیٰ 570ھ (28 نومبر 1174ء) کو حمص کا رخ کیا، 11 تاریخ کو وہ شہر کے سامنے جا پہنچے، شہر میں داخل ہونا ان کے لیے چنداں دشوار نہ ہوا مگر قلعہ دار نے مورچہ بند ہو کر لڑائی شروع کر دی۔ سمجھانے بجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس مستحکم قلعے کو سر کرنے میں دیر ہو رہی تھی جبکہ ابھی اگلے کئی اور شہر باقی تھے۔ آخر صلاح الدین ایوبی نے کچھ سپاہیوں کو قلعے کے محاصرے کے لیے چھوڑ دیا اور حماۃ پہنچ گئے۔ ²

حماۃ میں جوردیک سے گفتگو ٭ حماۃ کا قلعہ دار عزالدین جوردیک نورالدین زنگی کا وفادار امیر تھا۔ شاور کے خلاف مہمات میں وہ صلاح الدین ایوبی کے ساتھ ساتھ رہا تھا مگر اس وقت اسے اپنے پرانے

---

¹ کتاب الروضتین: 348/2 ² الکامل: تحت 570ھ

دوست کی نیک نیتی پر یقین نہ تھا۔ اس لیے اس نے قلعہ کے دروازے بند کر لیے۔ صلاح الدین کو شہر والوں کا تعاون حاصل تھا، شہر کے کھلے دروازوں سے لوگوں کو امن کا پیام دیتے ہوئے وہ حماۃ میں داخل ہوئے مگر قلعے کے دروازے بند پا کر انہیں افسوس ہوا۔ انہوں نے عزالدین کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ الملک الصالح کے ماتحت اور تابعدار ہیں اور اسے اس کے غصب شدہ علاقے واپس دلوانے اور خودغرض امراء کے تسلط سے آزاد کرانے آئے ہیں۔

عزالدین کو ایوبی کی بات پر کسی قدر یقین آ گیا مگر اس نے مزید اطمینان کے لیے قسم کھانے کا مطالبہ کیا۔ جب صلاح الدین ایوبی نے قسم کھا کر اسے اپنی سچائی کا یقین دلایا تو عزالدین کو اپنے قدیم دوست کی نیک نیتی پر کوئی شک نہ رہا تاہم اس نے قلعہ حوالے کرنے سے پہلے کچھ اور اقدامات ضروری سمجھے۔ اس نے صلاح الدین کو مشورہ دیا کہ ابھی حلب پر لشکر کشی نہ کی جائے بلکہ اہل حلب کو گفت وشنید کے ذریعے اصلاحِ احوال کا موقع دیا جائے۔

اس وقت دو معاملات اہم ترین تھے۔ پہلا یہ کہ حلب کا سابق حاکم ابن دایہ اپنے بھائیوں اور بیٹوں سمیت نابکار گمشتگین کی قید میں اذیتیں جھیل رہا تھا۔ اسے رہائی دلانا اور حکومت میں شامل کرانا ضروری تھا۔ دوسرے شام کی سیاست میں صلاح الدین کا کردار منوانا ناگزیر تھا۔ جوردیک نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر امرائے حلب کو یہ یقین دلائے گا کہ وہ اور صلاح الدین الملک الصالح کی بادشاہت کو متفقہ طور پر قبول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ابن دایہ کی سابقہ خدمات کا واسطہ دے کر اسے رہا کرانے کی بھی کوشش کرے گا۔ اس طرح یہ مسئلے لڑے بغیر حل ہو سکتے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی نے اس تجویز کو پسند کیا۔

جوردیک حماۃ کا قلعہ اپنے بھائی کے سپرد کر کے حلب روانہ ہو گیا۔ اسے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ حلب میں کیسی مصیبت اس کی منتظر ہے۔ حلب پہنچ کر جب اس نے بھرے دربار میں امرائے سلطنت کو صلاح الدین ایوبی سے مصالحت کا مشورہ دیا تو الملک الصالح کے درباریوں نے اسے ایوبی کا جاسوس قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس غدار کو گرفتار کر لیا جائے۔ الملک الصالح اپنے خاندان کے اس پرانے وفادار کو سزا نہیں دینا چاہتا تھا مگر گمشتگین نے بہت اصرار کر کے اس سے ہاں کرا دی۔ اب جوردیک کو حراست میں لے کر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں اور سخت تشدد کے بعد اسی اندھے کنویں میں ڈال دیا جس میں شمس الدین ابن دایہ اپنے خاندان سمیت سسک رہا تھا۔ چند ماہ قبل جوردیک ہی کے ہاتھوں اس خاندان کی قید و بند کا نامبارک کام انجام پایا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اس کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ جونہی اسے کنویں میں اتارا گیا، قیدی حسن ابن دایہ نے اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

جوردیک کے لیے زبان کے یہ زخم گمشتگین کے تشدد سے کہیں بڑھ کر تکلیف دہ ثابت ہوئے۔

صلاح الدین ایوبی نے رستن کے مقام پر ٹھہر کر خاصے دنوں تک جوردیک کا انتظار کیا۔ جب وہ واپس نہ آیا تو جباب الترکمان کی طرف کوچ کیا، راستے میں جوردیک کا ایک غلام ملا۔ اس سے پتا چلا کہ جوردیک بے چارہ خود پکڑا گیا ہے۔ صلاح الدین یہ خبر سن کر حماۃ کی طرف پلٹے جس کا قلعہ جوردیک کے بھائی کے ماتحت تھا۔ صلاح الدین نے اسے بھائی کی گرفتاری کی خبر دی تو اس نے قلعہ صلاح الدین کے سپرد کر دیا، کیوں کہ حلب کے سیاست دانوں سے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ یہ یکم جمادی الثانیہ 570ھ (27 دسمبر 1174ء) کا واقعہ ہے۔ صلاح الدین نے یہاں علی ابن ابو الفوارس کو قلعہ دار بنا دیا۔

صلاح الدین ایوبی کے سامنے اب اہم مسئلہ حلب کی تسخیر کا تھا۔ مرحوم سلطان زنگی کے اس مرکز پر احسان فراموش گمشتگین قابض تھا۔ عزالدین جوردیک اور ابن دایہ جیسے ممتاز امراء سے اس کی دغابازی کے بعد اس کا شرمناک کردار کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ خود الملک الصالح اس کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا، گمشتگین چکنی چپڑی باتوں سے اسے صلاح الدین ایوبی کے خلاف ورغلانے کامیاب ہو گیا تھا۔ ①

حلب میں الملک الصالح سے محاذ آرائی

13 جمادی الثانیہ 570ھ (8 جنوری 1175ء) کو صلاح الدین ایوبی کا لشکر حلب کی مضبوط فصیل کے سامنے جا پہنچا اور جبل جوشن پر پڑاؤ ڈالا۔ سپاہیوں کے خیمے خناقیہ سے سعدی کی وادیوں تک پھیل گئے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی اور موسم ناقابل برداشت تھا مگر صلاح الدین کا عزمِ صمیم ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اگر اہلِ شہر دروازے نہ کھولتے تو شہر پر قبضہ بہت مشکل تھا۔ فصیل کے بلند و بالا ہونے کے علاوہ خود حلب کے باشندے نورالدین زنگی کی تربیت کے باعث جنگوں کے عادی تھے، انہیں سرنگوں کرنا آسان نہ تھا۔ ادھر گمشتگین نے عوام میں صلاح الدین کے خلاف اشتعال انگیزی کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ الملک الصالح کو وہ اس بارے میں خوب بھڑکا چکا تھا۔ دراصل وہ اس کے ہمنوا امرائے حلب اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ ایوبی حلب پر یلغار کی جرأت نہیں کر سکے گا مگر اب مصری افواج کو فصیل کے باہر دیکھ کر انہیں یہ خدشہ ہوا کہ شہر کے لوگ صلاح الدین کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اہل شہر کو اعتماد میں لینے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ الملک الصالح سے مجمع عام میں ایوبی کے خلاف خطاب کروایا جائے۔

① ابن اثیر، الکامل: 7/252، کتاب الروضتین: 2/343

انہوں نے نوعمر حکمران کو اس کے لیے تیار کرلیا۔ ڈھنڈورا پیٹ کر شہریوں کو باب العراق کے میدان میں جمع کیا گیا، مجمع اتنا زیادہ تھا کہ میدان میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ الملک الصالح میدان کے شمالی کونے میں نمودار ہوا۔

کسی مجمعے سے خطاب کا اس کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس نے لوگوں کو پکار کر کہا:

"حلب کے لوگو! میں تمہارے ہاتھوں میں پلا ہوں۔ تمہارا مہمان ہوں، تمہارے ہاں آ کر پناہ لی ہے۔ تم میں سے بڑے میرے باپ کی جگہ ہیں، جوان میرے بھائیوں جیسے ہیں۔" اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا گلا رندھ گیا اور آنسو بہہ پڑے۔ اس نے روتے ہوئے کہا: "تمہیں معلوم ہے میرے والد گرامی نے تم پر کتنے احسانات کیے۔ وہ تم سے کیسی محبت کرتے تھے، تم سے ان کا برتاؤ کتنا اچھا تھا؟ مگر آج ایک ظالم انسان، ایک احسان فراموش مجھ سے میرا ملک چھیننے چلا آیا ہے، نہ اسے اللہ کا خوف ہے نہ بندوں کی ملامت کا۔"

الملک الصالح کی فریاد سن کر عوام بھی زاروقطار رونے لگے۔ انہوں نے اپنی پگڑیاں اتار پھینکیں اور چلانے لگے:

"ہم آپ کے وفادار ہیں۔ ہم آپ کے والد کے غلام ہیں۔ ہم آپ کے سامنے ڈھال بن کر لڑیں گے۔ اپنی جانیں اور مال آپ پر نچھاور کر دیں گے۔"

اس طرح سارا شہر صلاح الدین کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس موقع پر شہر کے اہل تشیع نے اپنی حمایت ان بدعات کے اجراء کے ساتھ مشروط کر دی جنہیں سلطان نورالدین نے بند کرا دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا:

"آئندہ سے جامع مسجد کا مشرقی حصہ ان کے لیے مخصوص کر دیا جائے، جنازہ پر چار کی جگہ پانچ تکبیریں اور ان کے ساتھ بارہ اماموں کے نام پڑھے جائیں، اذان میں "حی علیٰ خیر العمل" کے الفاظ بڑھائے جائیں۔"

امرائے حلب ہر حال میں صلاح الدین ایوبی کے خلاف لوگوں کو الملک الصالح کے گرد اکھٹا رکھنا چاہتے تھے چنانچہ اہل سنت کے جذبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان شرائط کو تسلیم کر لیا۔ اگلے دن سے جامع مسجد سمیت تمام مساجد کی اذانوں میں "حی علی خیر العمل" کی صدا گونج رہی تھی۔ اس طرح الملک الصالح کو استعمال کرنے والے امراء نے ثابت کر دیا کہ وہ صلاح الدین ایوبی کی مخالفت میں ہر حد سے گزر سکتے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی نے یہ رنگ دیکھ کر سمجھ لیا کہ مقابلہ ناگزیر ہے اور لڑائی سے بچنے کی ہر کوشش بے سود ہے۔ آخر کار جنگ شروع ہوئی۔ اہل شہر نے جبل جوشن پر آ کر صلاح الدین

ایوبی کے سپاہیوں سے زبردست مقابلہ کیا اور انہیں شہر کی فصیل کے قریب نہ آنے دیا۔ [۵]

صلاح الدین پر قاتلانہ حملہ: گمشتگین کو خطرہ تھا کہ اگر محاصرہ طویل عرصے تک جاری رہا تو شہر سرنگوں ہو جائے گا چنانچہ وہ اس دوران ایک اور اقدام کر چکا تھا۔ اس نے حسن بن صباح کی خفیہ جماعت کے علاقائی سربراہ سنان کو بھاری معاوضہ دے کر صلاح الدین ایوبی کے قتل پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس کام کے لیے جماعت کے مرکز سے احکام روانہ ہو چکے تھے۔ پانچویں سے ساتویں صدی ہجری کے وسط تک حسن بن صباح کی جماعت امت مسلمہ کے لیے ایک ناسور بنی رہی۔ اس جماعت نے مٹھی بھر افراد کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو اتنا نقصان پہنچایا جو بڑی بڑی دشمن افواج نہ پہنچا سکیں۔ حسن بن صباح خود اسماعیلی شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور مصر کی دولتِ عبیدیہ کے نمک خواروں میں سے تھا۔ بعد میں اسی نے "باطنیہ" کے نام سے ایک الگ جماعت بنا کر بحیرہ کیسپین کے کنارے بلند بالا پہاڑوں میں کئی قلعوں پر قبضہ کر کے ایک الگ دنیا بسالی تھی۔

وہ اپنے عقیدت مندوں کو حشیش کے نشے میں دھت کر کے انہیں عیش و آرام کی ایسی دنیا میں لے جاتا جس پر جنت کا گمان ہوتا تھا۔ انہیں یقین دلایا جاتا کہ یہی اصل جنت ہے جس میں ہمیشہ قیام کرنے کے لیے انہیں اپنی جان فدا کرنا ہوگی۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے پیشوا کے حکم کے مطابق بڑے بڑے لوگوں کو قتل کرنا ہوگا۔ اس ذہنیت کے ساتھ تیار کردہ لوگ فدائی کہلاتے تھے۔ انہیں خنجر زنی کی خاص مشق کرائی جاتی تھی۔ مصنوعی جنت کے دھوکے میں آجانے والے یہ فدائی ایسے جاں باز ہوتے تھے کہ اپنے پیشوا کے حکم پر ہر لمحہ جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اس جماعت کا مرکزی پیشوا شیخ الجبال کہلاتا تھا اور اس کا قیام شمالی ایران کے ناقابل تسخیر کوہستانی سلسلے کے الموت نامی قلعے میں ہوتا تھا۔ حسن بن صباح کے بعد اس کے جانشینوں کا سلسلہ تقریباً دو صدیوں تک چلتا رہا۔ ان فدائیوں کو دنیا کی تمام حکومتوں کے درباریوں، محافظوں، ملازموں اور سپاہیوں میں گھل مل کر رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اپنے آقا کا حکم ملتے ہی وہ ہر رکاوٹ عبور کر کے مطلوبہ شخصیت کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ ان کی دہشت کے باعث ہر حکمران ان سے خائف رہتا تھا، اکثر بادشاہ شیخ الجبال کو خراج ادا کرتے تھے۔

سلطان نورالدین زنگی کے آخری زمانے میں ان کا دائرہ کار شام تک پھیل چکا تھا۔ ایک بار جب نورالدین زنگی نے ان پر قابو پانے کی کوشش کی اور "الموت" پر حملے کا ارادہ کیا تو فدائیوں نے ایک

۵ کتاب الروضتین: 2/245_246؛ مل فی التاریخ: 7/253؛ البدایہ والنہایہ: تحت 570ھ

خنجر اور خط ان کے تکیے تلے اس طرح رکھ دیا کہ کسی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ خط میں خبردار کیا گیا تھا کہ شیخ الجبال کی جماعت کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ چوں کہ باطنی اسماعیلی جماعت کا نظریاتی رشتہ مصر کے شیعہ عبیدی حکمرانوں سے تھا اس لیے عبیدی حکومت کو ختم کر کے مصر پر قبضہ کرنے والا صلاح الدین ایوبی ان کے نزدیک قابلِ معافی نہ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے عمارہ یمنی نے مصر میں جو بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی تھی اس کے بیرونی مددگاروں میں حسن بن صباح کی جماعت بھی شامل تھی۔ اب جبکہ شیخ الجبال کے نائب کو خود شام کے ایک امیر کی جانب سے خطیر رقم کے عوض صلاح الدین ایوبی پر قاتلانہ حملے کی دعوت ملی تھی، وہ تردد نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ فدائی خنجر زن اپنے مرکز سے حلب روانہ ہو گئے جہاں صلاح الدین ایوبی شہر کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک صلاح الدین ایوبی نے اپنے حفاظت کا کوئی خاص اہتمام کرنا شروع نہیں کیا تھا اس لیے خنجر زنوں کو کسی خاص دقت کے بغیر صلاح الدین ایوبی کے خیمے تک رسائی کا موقع مل گیا۔ جوں ہی وہ خیمے کے پردے تک پہنچے ایوبی کے ایک وفادار امیر خمار تگین نے انہیں دیکھ لیا۔ وہ خود الموت کے آس پاس کے علاقے کا باشندہ تھا اور فدائیوں کو ان کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے اچھی طرح پہچانتا تھا، اس نے فوراً خطرے کا احساس کرتے ہوئے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا اور للکار کر کہا:

"کم بختو! میری موجودگی میں تمہیں یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی!! تمہیں کس نے بھیجا ہے اور کیوں آئے ہو؟"

مگر فدائی اپنے ہدف تک پہنچنے سے پہلے رکنے کے قائل نہ تھے، انہوں نے اپنے خنجر نکال کر خمار تگین پر حملہ کر دیا، خمار تگین شدید گھائل ہو کر گر پڑا، شور سن کر دوسرے افسران اور محافظ ادھر متوجہ ہو گئے۔ اس اثناء میں ایک فدائی خیمے میں گھس کر خنجر تانے صلاح الدین ایوبی کی طرف دوڑ لگا چکا تھا مگر امیر طغرل جاندار نے بجلی کی طرح جھپٹ کر اس پر ایسا کاری وار کیا کہ وہ صلاح الدین سے صرف چند قدم دور زمین پر گر پڑا۔ بقیہ فدائیوں کو دوسرے سپاہیوں نے گھیر لیا۔ وہ ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوئے اور کئی سپاہیوں کو شہید کر دینے کے بعد اس طرح لڑتے لڑتے مارے گئے۔ ۵

<u>ریمنڈ کا ایوبی کے خلاف استعمال</u> ۞ گمشتگین کا یہ حربہ بھی ناکام رہا تو اس نے ایک اور خطرناک داؤ استعمال کیا۔ حلب کے قید خانے میں ساحلِ شام کی عیسائی ریاست طرابلس کا حکمران ریمنڈ گیارہ سال تک قید رہا تھا۔ اسے سلطان نورالدین زنگی نے رمضان 559ھ (اگست 1164ء) میں حارم کے

۵ الکامل فی التاریخ: 7/253؛ کتاب الروضتین: 2/360؛ البدایہ والنہایہ: تحت 670ھ

معرکے کے دوران قید کیا تھا،نورالدین کی موت سے کچھ عرصے پہلے 569ھ(1174ء) میں امیر مسعودزعفرانی نے اس کی رہائی کی کوشش کی تو نورالدین نے اسے ڈیڑھ لاکھ دینار اور ایک ہزار قیدیوں کے عوض آزاد کرنے کی شرط منظور کرلی۔[1]

تاہم ابن اثیر کے بیان کے مطابق معاہدے پر عمل نورالدین کی وفات کے بعد ہوا اور گمشتگین نے الملک الصالح کے حکم سے محرم 570ھ(اگست 1174ء) میں اسے مذکورہ معاہدے کے مطابق رہا کیا۔[2]

ریمنڈ کی واپسی پر نصرانیوں نے اس کا زبردست استقبال کیا اور اسے ایک ہیرو کی سی حیثیت دی۔ چوں کہ القدس کا مجہول اور گھاگ حکمران املرک چند دن پہلے ہی مرا تھا اور اس کی جگہ اس کا تیرہ سالہ اپاہج اور کم عقل لڑکا جو رسمی طور پر تخت پر بٹھادیا گیا تھا کسی کام کا نہ تھا۔اس لیے عیسائی حکمرانوں نے ریمنڈ کو القدس کے کم سن تاجدار کا سرپرست و مربی مقرر کردیا اور طے یہ پایا کہ اب شام کی تمام عیسائی ریاستیں ریمنڈ سے رہنمائی لیا کریں گی۔

گمشتگین ریمنڈ کو رہا کرنے کی وجہ سے نصرانیوں کی نظروں میں ایک دوست کا مقام حاصل کرچکا تھا لہٰذا اس نے حلب کا محاصرہ اٹھوانے کے لیے ریمنڈ سے مدد طلب کی اور اسے صلاح الدین ایوبی کے نئے شامی مقبوضات پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دی۔ ریمنڈ کے لیے اس سے بہتر بات کیا ہوسکتی تھی۔تاہم پہلے اس نے قاصد بھیج کر صلاح الدین کو دھمکیوں سے ڈرا کر محاصرہ ختم کرانے کی کوشش کی۔ریمنڈ کے قاصد نے کہا:

''عیسائی متحد ہوگئے ہیں۔وہ یک جان ہو کر آپ سے لڑیں گے۔''

صلاح الدین نے اس دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا:

''میں فرنگیوں کے اتحاد سے ڈرنے والا نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فوج کا ایک دستہ انطاکیہ روانہ کردیا جس نے چھاپے مار کر خاصا مالِ غنیمت حاصل کیا اور اس طرح نصرانیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

آخرکار ریمنڈ حلب سے دوستی جتانے کے لیے ایک لشکر جرار لے کر نکلا،اس نے ہوشیاری یہ کی کہ آمنے سامنے کی ٹکر لینے کی بجائے حمص کا رخ کیا جہاں صلاح الدین ایوبی نے دو ماہ پہلے ہی قبضہ کیا تھا اور شہر کی حفاظت کے لیے وہاں زیادہ فوج نہ تھی۔ 7رجب کو ریمنڈ حمص کے فصیلوں کے سامنے پہنچ گیا اور محاصرہ کرلیا۔یہ وار کارگر ہوا۔صلاح الدین ایوبی کے لیے اس خبر کے بعد حلب کا محاصرہ جاری رکھنا

[1] کتاب الروضتین:351/2 [2] الکامل تحت:570ھ

ممکن نہ تھا۔ وہ حلب سے کوچ کر کے حماۃ سے ہوتے ہوئے حمص پہنچ گئے مگر ان کی آمد سے پہلے ریمنڈ بھاگ نکلا اور امرائے حلب کو پیغام بھیج دیا کہ میں نے وعدے کے مطابق حلب کا محاصرہ ختم کرادیا ہے۔ اِدھر صلاح الدین کے سپاہیوں نے حمص میں داخل ہو کر قلعے کا محاصرہ مزید سخت کر دیا جو کہ اب تک قلعہ دار کی تحویل میں تھا۔ 21 شعبان 570ھ (16 مارچ 1175ء) کو قلعہ دار نے ہتھیار ڈال دیے۔ بہر حال عیار گمشتگین حلب کا محاصرہ اٹھوانے میں کامیاب رہا، اس کے بعد ایک سال تک سلطان کو حلب کا رخ کرنے کا موقع نہ ملا۔

بعلبک کی فتح:- صلاح الدین ایوبی نے امرائے حلب کی مکاریوں اور نصرانیوں کے ساتھ ان کے گٹھ جوڑ کا بچشم خود مشاہدہ کر لیا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ الملک الصالح جس کا وہ اپنا آقازادہ ہونے کی حیثیت سے نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے بادشاہ کی حیثیت بھی دیتے ہیں، ایک عضوِ معطل ہے جو بے حمیت امراء اور اغراض پرست درباریوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ اس صورتحال میں ان کے لیے کچھ تلخ فیصلے کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ انہوں نے شام کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کر کے ان امراء کا زور توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب ان کی منزل بعلبک تھی جہاں کبھی ان کے والد نجم الدین، عماد الدین زنگی کے قلعہ دار کی حیثیت سے تعینات رہے تھے۔ بعلبک کے محاصرے کے دوران ماہ رمضان شروع ہو گیا۔ قلعہ دار یمن نے امان طلب کی اور 4 رمضان 570ھ (29 مارچ 1175ء) کو قلعہ سرنگوں ہو گیا۔ [1]

---

[1] کتاب الروضتین: 351،350/2

فصل:4

شام پر صلاح الدین ایوبی کا قبضہ اور خود مختاری کا اعلان

بعلبک پر قبضے کے بعد شام کا اکثر علاقہ صلاح الدین ایوبی کے زیر نگین آچکا تھا۔ حلب میں الملک الصالح اور کمشتگین اس صورتحال کو نہایت تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ادھر نور الدین زنگی کا بھتیجا موصل کا حکمران سیف الدین غازی دوئم بھی صلاح الدین سے خوفزدہ تھا۔ تشویش اور خوف کے یہ رویے جلد ہی صلاح الدین ایوبی کے خلاف ایک اتحاد میں تبدیل ہو گئے۔ کمشتگین کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے الملک الصالح نے سیف الدین کو شام پر چڑھائی کی دعوت دے دی۔ سیف الدین نے اسے فوراً قبول کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے ایک تیسرے فرد کو بھی اتحاد میں شامل کرنا ضروری سمجھا۔ یہ اس کا بڑا بھائی عماد الدین تھا جو سنجار کا حاکم تھا۔

اگر حلب، موصل اور سنجار تینوں حکومتوں کی فوجیں ایک پرچم تلے جمع ہو جاتیں تو صلاح الدین ایوبی کے لیے ان کا مقابلہ بہت دشوار ہوتا۔ مگر قدرت نے اس عظیم مجاہد کو ایک ماہر سیاست دان کی تمام خوبیاں عطا کردی تھیں۔ اس سے پہلے کہ سیف الدین اپنے بھائی عماد الدین سے رابطہ کرتا صلاح الدین ایوبی کے قاصد سنجار پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے عماد الدین کو یقین دلایا کہ اگر وہ اس موقع پر مصر کا ساتھ دے تو شام کی آئندہ حکومت میں اس کا معقول حصہ ہوگا۔

یہ پیش کش عماد الدین کو پرکشش معلوم ہوئی اور اس نے مصر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ سیف الدین کو یہ اطلاع ملی تو بڑا جھنجلایا، اس نے فوج کے دو حصے کردیے، ایک حصے کی کمان خود کرتے ہوئے اس نے سنجار کا محاصرہ کرلیا۔ دوسرے حصے کو جو اس کے بھائی عز الدین مسعود اور امیر ذلفندار کی قیادت میں تھا، مصری فوج سے لڑنے کے لیے روانہ کردیا۔ یہ لشکر حلب پہنچ کر وہاں کی افواج کو ساتھ ملانے کے

بعد مصری فوج سے لڑنے کے لیے روانہ ہوا اور صلاح الدین کے اہم شہر حماۃ کا محاصرہ کرلیا۔ [1]

سیف الدین غازی دوئم سے پہلی جھڑپ یہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ صلاح الدین کو جوان دنوں حماۃ سے دور تھے اور دوسرے قلعوں کی تسخیر کا سوچ رہے تھے، متحدہ لشکر کی پیش قدمی کی خبر ملی۔ ان کے پاس اس وقت تھوڑے سے سپاہی تھے۔ انہوں نے مصر اطلاع بھیج کر فوری کمک طلب کی اور خود حماۃ کی مضافاتی وادی قرونِ حماہ میں پہنچ گئے تاکہ حریف سے مذاکرات کریں۔ اس وادی کے دونوں جانب دو بلند پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں اسی بنا پر اسے قرون حماہ کہا جاتا تھا۔ مصری فوج کی قلت دیکھ کر اتحادیوں کی جرأت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ ان کی طرف سے جب کمشتگین اور ابن عجمی گفت وشنید کے لیے آئے تو ان کا انداز جارحانہ تھا۔ صلاح الدین نے اپنے سپاہیوں کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے صلح کی پیش کش کی اور کہا کہ انہیں صرف دمشق میں الملک الصالح کی نیابت کے طور پر حکومت کا موقع دیا جائے۔ ایوبی کی نرمی دیکھ کر اتحادی نمائندوں کے مطالبات بڑھتے گئے۔ صلاح الدین ان کی ہر شرط منظور کرتے چلے گئے۔ یہ بھی مان لیا کہ وہ حماۃ اور حمص سے دستبردار ہو جائیں گے۔ انہوں نے اب تک قبضے میں لیے گئے خزانے واپس کرنے کا مطالبہ بھی تسلیم کرلیا۔ اس کے باوجود کئی دنوں تک بات چیت چلتی رہی۔ اگر اس وقت اتحادی فوجیں یک بارگی حملہ کر دیتیں تو مصری فوج کی شکست ظاہر تھی مگر خوش قسمتی سے مذاکرات میں کئی دن گزر گئے۔ صلاح الدین ایوبی کو مصر سے طلب کردہ امدادی فوج کا انتظار تھا۔ اگر وہ آجاتی تو مذاکرات میں ان کا پلہ بھاری ہو سکتا تھا۔ جب امرائے حلب نے دیکھا کہ صلاح الدین ہر مطالبہ مانتا چلا جا رہا ہے تو انہوں نے اسے حریف کی کمزوری پر محمول کیا اور لڑائی کا بہانہ بنانے کے لیے ایک اور غیر معقول شرط رکھ دی، وہ یہ کہ حماۃ اور حمص کے ساتھ رحبہ اور اس کی متعلقہ جاگیریں بھی ان کو دی جائیں۔ ایوبی نے کہا:

"یہ علاقے میرے چچازاد ناصر الدین بن شیرکوہ کے ہیں۔ میرا ان پر کوئی اختیار نہیں۔"

اس پر امرائے حلب مشتعل ہو گئے۔ بات چیت تلخ تر ہوتی چلی گئی کیونکہ اتحادیوں کا اصل موقف یہ تھا کہ مصری فوج فوراً شام سے نکل جائے اور کسی علاقے پر حق نہ جتائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو ہم بزورِ قوت اسے نکال دیں گے۔ [2]

قرونِ حماۃ کا معرکہ ❁ انجام کار بات چیت ناکام ہوگئی۔ اب ایک خوفناک جنگ ناگزیر تھی۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت 570ھ، کتاب الروضتین: 2/383، 384

[2] کتاب الروضتین: 2/383 فصل فی ما جری للمواصلۃ والحلبیین مع السلطان

اتحادی لشکر جو سیف الدین کے بھائی عزالدین مسعود اور زلفندار کی قیادت میں تھا 19 رمضان 570ھ (13/اپریل 1175ء) کو قرونِ حماۃ کی وادی میں مصری فوج کے مقابل آ گیا۔ اتحادیوں کو عددی برتری حاصل تھی۔ صلاح الدین ایوبی نے جن افسران کو مصر سے کمک کے لیے بلوایا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے اس لیے جنگ کے آغاز میں سلطان کو شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی مختصر سی فوج کو ایک دستے کی شکل میں منظم کیا اور دشمن کے دائیں اور بائیں بازوؤں پر اچٹتے ہوئے حملے کر کے پلٹتے رہے تا کہ وقت گذرتا رہے اور اتنے میں کمک پہنچ جائے۔

سلطان نے اس لڑائی سے پہلے پیش قدمی کے طور پر حریف کے بعض افسران سے خفیہ رابطے کر کے انہیں خطیر رقم کے عوض جنگ سے پہلوتہی پر راضی کر لیا تھا، چنانچہ دشمن کی جانب سے بھی یک بارگی بھرپور حملوں میں دیر ہو رہی تھی۔ اگر وہ سچ مچ مصری فوج پر ٹوٹ پڑتے تو سخت جانی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ بہر حال ایوبی کی حکمت عملی کامیاب رہی اور آخر خاصے انتظار کے بعد سلطان کا بھتیجا تقی الدین عمر مصر کی تازہ دم فوج کے ساتھ عین جنگ کے دوران میدان میں آن پہنچا۔ اسے کوئی خبر نہ تھی کہ یہاں جنگ چھڑ چکی ہے، جب اس نے دونوں فوجوں کو لڑتے دیکھا تو فوراً اپنے سپاہیوں کو دائیں اور بائیں بازوؤں میں تقسیم کر کے دشمن پر زوردار حملے شروع کر دیے۔ اتحادیوں کا امیر زلفندار اپنی بلند حیثیت اور عہدے کے باوجود جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا تھا، تقی الدین کے حملوں نے اس کا منہ پھیر دیا اور وہ اپنے آدمیوں کو لے کر بھاگ نکلا، بھاگنے میں وہ افسران سب سے آگے تھے جن کو ایوبی نے خفیہ روابط کے ذریعے میدان چھوڑنے پر راضی کر لیا تھا البتہ عزالدین مسعود نے زنگی خاندان کی روایتی شجاعت کا ثبوت دیا اور دیر تک ڈٹا رہا جب کہ اس کا لشکر پسپا ہوتا رہا۔

صلاح الدین ایوبی اس کی مردانگی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور کہہ اٹھے:

"یا تو یہ دلیر ترین آدمی ہے یا اسے جنگوں کے داؤ پیچ سے کوئی واقفیت ہی نہیں۔"

یہ کہہ کر اپنے سپاہیوں کو بھرپور حملے کا حکم دیا۔ اب عزالدین مسعود کو بھی میدان چھوڑنے ہی میں عافیت نظر آئی۔ ایوبی نے حکم دیا کہ فرار ہونے والے یا زخمی سپاہیوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور تعاقب میں زیادہ تیزی نہ دکھائی جائے۔ [1]

سیف الدین غازی ابھی تک سنجار کے محاصرے میں مصروف تھا۔ عمادالدین نے شہر پر اس کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہونے دیا تھا مگر اب منجنیقوں کی سنگ باری سے شہر پناہ شکستہ ہوتی جا رہی تھی، ایک

[1] کتاب الروضتین: 384/2

جانب شگاف پڑ گیا تھا اور قریب تھا کہ شہر فتح ہو جائے مگر اسی دوران سیف الدین کو خبر ملی کہ مصری فوج نے تعداد میں بہت کم ہونے کے باوجود اس کے سپاہیوں کو مار بھگایا ہے۔ سیف الدین بڑا دل شکستہ ہوا اور ساتھ ہی اس نے خوف محسوس کیا کہ عماد الدین کو یہ خبر مل گئی تو اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور وہ فوراً جوابی کارروائی پر اتر آئے گا۔ چنانچہ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے عماد الدین تک یہ خبر پہنچنے سے پہلے ہی اس سے صلح کا معاہدہ کر لیا اور محاصرہ اٹھا کر موصل لوٹ آیا۔ سیف الدین نے اس موقع پر یہ فیصلہ بھی ناگزیر سمجھا کہ وہ عماد الدین کے ساتھ ساتھ اپنے حریف الملک الصالح سے بھی جس کے کئی علاقے اس نے کچھ مدت پہلے دبا لیے تھے، صلح کر لے اور دونوں مل کر ایوبی کا مقابلہ کریں۔ قاضی ابن شداد اس صلح کا حال یوں بیان فرماتے ہیں:

"سیف الدین نے عماد الدین سے صلح کر لی اور اسی وقت نصیبین جا پہنچا۔ افواج کو جمع کیا اور ان کے اخراجات کا انتظام کیا۔ پھر کوچ کر کے دریائے فرات تک آیا اور البیرہ کے مقام سے اسے پار کر کے دریا کے شامی کنارے پر پڑاؤ ڈالا۔ پھر الملک الصالح اور گمشتگین سے مراسلت شروع کی۔ ان کے درمیان مل بیٹھنے کی بات طے ہو گئی۔ گمشتگین اس سے ملنے آیا۔ بات چیت کے بہت سے ناکام دور چلے۔ سیف الدین نے بار بار واپسی کا ارادہ کیا مگر آخر کار الملک الصالح سے اس کی بلاواسطہ بات چیت طے ہو گئی اور اہل حلب نے سیف الدین کی زیادتیوں سے درگزر کیا۔ سیف الدین کوچ کر کے حلب پہنچا۔ الملک الصالح خود اس کے استقبال کے لیے نکلا۔ حلب کے قلعے کے قریب اس سے ملا۔ معانقہ کیا اور لپٹ کر خوب رویا۔ سیف الدین نے اسے قلعے میں واپس جانے کا کہا۔ وہ چلا گیا۔ سیف الدین خود لوٹ کر عین مبارک کے چشمے کے پاس خیمہ زن ہوا اور ایک مدت تک وہاں رکا رہا۔ حلب کے سپاہی روزانہ اس کی خدمت میں آتے رہے۔ سیف الدین قلعے میں بھی گیا اور وہاں کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ کوچ کر کے تل السلطان پہنچا، دیار بکر کے لوگ اور بہت سا مجمع اس کے ساتھ تھا۔"[1]

غرض شکست کے باوجود سیف الدین کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور صلاح الدین ایوبی کو شام سے نکالنے کے ہدف میں اب وہ اور الملک الصالح پوری طرح متحد ہو گئے تھے۔

حلب کا دوسرا محاصرہ اور خودمختاری کا اعلان صلاح الدین ایوبی نے قرون حماۃ میں دشمنوں کو شکست فاش دینے کے بعد انہی کی خیمہ گاہ میں جا کر پڑاؤ ڈالا اور پھر جلد ہی حلب کے نواح میں قرا

[1] النوادر السلطانیہ: ص 56

حصار پہنچ کر اسے خیمہ گاہ بنایا اور حلب کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک دوٹوک فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ الملک الصالح کا شام کی سیاست میں کوئی کردار نہیں ہے۔ اصل کھیل سیف الدین غازی اور کمشتگین کھیل رہے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو حال اور مستقبل کے خطرات کے سامنے بند باندھ سکتا۔ نورالدین زنگی کے مشن کی تکمیل کے لیے سینہ سپر ہو کر القدس کی بازیابی کی منزل تک پہنچنا تو بہت دور کی بات تھی، یہ حکمران نصرانیوں سے اپنے مقبوضات کو زیادہ عرصے تک بچانے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی کو یہ یقین بھی ہو چکا تھا کہ یہ بندگانِ مال وجاہ اپنے اقتدار کی خاطر آئندہ نصرانیوں سے مل کر ان کے خلاف مشترکہ یلغار سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ کمشتگین ریمنڈ کے ذریعے حمص پر حملہ کرا کے اس شقاوت کا عملی ثبوت پیش کر چکا تھا۔

حلب اب وہ حلب نہیں رہا تھا جس کے ایوان میں ہر روز جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سر جوڑ کر مشورے ہوتے اور کفار سے قوت آزمائی کے لیے فوجوں کو دم بدم احکام ملتے تھے۔ اب حلب سازشی قوتوں کا ایسا مرکز بن چکا تھا جو نصرانیوں سے برسرِ پیکار واحد اسلامی فوج کو پارہ پارہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ان تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب الملک الصالح کی بادشاہت کسی بھی طور پر اسلام یا مسلمانوں کے لیے مفید نہیں رہی تھی۔ اس سے جہاد کا پرچم بلند کرنے یا شام کے بکھرے ہوئے امراء کو متحد رکھنے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی لہٰذا صلاح الدین ایوبی کے نزدیک اس بادشاہت کو قبول کرنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے مخالفین انہیں اپنے آقا کا غدار اور احسان فراموش کہیں گے مگر وہ اپنے آقا زادے کو اغیار کے لیے استعمال ہوتا دیکھنے کے بعد زنگی خاندان سے واقعی مایوس ہو چکے تھے۔ اب اپنی خودمختاری کا فیصلہ کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور حکمران ایسا بااختیار ہوتا تو کب کا "شاہ" اور "سلطان" بن چکا ہوتا مگر صلاح الدین ایوبی نے آخر تک اپنے محسنوں کی بالادستی کا جواز برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو زنگی خانوادے کا غلام کہنے میں فخر محسوس کیا۔ تاہم اب وہ نصرانیوں کے حلیفوں کی کفش برداری کے لیے تیار نہ تھے۔ زنگی کے مشن کے حقیقی وارث وہ خود تھے اور انہیں پورا حق تھا کہ اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیں۔ آخر کار صلاح الدین ایوبی نے یہ قدم اٹھا لیا اور حلب کے محاصرے کے دوران ہی انہوں نے اپنے زیرِ نگین شہروں سے الملک الصالح کے نام کا سکہ منسوخ کرنے اور اس کے نام کا خطبہ بند کر دینے کا حکم جاری کر دیا۔ یہ زنگیوں کی حلقہ بگوشی سے آزادی کا واضح اعلان تھا۔

صلاح الدین ایوبی کے لشکر نے وادی قراحصار کے کیمپ ہی میں عید الفطر منائی۔ اُدھر حلب والے محاصرے کی طوالت اور شدت سے تنگ آ چکے تھے۔ صلاح الدین ایوبی کی خودمختاری کے بعد اب وہ

مصری افواج سے کسی نرم سلوک کی توقع بھی نہیں رکھ سکتے تھے، تاہم انہوں نے امید کا دامن تھام کر صلح کی پیش کش کی۔ الملک الصالح کے سفیر وادی قراحصار میں صلاح الدین ایوبی سے ملے۔ انہوں نے صلح کی شرائط پیش کیں جن میں سے بعض صلاح الدین ایوبی کے مفادات کے بالکل خلاف تھیں۔ صلاح الدین کو اب یہ قوت حاصل تھی کہ وہ منہ مانگی شرائط پر صلح کرتے مگر انہوں نے حیرت انگیز کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔ فریق مخالف کا پورا احترام کرتے ہوئے معاہدے کی شرائط کو فوراً قبول کرلیا جن میں الملک الصالح کو واضح طور پر زیادہ مراعات ملی تھیں۔ اس معاہدے کا خلاصہ یہ تھا:

- اگر کوئی دشمن الملک الصالح کے خلاف کارروائی کرے گا تو صلاح الدین کو خود آ کر اس کا دفاع کرنا ہوگا۔
- صلاح الدین ایوبی کو اس کے موجودہ مقبوضات کے علاوہ کفر طاب، حماۃ اور المعرۃ کے علاقے بھی دے دیے جائیں گے۔
- صلاح الدین ایوبی کے دیگر شامی مقبوضات باقی رہیں گے، مگر ان میں سکہ الملک الصالح کا جاری ہوگا اور جمعے کے خطبوں میں اسی کا نام لے کر دعائے خیر کی جائے گی۔[1]
- ریاست حلب سلطان کی رضامندی کے بغیر کسی حکومت سے کوئی معاہدہ یا اتحاد نہیں کرے گی۔
- حلب والے ابن دایہ اور اس کے خاندان کو رہا کر دیں گے۔[2]

کمزور فریق کے سامنے صلاح الدین ایوبی کا ایسی شرائط پر آمادہ ہوجانا ان کی حد سے زیادہ فراخ دلی کا ثبوت تھا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے مربی زنگی کے احترام میں ان شرائط کو قبول کیا ورنہ وہ اہل حلب پر دباؤ ڈال کر بہت سی شرائط مسترد کر سکتے تھے بہر کیف صلح ہوگئی۔ (تاہم الملک الصالح نے اولادِ دایہ کو رہا کرنے کا وعدہ پورا نہیں کیا اور اگلے معاہدے میں یہ مطالبہ دہرانا پڑا)

شوال 570ھ (مئی 1175ء) کے پہلے عشرے میں مصری فوجوں نے حلب کا محاصرہ اٹھالیا اور حماۃ چلی گئیں۔ شام کے اکثر شہروں پر صلاح الدین کے قبضے اور خودمختاری کے اعلان کی اطلاع دربار خلافت کو بھیج دی گئی تھی۔ خلیفہ المستضیی باللہ نے اس مردِ مجاہد کو شام و مصر کا آزاد بادشاہ تسلیم کرلیا اور اپنے سفیر کے ساتھ ایوبی کے لیے سلطنت کی سند اور خلعت روانہ کردی۔ مصری لشکر حماۃ میں قیام پذیر تھا کہ خلیفہ کا سفیر سیاہ پرچم، خلعت اور پروانۂ سلطنت لے کر دربار ایوبی میں حاضر ہوا۔ دربار خلافت کی اس عنایت سے صلاح الدین ایوبی کو بے حد مسرت ہوئی۔

[1] کتاب الروضتین: ج384/2   [2] کتاب الروضتین: 385/2

شوال کے آخری ایام میں انہوں نے امیر زعفرانی کی گوشمالی کا عزم کیا جس نے دمشق آ کر اطاعت کا وعدہ کیا تھا مگر پھر حسب منشا منصب نہ ملنے کی وجہ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ ایوبی نے اس کے قلعے ''بعرین'' کا محاصرہ کرلیا، اس نے گھبرا کر قلعہ حوالے کر دیا اور سلطان ایوبی دریائے عاصی عبور کر کے دمشق کو روانہ ہو گئے۔ عماد اصفہانی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ اس سفر کے دوران سورج گرہن ہوا اور چہار سو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ شوال کے آخر میں صلاح الدین ایوبی دمشق پہنچ گئے۔ اب وہ سلطان زمانہ تھے۔ اپنے فیصلوں میں مکمل طور پر آزاد۔ [1]

دمشق میں امن وعافیت کے کچھ دن ❊ صلاح الدین ایوبی کو قاہرہ سے نکلے ہوئے سات ماہ ہونے کو آئے تھے مگر شام کے معاملات مکمل طور پر نمٹائے بغیر واپسی مناسب نہ تھی۔ پھر مصر میں ان کا بھائی الملک العادل نظام مملکت کو اچھی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی دمشق میں مقیم رہ کر شام کے نو مفتوحہ علاقوں کا انتظام بہتر بنانے میں مشغول ہو گئے۔

حلب کی حکومت سے ان کی صلح جس معاہدے پر ہوئی تھی اس کے مطابق الملک الصالح اپنے موجودہ مقبوضہ علاقوں کا مالک تسلیم کر لیا گیا تھا جبکہ شام کے وہ تمام علاقے جن پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے قبضہ کر لیا تھا، حماۃ، المعرۃ اور کفرطاب سمیت انہی کا حق مان لیے گئے تھے۔ نئے انتظامات کے تحت سلطان نے حماۃ اپنے سسر اور ماموں شہاب الدین حارمی کی نگرانی میں دے دیا اور حمص کی ولایت اپنے چچا زاد بھائی ناصر الدین بن شیرکوہ کو دے دی۔ [2]

نصرانیوں سے جنگ بندی ❊ دمشق کے قیام کے انہی دنوں میں نیا ہجری سال 571ھ شروع ہو گیا، ماہ صفر (اگست 1175ء) میں شام کے عیسائیوں کا سفیر سلطان کے پاس آیا۔ عیسائی جو سلطان کے عروج سے خائف تھے، جنگ بندی کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ سلطان کو بھی شام کے نظم ونسق کے لیے کم از کم ایک سال درکار تھا۔ ویسے بھی وقت خشک سالی کے باعث عوام کے لیے گراں تھا، ایسے میں رعایا کے مسائل پر توجہ کی خاص ضرورت تھی۔ فرنگیوں سے فیصلہ کن معرکوں کے لیے ابھی خاصے مراحل باقی تھے، اس لیے سلطان نے کئی شرائط منوا کر صلح کی پیش کش قبول کر لی۔

اب سلطان کے پاس اطمینان کے ساتھ مقامی مسائل پر توجہ دینے کا خاصا وقت تھا۔ وہ پابندی کے ساتھ ''دارالعدل'' میں بیٹھتے، لوگوں کی شکایات سنتے اور فریادیوں کی دادرسی کرتے۔ اس طرح انہوں نے عوام کا دل جیت لیا۔ کبھی کبھی موقع ملتا تو شکار کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔

[1] الکامل فی التاریخ: 7/255

[2] الکامل فی التاریخ: 7/255، کتاب الروضتین: 2/384

چوں کہ شام میں قحط سالی کے باعث غلہ کم پڑ گیا تھا اور ویسے بھی اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے صلح کے معاہدوں کے بعد کچھ عرصے کے لیے خطرات سے نجات مل گئی تھی اس لیے سلطان صلاح الدین نے اپنی افواج کا بڑا حصہ واپس مصر روانہ کر دیا اور انہیں تاکید کی کہ ضرورت پڑنے پر وہ فوراً حاضر ہو جائیں۔ سلطان اس بات سے غافل نہیں تھے کہ موصل اور حلب کے سیاست دان اب بھی ان کے خلاف تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ①

سازش کا انکشاف ❋ موصل اور حلب کے درمیان واقعی کچھ کھچڑی پک رہی تھی۔ موصل کے سیاست دان الملک الصالح کے ساتھ مل کر طے کر چکے تھے کہ سلطان صلاح الدین کے خلاف ایک بار پھر مشترکہ محاذ بنایا جائے۔ اس بارے میں حلب اور موصل کے قاصدوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ امرائے موصل حلب کے ارباب اقتدار کو ترغیب دے رہے تھے کہ وہ ایوبی سے صلح نامہ منسوخ کر دیں۔ ان کے نزدیک صلاح الدین ایوبی سے صلح میں حلب نے جلد بازی سے کام لیا تھا، اس میں سراسر صلاح الدین ایوبی ہی کو فائدہ ہوا، حلب سراسر گھاٹے میں رہا جبکہ موصل کو کسی شمار ہی میں نہیں رکھا گیا۔

موصل اور حلب میں سلطان کے خلاف فوج کشی کا منصوبہ طے ہو گیا تو موصل کے امراء نے ایک سفیر کو سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس بھیج دیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ سلطان کو دھوکے میں رکھنے کے لیے موصل کے مفادات سے متعلق سلطان سے کچھ باتیں منظور کرائے، اس کے علاوہ وہ وہاں کی گفتگو سے اندازہ لگائے کہ سلطان کے آئندہ عزائم کیا ہیں؟...... یہ سفیر سلطان کے ہاں حاضر ہوا تو سلطان نے اسے خلوت میں اپنے پاس بلوایا اور پوچھا:

''موصل کی حکومت ہم سے کیا چاہتی ہے؟''

سفیر اپنی جیب سے مطالبات کی فہرست نکالنے لگا تو غلطی سے اس کے ہاتھ میں وہ رقعہ آ گیا جس پر موصل اور حلب کے مابین سلطان کے خلاف فوج کشی کا معاہدہ تحریر تھا۔ سفیر نے بے خیالی میں وہی رقعہ سلطان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سلطان نے اسے کھول کر دیکھا تو چونک گئے، انہوں نے ایک ہی نظر میں اسے پڑھ لیا اور اسے سفیر کو واپس کرتے ہوئے کہا:

''اصل دستاویز کی جگہ تم نے مجھے کوئی اور چیز دے دی ہے۔''

اب سفیر کی نظر رقعے پر پڑی تو وہ لرز گیا۔ اس سے بہت بھاری غلطی ہو گئی تھی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سلطان ان کے تمام کرتوتوں سے آگاہ ہو چکے تھے، سفیر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

① کتاب الروضتین: 389/2

سلطان نے کہا:

''اہل حلب، موصل والوں سے کیوں کر معاہدہ کر سکتے ہیں جبکہ وہ ہمیں قسم دے چکے ہیں کہ وہ آئندہ ہمیں اعتماد میں لیے بغیر اور ہماری اجازت کے بنا کسی سے معاہدہ نہیں کریں گے۔''

چوں کہ اس بات کے پھیل جانے سے خود سفیر پر بہت بڑی افتاد آسکتی تھی اس لیے سلطان نے اس راز کو اپنے تک ہی محدود رکھا اور سفیر کو خاموشی سے رخصت کر دیا۔ [1]

بہر کیف صلح ختم ہو چکی تھی۔ سلطان ایوبی اقتدار کی جن جنگوں سے بچنا چاہتے تھے وہ بار باران پر مسلط کی جارہی تھیں۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب حلب اور موصل کی مشترکہ فوجوں سے سخت معرکے کا وقت قریب تھا۔ سلطان نے مصر میں اپنے نائب بھائی الملک العادل کو لکھ بھیجا کہ وہ شعبان تک امدادی دستے دمشق روانہ کر دے۔ [2]

اس کے ساتھ ہی انہوں نے خلیفہ مستضیء کو خطوط لکھ کر حلب اور موصل والوں کے پختہ معاہدوں اور اور پھر اچانک بدعہدی سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں ورنہ مسلمانوں میں خونریزی ہوتی رہے گی۔ سلطان نے خلیفہ کو فرنگیوں کے خطرے سے بھی خبردار کیا اور عاقبت نااندیش مسلمانوں اور فرنگیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا:

''مجھے دو دشمنوں نے گھیر رکھا ہے۔ ایک دشمن تو وہ مسلمان ہیں جو اسلام کا صرف نام لیتے ہیں اور اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کافر صلیبی ہیں جن کے شہر مسلمانوں کے شہروں سے پیوست ہو چکے ہیں اور جن کی افواج کی دھمک سنائی دے رہی ہے۔''

سلطان نے اس مراسلے میں خلیفۃ المسلمین سے التجا کی کہ وہ مسلم حکام کو ان کی اعانت پر آمادہ کریں۔ انہوں نے لکھا:

''آپ اطراف و جوانب کے تمام مسلمان حکمرانوں کو لکھیے کہ وہ مشرکین کے مقابلے میں اس غلام کے مددگار بن جائیں اور اپنے نبی ﷺ کے امر کی تعمیل کرتے ہوئے ایک عمارت کی مانند بن جائیں۔ یہ غلام جدوجہد کرے تو وہ تقویت دیں، پکارے تو وہ لبیک کہتے ہوئے چلے آئیں۔ وہ بیت المقدس کی فتح میں شرکت سے کنارہ کش نہ ہوں کہ اس مقام کی آزادی سے دلوں کی خوشی وابستہ ہے اور اس سے محرومی نے ہمارے سر شرم سے جھکا رکھے ہیں۔ مسلمان ایسے سنگ دل کیسے ہو گئے کہ صخرہ کی یاد میں ان کے دل نہیں پگھلتے۔ ان کے حوصلے اتنے پست کیسے ہو گئے کہ وہ مسجد

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 395/2

[2] کتاب الروضتین: 395/2

اقصیٰ کو شرک کی نجاست سے پاک کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اگر ان کے عزائم جواب دے گئے ہیں اور وہ اللہ کے معاملے میں ملامت گروں کی ملامت سے ڈرنے لگے ہیں تو کم از کم میری مخالفت تو نہ کریں۔ میرے عزائم میں رکاوٹ تو نہ بنیں اور مجھے ایذائیں دینے کے درپے تو نہ ہوں۔"[1]

موصل اور حلب کی مشترکہ مہم: موسم سرما ختم ہوتے ہی سیف الدین نے سلطان کے خلاف لشکر کشی کی تیاری شروع کر دی۔ اس بار وہ اپنے بڑے بھائی عماد الدین کو جو سنجار کا حاکم تھا اپنے ساتھ ملا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ماردین کا قلعہ دار اور کچھ دیگر امراء بھی اس کے ساتھ مہم میں شریک ہو گئے۔ موسم بہار میں اتحادی فوجیں حلب پہنچیں، حلب کی فوج کی شمولیت سے لشکر کی مجموعی تعداد بیس ہزار گھڑسواروں تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شام کے فرنگی حکام سے بھی رابطے کر کے بوقت ضرورت ان سے تعاون کا وعدہ لے لیا تھا۔ ان سے تعلقات بہتر بنانے کی خاطر حلب کے قید خانے میں نور الدین زنگی کے زمانے میں قید کیے گئے کچھ اور بڑے عیسائی سردار اور نائٹ بھی آزاد کر دیے گئے جن میں کرک کا بدفطرت حاکم ریجی نالڈ (ارناط) اور جوسلین قابل ذکر ہیں۔ ان سے وعدہ لیا گیا کہ وہ سلطان کے خلاف اتحادی فوجوں سے تعاون کریں گے۔[2]

عید الفطر کے دن سلطان صلاح الدین ایوبی کو خبر ملی کہ سیف الدین زبردست تیاریوں کے ساتھ دمشق کی طرف آ رہا ہے اور تل السلطان کے علاقے تک پہنچ چکا ہے۔ یہ اطلاعات بھی مل گئی تھیں کہ فرنگیوں نے دشمن کو کمک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ سلطان نے اب تاخیر نقصان دہ سمجھی اور مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے۔ مصر سے ان کی امدادی فوج نہ پہنچنے کی وجہ سے ان کے سپاہیوں کی موجودہ تعداد چھ ہزار سے زائد نہ تھی۔ شیزر کے قریب دریائے عاصی عبور کرنے کے بعد سلطان نے اپنی فوج کو از سر نو مرتب کیا، دشمن سے اسی علاقے میں مڈبھیڑ کا قوی امکان تھا، زائد سامان حماۃ بھیج دیا گیا اور دشمن کی طرف پیش قدمی جاری رہی۔[3]

تل السلطان کا معرکہ: 9 شوال 571ھ (21/اپریل 1176ء) کو سلطانی لشکر تل السلطان کے قریب جباب الترکمان کے مقام پر پہنچا۔ حلب یہاں سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ سلطان کے سپاہی سخت تھکے ماندے اور تشنہ لب تھے۔ ان کے جانور بھی پیاسے تھے لہٰذا وہ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ خود سلطان ایک دستے کے ساتھ میدان میں رہ گئے۔ تھکن سے ان کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ وہ سب ستانے کے لیے وہیں لیٹ گئے اور بے سدھ ہو گئے۔

[1] کتاب الروضتین: 397/2 [2] کتاب الروضتین: 400/2 [3] کتاب الروضتین: 399/2، 400

ان کے وہاں پہنچنے سے قبل سیف الدین کا لشکر میدان کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ سیف الدین نے سلطان اور ان کے ساتھیوں کی خستہ حالی دیکھ کر موقع غنیمت سمجھا اور فوج کو آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا اشارہ کیا مگر اس کے دست راست امیر زلفندار نے ڈھلتے ہوئے سورج کی طرف دیکھ کر کہا:
''ہمیں اس باغی سے ایسے وقت میں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ کل صبح کی روشنی میں ہم ان سب کو آسانی سے پکڑ لیں گے۔''

لڑائی کل صبح پر موقوف ہوگئی۔ اگر سیف الدین حملہ کر دیتا تو شاید میدان مار لیتا کیوں کہ سلطان کے تھکے ہارے مٹھی بھر سپاہی یقیناً کسی سخت مزاحمت کے قابل نہیں تھے مگر صبح تک موقع مل جانے سے انہوں نے اپنی حالت درست کر لی، پیاسے سپاہی اور گھوڑے سیراب ہوگئے، رات بھر آرام کرنے سے وہ صبح سویرے بالکل تازہ دم تھے۔ سلطان نے منظم انداز میں صف بندی کی اور صبح سویرے دونوں فوجوں میں زوردار تصادم ہوا۔

سیف الدین کی فوج کے دائیں بازو کا کمانڈر مظفر کوکبری ابن زین الدین فنون حرب کا ماہر تھا۔ اس نے صلاح الدین ایوبی کے بائیں بازو پر اس شدت کا حملہ کیا کہ وہاں کے سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ یہ دیکھ کر صلاح الدین ایوبی نے خود باقی ماندہ فوج کو نئے سرے سے منظم کر کے حریف پر ایک تباہ کن حملہ کیا، دشمن کے سپاہی اسے برداشت نہ کر سکے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ اس موق پر سیف الدین کے کمانڈر زلفندار کا کردار ایک بار پھر عجیب نظر آتا ہے۔ معلوم نہیں یہ شخص اندرون خانہ سلطان صلاح الدین کا حامی تھا یا پرلے درجے کا کم عقل۔ اس پہاڑی غیر ہموار علاقے میں اس نے لشکر کے علمبرداروں کو نشیبی زمین میں کھڑا کیا تھا جنہیں قریب سے تو دیکھا جا سکتا تھا مگر ذرا دور نکل کر کسی سپاہی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ علمبردار کدھر ہے؟ چنانچہ جب سلطان کے حملے کے بعد دشمن کے سپاہی تھوڑا سا پیچھے ہٹے تو انہیں اپنا کوئی پرچم نظر نہ آیا۔ بس وہ یہی سمجھے کہ لشکر کی قیادت فرار ہوگئی ہے، چنانچہ پورا لشکر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس مختصر سے معرکے میں اگرچہ شدت کی لڑائی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے مگر حیرت انگیز طور پر صرف ایک آدمی قتل ہوا تھا۔ سیف الدین کے بڑے بڑے امراء گرفتار ہوگئے تھے جن میں فخر الدین عبدالمسیح بھی شامل تھا۔ یہ ایک نصرانی وزیر تھا جسے سیف الدین نے سلطنت کے کاروبار پر مسلط کر رکھا تھا۔

سلطان نے مفرورین کا تعاقب نہ کیا۔ زخمیوں کو قتل کرنے کی اجازت بھی نہ دی بلکہ ان کے علاج معالجے کا انتظام کیا۔ قیدیوں پر کوئی سختی نہ کی بلکہ نہایت فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں خلعتوں

سے نواز کر آزاد کر دیا۔ اس حسن سلوک سے انہوں نے بہت سے دشمنوں کے دل بھی جیت لیے۔ سیف الدین کی لشکر گاہ سے جو بے اندازہ مال غنیمت حاصل ہوا تھا وہ سب اپنے افسران اور سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ حریف کے پکے پکائے کھانوں سے فاتح لشکر کی ضیافت ہوئی۔ سلطان نے اپنی ذات کے لیے ایک دھیلا تک نہ لیا۔ جو کچھ ملا دوسروں پر لٹا دیا۔ سیف الدین کے لشکر سے بہت سی باندیاں بھی ملی تھیں، سلطان نے انہیں بحفاظت حلب واپس بھیجنے کا انتظام کر دیا۔[4]

سیف الدین اس شکست کے بعد ایسا خوفزدہ ہوا کہ تل السلطان سے بھاگ کر اسی دن بزاعہ پہنچ کر دم لیا۔ پھر سیدھا حلب پہنچا۔ وہاں سے اپنا ساز و سامان اور خزانہ سمیٹ کر فوراً موصل کی طرف چلا گیا۔ موصل پہنچ کر بھی اسے یقین نہ تھا کہ وہ سلطان صلاح الدین سے بچ سکے گا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان کے سپاہی بہت جلد اس کے تعاقب میں پہنچ جائیں گے، چنانچہ وہ موصل چھوڑ کر پہاڑی علاقوں میں پناہ لینے کے بارے میں مشورے کرنے لگا۔

<u>یہ محفوظ مشغلہ ہے</u> ﷬ سلطان ایوبی سیف الدین کو مزید خوفزدہ کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فتح کے بعد سیف الدین کے خیموں میں چڑیوں، قمریوں اور طوطوں کے پنجرے بھی دیکھے تھے جو مال غنیمت میں شامل کر لیے گئے تھے، سیف الدین ان پرندوں سے دل بہلایا کرتا تھا۔ سلطان نے یہ پنجرے ایک امیر مظفر اقرع کے حوالے کیے اور اسے کہا:

> ”یہ پرندے سیف الدین کے پاس لے جاؤ۔ اسے میرا سلام کہو اور میری طرف سے یہ پیغام دو کہ ان پرندوں سے دل بہلایئے، جنگ کی سختیوں کی بہ نسبت یہ بڑا لذیذ اور محفوظ مشغلہ ہے جو آپ کو دوبارہ ایسے خطرے میں نہیں ڈالے گا۔“[5]

سیف الدین کی لشکر گاہ میں موسیقی کے آلات بھی کثرت سے بکھرے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کسی فوج کا معسکر نہیں، گویوں اور سازندوں کی بزم سجائی گئی تھی۔ سیف الدین سو سے زائد گلوکارائیں ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ یہ ساز و سامان انہی کا تھا۔ یہ گلوکارائیں بھی گرفتار کر لی گئی تھیں۔ سلطان نے عبرت کے طور پر اپنے سپاہیوں کو راگ رنگ کے یہ شیطانی آلات دکھائے اور اس قصے میں پڑنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی کیوں کہ موسیقی کی تانوں میں کھو جانے والے کبھی اچھے شمشیر زن ثابت نہیں ہوتے۔ سلطان نے ان تمام گلوکاراؤں کو کھیل تماشوں اور موسیقی کے آلات سمیت موصل واپس

---

[4] کتاب الروضتین: 2/308، الکامل فی التاریخ: 7/250

[5] کتاب الروضتین: 2/400، البدایہ والنہایہ: تحت 571ھ

بھجوادیا تھا اور قاصد سے کہا:

''اپنے آقا سے کہنا کہ یہ چیزیں تمہیں رکوع اور سجدوں سے زیادہ محبوب ہیں۔''[1]

آ تجھے بتاؤں میں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

ملحوظہ: لین پول نے اس جنگ میں سلطان کے سپاہیوں کی تعداد ساٹھ ہزار بتائی ہے جو بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ سلطان کے پاس اس جنگ میں فقط صرف چھ ہزار آدمی تھے۔[2]

---

1. کتاب الروضتین: 2/400 البدایہ والنہایہ تحت 571ھ
2. کتاب الروضتین: 2/395_400، الکامل: 7/259_261

فصل:5

معاہدۂ حلب اور باطنیوں سے تصادم

سلطان صلاح الدین ایوبی کے لیے حلب پر قبضہ ناگزیر تھا، مگر حلب تر نوالہ نہیں تھا۔ اس لیے سلطان نے کہا:

"میرا خیال ہے کہ ہم پہلے حلب کے ارد گرد کے قلعوں، راستوں اور ناکوں پر قبضہ کریں، اس طرح حلب کی قوت کمزور ہو جائے گی اور وہاں قبضہ کرنا آسان ہو جائے گا۔"

امراء نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ [1]

بزاعہ اور منبج کی فتح: سلطانی لشکر نے تیزی سے حلب کے نواح میں وادی بطنان کا رخ کیا اور وہاں بزاعہ کے قلعے کو گھیر لیا۔ قلعہ لڑائی بھڑائی کے بغیر 22 شوال 571ھ (4 مئی 1176ء) کو فتح ہو گیا۔ اگلا نشانہ منبج تھا جس کا حاکم ینال بن حسان مصر کی فتح میں شیرکوہ کا سالار رہا تھا۔ دمشق پر صلاح الدین کے قبضے کے وقت اس نے انہیں سخت الفاظ میں دھمکایا تھا۔ وہ سلطان کو اپنا بدترین دشمن تصور کرتا تھا اور دوسرے امراء کو بھی سلطان کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ اس نے سپاہیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ اسلحے اور خوراک کے بڑے بڑے ذخائر جمع کر کے مقابلے کی ٹھان رکھی تھی۔ سلطان نے شہر پر آسانی سے قبضہ کر لیا مگر قلعہ دار قلعے کے دروازے بند کر چکا تھا، سلطان نے سختی سے محاصرہ کر لیا۔ یہاں نقب لگانے والے ماہرین نے کام دکھایا اور فصیل میں داخل ہو گئے۔

29 شوال 571ھ (11 مئی 1176ء) کو "منبج" کا قلعہ بھی سر ہو چکا تھا۔ ینال بن حسان نے جو بے پناہ مال و دولت جمع کر رکھا تھا وہ سب مال غنیمت کے طور پر لوٹ لیا گیا، وہ خود گرفتار ہوا۔ سلطان نے اس کی بدخوئی اور بے ادبی کے باوجود نہایت شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اسے اپنے ہاں ملازمت کی پیش کش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ سلطان نے اسے آزاد کر دیا اور وہ سیف الدین کے پاس موصل چلا گیا۔ [2]

---

[1] کتاب الروضتین: 405/2، البدایۃ والنہایۃ: 816/7

[2] الکامل فی التاریخ: 260/7، کتاب الروضتین: 405/2

وہ یوسف تو میں ہوں ❋ منبج میں جو نقد دولت ہاتھ آئی وہ تین لاکھ دینار سے کم نہ تھی۔ کپڑوں، چاندی کے برتنوں، اسلحے اور دیگر قیمتی سامان کی مالیت بیس لاکھ دینار کے لگ بھگ تھی۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ سلطان نے مال غنیمت میں ہاتھ لگنے والے بہت سے برتنوں اور صندوقوں پر "یوسف" لکھا دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا۔ بتایا گیا:

"یہ قلعہ دار کا بیٹا یوسف ہے، قلعہ دار کو اسے بڑی محبت ہے۔ اسی کے لیے وہ اتنا مال جمع کرتا رہا۔"

سلطان نے مزاح کے طور پر کہا:

"نہیں، وہ یوسف میں ہوں جس کے لیے یہ سب کچھ جمع کیا گیا، تو میں نے اپنے لیے جمع کردہ مال پالیا۔"

یہ سن کر سب مسکرا دیے۔ سلطان نے یہ خوش طبعی کے طور پر کہا تھا ورنہ وہ مال غنیمت کو ہمیشہ سپاہ اور رعایا کا حق سمجھتے تھے۔ ❶

عزاز کا محاصرہ ❋ سلطان صلاح الدین ایوبی کا اگلا حملہ "عزاز" کے سنگین قلعے پر تھا جو حلب کے شمال میں عیسائی ریاستوں کی سرحد پر شام کے مسلمانوں کا آخری بڑا مورچہ تھا۔ اس پر قبضے کے بعد حلب کو اپنے عیسائی حلیفوں کی امداد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس لیے یہ شہر اور قلعہ بے حد اہم تھا۔ عزاز کا محاصرہ 3 ذی القعدہ 571ھ (14 مئی 1176ء) کو شروع ہوا مگر قلعے کی بلندی کے باعث اس پر قبضہ نہایت مشکل تھا۔ زبردست لڑائی ہوتی رہی اور فریقین کو خاصا جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اِدھر حلب میں غیر معمولی تشویش پھیل چکی تھی۔ امرائے حلب کو ڈر تھا کہ عزاز کے بعد سلطان سیدھا حلب کا رخ کرے گا اور تب انہیں کسی گوشے سے کوئی کمک نہیں پہنچ سکے گی۔ اس صورتحال کے پیش نظر انہوں نے سلطان کی خیمہ گاہ پر تیز رفتار گھڑسوار دستوں کے ذریعے چھاپوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے سلطان کی فوج کو خاصی پریشانی اٹھانا پڑی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ حلب والے عیسائی حکام کو ان کے خلاف کارروائی پر اکسا سکتے ہیں اس لیے وہ جلد از جلد قلعہ فتح کر لینا چاہتے تھے۔

باطنیوں کا سلطان پر قاتلانہ حملہ ❋ محاصرے کے دوران ایک نہایت لرزہ خیز واقعہ پیش آیا۔ کچھ عرصے قبل حلب کے امراء بدنام زمانہ باطنی جماعت کے ذریعے سلطان پر ناکام قاتلانہ حملہ کرا چکے تھے۔ عزاز کے محاصرے کے دوران انہوں نے ایک بار پھر باطنیوں کے پیشوا شیخ سنان کو حملے کے لیے

❶ کتاب الروضتین: 405/2

اکسایا اور اس سے ایک خطیر رقم کا وعدہ کیا، چنانچہ شیخ سنان نے چند فدائیوں کو سلطان کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ فدائی سپاہیانہ لباس میں سلطان کی فوج سے ایسی حالت میں آ ملے جب کہ جنگ جاری تھی اور ہر آنے جانے والے کی چھان پھٹک کرنا مشکل تھا۔ فدائیوں نے سلطان کے سپاہیوں میں شامل ہو کر جنگ میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور بہت سے سپاہیوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ اس طرح وہ جلد ہی سلطان کے قریب رہنے والے سپاہیوں میں گھل مل گئے۔

وہ سلطان پر حملے کے لیے موقعے کی تلاش میں رہے۔ ایک دن انہیں موقع مل گیا۔ محاصرے کے دوران سلطان نے عزاز کی فصیلوں میں شگاف ڈالنے کے لیے قلعہ شکن آلات اور منجنیقیں نصب کرا دی تھیں۔ سلطان کے امیر جاولی الاسدی کا خیمہ منجنیقوں کے قریب تھا، یہاں سے محاذ جنگ کو اچھی طرح دیکھا جا سکتا تھا اس لیے سلطان کبھی کبھی وہیں بیٹھ جاتے تا کہ منجنیقوں کی کارکردگی کا مشاہدہ کر سکیں۔ یہاں وہ افسران کو ہدایات دیتے اور سپاہیوں کی ہمت بندھاتے۔ اس طرح یہ جگہ ان کی عارضی نشست گاہ بن گئی تھی۔ فدائی سلطان کے معمولات کی نگرانی کر رہے تھے، انہیں حملے کے لیے یہی مقام پسند آ گیا۔

11 ذی القعدہ 571ھ (22 مئی 1176ء) کی گرم دوپہر میں سلطان امیر جاولی کے خیمے میں بیٹھے محاذ کا نظارہ کر رہے تھے کہ اچانک ایک فدائی خنجر لہراتا ہوا ان پر حملہ آور ہو گیا۔ اس وقت سلطان بیٹھے ہوئے تھے، اس لیے وہ ان کے پیٹ یا سینے کو نشانہ نہیں بنا سکتا تھا، اس مقصد کے لیے فدائی کو جھکنا یا بیٹھنا پڑتا جبکہ اتنا وقت نہیں تھا لہٰذا اس نے تیزی سے سلطان کے سر پر وار کیا۔ خنجر کا فولادی پھل اتنا تیز دھار تھا کہ کھوپڑی کے اندر اتر سکتا تھا مگر سلطان نے ٹوپی کے نیچے لوہے کا خود (ہیلمٹ) پہن رکھا تھا۔ باطنیوں کے پہلے قاتلانہ حملے کے بعد انہوں نے یہ احتیاط شروع کر دی تھی کہ کبھی خود اور زرہ پہنے بغیر باہر نہیں نکلتے تھے چنانچہ یہ احتیاط کام آ گئی، خنجر کا بھرپور وار بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ جوں ہی فدائی نے محسوس کیا کہ اس کا خنجر سلطان کی ٹوپی تلے کسی سخت شے سے ٹکرا کر اُچٹ گیا ہے، اس نے پینترا بدل کر دوسرا وار سلطان کے چہرے پر کر دیا جو خوش قسمتی سے سیدھا نہ لگا اور سلطان کے رخسار کو چھیلتا ہوا نکل گیا۔ سلطان کا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ اب فدائی جنونی انداز میں سلطان پر ٹوٹ پڑا اور انہیں زمین پر گرا کر سینے پر سوار ہو گیا، اس کا خنجر سلطان کے حلق کی طرف اس تیزی سے آیا جیسے بجلی کوندتی ہو۔ وہ سلطان کو ذبح کر دینا چاہتا تھا مگر سلطان نے پورے ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے ایک بازو سے حلقہ بنا کر حملہ آور کے سر کو دبوچا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ تاہم فدائی پوری طاقت لگا کر سلطان کی مزاحمت کے باوجود اپنا خنجر ان کے گلے تک لے آیا مگر سلطان نے

قزاگند پہنی ہوئی تھی۔ یہ دوہرا ریشمی لباس تیز دھار اسلحے سے حفاظت کے لیے پہنا جاتا تھا۔ تلوار اور خنجر اس پر لگ کر پھسل جاتے تھے اور وار اوچھا پڑتا تھا۔ فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔ سلطان کی قزاگند پر بھی باطنی کا خنجر کامیابی سے نہ چل سکا۔ قزاگند کے کالر تو کٹ گئے مگر سلطان کو اللہ تعالیٰ نے بال بال بچالیا۔ گردن پر خراش تک نہ آئی۔

اگر چہ اس وقت سلطان کے ساتھ دو چار آدمی موجود تھے مگر یہ حملہ اتنا اچانک اور دہشت ناک تھا کہ ان کے دماغ ماؤف ہو گئے اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ باطنی کا یہ حملہ، سلطان کی مزاحمت اور اس بدبخت کے پے در پے وار...... یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔

خوش قسمتی سے خیمے میں ہل چل محسوس ہوتے ہی سلطان کا ایک بیدار مغز امیر ''بازکش'' اندر آ گیا جس نے کسی تردد کے بغیر باطنی کے خنجر کا پھل اپنے ہاتھ سے تھام لیا، باطنی نے وار کر کے اسے بھی زخمی کر دیا۔ اس کے باوجود اس نے خنجر پر اپنی گرفت کمزور نہ ہونے دی اگر چہ اس کا ہاتھ لہولہان ہو گیا۔ اتنے میں سلطان کا ایک اور وفادار افسر سیف الدین یازکوچ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے فوراً تلوار کا وار کر کے اس بدبخت کو جہنم رسید کر دیا۔

اس کے گرتے ہی ایک اور فدائی دوڑتا ہوا آیا۔ وہ سلطان پر جھپٹنا چاہتا ہی تھا کہ امیر داؤد بن منکلان اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ باطنی نے امیر داؤد کے پہلو پر وار کیا اور پھر خنجر اس کی پیشانی میں اتار دیا، داؤد نے گرتے گرتے جوابی حملہ کیا اور فدائی کو وہیں مار گرایا۔ (داؤد اس زخم کی وجہ سے تیسرے دن شہید ہو گیا)

اسی لمحے ایک تیسرا فدائی کسی گوشے سے لپکا۔ سلطان کے سپاہی اب پوری طرح چوکس تھے۔ امیر علی بن ابی الفوارس نے بڑی مہارت سے پشت کی جانب سے اس کے دونوں بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر اسے اس طرح جکڑ لیا کہ حملہ آور کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند ہو گئے۔ اب صورتحال یہ تھی کہ علی بن ابی الفوارس اس سے لپٹا ہوا تھا اور باطنی خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ سلطان کے دوسرے افسران اور محافظ جو موقع پر پہنچ چکے تھے، علی کے زخمی ہو جانے کے خدشے سے باطنی پر حملہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ادھر علی کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ باطنی کسی بھی لمحے اس کی گرفت سے نکل جائے گا۔ موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے وہ چلایا: ''اسے مار ڈالو اور اس کے ساتھ مجھے بھی۔ یہ میرے قابو سے نکلا جا رہا ہے۔'' اتنے میں سلطان کا چچازاد ناصر الدین بن شیر کوہ بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے سامنے آ کر تلوار کی نوک باطنی کے پیٹ میں گھسا دی اور اسے اس تیزی

مگر احتیاط کے ساتھ حرکت دی کہ باطنی کی آستین کٹ گئیں اور وہ بے جان ہو کر گر پڑا جبکہ علی بن ابی الفوارس بالکل محفوظ رہا۔

اتنی دیر میں ایک چوتھا فدائی بھی خیمے میں گھس چکا تھا۔ جب اس نے کارروائی کا راستہ بالکل مسدود دیکھا تو الٹے پاؤں واپس دوڑا، مگر سلطان کے ماموں شہاب الدین حارمی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ پلٹ کر دوسری سمت بھاگا لیکن دوسرے سپاہیوں نے اسے راستے میں پکڑ لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے اس غیر محفوظ خیمے کو فوراً چھوڑ دیا۔ وہ باہر نکلے تو ان کے گال سے بہنے والا خون چہرے کو سرخ کر چکا تھا۔ خنجر کی دھار سے قزاگند کے کٹنے والے کالر گواہی دے رہے تھے کہ موت انہیں کس قدر نزدیک سے چھو کر گزری ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی قنات کی طرف آئے۔ انہوں نے اس سے قبل کبھی اپنی ذاتی حفاظت کے لیے غیر معمولی انتظامات نہیں کیے تھے مگر اب جبکہ ان پر دو قاتلانہ حملے ہو چکے تھے مزید بے احتیاطی کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ ❶

نئے حفاظتی انتظامات کے تحت سلطان کے خیمے کے گرد لکڑی کا ایک احاطہ بنا کر سخت پہرہ لگا دیا گیا، کسی انجان آدمی کے سلطان کے قریب سے گزرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ سیکورٹی اہلکار اب ہر وقت سلطان کے ارد گرد موجود رہتے۔ سلطان اگر گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں نکلتے تو کسی اجنبی کو ان کے پاس نہ آنے دیا جاتا۔ ہاں اگر وہ شخص اپنی شناخت کرا کر مطمئن کر دیتا تو پھر ملاقات کی اجازت مل جاتی۔ ❷

عزاز پر قبضہ ﷽: فدائیوں کے ہولناک حملے کے بعد اس دن جنگ بند رہی۔ سلطان کے زخمی ہونے کی خبر پوری فوج میں پھیل چکی تھی۔ سپاہیوں پر ایک اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنے محبوب رہنما کی خیریت جاننا چاہتے تھے۔ انہیں مطمئن کرنے کے لیے سلطان نے محافظوں کے حصار میں باہر نکل کر لشکر کا چکر لگایا، تب کہیں جا کر لشکر گاہ کی فضا پرسکون ہوئی۔ باطنیوں کے اس حملے نے سلطان کے عزائم میں کوئی رخنہ پیدا نہیں کیا۔ عزاز کا محاصرہ جاری رہا۔ آخر 37 بعد 11 ذی الحجہ 571ھ (20 جون 1176ء) کو اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال کر امان کی درخواست کی۔ قلعے پر قبضے کے بعد سلطان نے اپنے بھتیجے تقی الدین عمر کو اس کا نگران بنایا۔ ❸

صلح نامہ حلب اور گمشتگین کی چال ﷽: سلطان صلاح الدین ایوبی کو یقین تھا کہ باطنیوں کے ان حملوں کے پیچھے امرائے حلب خصوصاً گمشتگین کا ہاتھ ہے لہٰذا اب حلب پر حملے میں دیر نہیں کی جا سکتی

❶ البدایہ والنہایہ: تحت 571ھ، الکامل: تحت 571ھ، کتاب الروضتین: 2/419، 425
❷ کتاب الروضتین: 571ھ، فصل ورود البلیخ
❸ الکامل فی التاریخ: 7/261، کتاب الروضتین: 2/409، 412

تھی۔عزاز کی مہم سے فارغ ہوتے ہی سلطانی فوجیں حلب کے سامنے جا پہنچیں اور محاصرہ کرلیا۔سلطان نے فوج کو شہر کی فصیل کے قریب لانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ جنگ سے گریز کرتے ہوئے محاصرے کو سخت سے سخت تر کرتے چلے گئے اسی دوران 571ھ گزر گیا اور نیا ہجری سال 572ھ شروع ہوگیا۔

جب سلطان نے عزاز کو فتح کیا تو گمشتگین سمجھا کہ اب سلطان اس کے قلعے حارم کا محاصرہ بھی کرے گا۔گمشتگین خود حلب میں رہا کرتا تھا مگر اس وقت سلطان کی یلغار کے خطرے کے پیش نظر وہ دفاعی انتظامات کے لیے حارم چلا گیا اور مورچہ بندی کرنے لگا مگر اس کے خیال کے برخلاف سلطان نے عزاز سے کوچ کر کے سیدھا حلب کا محاصرہ کرلیا۔یوں گمشتگین حلب سے باہر رہ گیا۔اب وہ بڑا سٹپٹایا۔اسے اندیشہ تھا کہ اس جنگ کی انتہاء اہل حلب اور سلطان کے درمیان صلح کی شکل میں ہوگی اور اگر صلح کا معاہدہ اس کی عدم موجودگی میں طے ہوا، تو اسے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا اور سونے کا پرندہ الملک الصالح بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔چنانچہ اس نے کسی نہ کسی طرح حلب میں داخلے کی تدبیر سوچنا شروع کردی۔اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایوبی فوج کے گھیرے سے گزر کر حلب کیسے جائے۔آخر اس نے براہ راست سلطان کو خط لکھا کہ آپ مجھے حلب جانے دیں، میں آپ کی مرضی کے مطابق صلح کرادوں گا۔دوسری طرف الملک الصالح اور امرائے حلب کو لکھا کہ مجھے کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں جو خط میں بیان نہیں کی جاسکتیں، آپ کے لیے ضروری ہے کہ سلطان سے کہہ کر میرے حلب آنے کا انتظام کریں۔چنانچہ امرائے حلب نے سلطان سے گمشتگین کو حلب میں داخلے کا موقع دینے کی درخواست کی۔سلطان نے بخوشی اجازت دے دی تا کہ جلد از جلد یہ قضیہ نمٹ سکے۔اب اس بات کی ضمانت کے لیے کہ گمشتگین کو محاصرے سے گزرتے ہوئے گرفتار نہیں کیا جائے گا، ضامن طے کیے گئے۔سلطان نے شیخ عماد اصفہانی اور شمس الدین ابی المضاء کو ضامن بنا کر حلب بھیج دیا۔ادھر سے ایک امیر نصرۃ الدین زنگی کو ضامن بنا کر سلطان کے معسکر میں بھیجا گیا۔

جب شیخ عماد اور ابی المضاء حلب پہنچے تو ان سے اجنبیوں کا سا برتاؤ کیا گیا۔شیخ عماد نے واپس آکر بتایا:

''ہم شہر پہنچے تو ہمیں رہنے کے لیے ایک تاریک کوٹھری دی گئی جس میں چراغ تک نہ تھا۔ ہمارے نوکر ہم سے الگ کردیے گئے۔ہمیں کھانے کو بھی نہ پوچھا گیا۔اسی شب گمشتگین شہر میں داخل ہوگیا۔صبح کو ہم دونوں الملک الصالح کے دربار میں گئے۔وہاں عدل ابن عجمی نے گفتگو شروع کی مگر میری طرف جان بوجھ کر توجہ نہ دی۔گویا کوئی ہمیں دیکھتا ہی نہ تھا۔''

کاتب عماد نے واپس آکر ماجرا بیان کیا تو یہ ظاہر ہوا کہ اس سارے کھیل کا مقصد صرف گمشتگین کو اندر داخل کرنے موقع دینا تھا۔ [1]

بہرکیف ایک ماہ گزرنے کے بعد اہل شہر محاصرے سے عاجز آکر صلح کی درخواست پر مجبور ہو گئے۔ اب دونوں طرف سے قاصدوں کی آمدورفت شروع ہوئی اور آخر 20 محرم 572ھ (29 جولائی 1176ء) کو صلح نامہ ہو گیا۔ اس میں درج ذیل امور طے کیے گئے۔

- سلطان صلاح الدین حماۃ سے لے کر مصر تک اپنے علاقوں کے خودمختار حکمران رہیں گے۔
- الملک الصالح حلب اور اس کے ملحقہ علاقوں کا حاکم رہے گا۔
- اس پر لازم ہوگا کہ وہ ابن دایہ اور اس کی اولاد کو قید سے رہا کردے۔ [2]

اِس صلح میں الملک الصالح کے دیگر حامی حکمران یعنی حاکم موصل سیف الدین غازی، حاکم ماردین اور حاکم کیفا بھی شامل ہو گئے۔ [3]

ہم نے سنا اور مانا ﷺ جب صلاح الدین ایوبی حلب سے واپس جانے لگے تو الملک الصالح نے اپنی چھوٹی بہن خاتون بنت نورالدین کو سلطان کی خدمت میں بھیجا۔ اسے پہلے یہ سکھا دیا گیا تھا کہ سلطان تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہے تو تم عزاز کا قلعہ مانگنا۔ یہ بچی سلطان کی بارگاہ میں آئی تو سلطان ایوبی اسے دیکھتے ہی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، دستور کے مطابق زمین کو بوسہ دیا اور اپنے آقائے ولی نعمت سلطان نورالدین زنگی کو یاد کر کے رو پڑے۔ انہوں نے اپنی آقازادی کو بے شمار گراں قدر تحائف دیے اور پھر پوچھا: ''اور کچھ چاہیے؟'' وہ بولی: ''عزاز کا قلعہ......''

اگرچہ یہ قلعہ دفاعی لحاظ سے بہت ہی اہم تھا اور سلطان نے اسے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا، اس کی واپسی کا مطلب یہ تھا کہ حلب اور عیسائی ریاستوں کا رابطہ بحال کر دیا جائے مگر سلطان زبان دے چکے تھے۔ بلاتردد بولے: ''جو حکم۔ ہم نے سنا اور مانا'' بے پناہ تکالیف کے ساتھ مسخر کیا جانے والا قلعہ عزاز اپنے تمام خزانوں، اسلحے اور خوراک کے ذخائر سمیت اس بچی کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں عزاز دوبارہ حلب کی حکومت کے پاس چلا گیا۔ [4] ......سلطان کے اس طرزِ عمل سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ ان حالات میں بھی ان کے دل میں زنگی خاندان کا کتنا احترام تھا۔

---

[1] کتاب الروضتین: 420/2
[2] کتاب الروضتین: 422/2
[3] ابن اثیر: 261/7
[4] ابن اثیر: 262/7، کتاب الروضتین: 421/2، 422

باطنیوں کے خلاف کارروائی ❊ صلح نامۂ حلب کے بعد سلطان کی سیاسی حیثیت مضبوط تر ہوگئی تھی۔ اگر صلح میں شریک تمام حکومتیں اپنے عہد و پیمان کی پابند رہتیں تو سلطان صلاح الدین ایوبی کو اپنے اصل مقصد کے لیے سازگار ماحول اور اچھا خاصا وقت میسر آسکتا تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ فرنگیوں سے ایک طویل جنگ شروع کر سکتے تھے۔ انہیں یہ امید تو نہ تھی کہ موصل اور حلب فرنگیوں کے خلاف جہاد میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوجائیں گے مگر صلح نامے کی موجودگی میں یہ خطرہ کم تھا کہ وہ سلطان کے خلاف نصرانیوں سے جاملیں گے۔ کیوں کہ صلح نامے کی ایک شق یہ تھی کہ اگر معاہدے میں شامل کوئی حکمران خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تو باقی تمام حکمران مل کر اس کے خلاف کارروائی کرنے کے مجاز ہوں گے۔[1]

اس سے قبل کہ سلطان فرنگیوں سے کسی صبر آزما جنگ کی ابتداء کرتے ایک بہت بڑے خطرے سے جان چھڑانا ضروری تھا۔ باطنیوں کا علاقائی شیخ الجبال سنان سلطان پر دو قاتلانہ حملے کروا چکا تھا۔ سلطان کو یہ تو اندازہ تھا کہ کوہستانی علاقے کی پیچیدہ گھاٹیوں اور ساحلوں کے مضبوط قلعوں میں مورچہ بند باطنی جماعت کا خاتمہ بہت مشکل ہے تاہم ان پر فی الحال اتنا دباؤ ڈالنا ضروری تھا کہ وہ آئندہ سلطان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے ڈریں۔ جس دن حلب کا محاصرہ ختم ہوا، اسی دن سلطان نے باطنیوں کے پیشوا شیخ الجبال سنان کے خلاف کارروائی کے لیے کوچ کر دیا۔[2]

شیخ الجبال شام کی عیسائی ریاست طرابلس سے کچھ فاصلے پر مصیاف کے ساحلی علاقے میں مقیم تھا[3] ...... یہ علاقہ کوہستان انصاریہ کہلاتا تھا۔ اس قلعے سے دور دور تک کئی قلعوں اور بستیوں میں باطنیوں کی اجارہ داری تھی۔ اگرچہ باطنیوں کا عالمی مرکز ''الموت'' شام سے سینکڑوں کوس دور بحیرہ کیسپین کے کنارے واقع تھا مگر گزشتہ کئی برس سے وہ شام کے ساحلوں پر اپنا علاقائی مرکز قائم کر کے ایک وسیع علاقے پر باقاعدہ حکومت کر رہے تھے۔

سلطانی افواج باطنیوں کی اس دہشت گرد دنیا میں ایک طوفان کی طرح داخل ہوئیں اور ان کے مختلف ٹھکانوں کو اجاڑتی اور بستیوں پر قبضہ کرتی ہوئی ''مصیاف'' کے قلعے تک پہنچ گئیں۔ قلعے کا سختی سے محاصرہ کر لیا گیا اور منجنیقوں کے ذریعے سنگ باری شروع کر دی گئی۔[4]

شیخ الجبال کا ہاتھ آنا تو آسان نہ تھا تاہم محاصرہ طول کھینچتا تو مصیاف کا سرنگوں ہونا عین ممکن تھا لیکن اس دوران سلطان کو اطلاع ملی کہ نصرانیوں نے بعلبک اور دیگر اسلامی شہروں پر حملے شروع کر دیے

① ابن اثیر: 262/7
② ابن اثیر: 262/7، کتاب الروضتین: 422/2
③ ابن اثیر: 265/7، معجم البلدان: مصیاف
④ ابن اثیر: 265/7

ہیں۔ اس خبر سے سلطان کو تشویش ہوئی کہ کہیں ان کی غیر موجودگی میں عیسائی باقاعدہ فوج کشی کر کے کسی شہر پر قبضہ نہ کرلیں۔

مصیاف کا محاصرہ جاری تھا کہ بعلبک کے حاکم ابن المقدم کا نمائندہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابن المقدم نے فرنگیوں سے سلطان کے شہروں کی مدافعت کرتے ہوئے دوسو فرنگی سپاہی گرفتار کرلیے تھے جنہیں یہ نمائندہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس سے سلطان کو جو حالات معلوم ہوئے ان کے تحت "مصیاف" کا محاصرہ زیادہ دنوں تک برقرار رکھنا خلافِ مصلحت تھا۔

اس دوران شیخ سنان سلطان صلاح الدین کے ماموں شہاب الدین حارمی سے جو حماۃ کا حاکم تھا، خط و کتابت کر کے اسے آمادہ کر چکا تھا کہ وہ سلطان سے محاصرہ ختم کر دینے کی سفارش کرے۔ اس کے ساتھ سنان نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ سلطان، ان کے اہل و عیال اور تمام امراء کو اپنے فدائیوں کے ذریعے مروا دے گا۔ شہاب الدین حارمی کی سنان سے پرانی جان پہچان تھی۔ وہ اس کی طبیعت اور ضد سے خوب واقف تھا۔ وہ حماۃ سے چل کر مصیاف پہنچا اور سلطان کو ساری اونچ نیچ سمجھائی اور شیخ الجبال کی دھمکی سے آگاہ کر کے محاصرہ ختم کرنے کی سفارش کی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر قلعہ سر ہونے کے باوجود سنان بھاگ نکلتا تو سلطان کے سر پر ہمیشہ فدائیوں کا خطرہ منڈلاتا رہتا۔ صلح کر لی جاتی تو کچھ عرصے کے لیے ایک موذی دشمن سے بے فکری ہو جاتی۔ عام حالات میں شاید سلطان صلاح الدین "مصیاف" کو مسخر کیے بغیر واپس نہ جاتے مگر فرنگیوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کے پیش نظر وہ پہلے ہی واپسی کا ارادہ کر چکے تھے۔ حارمی کی سفارش نے مزید وزن ڈالا، شیخ الجبال سے صلح کر لی گئی اور سلطانی افواج واپس روانہ ہو گئیں۔ [1]

<u>لین پول کی غلط بیانی</u>:۔ لین پول نے اس صلح کو مسلمانوں پر فدائیوں کی دہشت اور ان کے خنجروں سے سلطان کی بے پناہ مرعوبیت کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی ہے اور اس موقع پر ایک بے سروپا کہانی نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیخ الجبال سنان پر اسرار قوتوں کا مالک تھا اور جب سلطان پر اس کی مافوق الفطرت قوتیں ظاہر ہوئیں تو اس نے گھبرا کر معافی مانگی اور اپنی جان بچا کر فوراً واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ [2] حالانکہ ان باتوں کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لین پول جیسے ممتاز یورپی مؤرخ کے قلم سے ایسی غیر محتاط روایات کا سامنے آنا نہ صرف مسلم فاتحین کے حقیقی مقام سے ان کی ناواقفیت کا ثبوت ہے بلکہ یہ اس تعصب کی بھی عکاسی کرتا ہے جس سے منصف مزاج مستشرقین بھی عموماً خالی نہیں ہوتے۔

[1] کتاب الروضتین: 423/2 [2] صلاح الدین، لین پول: 60

توران شاہ کی شام آمد٭ باطنیوں سے صلح کے معاہدے کے بعد سلطان کی حالت مزید مضبوط ہوگئی تھی۔ اب اس کا امکان کم تھا کہ مصر میں بچے کچے عبیدی شیعہ یا شام کے عیسائی فدائیوں سے سلطان کے خلاف مدد لے سکیں گے کیوں کہ باطنی عموماً اپنے معاہدوں کی پابندی کیا کرتے تھے۔

سلطان کے سپاہی ان طویل مہمات کے بعد شام میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی طرف لوٹے تو گزشتہ کئی جنگوں کے مال غنیمت سے لدے پھندے تھے۔ اس سامان کو سنبھالنے اور لشکر کو آرام دینے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سلطان نے سپاہیوں کو اپنے علاقوں میں واپس جانے کی رخصت دے دی۔[1]

فرصت کے ان ایام میں سلطان خود حماۃ میں ٹھہر گئے۔ ان کا بڑا بھائی شمس الدولہ توران شاہ جو یمن کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا ان سے ملنے چلا آیا۔ 2 صفر کو یہ دونوں بھائی حماۃ کے سامنے لشکر کی خیمہ گاہ میں مدتوں بعد ایک دوسرے سے ملے اور بغل گیر ہوئے۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے کو اپنی اپنی مہمات کے حالات سناتے رہے۔

17 صفر 572ھ (24 اگست 1176ء) کو سلطان اپنے بھائی کے ساتھ دمشق پہنچے۔ اب وہ بے فکر ہو کر مصر واپس جا سکتے تھے کیوں کہ توران شاہ ان کی غیر موجودگی میں شام کا انتظام سنبھالنے کے لیے تیار تھا۔ سلطان نے دمشق کی جاگیریں اس کے حوالے کر کے مصر روانگی کی تیاری کی۔[2]

سلطان کا بنت معین الدین انز سے نکاح٭ روانگی سے قبل سلطان صلاح الدین کی سخت کوش زندگی میں فرحت و مسرت کا ایک جھونکا آیا۔ دمشق کے قلعے میں عصمۃ الدین نامی ایک نہایت نیک سیرت شریف النسب خاتون رہائش پذیر تھی۔ اس کا باپ معین الدین انز اپنے زمانے میں دمشق کا سپہ سالار اور عملاً خود مختار حاکم تھا۔ یہ خاتون دمشق کے قلعے میں مرحوم باپ کی حویلی میں مقیم تھی۔ جب دمشق پر سلطان نورالدین زنگی نے قبضہ کیا تو اس کی بے حد عزت و تکریم کی اور عمر بھر اس کی تمام ضروریات کا انتظام کرتے رہے۔ سلطان نورالدین کے بعد بھی دمشق کے امراء اس کا پورا خیال رکھتے تھے۔

سلطان صلاح الدین نے امرائے دمشق کی وساطت سے اس خاتون کو نکاح کا پیغام دیا۔ جواب اثبات میں ملا۔ قاضی شرف الدین بن ابی عصرون نے دلہن کے بھائی سعد الدین بن انز اور دیگر امراء کی موجودگی میں نکاح کرایا۔ رسم رخصتی کے دو دن بعد جمعہ 4 ربیع الاول 572ھ (9 ستمبر 1176ء) کو سلطان صلاح الدین مصر روانہ ہو گئے۔[3]

---

[1] ابن اثیر: 265/7
[2] کتاب الروضتین: 2/424_425
[3] کتاب الروضتین: 2/430_431

فصل:6

سلطان کی مصر واپسی - تعمیراتی و ترقیاتی کام - رملہ کی جنگ

شام سے مصر کے اس سفر میں شیخ عماد اصفہانی بھی سلطان صلاح الدین کے ہم رکاب تھے۔ وہ پہلی بار مصر کی سیر کے لیے جا رہے تھے۔ ہر منزل پر وہ سلطان کی شان میں قصیدے کہتے اور سفر کے تاثرات کو اشعار کی شکل میں ڈھالتے۔ ہفتہ 16 ربیع الاول 572ھ (21 ستمبر 1176ء) کو سلطان صلاح الدین دو برس کی جدائی کے بعد دوبارہ مصر میں پہنچے۔ سلطان کے بھائی اور نائب الملک العادل ابو بکر نے بحیرۂ قلزم کا پل عبور کر کے ان کا شاندار استقبال کیا۔

صلاح الدین کا مصر ❊ عماد اصفہانی نے صلاح الدین کے مصر کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ انہیں شاہی محل، شہر کے بازاروں اور سرکاری عمارتوں سے زیادہ دریائے نیل کے فراخ سینے اور اہرام مصر کی بلند چوٹیوں نے متاثر کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم نے قاضی ضیاء الدین شہروری سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اہرام کی سیر کرائیں۔ وہ ہمیں وہاں لے گئے۔ ہم نے اس رہ گزار، صحرائی سرزمین میں گشت کیا اور اس جگہ کی تعریف کی۔ ابو الہول کو دیکھ کر ہم دہشت زدہ ہو گئے۔ اس کی ہیبت بیان کرنے کی مجال نہیں۔ ہم نے عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔ اہرام کے سامنے ہر شے چھوٹی محسوس ہوئی۔ یہ زمین میں گڑے ہوئے بلند ستونوں اور دو بلند پہاڑیوں کی مانند ہیں۔ نسلیں فنا ہو گئیں مگر یہ موجود ہیں۔ محلات ختم ہو گئے مگر ان کی آب و تاب باقی ہے۔''[1]

سلطان مصر پہنچ کر ان سرکاری کاموں کو نمٹانے میں مشغول ہو گئے جو دو برسوں کی غیر حاضری کے

[1] کتاب الروضتین: 2/440، 442

سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے دارالحکومت کی ازسرِنو تعمیر و توسیع کا کام شروع کرایا۔ دارالحکومت قاہرہ کے ساتھ تین پرانے شہر الگ الگ ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر ایک کی الگ الگ فصیل تھی۔ یہ تین شہر اس طرح تھے:

1- فسطاط جو پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کا دارالحکومت تھا۔

2- العسکر جو عباسی دور میں آباد کیا گیا تھا۔

3- وہ حصہ جو ابن طولون کے دور میں بسایا گیا تھا۔

سلطان نے ان سب کو قاہرہ کے ساتھ ملا کر ایک بڑے شہر کی شکل دینے کا کام شروع کرادیا۔ ایک بڑی فصیل کی تعمیر کا آغاز کیا گیا جو قاہرہ، فسطاط اور دوسری پرانی آبادیوں کو اپنے دائرے میں لے سکے۔ مدتوں بعد جب یہ کام ختم ہوا تو ایک بہت وسیع اور خوبصورت شہر بن گیا۔ اس کے ساتھ سلطان نے قاہرہ کے وسط میں مسجد سعد الدولہ کے قریب جبل مقطم پر ایک نئے مستحکم قلعے کی تعمیر کا کام بھی شروع کرادیا۔ نقشے کے لحاظ سے یہ بہت بڑا منصوبہ تھا۔ اتنا بڑا قلعہ دنیا میں ناپید تھا۔ اس کام کی ذمہ داری شہر کے ناظم بہاؤ الدین قراقوش کو سونپی گئی۔ یہ کام شروع تو ہو گیا مگر سلطان کی زندگی میں پورا نہ ہوسکا۔ [1]

قاہرہ کو ہر لحاظ سے پرسہولت شہر بنانے کے لیے سلطان نے ایک بڑے ہسپتال کی بنیاد بھی رکھ دی اور اس کے اخراجات کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کردیں۔ بچوں کی دینی تعلیم کے لیے امام شافعی رحمہ اللہ کے مزار کے پاس ایک بڑا دارالعلوم قائم کردیا۔ دو صدیوں تک یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ شمار ہوتا تھا۔ سلطان نے عظیم محدث و فقیہ شیخ النجم الدین خبوشانی کو اس کا مہتمم مقرر کیا تھا اور ان کی ماہانہ تنخواہ پندرہ تولے سونا طے کی تھی۔ [2]

قاہرہ کے بعد دوسرا شہر جس کی اہمیت سلطان کے نزدیک سب سے زیادہ تھی، اسکندریہ تھا۔ اس کی عسکری تعمیرات اور ترقیاتی کاموں کے لیے ماہ شعبان میں وہ خود وہاں پہنچے۔ شہر کی فصیل جس کی تعمیر جاری تھی سلطان کی موجودگی میں مکمل ہوگئی۔ سلطان نے اسکندریہ کے بحری بیڑے کی نئے سرے سے تیاری اور کشتیوں کی مرمت کا حکم دیا۔ حاکم اسکندریہ کو تاکید کی کہ وہ بحری بیڑے کو سپاہیوں سے بھر دے اور بحیرہ رُوم کے جتنے جزیروں پر ممکن ہو، قبضہ کرلے۔ سلطان نے ان مقاصد کے لیے خزانے سے بھرپور رقم فراہم کردی۔ سلطان یہ سب پیش بندیاں اس لیے کررہے تھے کہ ان کے اندازے کے مطابق نصرانیوں سے زبردست معرکوں کے دن قریب تر آتے جارہے تھے جس میں بحری جنگ ناگزیر تھی۔

[1] البدایہ: 7/822، کتاب الروضتین: 2/446، صلاح الدین لین پول: 65

[2] حسن المحاضرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ: 2/257

انہی تیاریوں میں ماہ رمضان شروع ہوگیا۔ سلطان کو اپنے کم سن بچوں افضل علی اور عزیز عثمان کی تربیت کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ انہیں قاہرہ سے اپنے ساتھ اسکندریہ لے آئے تھے تاکہ انہیں مقامی علماء کے حلقوں میں شریک کریں۔ سلطان کو یہاں کے عظیم محدث حافظ طاہر بن محمد السّلفی رحمہ اللہ سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ بچوں کو ان کے حلقے میں ساتھ لے جا کر حدیث کی سماعت کراتے رہے۔ [1]

سلطان صلاح الدین ایوبی کا مصر اس لحاظ سے نہایت محفوظ ملک شمار کیا جا سکتا تھا کہ اب آس پاس موحدین کے سوا کوئی ایسی حکومت نہیں تھی جو مصر سے ٹکر لینے کے قابل ہوتی۔ مشرق میں شام کا بڑا حصہ ان کے زیرِ نگین تھا، باقی شام نصرانیوں اور مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو چکا تھا، جنوب میں سوڈان کے سرکش قبائل کی طاقت کچلی جا چکی تھی، شمال سے حملہ آور یورپی بیڑے کو بحیرۂ روم میں عبرتناک شکست دے دی گئی تھی۔

جہاں تک موحدین کا تعلق ہے وہ اس زمانے میں عروج پر تھے اور ان کی حکومت کا استحکام عالم اسلام کے لیے بڑی خیر و برکت کا باعث تھا۔ موحدین نے مغربی افریقہ اور اندلس میں مرابطین کے زوال کے بعد اسلام کے بازوئے شمشیرزن کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اگر وہ ان اسلامی ملکوں کو نہ سنبھالتے تو یوسف بن تاشفین کی فتوحات کے ثمرات صرف نصف صدی بعد ضائع ہو جاتے۔ موحدین نے مرابطین کی زوال پذیر حکومت کے کھنڈرات پر ایک نئی عظیم الشان حکومت قائم کی جس کے ہوتے ہوئے یورپی اقوام اسپین سے مسلمانوں کے خاتمے کا خواب پورا نہیں کر سکتی تھیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں موحدین کا دوسرا نامور بادشاہ ابویعقوب یوسف بن عبدالمؤمن تخت نشین تھا جو ہر لحاظ سے ایک مثالی حکمران تھا۔ اس سے قبل مصر کی عبیدی حکومت مراکش کے ہر حکمران کے لیے خطرہ بنی رہی تھی مگر صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں عبیدیوں کے خاتمے کے بعد موحدین اس خطرے سے محفوظ ہو گئے تھے۔ اس لحاظ سے سلطان صلاح الدین کا مصر افریقہ کے موحدین کے لیے ایک نعمت تھا۔ دوسری طرف موحدین جو اندلس کے نصرانیوں کی سرکوبی میں مصروف رہتے تھے، یورپی طاقتوں کے ایک بڑے حصے کو اپنی طرف متوجہ رکھ کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے لیے مستقبل کی جنگوں میں بالواسطہ طور پر معاون ثابت ہوئے۔

یہاں تاریخ کا یہ پہلو بھی سبق آموز ہے کہ عموماً جب دو طاقتور ملک پہلو بہ پہلو ترقی کرتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کو دبانے بلکہ بعض اوقات ختم کرنے پر تل جاتا ہے اور اس سے بڑی بڑی خوں

[1] البدایۃ: 820/7

ریز جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر صلاح الدین ایوبی اور ابو یعقوب کے درمیان ابتداء میں چند سرحدی تنازعات اور دو تین معرکوں کے بعد محاذ آرائی کا کوئی مستقل سلسلہ نظر نہیں آتا جس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ دونوں حکمرانوں کو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کی طاقت کا احساس تھا بلکہ ان اعلیٰ مقاصد سے بھی دلی لگن تھی جو حقیقتاً مشترک تھے۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی عمر بھر مشرق کی طرف نصرانیوں کی سرکوبی اور القدس کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف رہے جبکہ ابو یعقوب اندلس کے مسلمانوں کے دفاع کے لیے سینہ سپر رہا۔

اس کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ مقاصد کے اشتراک اور دشمن کے ایک ہونے کے باوجود مصر کے ایوبی اور مراکش کے موحدین اس تمام عرصے میں کبھی ایک اتحاد بنا کر نصرانیوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ دونوں طاقتور خاندان اندر ہی اندر ایک دوسرے کی قوت سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ بہرحال معاہدوں اور مشترکہ لائحہ عمل کے ذریعے ہر خدشے کا تدارک کیا جا سکتا تھا۔ مصر اور مراکش کے عدم تعاون کا نقصان آئندہ صلیبی جنگوں میں ظاہر ہوا جب مصر کو یہ تمام معرکے تنہا لڑنے پڑے۔

<u>نصرانیوں کی عہد شکنی</u>: سلطان صلاح الدین کے مصر چلے آنے کے بعد شام کے نصرانیوں نے دمشق اور اس کے نواح میں سلطان کے مقبوضات پر حملے شروع کر دیے تھے۔ انہوں نے سلطان سے جنگ بندی کے معاہدے کا جو صفر 571ھ (ستمبر 1175ء) میں ہوا تھا، ذرا بھی پاس نہیں کیا۔ بقول لین پول:

"عیسائی مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے معاہدوں کی پابندی کے قائل نہ تھے۔"

چنانچہ معاہدے کی باضابطہ تنسیخ کیے بغیر وہ عملی طور پر بار بار عہد شکنی کر رہے تھے۔

سلطان کی غیر موجودگی میں جب انہوں نے دمشق کے آس پاس زیادہ لوٹ مار کی تو سلطان کا بھائی توران شاہ ان کی سرکوبی کے لیے نکلا مگر فرنگیوں کی قوت اتنی بڑھ چکی تھی کہ انہوں نے توران شاہ جیسے معرکہ آزما سالار کو دمشق اور بعلبک کے درمیان عین الجبر کے مقام پر شکست فاش دے دی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے کئی بڑے بڑے امراء اور سردار بھی نصرانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے جن میں سیف الدین ابوبکر بن سالار بھی شامل تھا۔ [1]

اس کامیابی کے بعد نصرانیوں کی ہمت مزید بڑھ گئی تھی اور وہ بلا روک ٹوک اسلامی مقبوضات کو پامال کرنے لگے تھے۔

---

[1] کتاب الروضتین: 451/2

سلطان کا غزہ اور عسقلان پر حملہ: یہ تمام حالات سلطان صلاح الدین کے سامنے تھے۔ عہد شکنی کے بعد نصرانیوں سے معاہدہ از خود ختم ہو چکا تھا۔ اب سلطان اُن کو مزا چکھانے میں مزید تاخیر نہیں کر سکتے تھے۔

3 جمادی الاولیٰ 573ھ (27 اکتوبر 1177ء) کو سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ ایک بار پھر مصر سے شام کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ غزہ اور عسقلان پر حملے کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ یہ دونوں نصرانیوں کے اہم مراکز تھے اور ان پر حملے سے نصرانیوں کو زبردست چوٹ لگائی جا سکتی تھی۔ [1]

5 جمادی الاولیٰ 573ھ (29 اکتوبر 1177ء) کو لشکر بلبیس پہنچا۔ یہاں سے آگے نکل کر سلطان نے اعلان کرایا کہ ہر سپاہی دس دس دن کا راشن اپنے ساتھ لے لے، تاکہ فرنگیوں کی ریاستوں کے اندر دور تک کارروائیاں کی جا سکیں۔ سلطان کے کاتب شیخ عماد اصفہانی نے جو شام سے سلطان کے ساتھ ہی مصر آئے تھے اور اب دمشق واپس جانا چاہتے تھے یہاں سلطان سے رخصت طلب کی۔ شیخ عماد اصفہانی فرماتے ہیں کہ یہ واحد جہادی مہم تھی جس میں سلطان کے ساتھ میں شریک نہیں ہوا، ورنہ ہر موقع پر میں ان کے ساتھ رہا۔ سلطان جہادی مہمات میں علماء اور اہل علم وفضل کی شرکت کو بڑی برکات کا باعث یقین کرتے تھے۔ اس لیے ان کی دلی خواہش تھی کہ شیخ عماد اس موقع پر بھی ان کے ساتھ رہیں۔ اس لیے کہا:

''آپ نہیں چل رہے؟ آپ تو ہمیشہ ساتھ ہوا کرتے ہیں، کیا آپ نے ہمیں چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

شیخ عماد اصفہانی نے کہا:

''فیصلہ تو آقا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ میرے لیے جو پسند کریں وہی بہتر ہوگا۔''

سلطان نے شیخ کے عذر کو سمجھتے ہوئے کہا:

''ٹھیک ہے آپ جایئے اور ہمارے لیے دعا فرماتے رہیے بارگاہ خداوندی میں ہمارے لیے مغفرت طلب کرتے رہیے۔''

شیخ عماد اصفہانی دمشق روانہ ہو گئے اور سلطان اپنے لشکر کے ساتھ عسقلان کی طرف بڑھے۔ [2]

9 جمادی الاولیٰ 573ھ (2 نومبر 1177ء) کو سلطانی افواج عسقلان کے سامنے پہنچ چکی تھیں۔ یہاں مختلف جھڑپوں اور چھاپہ مار کارروائیوں میں دشمن کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔ بہت سے فرنگی گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے۔ سلطانی افواج نے بہت سا مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ نصرانیوں نے کوئی

[1] الکامل فی التاریخ: 266/7 [2] کتاب الروضتین: 458/2

مزاحمت نہیں کی۔ مجاہدین کو ہر طرف میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بے خوف و خطر ہو کر مختلف سمتوں میں پھیل گئے اور دشمن کے علاقوں میں چھاپے مارنے لگے۔ [1]

رملہ کا خون ریز معرکہ یکم جمادی الثانیہ 573ھ (24 نومبر 1177ء) کو سلطان فوج کے ایک مختصر سے حصے کو اپنی کمان میں لے کر رملہ کے سامنے پہنچے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ چھاپہ مار کارروائیوں کے بعد فرنگیوں کے کسی مضبوط اور اہم قلعے کا محاصرہ کر لیں گے۔ [2]

وہ رُکے بغیر رملہ سے آگے بڑھ گئے۔ اب "تل الصافیہ" کا دریا ان کے سامنے تھا۔ سلطان کے سپاہی دریا عبور کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ فرنگیوں کا ایک لشکر کسی نامعلوم گوشے سے نکل کر اس وادی میں آ دھمکا۔ یہ دیکھ کر سلطان نے فوج کو صف بندی کا حکم دیا۔ صف بندی ابھی جاری تھی کہ دشمن قریب آ گیا۔ اس وقت سلطان نے پوزیشن میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ ان کے اشارے پر دایاں بازو بائیں سمت، اور بایاں بازو قلب کی جگہ پر آنے لگا، اس طرح وہ اپنی پشت کو رملہ کے ٹیلے کی اوٹ میں محفوظ رکھ سکتے تھے۔

مگر ابھی صف بندی مکمل ہونے نہ پائی تھی کہ دشمن نے دھاوا بول دیا اور سلطان کو ان مٹھی بھر مجاہدین کے ساتھ گھیر لیا۔ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی زندگی کے خطرناک ترین لمحات تھے۔ دشمن نے تین سمتوں سے ان پر حملہ کر دیا تھا تاہم سلطان کے محافظ دستے نے جان توڑ مدافعت کرتے ہوئے اپنے آقا کی حفاظت کی۔ سلطان کا بہادر بھتیجا محمد چند سپاہیوں سمیت دشمن کے سامنے لوہے کی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سپاہی آخر دم تک ڈٹے رہے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

سلطان کے دوسرے دلیر اور معرکہ آزما بھتیجے تقی الدین عمر نے بھی زبردست مزاحمت کی۔ ان نے فرنگیوں کے کئی دھاووں کو آگے بڑھ کر ناکام بنایا اور حملہ کرنے والے درجنوں گھڑسواروں اور پیادوں کو مار گرایا۔ اس تگ و دو میں اس کے کئی ساتھی شہید ہو گئے اور وہ خود لڑتے لڑتے بری طرح تھک گیا۔ اس کا سترہ سالہ لڑکا احمد اس معرکے میں ہمراہ تھا۔ بڑا خوبصورت نوجوان تھا، ابھی اس کے رخساروں پر ڈاڑھی نکلنا شروع ہوئی تھی۔ تقی الدین نے اسے پکار کر کہا:

"لو بیٹے! اب تمہاری باری۔ بہادری کہاں ہے تمہاری۔ اس سے میری آنکھیں ٹھنڈی کرو، اندیشہ سود و زیاں کو اپنی جنگی مہارت اور تیز دھار تلوار سے پارہ پارہ کر ڈالو۔"

احمد نے یہ پکار سنی تو تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سلطان کی جانب آنے والی

[1] البرق الشامی: 37/3 [2] الکامل فی التاریخ: 269/7

ایک ٹولی پر ٹوٹ پڑا، انہیں پیچھے دھکیل کر وہ تیزی سے واپس آ گیا۔ اس کا لباس سرخ ہو رہا تھا کیوں کہ اسے کئی گہرے زخم آ چکے تھے۔ اسے مرہم پٹی کی فوری ضرورت تھی۔ مگر تقی الدین عمر سلطان صلاح الدین ایوبی کی حفاظت کے لیے بیٹے کی قربانی پر مجبور تھا۔ محافظ سپاہی ایک ایک کر کے کٹ رہے تھے اور چند لمحوں کے اندر اندر گھیرا توڑ کر سلطان کو باہر نکالنا ضروری تھا۔ اس نے احمد کو دوبارہ آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا اور یہ تاریخی فقرہ کہا:

عُدْ یَا اَحمد فَاِنَّ الْعَوْدَ اَحْمَدُ

''اے احمد! دوبارہ حملہ کر...... کہ پلٹ کر جھپٹنا زیادہ قابلِ تعریف ہے۔''

فرمانبردار بیٹا خندہ پیشانی سے باپ کا حکم بجا لایا۔ وہ تلوار سونت کر ایک بار پھر اس طرف آنے والے سپاہیوں پر حملہ آور ہوا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔ [1]

اس وقت سلطان کے ساتھ بڑی تعداد میں چنے ہوئے ممتاز امراء اور مجاہدین تھے۔ ان میں سے ہر ایک سلطان کی زندگی کو پوری امت مسلمہ کی وہ امانت سمجھتا تھا جس کے ضائع ہونے سے عالمِ اسلام کی عزت کے خطرے میں پڑ جاتی، اس لیے ہر فرد جان کی بازی لگا کر اپنے آقا کی حفاظت کر رہا تھا۔ انہی میں ایک ممتاز شخصیت فقیہ عیسی الھکاری تھے جو اصل میں افتاء وتدریس اور تصنیف وتالیف کے مردِ میدان تھے مگر اس کے ساتھ نہایت ماہر شمشیر زن بھی تھے۔ اس دن ان کی تلوار بازی کے جوہر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سب سے آگے بڑھ بڑھ کر فرنگیوں پر وار کر رہے تھے۔ ان کے جھگمٹے میں گھس کر ان کے سورماؤں کو تگنی کا ناچ نچا رہے تھے۔ فقیہ عیسی الھکاری کی شمشیر زنی کے بارے میں علامہ ابن اثیر کے یہ الفاظ تاریخ میں محفوظ ہو چکے ہیں:

وکان اشد الناس قتالا ذالك اليوم الفقيه عيسى رحمه الله

اس دن لوگوں میں سب سے زبردست لڑائی کرنے والے فقیہ عیسی رحمہ اللہ تھے۔

محافظوں کی اس قدر زبردست مدافعت کے باوجود چند فرنگی سلطان صلاح الدین کے بالکل قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک نائٹ نے سلطان پر براہ راست حملہ کیا مگر سلطان کے جانثاروں نے بروقت اس کا حملہ روک کر اسے مار ڈالا۔ سلطان صلاح الدین اس معرکے میں اپنے جانثاروں کی دلیری کو اکثر یاد کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے کاتب عماد اصفہانی کو اس لڑائی کا احوال سناتے ہوئے کہا:

''میں نے ایک گھڑ سوار کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر میری جانب آ رہا تھا اور اپنا نیزہ

[1] البرق الشامی: 40/3

میرے حلق کی جانب سیدھا کر چکا تھا۔ اس کا وار مجھ پر پڑنے ہی والا تھا، اس کے ساتھ ہی دو اور صلیبی نائٹ بھی مجھ پر حملہ آور ہو چکے تھے...... مگر یک دم میرے تین جانباز ان کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے ایک ایک حملہ آور کو سنبھال لیا۔ پہلا حملہ آور میرے بالکل قریب آ چکا تھا مگر میرے ساتھیوں نے اسے نیزے سے مار گرایا اور اس کے وار کو کارگر نہ ہونے دیا۔"

یہ تین جانثار ابراہیم بن قابر، فضل فیضی اور سوید بن غشم مصری تھے۔ سلطان کے ان تین جانثاروں نے سلطان کے گرد ایک آہنی حلقہ قائم کر لیا اور اسے آخر تک ٹوٹنے نہ دیا۔

اب پسپائی ناگزیر تھی مگر سلطان غیر منظم پسپائی اختیار کر کے دشمن کو مزید جری ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ یکدم نکل بھاگنے میں اپنے ساتھیوں کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا، چنانچہ وہ میدان چھوڑ کر ایک طرف نکل گئے اور کچھ دور جا کر ٹھہر گئے۔ سلطان کے جن بکھرے ہوئے ساتھیوں نے انہیں نکلتے ہوئے دیکھ لیا وہ بھی میدان سے ہٹ کر ان کی جانب آ گئے۔ دشمن نے تعاقب شروع کیا تو سلطان نے ساتھیوں کو پھر تیزی سے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جب خطرہ کم ہو گیا تو سلطان نے پھر رک کر بکھرے ہوئے سپاہیوں کا انتظار شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہا۔

چاند کی دوسری تاریخ تھی، اس لیے سورج ڈوبتے ہی گہری تاریکی چھا گئی۔ جب سلطان کو یقین ہو گیا کہ جس قدر سپاہی میدان جنگ سے فرار ہو سکے تھے وہ سب یہاں پہنچ چکے ہیں تو انہوں نے مغرب کی طرف کوچ کر دیا۔ تاریکی میں دشمن ان کا تعاقب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم ان کے اکثر سپاہی شہید یا گرفتار ہو چکے تھے۔ بہت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر دور دراز کے مختلف علاقوں کی طرف جا نکلے تھے۔ کئی ایک بھٹک کر دشمن کے چنگل میں جا پھنسے تھے، انہی میں فقیہ عیسیٰ، ان کے بھائی فقیہ ظہیر الدین اور کئی خواص بھی شامل تھے۔ [1] یہ حضرات مصر کا رخ کرنے کی بجائے غلطی سے کسی عیسائی ریاست میں داخل ہو گئے تھے، وہاں ایک غار میں پناہ لیے ہوئے کسی نجات دہندہ کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک شخص ادھر آ نکلا، اس نے ان سے رہنمائی کا وعدہ کیا مگر دھوکہ دے کر انہیں نصرانیوں کے پاس لے گیا اور انہیں گرفتار کرا دیا۔ فقیہ عیسیٰ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی کئی سال تک نصرانیوں کی قید میں رہے، آخر سلطان ایوبی نے ستر ہزار دینار اور قیدی نصرانیوں کے ایک گروہ کے عوض انہیں آزاد کرایا۔ یہ سلطان صلاح الدین کی زندگی کی وہ جنگ تھی جس میں مسلمانوں کو بہت سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ [2]

---

[1] البرق الشامی: 40/3

[2] البرق الشامی: 41/3

چونکہ پسپائی کے سفر میں سارا علاقہ صحرائی تھا اور شام کا کوئی ایسا شہر قریب نہیں تھا جہاں پناہ لی جا سکتی اس لیے مصر کی جانب لوٹنے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کا تمام ساز و سامان اور خوراک و رسد کے ذخائر میدان جنگ ہی میں رہ گئے تھے جن پر دشمن نے قبضہ کر لیا تھا۔ سو اب کسی زاد سفر کے بغیر کیے جانے والی یہ صحرا پیمائی حد درجے اذیت ناک تھی۔ شکر کہ موسم سخت سردی کا تھا۔ گرمی ہوتی تو قافلہ پیاس سے مر گیا ہوتا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی دو ہفتوں کے دشوار گزار صحرائی سفر کے بعد جمعرات 15 جمادی الثانیہ 573ھ (8 دسمبر 1177ء) کو قاہرہ پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ تھوڑے سے افراد تھے جن کی بھوک اور پیاس سے بری حالت ہو رہی تھی۔ ان کے سواری اور بار برداری کے جانور زیادہ تر ہلاک ہو چکے تھے۔

سلطان کی شکست اور پسپائی کی خبر قاہرہ کے گلی کوچوں میں پھیل چکی تھی اور لوگ نہایت تشویش کی حالت میں سلطان کی خیر خبر کے منتظر تھے۔ ان کے قاہرہ پہنچنے پر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس حادثے میں سلطان کا بچ جانا ایک کرامت سے کم نہیں تھا۔ سلطان نے قاہرہ پہنچ کر اپنے بھائی توران شاہ کو جو دمشق میں تھا، اس معرکے کی روداد لکھ کر بھیجی۔ بھائی سے اظہار محبت کے ساتھ انہوں نے اس معرکے کا نقشہ کھینچتے ہوئے مراسلے کا آغاز اس شعر سے کیا:

ذَكَرْتُكَ وَالْخَطِّ يَخْطِرُ بَيْنَنَا وَقَدْ نَهلت مِنَّا مُثَقَّفَةُ السَّمُرُ

"میں نے تمہیں اس وقت یاد کیا جب برچھیاں چل رہی تھیں اور دشمن کے سیدھے اور گندمی نیزے ہمارے جسموں میں داخل ہو کر بار بار ہمارا خون پی رہے تھے۔"

اس کے بعد تحریر کیا:

"ہم اس معرکے میں بار بار ہلاک ہوتے ہوتے بچے۔ اللہ نے ہمیں اس موقع پر یقیناً اس لیے زندہ رکھا کہ وہ ہم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔"[۵]

یہ بات بالکل سچ تھی۔ بلاشبہ قدرت خداوندی نے انہیں القدس کی آزادی اور حفاظت کا کام لینے کے لیے محفوظ رکھا تھا۔

۵ الکامل فی التاریخ: 269/7

فصل:7

رملہ کی شکست کا بدلہ

رملہ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کو پسپائی پر مجبور کرنے کے بعد شام کے فرنگیوں کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے۔ انہی دنوں یورپ سے ان کا ایک نواب فلپ فلانڈر (فلندرس) اپنی فوج کے ساتھ شام کے نصرانیوں کی مدد کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں سے لڑائی کے لیے بے قرار اور انہیں پورے شام سے نکال دینے کے لیے پرجوش تھا۔ صلاح الدین ایوبی کی پسپائی کے ایک ہفتے بعد 2 جمادی الاولیٰ 573ھ (14 نومبر 1177ء) کو اس نے حماۃ پر حملہ کر دیا۔ حاکم حماۃ شہاب الدین حارمی جو سلطان کا ماموں اور سسر تھا، شدید بیمار تھا۔ پھر بھی اس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خوش قسمتی سے شام کا ایک کہنہ مشق امیر سیف الدین مشطوب عین موقع پر اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ اس وقت شدید ترین لڑائی دیکھنے میں آئی۔ فرنگی شہر کے اندر گھس گئے مگر حماۃ کے جانباز مسلمانوں نے حفاظتی فوج کے ساتھ مل کر زبردست مزاحمت کے بعد فرنگیوں کو شہر سے باہر دھکیل دیا۔ شہر کے سامنے میدان میں چوبیس گھنٹے تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی اور آخر کاؤنٹ فلپ کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ المشطوب نے سلطان ایوبی کو مراسلہ لکھ کر اس کامیابی کی اطلاع دی اور بتایا کہ اس معرکے میں کم از کم ایک ہزار فرنگی گھڑسوار اور پیادے مارے گئے۔ [1]

شہاب الدین حارمی کی وفات ❊ شہاب الدین حارمی اس ہولناک لڑائی کے چند دنوں بعد چل بسا۔ یوں شام میں سلطان اپنے ایک اہم معتمد رکن سے محروم ہو گئے۔ دمشق میں ان کی نیابت کرنے والے توران شاہ کو شام کے پرکیف نظاروں اور عیش کی بہاروں نے اس قدر گرویدہ بنا لیا تھا کہ وہ نصرانیوں کی چیرہ دستیوں کی روک تھام پر کوئی توجہ نہیں دے پا رہا تھا، اس لیے شام پر سلطان صلاح الدین کی گرفت کمزور پڑ جانے کا خدشہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ [2]

تین حریف ❊ اس وقت نصرانیوں کے تین بڑے حاکم مسلمانوں سے گزشتہ شکستوں کا بدلہ لینے کے

[1] الروضتین: 471/2 [2] الروضتین: تحت 573ھ

لیے سرگرم ہو چکے تھے۔ پہلا دشمن کرک کا حاکم ریجی نالڈ تھا جسے یورپی مؤرخین ریناٹ، ریجنالٹ اور رینالڈ بھی کہتے ہیں۔ اسی کو عرب مؤرخ ارناط، ارناط برنس اور برنس ارناط کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ یہ بدطینت اور ہیبت ناک بڈھا متعصب نصرانیوں کے گروہ ہاسپٹلر کا سردار اور انطاکیہ کا حاکم تھا۔ نورالدین زنگی نے اسے کسی معرکے میں گرفتار کیا تھا۔ اس نے موصل میں دس برس کے لگ بھگ قید کاٹی تھی۔ زنگی کی وفات کے بعد سیف الدین غازی نے 570ھ میں اسے رہا کر دیا تھا۔ اس دوران اس کے شہر انطاکیہ کا انتظام دوسرے عیسائی امراء کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا جنہوں نے اسے بدلے میں کرک کا قلعہ دے دیا۔ ریجی نالڈ نے اس قلعے کو مسلمانوں پر مسلسل تاخت وتاراج کا مرکز بنالیا تھا۔

دوسرا دشمن طرابلس کا حاکم ریمنڈ تھا جسے عرب مؤرخین ''قومص'' کہتے ہیں۔ نورالدین زنگی نے اسے 559ھ میں حارم کی فتح کے موقع پر گرفتار کیا تھا۔ گیارہ برس تک حلب میں قید میں رہنے کے بعد وہ محرم 570ھ میں الملک الصالح کے حکم سے آزاد ہوا۔ (عماد کاتب کے بقول نورالدین نے اس کی رہائی کے لیے ڈیڑھ لاکھ دینار اور ایک ہزار قیدیوں کی شرط رکھی تھی۔ [1]) نصرانیوں کے ہاں اسے سب سے مدبر قائد مانا جاتا تھا۔ تیسرا دشمن القدس کا نیا حاکم بالڈون تھا جو املرک کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوا تھا اور مسلمانوں کے خلاف سراپا غضب بنا ہوا تھا۔

کمش تگین کا انجام: اس دوران شام کی سیاست میں ایک اور تبدیلی آچکی تھی۔ حلب جو سلطان صلاح الدین ایوبی سے صلح کے بعد امن وسکون کے دن گزار رہا تھا اندرونی سیاسی بحران کا شکار ہو گیا تھا۔ حاکم حلب الملک الصالح اور حکومت کے سب سے متحرک پرزے کمش تگین میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ کمش تگین کی من مانیوں، زیادتیوں اور مفاد پرستیوں کی وجہ سے امرائے حلب کی بڑی تعداد ایک اور بااثر امیر عدل ابن العجمی کے گرد جمع ہو گئی تھی۔ یوں ابن العجمی کمشت گین کا سیاسی حریف بن گیا تھا۔ اسی دوران فدائیوں نے نماز جمعہ کے بعد ابن العجمی کو قتل کر ڈالا۔

چونکہ کمش تگین کے فدائیوں سے دوستانہ مراسم کا سب کو پتا تھا، اس لیے ابن العجمی کے حامیوں کو کمش تگین پر ہی شک ہوا۔ انہوں نے الملک الصالح کو یقین دلایا کہ کمش تگین نے فدائیوں کو مال وزر دے کر یہ کارروائی کروائی ہے۔ ان امراء نے الملک الصالح کو عار دلائی کہ کمش تگین امور سیاست پر حاوی ہے اور ہر معاملے میں من مانی کر رہا ہے، انہوں نے کہا:

''بادشاہ آپ ہیں، پھر بھلا کوئی دوسرا کیوں حکم چلا رہا ہے۔''

[1] کتاب الروضتین: 351/2

الملک الصالح جوان ہو چکا تھا، اور اسے بھی ہر معاملے میں گمش تگین کی من مانی سخت شاق گزر رہی تھی چنانچہ اس کی اجازت سے گمش تگین کو ابن العجمی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ساتھ ہی اسے حکم دیا کہ وہ اپنے زیر انتظام حارم کے قلعے سے دست بردار ہو جائے۔ گمش تگین نے جبراً وقہراً حارم کے قلعہ دار کو جو اس کا ماتحت تھا، رقعہ لکھ بھیجا کہ وہ قلعہ خالی کر دے مگر قلعہ دار نے موقع غنیمت جان کر خود مختاری کا اعلان کر دیا اور قلعے کے دروازے بند کر دیے۔ الملک الصالح کو شک ہوا کہ گمش تگین نے ہی قلعہ دار کو خفیہ طور پر ڈٹے رہنے کا حکم دیا ہوگا، اس لیے وہ قلعہ دار کو مرعوب کرنے کی خاطر گمش تگین کو ساتھ لیے خود حارم کی فصیل کے سامنے پہنچ گیا۔ وہاں گمش تگین کو الٹا لٹکا کر نیچے آگ سلگائی گئی اور ناک میں دھواں دیا گیا تا کہ قلعہ دار اپنے آقا کی جان خطرے میں دیکھ کر دروازہ کھول دے۔ گمش تگین بھی چیخ چیخ کر اسے دروازہ کھولنے کا حکم دیتا رہا مگر قلعہ دار اس کا وفادار ہوتا تب اس پر اثر ہوتا۔ وہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا۔ یوں ستم گر وعیار گمش تگین، بدترین اذیتوں کا نشانہ بن کر موت کے گھاٹ اتر گیا۔ یہ واقعہ جمادی الثانیہ 573ھ (دسمبر 1177ء) کا ہے۔[1]

نصرانیوں کا حارم پر حملہ ❋ اندرونی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حلب کی حکومت مزید کمزور پڑ گئی تھی۔ حماۃ سے پسپا ہونے والے نصرانیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جمادی الثانیہ 573ھ میں یلغار کر کے حارم کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ بہت مضبوط تھا اس لیے فرنگی اس پر قابض نہ ہو سکے۔ اس دوران الملک الصالح کا لشکر بھی فرنگیوں کے مقابل کھڑا رہا تا کہ موقع ملے تو قلعے پر خود قبضہ کر لے۔ محاصرہ چار ماہ تک جاری رہا۔ آخر کار الملک الصالح نے فرنگیوں کو پیش کش کی اگر وہ محاصرہ اٹھا لیں تو حلب کی حکومت انہیں ایک خطیر رقم ادا کرے گی۔ ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ سلطان ایوبی کی عن قریب دوبارہ آمد متوقع ہے، اگر فرنگیوں نے محاصرہ جاری رکھا تو حارم کا قلعہ دار ایوبی سے جا ملے گا۔ یہ دھمکی کام کر گئی اور فرنگی محاصرہ اٹھا کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد رمضان کے آخری عشرے میں قلعہ دار نے قلعہ الملک الصالح کے حوالے کر دیا کیونکہ اسے فرنگیوں کے دوبارہ حملے کا خطرہ بدستور لاحق تھا۔[2]

صلاح الدین کی دوبارہ شام آمد ❋ صلاح الدین ایوبی کی دوبارہ شام آنے کی دھمکی صداقت پر مبنی تھی۔ نصرانیوں کے حارم پر حملے سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ انہیں سلطان ایوبی کی شام میں موجودگی ہی اپنی زیادتیوں سے باز رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ سلطان نے الملک العادل کو نائب بنا کر عید الفطر کے دن (23 مارچ) قاہرہ سے کوچ کر دیا۔ سرزمین شام ایک بار پھر صلاح الدین کے گھڑ سواروں کی ٹاپوں سے

[1] الروضتین تحت 573ھ [2] الکامل فی التاریخ: 273/7

گو ننج اٹھی۔ 10 شوال کو ایلہ میں منزل کر کے وہ 24 شوال 573ھ (15/اپریل 1178ء) کو دمشق پہنچ گئے۔ کئی ہفتوں تک وہ یہاں کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کرتے رہے اور فوری توجہ طلب معاملات نمٹاتے رہے۔ اس دوران ذی الحجہ میں وہ قارا کے جنگلات میں شکار کے لیے بھی نکلے۔ [1]

سلطان حمص کے نواح میں ❁ 574ھ کے آغاز میں سلطان ایوبی دمشق سے حمص پہنچے۔ دریائے عاصی کی وادی میں خیمہ زن ہو کر وہ نصرانیوں کی مکمل سرکوبی کی مہم کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ رملہ کی شکست سے وہ سبق سیکھ چکے تھے اور عجلت میں کسی غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ان کی خاموشی کو فرنگیوں نے ان کی کمزوری پر محمول کیا اور ربیع الاول 574ھ (اگست 1179ء) میں ایک بار پھر حماۃ پر حملہ کر کے نواحی بستیوں اور دیہاتوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا مگر حماۃ کے سپاہیوں نے جو سلطان صلاح الدین کی شام میں موجودگی کے باعث جری تھے، بھرپور جوابی حملے کیے اور فرنگیوں کی بڑی تعداد کو قتل کر کے بہت سوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ قیدی سلطان کے پاس حمص لائے گئے۔ سلطان نے کسی رعایت کا مستحق سمجھے بغیر ان کی گردنیں اڑا دینے کا حکم دیا۔ یہ کام حاضرین میں سے ان افراد کے سپرد کیا گیا جو دین داری اور پرہیزگاری میں ممتاز تھے۔ چنانچہ بعض علماء و مشائخ نے بھی اس کام میں حصہ لیا۔ [2]

بعلبک اور توران شاہ ❁ انہی دنوں ایک اور الجھن آ پڑی۔ بعلبک کا قلعہ ان دنوں شام کی سیاست کے ایک اہم کردار ابن المقدم کے پاس تھا۔ یہ وہی ابن المقدم تھا جس نے صلاح الدین کو پہلی بار شام میں مداخلت اور دمشق پر قبضے کی دعوت دی تھی۔ سلطان نے دمشق کے بدلے اسے بعلبک دے دیا تھا مگر اب سلطان کا بڑا بھائی توران شاہ بعلبک کی تولیت کا خواہش مند تھا کیوں کہ اس شہر سے ایوبی خانوادے کی قدیم یادیں وابستہ تھیں۔ بعلبک کے حصول کے لیے وہ سلطان پر اتنا دباؤ ڈال چکا تھا کہ آخر سلطان کو ابن المقدم سے بعلبک واپس مانگنا پڑا مگر ابن المقدم نے بعلبک حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار سلطان کو خود بعلبک جانا پڑا۔ انہوں نے ابن المقدم پر دباؤ ڈالنے کے لیے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ موسم سرما شروع ہوا تو سلطان نے محاصرے کی ذمہ داری طغرل جاندار کو سونپی اور خود رجب 574ھ کے آخری عشرے میں دمشق واپس آ گئے۔ ابن المقدم کو گفت و شنید کے ذریعے سمجھانے کی کوشش جاری رہی۔ آخر وہ مان گیا۔ اس نے بعلبک کے عوض سلطان سے بعرین، کفرطاب اور معرہ کی جاگیریں حاصل کر لیں۔ سلطان نے بعلبک اپنے بھائی توران شاہ کے حوالے کر دیا۔ [3]

[1] الروضتین تحت 573ھ [2] الروضتین تحت 574ھ [3] الروضتین: تحت 574ھ

حصن الاحزان: بعلبک کی مہم کے دوران سلطان کو کچھ مدت کے لیے نصرانیوں کی سرحدات سے توجہ ہٹانا پڑی تھی۔ موقع پا کر شاہ یروشلم بالڈون سلطان کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگیا تھا۔ ویسے بھی رملہ کی فتح نے اس کی ہمت بہت بڑھادی تھی چنانچہ اس نے اپنی حدود سے آگے بڑھ کر دمشق جانے والی شاہراہ پر ایک نیا قلعہ تعمیر کرانا شروع کر دیا۔ عرب اس جگہ کو ''بیت الاحزان'' (غموں کا گھر) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا گھر اسی جگہ تھا۔ عرب مؤرخین نے غالباً اس قلعے کے محل وقوع کی وجہ سے اسے ''حصن الاحزان'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ مقام بانیاس سے بہت قریب تھا جبکہ دمشق سے بھی اس کا فاصلہ 16 میل سے زیادہ نہ تھا۔ نصرانیوں کے قلعے صفد اور طبریہ اس سے صرف آٹھ میل دور تھے۔ [1]

عجیب بات یہ ہے کہ جب تک یہ قلعہ تعمیر ہوتا رہا سلطان صلاح الدین نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی حالاں کہ ان کے امراء ان سے کہتے رہے تھے:

''جب یہ قلعہ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو اسلامی سرحدیں غیر محفوظ ہو جائیں گی۔''

مگر سلطان کا جواب تھا:

''جونہی وہ قلعے کی تعمیر مکمل کریں گے ہم ان پر دھاوا بول دیں گے اور قلعے کو بنیادوں سے اکھاڑ کر بے نام ونشان کردیں گے، فی الحال انہیں اس قلعے پر اپنی دولت، اپنے سپاہی اور اپنی فکر ضائع کرنے دو۔''

سلطان کے امراء نے اس پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کئی بار یہ کہا کہ کسی مصیبت کو ابتداء میں روک لینا، انتہائی مرحلے میں اس کی روک تھام کی نسبت زیادہ آسان ہے مگر سلطان اپنی رائے پر مضبوطی سے قائم رہے جو بظاہر زمینی حقائق کے خلاف معلوم ہوتی تھی۔ تاہم وقت نے ثابت کردیا کہ سلطان کا فیصلہ درست تھا اور ان کے کہے ہوئے الفاظ کہ قلعے کی تعمیر مکمل ہوتے ہی ہم اسے بنیادوں سے اکھاڑ دیں گے حرف بحرف سچ ثابت ہوئے۔

سلطان کے کاتب عماد اصفہانی اس بارے میں کہتے ہیں:

''سلطان اپنی دین داری کی قوت اور یقین کی روشنی کے سبب صبر کر رہے تھے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر غیب کا راز کھول دیا تھا اور ان سے شک وشبہے کو دور کر دیا تھا، پس ایک سال بعد ان کے فیصلے کا بہترین نتیجہ ان کے کہے ہوئے الفاظ کے بالکل مطابق سامنے آگیا۔'' [2]

[1] کتاب الروضتین: تحت 574ھ، الکامل فی التاریخ: تحت 575ھ [2] البرق الشامی: 145/3

صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو حصن الاحزان سے کوئی غیر معمولی خطرہ لاحق نہیں تھا، انہیں اس پر قبضہ کوئی خاص مشکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے نزدیک عیسائی اس قلعے کی تعمیر پر وقت اور سرمایہ ضائع کر رہے تھے جس کا انہیں مستقبل میں کوئی فائدہ نہ تھا۔

سلطان خود اس دوران شام میں اپنے قدم زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہے تھے اور ایک طویل عرصے سے تھکی ماندی افواج کو قدرے استراحت کا موقع دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لیے تیاری مکمل کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ جہاد کے فریضے سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ دمشق میں ڈیرہ ڈال کر وہ حصن الاحزان کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ سال قحط کا سال تھا۔ علامہ ابن اثیر کے بقول:

''بارشیں بالکل بند تھیں اور تمام شہروں میں گرانی شدید تر تھی...... نماز استسقاء کے باوجود پانی نہیں برس رہا تھا۔ غلے نایاب ہو رہے تھے اور لوگ مردار جانور کھانے پر مجبور تھے۔''[1]

اس حالت میں جہاد کی کسی نئی مہم کا آغاز بڑے دل گردے کی بات تھی۔ چنانچہ امراء نے سلطان سے کہا:

''یہ جہاد کا سال نہیں، اگر دشمن مصالحت پر آمادہ ہو تو کر لیجیے۔ اگر وہ صلح پر مائل ہو تو آپ بھی لچک کا مظاہرہ کیجیے۔''

مگر سلطان نے چٹان جیسے مضبوط لہجے میں یہ تاریخ ساز جواب دیا:

''جہاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے جبکہ رزق کی کفالت اس نے اپنے ذمہ لی ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل واجب ہے اور اس کا رزق دینے کا وعدہ پکا اور سچا ہے۔ ہم تو وہی کریں گے جس کا اس نے ہمیں مکلف بنایا ہے۔ تب ہی ہم وہ حاصل کر سکیں گے جس کی کفالت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل سے غافل ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے مزید غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔''[2]

بالڈون کا حملہ اور فرخ شاہ کی شجاعت: آخر بیت الاحزان کے قلعے کی تعمیر مکمل ہو گئی جس کے بعد شاہ یروشلم بالڈون نے شام کے شہروں پر یلغار کی تیاری شروع کر دی۔ درحقیقت اس قلعے کی وجہ سے عیسائی بانیاس کے سامنے پھیلے ہوئے زرخیز میدانی علاقے پر پورا تسلط حاصل کر چکے تھے۔ دریائی راستے بھی اب ان کی زد میں تھے۔ سلطان ابھی قلعے پر فوج کشی کا حتمی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ شاہ یروشلم اپنی پوزیشن مضبوط دیکھ کر ذیقعدہ 574ھ میں خود جارحانہ حملے پر اتر آیا۔ وہ ایک بڑی فوج لے کر اچانک دمشق کی طرف بڑھنے لگا۔ دمشق کے دیہات اور بستیاں نصرانیوں کی غارتگری کا نشانہ بنتی

[1] الکامل فی التاریخ تحت 575ھ [2] کتاب الروضتین: 3/21 تحت 574ھ

چلی گئیں۔ اس فوج میں بالڈون کے پرچم تلے نصرانیوں کے درجنوں نامی گرامی امراء جمع تھے جن میں توران کا حاکم ہمفری بھی تھا جو اپنی سفا کی کے باعث ہر طرف مشہور تھا۔

جب صلاح الدین ایوبی کو دمشق میں اس یلغار کی اطلاع ملی تو ان کے پڑاؤ میں موجود فوج کی تعداد چند ہزار سے زائد نہ تھی۔ اکثر سپاہی قحط کے باعث رخصت پر چلے گئے تھے۔ سلطان نے فوراً اپنے بھتیجے فرخ شاہ کو ہراول کے تیز رفتار دستے

کے ساتھ بالڈون کے لشکر کی طرف روانہ کر دیا اور تاکید کی:

''بالڈون کی فوج کے نزدیک پہنچ کر پیغام رساں کبوتروں کے ذریعے ہمیں صورتحال سے آگاہ کر دینا، خود جنگ مت چھیڑنا اور دشمن کی پیش قدمی جاری رہنے دینا۔''

سلطان کا منصوبہ یہ تھا کہ جب دشمن قریب آجائے تو مختلف اطراف سے چھاپہ مار حملوں اور قلعہ بند جنگوں کے ذریعے اس کے دانت کھٹے کر دیے جائیں۔

فرخ شاہ کے سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ وہ ان جانبازوں کے ساتھ دشمن کے علاقے کے قریب پہنچ کر کئی دنوں تک ان کی تیاریوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ایک دن وہ دشمن کی سرحدوں میں گھس گیا۔ اس نے دیکھا حریف لشکر پیش قدمی کے لیے تیار ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی صفیں حرکت میں آگئیں۔ اس سے قبل کہ فرخ شاہ ان کی نظروں سے بچ کر نکل جاتا، دشمن کے سپاہیوں نے اسے دیکھ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے غول کے غول اس طرف لپکنے لگے۔ فرخ شاہ کے اکثر ساتھی پیچھے تھے، وہ ایک سو سے کم سپاہیوں کو لے کر جاسوسی کے لیے آگے آیا تھا۔ اس تعداد کے ساتھ دشمن سے مقابلہ بظاہر ناممکن تھا مگر اب کترا کر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے لڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اگرچہ دشمن کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بچ نکلنے کے امکانات نہ تھے مگر فرخ شاہ کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ ہتھیار ڈال کر مسلمانوں کی عزت کو بٹہ لگائے۔ اس نے مدد لانے کے لیے ایک دو برق رفتار سواروں کو عقب میں روانہ کیا اور اپنے باقی ساتھیوں کو شہادت کا شوق دلاتے ہوئے ایک جگہ جمع کر لیا۔ پھر ان میں سے چند بہترین نشانہ بازوں کو آگے بڑھ کر دشمن پر تیر اندازی کا حکم دیا۔ تیر اندازوں نے تیزی سے صف باندھ کر دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ دشمن کے سپاہی جوان مٹھی بھر مجاہدوں کے سرنگوں ہونے کا یقین کیے ہوئے تھے اس خلاف توقع صورتحال پر پٹپٹا گئے۔ انہوں نے فوراً دفاعی ہیئت اختیار کی اور پھر اپنے نشانہ بازوں کو آگے لا کر جوابی تیر اندازی شروع کر دی۔

اس دوران فرخ شاہ اپنے ان ساتھیوں کی مدد آنے کا انتظار کرتا رہا، جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ کچھ

ہی دیر میں وہ تمام سپاہی فرخ شاہ کے پاس پہنچ گئے۔ان کی کل تعداد ایک ہزار سے کم تھی۔فرخ شاہ نے انہیں جنگی حکمت عملی سمجھائی جو صرف ایک نکتے پر مشتمل تھی:

''دشمن کی قیادت پر طوفانی حملہ کر کے اسے ٹھکانے لگاتے ہوئے خود شہادت کی منزل پالینا۔''

اسے آج کل کی اصطلاح میں فدائی حملہ بھی کہا جاسکتا ہے۔فرخ شاہ اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ دشمنوں سے ٹکرا گیا اور اس شدت سے لڑا کہ ان کے چھکے چھڑا دیے۔علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''فرخ شاہ نے خود کو جنگ میں جھونک دیا، وہ لڑائی پر چھا گیا اور معرکے کو تنہا اپنی ذمہ داری سمجھ کر لڑا۔''

اس موقع پر مسلم تیر اندازوں نے کمال کر دیا، انہوں نے نصرانی فوج کے قلب کو تیروں کی زد میں لے لیا۔یہاں بڑے بڑے نواب، امراء اور نائٹ موجود تھے، خود شاہ یروشلم بالڈون بھی یہیں تھا۔یہ سب تیروں کی برسات سے بری طرح گھائل ہونے لگے۔

بالڈون فرار۔ہمفری مقتول: کچھ تیر اندازوں نے بالڈون کو ہدف بنا کر پے در پے نشانے لگائے۔یہ دیکھ کر مشہور عیسائی نائٹ ہمفری اپنی جان کی بازی لگا کر بڑھا اور شاہ یروشلم کی ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا۔مسلمانوں کے تیروں کے لیے ہمفری بھی معمولی ہدف نہ تھا۔کئی تیر اس سفاک دشمن کے جسم سے پار ہو گئے، ایک تیر اس کی ناک میں گھس کر داڑھ کو اکھاڑتا ہوا تھوڑی کے نیچے سے نکل گیا۔اسے انتہائی زخمی حالت میں واپس لے جایا گیا اور دو دن بعد اس کی روح پرواز کر گئی۔ہمفری نے ایک عرصے سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہاء کر رکھی تھی، وہ بے حد تجربہ کار، جنگ آزمودہ اور نڈر انسان تھا۔علامہ ابن اثیر کہتے ہیں:

''ہمفری کی شجاعت اور جنگی امور میں مہارت ضرب المثل تھی، وہ ایک بلا تھا جسے اللہ نے مسلمانوں پر مسلط کر دیا تھا۔پس اللہ تعالیٰ نے اس کے شر سے مسلمانوں کو راحت پہنچائی۔''

ہمفری کے گرتے ہی بالڈون اپنی جان بچا کر بھاگا، اس دوران اس کی پوری فوج میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور مسلمانوں نے انہیں تلواروں کی دھار پر رکھ لیا تھا۔جو تلواروں سے بچ نکلے انہیں تیر اندازوں نے نہ بخشا۔عماد اصفہانی کا بیان ہے کہ اس جنگ میں تیر اندازوں نے اتنے تیر چلائے کہ ان کے ترکش خالی ہو گئے۔

جنگ کے اختتام پر ہلاک شدہ نصرانیوں کی لاشیں دور دور تک بکھری نظر آرہی تھیں۔ان کے بہت سے قیدی سر جھکائے ایک طرف کھڑے تھے۔دشمن کا لشکر بکھر کر بھاگ چکا تھا۔بالڈون تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکا۔علامہ شہاب الدین المقدسی فرماتے ہیں:

----

(1) العبر فی التاریخ: 151/3 (2) الکامل فی التاریخ تحت 574ھ (3) الکامل فی التاریخ تحت 574ھ

"فرنگی بڑی رسوائی کے ساتھ واپس لوٹے، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو زخمی نہ ہو۔ روزانہ ان کے کسی نہ کسی زخمی افسر کی موت کی خبر مسلمانوں تک پہنچ رہی تھی۔"

چند سو سپاہیوں کے ساتھ شاہ یروشلم کی فوج کا تیا پانچا کر دینا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا جس کے باعث فرخ شاہ کا نام تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔ یہ فتح اس بات کا ثبوت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی وہ مدد جو غزوۂ بدر اور غزوۂ احزاب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شامل حال ہوا کرتی تھی، ہر دور میں اہل ایمان کو نصیب ہو سکتی ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اس فتح کی خوشخبری اسی دن نامہ بر کبوتروں کے ذریعے دمشق پہنچ گئی۔ سلطان صلاح الدین اس بشارت سے مسرور ہو کر فاتحین کے استقبال کے لیے دمشق سے نکل پڑے۔ وہ راستے ہی میں تھے کہ فاتح سپاہی مقتول نصرانیوں کے کٹے ہوئے سروں اور قیدیوں کی قطاروں کے ساتھ ان سے آملے۔ ۵

---

۵ تاریخ الاسلام: 21/ وقائع 574ھ

فصل:8

بانیاس کے میدان میں

شام اور عراق میں قحط سالی نے نہایت خطرناک صورت حال اختیار کر لی تھی۔ ادھر شاہ یروشلم کی اس شکست کے بعد سلطان کو کچھ عرصہ کے لیے نصرانیوں سے کسی جارحیت کی توقع نہ تھی لہٰذا سلطان نے مناسب سمجھا کہ بھوک سے درماندہ فوج کے بڑے حصے کو مصر بھیج دیا جائے تاکہ شام کے غذائی ذخیرے جلد ختم ہو جانے کا خطرہ کم ہو سکے۔

ذیقعدہ 574ھ (مئی 1179ء) کے آخر میں سلطان نے اپنے بڑے بھائی توران شاہ کو جسے حال ہی میں بعلبک کا قلعہ دیا گیا تھا ترغیب دی کہ وہ فوج کے ایک حصے کو لے کر مصر چلا جائے۔ جمعہ 24 ذیقعدہ (3 مئی) کو توران شاہ نماز جمعہ کی ادائیگی سے فارغ ہو کر ایک بڑے قافلے کے ساتھ مصر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ سپاہیوں کے علاوہ تاجروں اور عام مردوں عورتوں اور بچوں کی بڑی تعداد بھی تھی۔ فوج کی وجہ سے یہ لوگ راستے میں کسی خطرے کا سامنا کیے بغیر مصر پہنچ گئے۔ یوں قحط سالی سے دمشق کے خزانے پر پڑنے والا ناقابل برداشت بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا۔ ●

<u>نصرانیوں کی عہد شکنی اور سلطان کی چھاپہ مار کارروائیاں</u>: دو مہینے آرام سے گزر گئے، سلطان بانیاس کے مقام "تل قاضی" پر پڑاؤ ڈالے ہوئے چوکنا نگاہوں سے دشمن کی حرکات و سکنات کا معاینہ کر رہے تھے۔ یہ علاقہ فرنگیوں کی سرحد پر تھا جن کی جانب سے ایک بار پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ انطاکیہ اور لاذقیہ کے حاکم نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسلامی عملداری کے علاقے شیزر پر چھاپہ مار کر بہت سے مویشی چھین لیے تھے۔ طرابلس کے حاکم ریمنڈ (قومص) نے اپنی سرحدوں کے قریب آباد ترکمان مسلمانوں سے معاہدہ توڑ کر ان پر شب خون مارا تھا۔ یہ دیکھ کر سلطان نے نئی ترتیب سے اپنے <u>افسران کو مختلف علاقوں پر تعینات کر دیا</u>۔ اپنے بھتیجے تقی الدین عمر کو لشکر مقدم اور

● صبح الاعشیٰ 71/2

امیر مشطوب کے ساتھ حماۃ کی سرحد پر بھیج دیا۔ اپنے چچازاد بھائی ناصر کو ریمنڈ کے بالمقابل حمص کے محاذ پر متعین کر دیا۔ ساتھ ہی مصر میں اپنے نائب ابوبکر الملک العادل کو لکھ بھیجا کہ وہ صرف ڈیڑھ ہزار منتخب شہ سواروں کو ان کے پاس بھیج دے۔ اب سلطان کے جانبازوں نے روزانہ آخرِ شب میں دشمن کے علاقوں میں چھاپے مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی زیادہ تر کارروائیاں دشمن کی خوراک و رسد کے ذخیرے لوٹنے سے متعلق تھیں۔ "[1]

مرج عیون کا یادگار معرکہ ﷺ نیا اسلامی سال 575ھ اس حال میں شروع ہوا کہ شام میں مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان سرحدوں پر چھاپہ مار کارروائیاں جاری تھیں۔ بانیاس کے میدان کے ایک حصے میں ایوبی سپاہ کی خیمہ گاہ سے ہر رات جواں مردوں کی ٹولیاں نکلتیں اور دشمن پر شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑتیں، مگر ان کامیابیوں کے باوجود سب سے پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ قحط کی وجہ سے اپنی پیداوار بھی ختم ہونے کو تھی اور دشمن سے چھینے گئے اناج کے ذخائر بھی اب لشکر کی ضروریات کے لیے ناکافی تھے۔ اس لیے سلطان کے لشکر کے لیے یہاں قیام آسان نہیں رہا تھا۔

اُدھر دشمن کے علاقوں میں قحط کی صورتحال نہیں تھی بلکہ وہاں فصلیں ہری بھری تھیں اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ عزالدین فرخ شاہ جو ہنفری کے قتل کے بعد خاصا مشہور ہو چکا تھا ان حالات میں بڑا فکر مند تھا۔ وہ اسی خیمہ گاہ میں ٹھہرا ہوا تھا، اس کے سپاہیوں کے خیمے سلطان کے احاطے سے خاصے دور تھے۔ جس رات محرم کا چاند دکھائی دیا وہ اپنے ساتھیوں اور امراء کی ایک جماعت کے ساتھ سلطان کے پاس حاضر ہوا اور تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

"یہاں قیام دشوار ہو چکا ہے، گرمی بڑھتی جا رہی ہے، فصلیں اجڑ چکی ہیں، ہمارا لشکر بکھرا ہوا ہے جبکہ دشمن بالکل تیار ہے، مناسب ہوگا کہ ہم کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں تنگی کی بجائے وسعت اور نقصان کی جگہ نفع میسر آئے۔"

سلطان صلاح الدین ایوبی نے فرخ شاہ کی رائے کو یوں مسرت سے سنا جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔ وہ بولے:

"کیا خوب تجویز ہے۔ سمجھیں آپ حضرات کی کوشش کامیاب ہوئی۔ اب بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ آپ سب آج رات اٹھ کھڑے ہوں اور دشمن کے علاقے میں گھس جائیں۔ وہ جو کچھ چھوڑ چھاڑ کر فرار ہوں، اسے جمع کر کے کیمپ میں لوٹ آئیں۔ جب آپ کامیابی کے ساتھ واپس

[1] البرق الشامی: 162/3

آجائیں گے تو ہم اصل ہدف کی طرف پیش قدمی کریں گے جس سے اسلام کو نفع اور اس کے پرچم کو بلندی نصیب ہوگی۔"

اسی رات سلطان کی فوج کا اکثر حصہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر دشمن کے علاقے میں خوراک لوٹنے کے لیے نکل گیا۔فرخ شاہ ان کی قیادت کر رہا تھا۔اگلا دن اتوار کا تھا۔سلطان کو صبح سے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔وہ فرخ شاہ کے بارے میں فکر مند تھے جواب تک نہیں لوٹا تھا۔"

سلطان کا خدشہ بالکل درست تھا۔فرخ شاہ دشمن کی زد میں آچکا تھا۔رات بھر شب خون مارنے کے بعد صبح سویرے اسے دشمن کی نقل و حرکت کا علم ہوا تھا۔اس نے سلطان کو اس خطرے کی اطلاع تو بھجوادی تھی مگر اس کے لیے سب بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دشمن کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد تیز رفتاری کے باعث وہ باقی سپاہیوں سے خاصا آگے نکل گیا تھا۔اب اس کے ساتھ تیس سے بھی کم سپاہی رہ گئے تھے۔

وہ محتاط انداز میں واپسی کا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ اسے ایک پہاڑ پر نصرانیوں کا ایک دستہ نظر آیا۔یہ چھ سو گھڑ سوار تھے جو فرخ شاہ کی کمک کا راستہ بند کرنے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔پہاڑ کے سامنے ندی بہہ رہی تھی۔فرخ شاہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"میرا خیال ہے ہمیں ندی عبور کر کے ان پر حملہ کر دینا چاہیے۔"

امیر حسام الدین تمیرک نے ٹوکتے ہوئے کہا:

"کیا کہہ رہے ہو،کن کے ساتھ اور کس چیز سے ان پر حملہ کرو گے۔"فرخ شاہ نے اٹل لہجے میں کہا:"جب ہم ندی عبور کر کے ان پر حملہ کریں گے تو یہ لوگ مرعوب ہو جائیں گے۔اتنی دیر میں ہمارے بقیہ ساتھی بھی پہنچ جائیں گے اور یہ گھبرا کر بھاگ نکلیں گے۔اس کے برخلاف اگر ہم یہیں رکے رہے یا پیچھے ہٹے تو یہ لوگ جری ہو کر ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

فرخ شاہ کے ساتھیوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ندی عبور کر کے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔چند لمحوں بعد وہ دشمن سے ٹکرا چکے تھے۔ان گنتی کے پچیس چھبیس گھڑ سواروں اور چھ سو نصرانیوں میں شدت کی جنگ شروع ہو گئی۔"

ادھر سلطان ایوبی صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہو کر چند مصاحبین کے ساتھ اپنے سپاہیوں کی خیر خبر لینے دشمن کے علاقے کی طرف نکل پڑے تھے کیونکہ اب تک انہیں اپنے چھاپہ ماروں کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔بانیاس کا حاکم صمصام الدین بھی ان کے ساتھ تھا۔دشمن کی سرحد پر پہنچ کر وہ راستے کے

۰۰ البرق الشامی:162/3 د۔ سلسلہ السلطانی:1/18،البرق الشامی:173/3

کنارے کھڑے ہو گئے اور مخبر کا انتظار کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اللہ تعالیٰ سے مجاہدین کی کامیابی کی دعائیں بھی کر رہے تھے۔

اچانک سلطان کی نظر گایوں، بکریوں اور گھوڑوں کے گلوں پر پڑی۔ یہ بانیاس کے چرواہوں کے مویشی تھے جو چراگاہوں سے لوٹ رہے تھے حالاں کہ یہ ان کے لوٹنے کا وقت نہیں تھا۔ جانور گھبرائے ہوئے تھے اور جنگل سے نکل کر تیزی سے وادی میں اتر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بے اختیار سلطان کے منہ سے نکلا:

''جنگ چھڑنے کو ہے۔''

سلطان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چرواہا لپکتا ہوا ان کے پاس آن پہنچا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا:

''میں نے دیکھا ہے کہ دشمنوں کا ایک لشکر آپ کے ان سپاہیوں سے لڑائی کے لیے تیار ہے جو رات کو لوٹ مار کے لیے ان کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔''[1]

ویسے تو سلطان کا محکمۂ خبر رسانی اور شعبۂ جاسوسی نہایت فعال تھا۔ یہ بہت مشکل تھا کہ دشمن کا لشکر اتنی خاموشی سے قریبی علاقے میں پہنچ جائے اور انہیں خبر تک نہ ہو مگر آج مخبر چوک ہی گئے تھے۔ بہر حال سلطان نے چرواہے کو مطمئن کرتے ہوئے کہا:

''اگر فرنگیوں نے پیش قدمی کا ارادہ کیا ہوتا تو ہمارا جاسوس نہ صرف ہمیں خبر دے چکا ہوتا بلکہ دشمن کی تعداد، وسائل اور منصوبہ بندی تک سے آگاہ کر چکا ہوتا۔''

مگر سلطان جانتے تھے کہ چرواہے کی بات سچ ہے اور دشمن کا لشکر زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ چرواہے کو مطمئن کرنا اس لیے ضروری تھا تاکہ وقت سے پہلے ہی افواہیں نہ پھیل جائیں۔ کچھ ہی دیر میں جاسوسوں نے آکر اس خبر کی تصدیق کر دی کہ دشمن کے ایک بڑے لشکر نے ''مرج عیون'' کے مقام پر ہمارے چھاپہ مار دستوں کو روک لیا ہے۔ یہ سن کر سلطان بڑی تیزی سے اپنی خیمہ گاہ کی طرف لوٹے۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ سلطان نے منادی کرا دی کہ جو امراء، غلام، خدام اور سپاہی چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لینے سے رہ گئے ہیں وہ سب فوراً جمع ہو جائیں۔ تھوڑی دیر میں پوری خیمہ گاہ کے باقی افراد ان کے گرد جمع ہوئے۔ اصطبل میں زائد گھوڑے موجود تھے۔ ان پر زینیں کس دی گئیں۔ سلطان نے ان افراد کو ایک دستے کی شکل میں منظم کیا اور انہیں اپنی قیادت میں لے کر تیزی سے دشمن کی طرف لپکے۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ فرخ شاہ کے ساتھی کتنے بڑے خطرے سے دوچار ہیں۔

ادھر مسلمان چھاپہ مار دستوں نے جو خوراک کے ذخائر لوٹ کر لا رہے تھے دشمن کے لشکر کی نقل

[1] البرق الشامی: 162/3

وحرکت کو بھانپتے ہی لوٹے ہوئے سامان کو وہیں چھوڑ کر خود کو زائد بوجھ سے آزاد کرلیا تھا۔ وہ پہلے مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے اور اب ایک جگہ جمع ہونے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ صف بستہ جنگ لڑی جاسکے، ادھر دشمن نے ان کی واپسی کا راستہ روکنے کے لیے سرحد پر جگہ جگہ گشتی دستے متعین کر دیے تھے۔ [1]

بہرکیف مسلمانوں کے چھاپہ مار دستے ہر طرف سے سمٹ کر فرخ شاہ کے ساتھ جا ملے۔ ادھر سے نصرانیوں کی بڑی فوج بھی جو دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، میدان کارزار میں پہنچ گئی۔ اس کی کمان شاہ یروشلم بالڈون کے ہاتھ میں تھی جو کچھ دنوں پہلے کی شکست کا انتقام لینے کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے حکام، امراء اور نواب اس کے ہم رکاب تھے۔ آخر معرکہ شروع ہوا اور مسلمان جان ہتھیلی پر رکھ کر پوری ثابت قدمی سے لڑنے لگے۔ [2]

فرخ شاہ ایک بار پھر غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے بعد میں اس معرکے میں اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا: ''میں اس لڑائی میں آر یا پار کی حالت سے گزر رہا تھا اور متنبی شاعر کے یہ دو شعر دہرا رہا تھا:

فَإِنْ تَكُنِ الدَّوْلَاتُ قِسْماً فَإِنَّهَا لِمَنْ وَرَدَ الْمَوْتَ الزُّؤَامَ تَدُوْنُ

لِمَنْ هَوَّنَ الدُّنْيَا عَلَى النَّفْسِ سَاعَةً وَلِلْبِيْضِ فِيْ هَامِ الْكُمَاةِ صَلِيْلُ

''اگر فتوحات کسی کی قسمت میں ہیں تو یہ اسی شخص کا حصہ ہو سکتی ہیں جو خود موت کے لیے تیار ہو اور دنیا کو اپنے لیے اس گھڑی بے حیثیت کر دے جب تلواریں مسلح سپاہیوں کی آہنی ٹوپیوں سے ٹکرا کر جھنکار پیدا کر رہی ہوں۔'' [3]

معرکہ پوری شدت سے جاری تھا کہ سلطان صلاح الدین اپنے وفاداروں کا امدادی دستہ لیے آن پہنچے۔ اب مجاہدین کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ گھمسان کی جنگ کے بعد دشمن کو عبرت ناک شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان معرکے کے بعد اپنی خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے تو ان کی تلوار سے خون ٹپک رہا تھا۔

اس لڑائی میں نصرانیوں کے بے شمار افراد قتل اور باقی فرار ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عام قیدیوں کی ایک خاصی تعداد مسلمانوں کے ہاتھوں آئی تھی مگر اس جنگ کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں 70 کے لگ بھگ بڑے بڑے عیسائی حاکم، نائٹ اور نواب گرفتار ہوئے تھے جن میں حاکم طرابلس ریمنڈ، ابلین کا حاکم بالیان، طبریہ کا نواب ہیوگ اور ٹیمپلرز اور ہاسپٹلرز کے گرینڈ ماسٹرز قابل ذکر ہیں۔ ان میں

---

[1] البرق الشامی: 163/3

[2] صلاح الدین، لین پول: ص 71

[3] الکامل فی التاریخ: 277/7، البرق الشامی: 163/3

رملہ اور نابلس کا حاکم ابن بیرزان بھی شامل تھا جو شاہ یروشلم کے بعد سب سے معزز نصرانی قائد شمار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا بھائی حاکم جبیل، جنین کا نواب اور کئی مشہور امراء پکڑے گئے تھے البتہ شاہ یروشلم ایک بار پھر زخمی ہونے کے باوجود فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔[1]

قیدیوں کی سلطان کے سامنے پیشی: اتنی بڑی تعداد میں صلیبی حکام کی گرفتاری سے عیسائی ریاستوں میں صف ماتم بچھ گئی تھی جبکہ مسلمانوں کے لیے یہ نہایت مسرت کا موقع تھا۔ اپنے معسکر پہنچ کر سلطان ایوبی نے ساتھیوں کو جمع کیا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور فرمایا:

''اگر اللہ تعالیٰ کی تائید شامل حال نہ ہوتی تو یہ واقعہ بہت بڑے خطرے اور سخت نقصان کا باعث ہوتا۔ ان لوگوں نے ہم پر یکدم دھاوا بول دیا جبکہ ہم بے خبر تھے۔ انہوں نے اپنے راز کو خوب چھپایا جبکہ ہم اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی بصارت پر پردہ ڈال دیا اور انہیں صحیح راہ سے بھٹکا یا۔ اگر یہ لوگ پہلے ہماری خیمہ گاہ پر حملہ آور ہوتے تو کھلا موقع پا لیتے اور انہیں میدان خالی ملتا۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے ارادے کی تکمیل میں حائل ہو گیا۔''

اس کے بعد سلطان نے گرفتار شدگان میں سے اونچے درجے کے قیدیوں کو اپنے پاس طلب کیا۔ وہ خوف ودہشت سے لڑکھڑاتے ہوئے سلطان کے سامنے حاضر ہوئے۔ اس وقت سلطان کی خدمت میں جو خاص مصاحبین موجود تھے وہ بیس سے زیادہ نہیں تھے۔ جبکہ ان کے سامنے 70 سے زائد قیدی کھڑے تھے مگر ان پر کچھ ایسی ہیبت طاری تھی کہ وہ عاجزی اور مسکنت کے ساتھ چپ چاپ کھڑے رہے۔ انہیں گڑبڑ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

اس وقت رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔ سلطان کے خیمے میں شمعیں روشن تھیں اور امراء وخواص آس پاس موجود تھے۔ قیدیوں پر کوئی سختی نہیں کی گئی پھر بھی ان کی حالت پتلی تھی۔ سلطان نے ان ظالم وجابر لوگوں کو سرنگوں دیکھ کر نرمی کا معاملہ کیا۔ انہیں بٹھا کر شائستہ انداز سے بات چیت کی۔ عشاء کی نماز سے لے کر فجر کی اذان تک سلطان اسی مجلس میں بیٹھے جنگ کے بعد کے معاملات کو حل کرتے رہے اور پھر عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد دوبارہ اپنی نشست پر آ کر عام قیدیوں کو جو دو سو سے زائد تھے بلوایا۔ ان کے حال احوال کا جائزہ لیا۔ بعدازاں ان تمام قیدیوں کو دمشق کے قید خانے میں بھیج دیا۔[2]

سلطان نے ان قیدیوں کی پوری پوری قیمت وصول کی۔ ابن بارزان کو ایک سال تک جیل میں رکھنے

---

[1] البرق الشامی: 3/165، کتاب الروضتین: تحت 575ھ، صلاح الدین، لین پول: ص: 71

[2] البرق الشامی: 3/165، کتاب الروضتین: تحت 575ھ

کے بعد اس کے بدلے اپنے دستِ راست فقیہ عیسیٰ الہکاری اور ان کے بھائی سمیت ایک ہزار مسلمان قیدیوں کو آزاد کرایا (فقیہ عیسیٰ رملہ کے معرکے میں گرفتار ہوئے تھے) اس کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ لاکھ دینار بھی وصول کیے۔ ابن قومصیہ نامی عیسائی سردار کو اس کی ماں نے پچپن ہزار شامی دینار فدیہ دے کر آزاد کرایا۔ البتہ ٹیمپلرز گروہ کے گرینڈ ماسٹر (مقدم الداویہ) ''اوڈ'' کو رہا نہ کیا گیا اور وہ مختلف جیل خانوں میں سڑتا ہوا کئی سال بعد مر گیا۔''

دو مزید فتوحات ❊ مرج عیون کی اس شاندار فتح کے ساتھ سلطان کو ایک اور خوشخبری ملی۔ ایشیائے کوچک کے حکمران قلج ارسلان کو سلطان کے لشکر کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی۔ یہ لشکر اپنی سرحدوں کے دفاع کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ مدت پہلے قلج ارسلان نے سلطان کے پاس سفیر بھیج کر سرحدی قلعے ''رعبان'' پر اپنا حق جتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ قلعہ زنگی نے اس سے چھینا تھا اور الملک الصالح نے اسے لوٹا دیا ہے اس لیے سلطان اس سے دست بردار ہو جائے۔ اس غیر معقول مطالبے پر سلطان کو غصہ آ گیا اور سفیر کو درشت جواب دے کر واپس بھیج دیا جس کے بعد قلج ارسلان طاقت آزمائی پر اتر آیا اور اس نے فوج بھیج کر رعبان کا محاصرہ کر لیا۔

سلطان صلاح الدین نے مرج عیون کے معرکے سے کچھ دن پہلے اس محاصرے کو توڑنے کے لیے اپنے معتمد جرنیل تقی الدین عمر اور سیف الدین مشطوب کو ایک ہزار سپاہی دے کر ادھر روانہ کیا تھا۔ ادھر قلج ارسلان کے پاس بیس ہزار سپاہی تھے مگر تقی الدین بہت تجربہ کار انسان تھا۔ اس نے حکمت عملی سے کام لے کر قلج ارسلان کی عددی برتری کو بے حیثیت کر دیا۔ رعبان کا قلعہ نہایت دشوار گزار پہاڑی علاقے میں تھا۔ یہاں کی پر پیچ گھاٹیوں اور تنگ راستوں کو زیادہ تر پیدل ہی طے کیا جا سکتا تھا۔ رات کی تاریکی میں تقی الدین یہاں پہنچا تو اس کے ساتھ صرف دو سو سپاہی تھے۔ باقی راستے کی دشواری کے باعث خاصے پیچھے آ رہے تھے۔

تقی الدین نے دیکھا کہ دشمن کے سپاہی بہت زیادہ ہیں اور قلعے کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''دشمن بے خبر اور مطمئن ہے۔ ہمیں مختلف سمتوں میں پھیل کر چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں ان پر حملہ کر دینا چاہیے۔ ہم نعرے لگاتے، بگل بجاتے اور نقارے پیٹتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں گے۔ اس سے بے خبر دشمنوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔''

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایوبی سپاہیوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں سے فضا کو دہلاتے، نعرے لگاتے

•• سفرنامہ السلطان: 18/1

نقارے پیٹتے ہوئے دشمن پر حملہ کردیا۔ دشمن کے بہت سے سپاہی بیدار تھے اور قلعے کے محاصرے میں معروف تھے۔ یہ تین ہزار ترک سپاہی تھے۔ انہوں نے تقی الدین کو گھیرنے کی کوشش کی مگر تقی الدین ان پر پل پڑا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے حریف پر ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی دیر میں قلج ارسلان کے سپاہی بھاگ نکلے اور ان کی خیمہ گاہ کا سارا ساز و سامان ایوبی سپاہیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ ان کے کئی افسران گرفتار ہوئے مگر تقی الدین نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سب کو زادِ راہ اور سواریوں کے علاوہ خلعتوں سے نوازتے ہوئے ان کے ملک واپس روانہ کردیا۔

مرج عیون کے اسی معرکے کے دن بحیرۂ روم میں بھی سلطانی افواج کو ایک فتح نصیب ہوئی تھی۔ وہاں سلطان کے بحری بیڑے نے جس میں بیس جہاز اور ساٹھ جنگی کشتیاں شامل تھیں، رومیوں کے ساحلی شہروں پر حملے کیے اور سلطان کے بحری افسران ایک ہزار قیدیوں کو لے کر مصر لوٹے۔

تقریباً ایک ہی وقت میں ان تین اکٹھی فتوحات نے سلطان صلاح الدین کی حالت بہت مستحکم بنادی جبکہ ان کاری ضربات کے زخم دشمنوں کے لیے خاصے دنوں تک حوصلہ شکن رہے۔ پورے عالم اسلام میں سلطان کی ان فتوحات کا چرچا ہوگیا۔ بغداد کے ایک شاعر ابن التعاویذی نے ان کامیابیوں پر سلطان کی تعریف کرتے ہوئے کہا:[1]

لَوْ اَنَّ لِلَّیْثِ الْھِزَبْرِ سَطْوَۃٌ	لم یَلْجَأُ اِلٰی غَابٍ لَہٗ وَعَرِیْنٌ
اگر شیرِ خونخوار میں ان جیسی دلیری ہوتی	تو وہ اپنی کچھار میں پناہ نہ لیتا
وَالْبَحْرُ لَوْمُزِجَتْ بِہٖ اَخْلَاقُہٗ	لَغَدَتْ مِیَاہُ الْبَحْرِ غَیْرَاٰجِنٍ
اگر سمندر میں انکے اخلاق ڈال دیے جائیں تو	تو سمندر کا پانی کھارا نہ رہے
لَکَ عِفَّۃٌ فِیْ قُدْرَۃٍ وَتَوَاضُعٌ	فِیْ عِزَّۃٍ وَشَرَاسَۃٌ فِیْ لِیْنٍ
اے بادشاہ آپ قدرت رکھتے ہوئے پاک دامن	عزت کیساتھ متواضع اور نرمی کیساتھ سخت گیر بھی ہیں
وَاَرَیْتَنَا بِجَمِیْلِ صُنْعِکَ مَارَوٰی	اَلرَّاوُوْنَ عَنْ اُمَمٍ خَلَتْ وَقُرُوْنٍ
آپ نے ہمیں اپنے عمدہ کارنامے دکھا کر گزشتہ	صدیوں اور نسلوں کی روایات تازہ کردی ہیں
وَضَمِنْتَ اَنْ تُحْیِیَ لَنَا اَیَّامَھُمْ	بِالْمُکْرِمَاتِ فَکُنْتَ خَیْرَضَمِیْنٍ
آپ نے ذمہ لیا ہے کہ ہمیں عظمت اسلام کے گزشتہ ایام	اعزاز کیساتھ واپس دلائیں گے پس آپ بہترین ضامن ہیں

[1] سلطان العادل:1/20، 24، کتاب الروضتین، بحث 575ھ

فصل:9

حصن الاحزان کی فتح
سلطان صلاح الدین ایوبی کا استحکام

سلطان صلاح الدین نے اب اپنی پوری توجہ حصن الاحزان پر مرکوز کردی جو نصرانیوں کے لیے ایک مضبوط پناہ گاہ تھا اور جس کی بدولت عیسائی اتنے جرأت مند ہو چکے تھے کہ انہوں نے تھوڑی سی مدت میں سلطان کے خلاف دو بار فوج کشی کی تھی۔ سلطان نے عیسائی حکام کو لکھوا بھیجا کہ وہ حصن الاحزان کو فوری طور پر منہدم کردیں۔ جواب نفی میں ملا تو سلطان نے خبردار کرتے ہوئے کہا:

''قلعے کو خود منہدم کردو ورنہ میں اسلامی لشکر لے کر آرہا ہوں۔''

عیسائی اس قلعے کو اپنے ہاتھوں منہدم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے اس پر بے پناہ رقم خرچ کی تھی جس میں ٹیمپلرز نے سب سے زیادہ مالی تعاون کیا تھا مگر اب جبکہ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ مسلمان قلعے کو تباہ کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے تو انہوں نے سلطان کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ قلعے کی تعمیر پر لگنے والے اخراجات انہیں دے دیے جائیں۔ سلطان نے اسے قبول کرتے ہوئے ساٹھ ہزار دینار کی پیش کش کی مگر نصرانیوں نے اسے کم گردانتے ہوئے انکار کردیا۔ اب سلطان نے ایک لاکھ دینار کی پیش کش کی، یہ بات انہیں پرکشش معلوم ہوئی مگر وہ اس میں مزید اضافے کے خواہش مند تھے۔ ادھر سلطان نے اس خطیر رقم میں مزید اضافہ کرنے نہ کرنے کی بابت اپنے امراء کا اجلاس بلا کر مشورہ لیا۔ امراء کی اکثریت اس پر رضا مند ہوگئی کہ فرنگیوں کو مطلوبہ رقم دے کر قلعہ منہدم کروالیا جائے۔ [1]

تقی الدین کا بے باکانہ مشورہ: ان دنوں سلطان کا امیر تقی الدین حماۃ کے قلعے کی مرمت کے لیے گیا ہوا تھا۔ سلطان نے اس سے مشورہ بھی ضروری سمجھا اور امراء کی ایک جماعت کو اپنے مکتوب کے

[1] البرق الشامی: 3/175۔176، کتاب الروضتین: 3/37

ساتھ اس کے پاس بھیجا تا کہ وہ اسے معاملے کی نزاکت سمجھا کر پوری وضاحت کے ساتھ اس سے رائے لے لیں۔ تقی الدین نے سلطان کا خط پڑھ کر ان امراء سے کہا:

''مجھے رقم ادا کرنے کی بات پسند نہیں آئی۔''

پھر سلطان کو دوٹوک انداز میں لکھا:

''آپ جس رائے پر عمل کا ارادہ کر رہے ہیں وہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی بلکہ اللہ تعالیٰ آپ سے فرنگیوں کو خواہ مخواہ اتنا مال دینے کے بارے میں باز پرس کریں گے جب کہ آپ فرنگیوں پر حملہ کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ یہ دولت اپنے سپاہیوں پر خرچ کر کے حصن الاحزان پر حملہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔''

سلطان نے تقی الدین کا خط پڑھا تو خوش ہو کر بولے:

''درست رائے یہی ہے۔''

اب سلطان نے دریائے فرات کے دونوں کناروں پر آباد ترکمان قبائل کی طرف نقد مال، تحائف اور خلعتیں روانہ کر کے انہیں اپنی مدد کے لیے بلایا۔ انہوں نے ندائے جہاد پر لبیک کہتے ہوئے بکثرت جوان سلطان کی خدمت میں بھیج دیے۔ سلطان کی ترغیب پر دیگر شہروں اور قصبوں سے بھی بڑی تعداد میں سپاہی پہنچنے لگے۔ یکم ربیع الثانی 575ھ (5 ستمبر 1179ء) کو تقی الدین خود سپاہیوں کی خاصی تعداد لے کر حماۃ سے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سلطان اس وقت دمشق پہنچ چکے تھے۔ وہ تقی الدین کی آمد سے بہت خوش ہوئے۔ ❶

حصن الاحزان کا محاصرہ ❀ اب ایک مضبوط لشکر تیار ہو چکا تھا۔ سلطان جمعرات 5 ربیع الثانی 575ھ (9 ستمبر 1179ء) کو دمشق سے حصن الاحزان کی سمت روانہ ہوئے۔ منگل 11 ربیع الثانی (13 ستمبر) کو وہ قلعے کی فصیلوں کے سامنے تھے۔ اردگرد کے عیسائی قلعے میں پناہ لے کر مورچہ بند ہو چکے تھے۔ قلعے کی مضبوطی مسلمانوں کے اندازوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس کو ساڑھے دس مربع فٹ کے بیس ہزار پتھروں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک ٹھوس چٹان معلوم ہوتا تھا۔

شدید گرمی کے دن تھے، سورج آگ برسا رہا تھا اور زمین تپ کر بھٹی بن چکی تھی۔ اس کے باوجود سلطان نے طویل محاصرہ کر کے حصن الاحزان کو منجنیقوں کے ذریعے کمزور کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ چونکہ اس علاقے میں پتھر کم دستیاب تھے اس لیے سلطان نے منجنیقوں میں پتھروں کی جگہ درختوں کے تنے

❶ سلطان الکامل: 25/1

استعمال کرنے کی ترکیب سوچی اور اگلے دن کچھ فوج کے ساتھ صبح سویرے قریبی علاقے میں واقع قلعۂ صفد کی جانب چلے گئے جو نصرانیوں کی جنگجو تنظیم ٹیمپلرز (داویہ) کے پاس تھا۔ انہوں نے صفد کے قلعے کے آس پاس انگوروں کے باغ صاف کرا دیے اور بڑے بڑے درختوں کے تنے کٹوا دیے۔ ظہر کے بعد سلطان یہ سامان لے کر اپنی خیمہ گاہ لوٹ آئے۔

نمازِ عصر سے فارغ ہو کر انہوں نے امراء کو مشورے کے لیے بلایا۔ امیر عزالدین جاولی نے عرض کیا:

''ہم چاہتے ہیں کہ منجنیقیں چلانے سے پہلے آپ ہمیں عام حملہ کرنے کا موقع دیں۔ ہم ان سے دست بدست لڑائی کا مزا بھی لیں اور ان کی اوقات بھی دیکھ لیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں اس دوران قلعے پر قبضے کا موقع مل جائے۔''

سلطان نے کہا:

''آپ استخارہ کرلیں اور پھر جو مناسب معلوم ہو کریں۔''

کچھ دیر بعد ایوبی امراء قلعے کی بیرونی فصیل پر حملہ کر رہے تھے۔ بیرونی فصیل کے محافظ عیسائی مقابلے کرنے کی بجائے پسپا ہو کر قلعے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اندر جانے کے تمام راستے بند کر دیے اور قلعے کے برجوں میں چھپ کر تیر اندازی اور آتش باری کرنے لگے۔

اس کے باوجود ایوبی سپاہیوں نے بیرونی فصیل پر قبضہ کر کے قلعے کو گھیر لیا اور اپنا زیادہ تر سامان وہیں منتقل کرلیا۔ رات بھر وہ جاگ کر پہرہ دیتے رہے، سلطان مسلسل انہیں تازہ دم سپاہی بھیج رہے تھے۔ خطرہ تھا کہ موقع پاتے ہی نصرانی سپاہی دروازے کھول کر باہر نکل آئیں گے اور ان پر شب خون مارنے کی کوشش کریں گے مگر اس دوران اسلامی فوج کے ایک غلام نے قلعے کے دروازے کے پاس پہنچ کر اندر کی سن گن لی۔ اسے اندازہ ہوا کہ فرنگی ہر دروازے کے آگے بھاری پتھر رکھ کر الاؤ روشن کر رہے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ فرنگیوں کا رات کو دروازے کھول کر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ وہ خوفزدہ تھے اور اپنی مدافعت کا سوچ رہے تھے۔ غلام نے یہ خبر تقی الدین عمر تک پہنچائی۔ تقی الدین نے سمجھ لیا کہ اب قلعے کو فتح کرنے میں دیوار کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس نے یہ خبر سلطان کو دی۔ سلطان نے قلعے کو پے در پے حملوں کے ذریعے سر کرنے کا عزم کرلیا۔ رات بھر دونوں جانب سے تیر چلتے رہے اور آگ کے گولے پھینکے جاتے رہے۔[1]

سرنگوں کی کھدائی: اصل مسئلہ اب قلعے کی دیوار گرانا تھا۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ قلعہ لوہے کی

[1] سلسلہ السلطان: 27/1

طرح مضبوط ہے جسے منجنیقوں سے خستہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔اب متبادل صورت یہ تھی کہ قلعے کی بنیادوں میں نقب لگا کر سرنگیں بنائی جائیں اور انہیں بارود سے اڑا کر دیواروں کو تڑ قانے کی کوشش کی جائے۔اس کے باوجود دیواروں کو گرانا آسان نہیں تھا کیونکہ فصیل تقریباً چودہ فٹ چوڑی تھی۔اگلے دن سلطان نے امراء کو جمع کر کے قلعے کی فصیل کی مختلف حصے ان پر تقسیم کر دیے۔ناصر الدین بن شیر کوہ ایک جانب سے سرنگ کھودنے لگا اور سلطان صلاح الدین نے دوسری جانب سے اپنی سرنگ کھدوانا شروع کی۔سرنگیں کھودنے والے انجینئر اور مزدور قلعہ بند نصرانیوں کی تیر اندازی اور سنگ باری کے باوجود اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔

اتوار کی شام تک سلطان ایوبی نے اپنی سرنگ مکمل کرالی جو 45 فٹ لمبی اور ساڑھے چار فٹ چوڑی تھی۔اسی رات سرنگ کو ایندھن سے بھر کر آگ لگا دی گئی۔رات بھر مسلمان دیوار پھٹنے کے منتظر رہے مگر کچھ نہ ہوا۔صبح سرنگ میں آگ اسی طرح دہک رہی تھی۔اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ آگ بجھا کر سرنگوں کو ٹھنڈا کیا جائے اور از سر نو کھدائی کر کے سرنگوں کو مزید لمبا، چوڑا اور گہرا کیا جائے۔سلطان اس کام کو فوراً کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے تین سو دینار کی ایک تھیلی نکالی اور عز الدین جاولی کو تھما کر صدا لگائی:

”جو ایک مشکیزہ پانی لا کر ڈالے، اسے ایک دینار ملے گا۔“

پانی کا چشمہ قریب ہی تھا۔اعلان سنتے ہی سپاہی، مزدور اور دوسرے لوگ مشکیزے اور برتن لے کر دوڑ پڑے، تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے پانی ڈال ڈال کر سرنگ کو ٹھنڈا کر دیا۔اب سرنگ کی کھدائی دوبارہ شروع ہوئی اور مسلسل دو دن جاری رہی۔اس دوران سلطان کو طبریہ میں نصرانیوں کی ایک فوج کے جمع ہونے کی اطلاع ملی۔سلطان کو خطرہ محسوس ہوا کہ یہ فوج حصن الاحزان کے محصورین کی مدد کے لیے وقت پر نہ پہنچ جائے۔اس لیے سرنگ کی کھدائی کا کام تیز تر کر دیا گیا۔بدھ کی شام کھدائی مکمل ہوئی اور ایندھن بھر کر اسے آگ لگا دی گئی۔رات بھر اس سے شعلے اٹھتے رہے۔جمعرات 24 ربیع الثانی 575ھ (28 ستمبر 1179ء) کا دن مسلمانوں کے لیے نہایت مسرت انگیز تھا۔شدت کی گرمی کے ساتھ سرنگ میں بھڑکتی آگ نے کام دکھایا اور دوپہر کے وقت قلعے کی دیوار بیٹھنے لگی۔

اسلامی لشکر میں تکبیریں گونجنے لگیں۔افسران اور سپاہی دیوار کے شگاف کی طرف دوڑ پڑے۔ادھر فصیل کی دوسری جانب نصرانیوں نے آگ لگا دی تھی تاکہ فصیل گرنے پر بھی مسلمان فوراً ادھر نہ آسکیں مگر جب فصیل کا متاثرہ حصہ گرا تو ہوا کے جھونکوں نے دھول اور گرد و غبار کے ساتھ نصرانیوں کی لگائی ہوئی آگ کا رخ انہی کی طرف پھیر دیا اور ان کے مکانات جلنے لگے۔سلطان ایوبی دیوار گرنے اور اپنے سپاہیوں کے

فصیل کو پھلانگنے کا منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ مسلمانوں نے تھوڑی ہی دیر میں دشمن کے سات سو کے لگ بھگ سپاہیوں کو جو مزاحمت کر رہے تھے مار ڈالا۔

اس وقت سلطان کے پاس حاکم طبریہ ریمنڈ (قومس) کا قاصد آیا ہوا تھا۔ وہ بھی اپنی قوم کی شکست کا عبرتناک منظر بچشم خود دیکھ رہا تھا۔ قلعے سے سو کے قریب مسلمان قیدی بھی برآمد ہوئے جن کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں نے بیڑیاں کھول کر اسی وقت فرنگی قیدیوں کو پہنا دیں۔ یہاں مالِ غنیمت میں خوراک کے بڑے بڑے ذخائر بھی ملے جو قلعے والوں کو کئی سال کے لیے کافی تھے۔ اب سلطان صلاح الدین ایوبی نے قلعے کو ناپ کر اپنے امراء میں تقسیم کر دیا اور کہا:

''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹوں گا جب تک قلعے کو بالکل مسمار نہ کرا دوں۔''[1]

قلعے کا انہدام: سلطان نے فرنگی قیدیوں کو جو سات سو سے زائد تھے دمشق روانہ کر دیا اور قلعے کے انہدام کا کام شروع کرا دیا۔ ناقابل برداشت گرمی کے باعث سپاہیوں کا زیادہ دنوں تک اس جگہ ٹھہرنا مشکل تھا۔ پھر معرکے میں مرنے والے نصرانیوں کی لاشیں گرمی کے سبب پھٹ کر ماحول کو متعفن کر رہی تھیں۔ اس تعفن سے فضا اتنی آلودہ ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کے دس سے زیادہ افسران بیمار پڑ کر جان بحق ہو گئے مگر سلطان نے قلعے کی توڑ پھوڑ کا کام روکنا گوارا نہ کیا۔ قلعے کے درمیان ٹیلے پر ایک گہرا کنواں کھود دیا گیا تھا۔ سلطان کے حکم سے ساری لاشیں اس میں ڈال کر اسے مٹی سے پاٹ دیا گیا۔[2]

آخر حصن الاحزان فنا ہو گیا۔ یہ علاقہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی رہائش گاہ کی برکات کے باعث ''مشہد یعقوبی'' مشہور تھا اور گریہ یعقوب علیہ السلام کی مناسبت سے ''بیت الاحزان'' کہلاتا تھا، اپنی سابقہ حیثیت پر لوٹ آیا۔

حصن الاحزان پہنچنے کے چودھویں دن سلطان نے اس مقام سے کوچ کیا تو وہاں قلعے کی جگہ صرف مٹی اور پتھروں کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان دمشق پہنچے تو دور دور سے انہیں مبارکباد کے پیامات آئے۔ احمد بن نفاذہ دمشقی نے اس موقع پر یہ اشعار پڑھے:

هَلاكُ الفَرنجِ اَتٰى عاجِلاً   وَقَدْ اٰنَ تَكْسِيْرُ صُلْبَانِها
فرنگیوں کی موت یکدم آگئی   اور ان کی صلیبوں کے ٹوٹنے کا وقت آن پہنچا

وَلَوْ لم يَكُنْ قَدْ دَنا حَتْفُها   لما عَمَرَتْ بَيْتَ اَحْزانِها
اگر ان کی موت سر پر نہ آگئی ہوتی   تو وہ غموں کا گھر تعمیر نہ کرتے

[1] سلطان صلاح الدین: 1/27؛ الکامل ابن اثیر: 3/179
[2] کتاب الروضتین: 3/37، 38؛ سلطان صلاح الدین: 1/29، 30

علی بن محمد الساعاتی نے کہا:

نَصَحْتُكُمْ وَالنُّصْحُ لِلدِّيْنِ وَاجِبُ
ذَرُوْا بَيْتَ يعقوبَ جَاءَ يُوْسُفُ

تمہیں میں خیرخوانہ طور پر کہہ رہا ہوں کیوں کہ دین میں خیرخواہی لازمی ہے
تم بیت یعقوب چھوڑ دو کہ اس کا اصل وارث یوسف آگیا ہے [1]

خلیفہ مستضیی کی وفات - دنیا میں سیاسی تبدیلیاں: اس دوران جبکہ سلطان صلاح الدین شام کے میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے تھے، 2 ذیقعدہ 575ھ (30 مارچ 1180ء) کو عباسی خلیفہ مستضیی بامر اللہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مؤرخین کے مطابق وہ ایک عادل حکمران اور خدا ترس انسان تھا۔ اس کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک بڑا سانحہ تھی۔ اس نے 45 سال کی عمر پائی تھی اور نو سال سال سات ماہ حکومت کی تھی۔ اس کے دور میں بغداد میں اہل سنت کا بول بالا ہوا اور رافضی کونے کھدروں میں جا چھپے۔ وہ علماء وفقہاء کا بڑا قدردان تھا۔ علامہ ابن جوزی کو مجلسِ وعظ کے لیے مدعو کرتا اور خود ایک گوشے میں بیٹھ کر ان کی تقریر سنتا۔ [2]

مستضیی بامر اللہ کا جانشین خلیفہ ناصر لدین اللہ ہوا، عباسی خلافت میں سب سے طویل دورِ حکومت پانے والے اس خلیفہ نے ابتداء میں کئی سال تک اچھی حکومت کی مگر بعد میں اس نے اہل تشیع کے نظریات اپنا لیے اور اہل سنت کے لیے متعدد آزمائشوں اور عالم اسلام کے لیے کئی فتنوں کا سبب بنا۔ سنتوں کی پامالی، جہاد اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی، رافضیوں کی ہمت افزائی اور تاتاریوں کو عالم اسلام پر حملہ کی دعوت دینا اس کے "سیاہ کارنامے" ہیں۔

575ھ میں پیش آنے والے دیگر اہم واقعات: اس سال سلطان کے بیٹے الملک المنصور حسن نے شام میں وفات پائی اور دمشق کے باہر اپنے مرحوم چچا شاہنشاہ بن ایوب کے پہلو میں دفن ہوا۔ سلطان اس کی وفات سے بے حد رنجیدہ ہوئے۔ 575ھ کا آخری اہم واقعہ یہ تھا کہ فرخ شاہ نے 18 ذی قعدہ (15 اپریل 1180ء) کو صفد کے علاقے میں ان نصرانیوں کے خلاف ایک کامیاب کاروائی کی جو بانیاس اور مضافات سے مسلمانوں کے خلاف جمع ہو رہے تھے۔ فرخ شاہ مال غنیمت کے انبار حاصل کر کے اس مہم سے لوٹا۔ [3]

---

[1] الروضتین: 3/31، الکامل: 7/277_278
[2] شذرات الذہب: 2/251، الکامل: 10/97
[3] الروضتین: تحت 575ھ

576ھ کا آغاز: مستضیئ باللہ کی وفات اور خلیفہ ناصر کی مسند نشینی کے کچھ عرصے بعد 576ھ کے آغاز میں عالم اسلام کی سیاسی صورتحال میں کچھ اور تبدیلیاں بھی آئیں۔ مصر میں سلطان کے بڑے بھائی توران شاہ نے ماہ محرم میں اسکندریہ کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی سلطان کی ہدایت پر مصر پہنچا تھا اور وہاں کا انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو جب یہ خبر ملی تو وہ حمص کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ وہ رنج وغم سے بے حال ہو گئے اور کئی درد بھرے اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ انہیں دیوانِ حماسہ زبانی یاد تھا۔ اس کے مرثیے اکثر وہ ایسے مواقع پر پڑھا کرتے تھے۔ [1]

انہی دنوں موصل اور الجزیرہ کا حکمران سیف الدین غازی دوئم جو ایک عرصے تک سلطان صلاح الدین ایوبی کا سخت حریف رہا تھا، 3 صفر 576ھ (28 جون 1180ء) کو وفات پا گیا۔ اس کی عمر تیس سال تھی۔ اس نے دس برس حکومت کی تھی۔ اس کی موت کا قصہ عجیب ہے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ قحط کے دن تھے۔ موصل کے لوگ نمازِ استسقاء کے لیے نکلے۔ مجمعے نے منکرات سے توبہ کی اور بعض شرابیوں کے گھروں میں گھس کر شراب کی بوتلیں بہا دیں۔ اس ہنگامے میں کچھ افراد نے لوٹ مار بھی شروع کر دی۔ ابوفرج الدقاق نامی ایک بزرگ یہ سب دیکھ رہے تھے، انہوں نے شراب بہانے کی کارروائی میں تو ساتھ دیا مگر لوگوں کو لوٹ مار سے منع کرتے رہے۔ تاہم کسی نے ان کی روک ٹوک پر توجہ نہ دی۔ اس ہنگامے سے جن لوگوں کا نقصان ہوا انہوں نے سیف الدین کے دربار میں فریاد کی۔ اس نے مشتبہ افراد کو گرفتار کر لیا۔ ان میں ابوفرج الدقاق بھی تھے۔ انہیں قلعے میں لایا گیا۔ سیف الدین کے حکم سے ایک پولیس افسر نے آگے بڑھ کر ابوفرج الدقاق کا عمامہ اتارا اور سر پر ضربیں لگائیں۔ سزا کے بعد ابوفرج الدقاق کو قلعے سے باہر لایا گیا تب بھی وہ ننگے سر تھے۔ لوگوں نے ان کے سر پر عمامہ رکھنے کی کوشش کی تو بولے:

> ''میں نے قسم کھائی ہے کہ اس وقت تک سر نہیں ڈھانپوں گا جب تک اللہ پاک مجھ پر زیادتی کرنے والوں سے انتقام نہیں لے لیتا۔''

اس واقعے کے چند دن بعد وہ پولیس افسر فوت ہو گیا جس نے ان کو سزا دی تھی۔ پھر تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ سیف الدین بھی بیمار ہو کر چل بسا۔ وفات سے قبل وہ اپنے 12 سالہ بیٹے کو جانشین بنانا چاہتا تھا مگر پھر امرائے سلطنت کے مشورے پر اپنی خواہش کے برخلاف اپنے بھائی عزالدین مسعود کو جانشین قرار دے دیا۔ [2]

---

[1] الروضتین: حت 576ھ، فصل فی وفاۃ شمس الدولہ [2] الکامل: حت 576ھ

سلطان صلاح الدین ایوبی کو سیف الدین کی موت اور عزالدین مسعود کی تخت نشینی کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر ''کوک سو'' نامی علاقے میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ کچھ دنوں بعد انہیں یہ افسوسناک خبر بھی ملی کہ ان کے استاذ شیخ ابوطاہر سلفی وفات پا گئے ہیں۔ ان کی عمر 100 برس کے لگ بھگ تھی۔ سلطان ایوبی اسکندریہ میں اپنے بیٹوں سمیت ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی سماعت کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات 5 ربیع الثانی 576ھ (28/اگست 1180ء) کو ہوئی۔ [1] اسی سال فرانس کا حکمران لوئی جان، پوپ الیگزنڈر اور شاہ مینوئیل کامینوس بھی دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس طرح یورپ کے لیے بھی یہ سال غم انگیز ثابت ہوا۔ [2]

<u>سلطان صلاح الدین ایوبی کی فیصلہ کن حیثیت کا استحکام</u> ❋ چوں کہ فرنگیوں کو تین مسلسل شکستوں کے بعد اچھا خاصا سبق مل گیا تھا اور یورپ میں ان کی بڑی بڑی شخصیات اور حکمرانوں کی موت بھی ان پر بھاری تھی لہٰذا سال 576ھ کا باقی حصہ قدرے سکون سے گزرتا جا رہا تھا۔ سلطان صلاح الدین کو شام، مصر، عراق اور ایشیائے کوچک کی سیاست میں اب ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اردگرد کے چھوٹے بڑے حکمران ان سے ناتا جوڑنے میں عافیت محسوس کرنے لگے تھے، باہمی جھگڑوں کو بھی وہ سلطان کی خدمت میں پیش کر کے ان سے فیصلہ لینے لگے تھے۔

حصن کیفا و دیار بکر کے حکمران نورالدین اور اس کے داماد ایشیائے کوچک کے سلجوقی حکمران قلیج ارسلان کے مابین چپقلش چل رہی تھی۔ نورالدین نے قلیج ارسلان کے استبداد سے بچنے کے لیے سلطان سے پناہ کی درخواست کی تھی۔ ادھر قلیج ارسلان نے سلطان کو باہمی اتحاد کی پیش کش کر دی اور ساتھ ہی یہ گزارش کی تھی کہ سلطان، ارمنی ریاست کے عیسائی سردار ابن لاون کی شرارتوں اور دست درازیوں کی روک تھام کرے۔ [1]

ایوبی خاندان کے ممتاز مؤرخ محمد بن تقی الدین نے اپنی یادداشتوں میں ابن لاون کی فتنہ انگیزی کی وضاحت یوں کی ہے:

''ابن لاون نے ترکمان مسلمانوں کو (جو خانہ بدوش تھے) بہلا پھسلا کر اپنے علاقے کی چراگاہوں میں بلایا اور ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ مگر جب وہ وہاں بس گئے تو اچانک حملہ کر کے ان کو قیدی بنا لیا اور مال مویشی لوٹ لیے۔ اس کی مسلمانوں پر ایسی زیادتیوں کی شکایات بکثرت آ رہی تھیں۔'' [1]

چونکہ سلطان کی سرحدیں بھی اب ابن لاون کے علاقے سے مل گئی تھیں اور ان کی فوجی قوت بھی اس

---

[1] کتاب الروضتین: تحت 576ھ
[2] سوانح السلطان، لین پول، ص: 74
[1] النوادر السلطانیہ، ص: 98_99
[1] سلطان... ص: 42

محلے کے تمام حکمرانوں سے زیادہ تھی اس لیے قلیج ارسلان کو یقین تھا کہ وہ اس فتنے کی روک تھام آسانی سے کر لیں گے۔

سلطان نے ایشیائے کوچک کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی ضروری سمجھی، اس سے قبل فرنگیوں سے جنگ بندی کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ لین پول کا بیان ہے کہ خود عیسائی بادشاہ بالڈون نے سلطان کو صلح کی پیش کش کی تھی اور دو سال کے لیے برابری کی بنیاد پر طے شدہ شرائط کے ساتھ عارضی صلح طے پا گئی۔ لین پول لکھتا ہے:

''اب تک صلیبی ہمیشہ اپنی شرائط پر صلح کرتے رہے تھے مگر یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں دب کر صلح کرنا پڑی۔ صلیبیوں کو بالڈون کا یہ اقدام سخت ناپسند آیا۔ طرابلس کے نواب ریمنڈ نے اس معاہدے کی کھلم کھلا مذمت کی مگر جب مسلمانوں نے اس کی ریاست پر حملہ کیا اور صلاح الدین کا بحری بیڑہ طرطوس پہنچا تو اسے ہوش آ گیا۔''

لین پول کا بیان واضح کرتا ہے کہ صلح کی ابتداء خود نصرانیوں نے کی تھی اور کم و بیش تمام عیسائی حکمران اس میں شامل ہو گئے تھے۔ ۞

<u>ایشیائے کوچک کا سفر</u> ۞ سلطان نے شمال کی طرف رختِ سفر باندھا تو ان کے سامنے تین مقاصد تھے، ایک قلیج ارسلان سے معاہدۂ اتحاد کرنا، دوسرے ابن لاؤن کے مظالم سے مقامی ترکمان مسلمانوں کو نجات دلانا۔ تیسرے قلیج ارسلان اور اس کے سسر نور الدین میں صلح کرانا۔

حلب کا حاکم الملک الصالح بھی جو سلطان سے صلح کر چکا تھا اس سفر میں ہمرکاب تھا۔ شام کی سرحدوں پر قلیج ارسلان کے سفیروں سے گفتگو ہوئی اور آخر بات چیت ایک معاہدے پر ختم ہوئی۔ قاضی بہاؤالدین شداد کا بیان ہے:

''اس موقع پر قلیج ارسلان نے سلطان سے مستقل معاہدۂ صلح کی درخواست کی تاکہ وہ ارمنی نصرانیوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ سکے۔''

چنانچہ 10 جمادی الاولیٰ 576ھ (2/اکتوبر 1180ء) کو دریائے سنجہ کے کنارے ایک معاہدہ ہوا جس میں سلطان اور قلیج ارسلان کے علاوہ موصل اور دیار بکر کے حکام بھی شامل تھے۔ حلب پہلے ہی سلطان سے صلح نامے پر کاربند تھا اور اس لیے اس کی فوج اس مہم میں سلطان کے ساتھ تھی۔ حصنِ کیفا کا حاکم نور الدین بھی پہلے سے سلطان کا دامن تھام چکا تھا۔ چنانچہ اس معاہدے کے بعد ایشیائے کوچک، کیفا، دیار بکر، حلب اور دیگر قریبی ریاستوں میں <u>سلطان صلاح الدین کی فیصلہ کن سیاسی حیثیت مزید مستحکم ہو گئی۔</u> ۞

۞ سوانح صلاح الدین، لین پول، ص: 70 ۞ النوادر السلطانیہ، ص: 100، السلطان الحاکم ... الکامل فی التاریخ تحت 576ھ، کتاب الروضتین تحت 576ھ

<u>ارمن حکمران کے خلاف کاروائی</u>❊ اب سلطان نے ترکمان مسلمانوں کو نصرانی ارمن حکمران ابن لاؤن کی دست درازیوں سے نجات دلانے کے لیے فوج کشی کی اور دریائے اسود پر کیمپ لگا کر چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کردیا۔ کچھ دور ایک بلند پہاڑ پر ابن لاؤن کا بہترین قلعہ حصن قابوس تھا۔ سلطان کو قریب آتے دیکھ کر ارمنی حکمران نے قلعہ خالی کرنے اور اس میں موجود خوراک کے تمام ذخائر کو جلا ڈالنے کا حکم دیا مگر سلطان کے سپاہی بروقت پہنچ گئے اور انہوں نے اناج کے زیادہ تر ذخیروں کو بچالیا۔ آگے بڑھنے سے قبل سلطان کے حکم سے یہ قلعہ مسمار کردیا گیا۔ ابن لاؤن نے سلطان کو آگے بڑھتا دیکھا تو گھبرا کر اظہار اطاعت کیا اور گرفتار شدہ پانچ سو ترکمان گلہ بانوں کو رہا کر کے ان سے چھینا گیا مال واپس کردیا۔ سلطان نے اسے امن کا پروانہ لکھ دیا۔

سلطان ابھی بلادِ روم میں ''کوک سو'' کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے کہ کہ موصل کے وزیر اعظم مجاہد الدین قائماز کا سفیر حاضر ہوا اور درخواست کی کہ جس طرح سابق حکمران سیف الدین کے دور میں سروج، رہا، رقہ، حران، خابور اور نصیبین کے علاقے موصل کے پاس تھے اسی طرح نئے حکمران عزالدین مسعود کے دور میں بھی انہیں یونہی رہنے دیا جائے مگر سلطان اس پر آمادہ نہ ہوئے اس لیے کہ یہ علاقے سیف الدین غازی کے دور میں خلیفہ کی سفارش سے اس کی تحویل میں دیے گئے تھے اور شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ سلطان کی عسکری امداد کا پابند ہوگا۔ سیف الدین غازی کی وفات کے بعد سلطان نے خلیفہ کو خط لکھ کر تازہ صورتحال سے آگاہ کردیا تھا اور بتایا تھا کہ شام کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ان قلعوں کا ہمارے پاس رہنا ضروری ہے۔ خلیفہ ناصر نے سلطان کو اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس صورتحال کے پیش نظر سلطان نے موصل کی نئی حکومت کی درخواست قبول نہیں کی۔ یوں ایوبی سطوت کا سایہ یہاں بھی چھا گیا۔ [1]

<u>دمشق واپسی اور خلیفہ ناصر کا پیام تہنیت</u> سلطان حلب سے ہوتے ہوئے جمادی الاخری 576ھ کے وسط میں حماۃ پہنچے اور پھر حمص کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں دور دور سے علماء، فقہاء اور شعراء نے سلطان کی خدمت میں حاضری دی اور مسلسل فتوحات پر انہیں مبارک باد پیش کی۔ [2]

یکم رجب 576ھ (20 نومبر 1180ء) کو سلطان دمشق پہنچے۔ چند روز بعد بغداد سے نئے خلیفہ ناصر کے سفیر دربار خلافت کی جانب سے سلام، پیام تہنیت اور خلعت لے کر آئے۔ سلطان نے سفیروں کا بھرپور خیر مقدم کیا اور ان کے اعزاز و اکرام میں دمشق کو سجانے کا حکم دیا۔ [3]

1. سنا الشامی: 1/44
2. کتاب الروضتین: 3/66؛ سنا الشامی: 1/51
3. کتاب الروضتین: 3/60

فصل:10

مصر روانگی کا فیصلہ

قاہرہ سے سلطان کے بڑے بھائی توران شاہ کی وفات کی خبر آچکی تھی، انہیں اس حادثے کا سخت صدمہ تھا، پھر مصر سے ان کی غیر حاضری کو تقریباً تین سال گذر چکے تھے لہٰذا ان کا مصر جانا ضروری تھا۔۔۔ تاہم وہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ آئندہ ان کا مستقل قیام شام میں ہی رہے گا اور مصر کے معاملات کا جائزہ لینے اور ضروری امور نمٹانے کے بعد وہ نصرانیوں سے معاہدۂ صلح ختم ہونے سے پہلے واپس آجائیں گے۔ سلطان نے روانگی سے قبل فرخ شاہ کو شام میں اپنا نائب مقرر کیا اور تقی الدین عمر کو حماۃ پہنچ کر سرحدوں کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی۔ پیر 18 رجب 576ھ کو سلطان صلاح الدین دمشق سے قاہرہ روانہ ہوئے، ان کو الوداع کہتے ہوئے عماد اصفہانی نے کہا:

أَسْأَلُ اللهَ ذَا الْعُلَاءِ تَعِيشَا   أَلْفَ عَامٍ لِنُصْرِهِ مُسْتَجِيشَا

''میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہزار سال اس کی مدد ونصرت سے بہرہ ہو کر جیتے رہیں۔''

اس سفر میں خلیفۂ بغداد کی سفارت کے ایک اہم رکن شیخ ابو القاسم عبد الرحیم بھی ہم رکاب تھے۔ انہیں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے مزار کی زیارت کا شوق مصر لیے جارہا تھا۔ سلطان جمعرات 13 شعبان 576ھ (30 جنوری 1181ء) کو خیر وعافیت سے مصر پہنچ گئے۔ [1]

حج بیت اللہ کی حسرتِ نایافت: سلطان صلاح الدین کو حج بیت اللہ کی آرزو تھی ایک عرصے سے وہ اس کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے مگر حالات کے تقاضوں سے مجبور تھے۔ پے درپے مہمات سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اس تمنا کو پورا کرسکتے۔ سلطان کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس ذاتی ملکیت میں اتنی رقم نہیں رہتی تھی کہ حج فرض ہوتا۔ اس کے باوجود اللہ کے گھر کی زیارت کا

[1] کتاب الروضتین: 3/67، سلطان السلاطین: 1/53

شوق بہرحال ان کے دل میں چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔ سلطان کے ساتھ مصر آنے والے سفیر بغداد شیخ ابوالقاسم عبدالرحیم کا ارادہ تھا کہ وہ مصر میں چند دن گزار کر بحری راستے سے مکہ معظمہ چلے جائیں گے۔ سلطان نے بھی ارادہ کرلیا کہ وہ اسی سال حج کی سعادت حاصل کریں گے۔

چونکہ شیخ ابوالقاسم عبدالرحیم رمضان کا مہینہ حرمین میں گزارنے کے خواہش مند تھے اس لیے وہ صرف چند دن مصر ٹھہر کر سمندری راستے سے حجاز روانہ ہو گئے اور انہیں رمضان وہیں گزارنے کا موقع مل گیا۔ سلطان رمضان کے اختتام تک مصر ہی میں ٹھہرنا چاہتے تھے اس لیے وہ رک گئے، تاہم صلاح الدین کے وزیر قاضی فاضل نے یمن، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں یہ اطلاع بھیج دی تھی کہ سلطان اس سال حج کے لیے حجاز پہنچ رہے ہیں۔ [1]

اب سلطان مصر میں تمام حکومتی انتظامی اور عسکری امور کا جائزہ لے کر ان معاملات کو مربوط اور مرتب سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے اور دفاعی نظام کو مضبوط کرنے اور عوام کی حالت بہتر بنانے کے لیے فکرمند تھے۔ حالات بڑی حد تک ان کے لیے سازگار تھے۔ مصر میں ان کے نائبین نے امور سلطنت کو خوش اسلوبی سے سنبھالا ہوا تھا اور مصری بیڑے نے بحیرۂ روم میں یورپی طاقتوں کے خلاف کئی اہم کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ سلطان کو اطمینان تھا کہ ایام حج سے پہلے پہلے وہ مصر کے معاملات سے فارغ ہو جائیں گے مگر بعد میں وہ کچھ اہم مسائل مہمات اور حکومتی ذمہ داریوں میں کچھ اس طرح گھر گئے کہ ایام حج میں اس مقدس سفر کے لیے رخت سفر نہ باندھ سکے۔

سلطان کی عدم موجودگی میں شام کی صورتحال: نئے ہجری سال 577ھ کا آغاز اس حال میں ہوا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی قاہرہ میں مقیم تھے اور حالات بظاہر پرسکون تھے۔ یورپ میں فرانس کا بادشاہ لوئی جان، شاہ مینوئیل کامینوس اور پوپ الیگزنڈر یکے بعد دیگرے مر چکے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا عیسائی حکمرانوں سے دو سال تک عارضی صلح کا معاہدہ ابھی باقی تھا۔ یورپ اور ایشیا کے اس نقطے پر جہاں نصرانی اور اسلامی افواج معرکہ زن رہا کرتی تھیں ایک خاموشی طاری تھی۔ سلطان صلاح الدین قاہرہ میں ہر ہفتے پیر اور جمعرات کے دن ''دارالعدل'' میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہاں فریادی اور مظلوم کسی رکاوٹ کے بغیر ان سے مل سکتے تھے۔ سلطان ان کی شکایات سنتے اور انہیں فوری انصاف فراہم کرتے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ امام تاج الدین المسعودی رحمہ اللہ سے حدیث نبوی کی سماعت میں صرف کر رہے تھے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ: 834/7

شام سے آنے والی اطلاعات بھی اطمینان بخش تھیں۔ اس لیے فوری طور پر شام کے سفر کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں افریقہ میں عبدالمومن نے بڑی قوت حاصل کر لی تھی اور وسیع و عریض علاقوں پر قبضہ کر کے مصر کی سرحدوں کے قریب تک آ پہنچا تھا تاہم سلطان کے مصری امیر شرف الدین قراقوش نے عبدالمومن کے سالار ابراہیم کو قیروان میں زبردست شکست دی تھی اور بھاری مقدار میں مال غنیمت لے کر لوٹا تھا۔

577ھ کے آغاز میں سلطان کو فرخ شاہ کے ذریعے ایک خوشخبری ملی۔ مکتوب میں بتایا گیا کہ شام میں اس سال مسلمانوں کے ہاں جڑواں بچے کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں، وبائی امراض ختم ہو چکے ہیں اور قحط سالی جاتی رہی ہے۔ سرسبزوشادابی کا دور شروع ہو رہا ہے اور گرانی کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ ①

<u>ریجی نالڈ کا ناپاک منصوبہ ناکام</u>❋ اس سال شام میں مسلمانوں کو ایک اور کامیابی نصیب ہوئی۔ کرک کا عیسائی حاکم ریجی نالڈ اسلام دشمنی میں ہر حد کو پھلانگتا جا رہا تھا۔ وہ پرلے درجے کا شاطر، دغاباز، متعصب اور کینہ پرور انسان تھا۔ شیطنت اس کی رگ رگ میں بھری تھی۔ وہ انطاکیہ کا سابق حاکم تھا جو ایک لڑائی میں قید ہو کر حلب میں قید رہا تھا۔ رہائی کے بعد اس نے مشہور سورما ہمفری کی بیوہ سٹیفانیا سے شادی کر لی تھی جو قلعہ کرک کی وارث تھی۔ ریجی نالڈ اس طرح قلعہ کرک کا حاکم بن گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین سے نصرانیوں کے معاہدۂ صلح کے باوجود اس دغاباز نے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا طوفان برپا کیا ہوا تھا۔ ②

اس بدبخت نے اردگرد کے علاقوں سے نصرانیوں کو جمع کر کے یہاں تک منصوبہ بندی کر لی تھی کہ بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ ساحلی علاقے طے کر کے چپکے چپکے حجاز مقدس تک جا پہنچے اور حرمین شریفین پر قبضہ کر کے مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو تباہ کر دے۔ اس ناپاک مقصد کے لیے ریجی نالڈ افواج مرتب کر چکا تھا اور کوچ کرنے والا تھا کہ فرخ شاہ کو اطلاع مل گئی۔ اس نے ریجی نالڈ کو سبق دینے کا فیصلہ کر لیا اور دمشق کی فوج لے کر ریجی نالڈ کے علاقے میں گھس گیا، بڑے پیمانے پر تاخت و تاراج کے بعد اس نے اپنی سرحد کی طرف ہٹ کر ریجی نالڈ کے راستے میں پڑاؤ ڈال دیا تاکہ اگر وہ بدطینت انسان حجاز کا رخ کرنے کی کوشش کرے تو اسے روک لیا جائے۔

ریجی نالڈ میں لڑنے کی ہمت نہیں تھی چنانچہ وہ اس انتظار میں دن گزارنے لگا کہ مسلمان اکتا کر واپس چلے جائیں اور وہ موقع پا کر حجاز کی طرف نکل جائے مگر فرخ شاہ دھن کا پکا تھا۔ آخر ریجی نالڈ کو یقین

① البدایہ والنہایہ: 7/830، کتاب الروضتین: 3/73-99 ② سوانح الصلاح الدین لین پول، ص: 73

ہو گیا کہ فرخ شاہ راہ سے نہیں ہٹے گا۔ ریجی نالڈ کے ساتھ جمع ہونے والے نصرانیوں کا جوش بھی اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ آخر وہ سب ادھر ادھر بکھرنے لگے اور یوں ریجی نالڈ اپنے مکروہ عزائم کے ساتھ کرک واپس لوٹ گیا۔ سلطان کی غیر موجودگی میں شام کے محاذ پر مسلمانوں کی یہ ایک اہم فتح تھی۔ [1]

اس واقعے سے جہاں یہ ثابت ہو گیا کہ نصرانیوں کا معاہدۂ صلح محض فریب ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ سلطان کے سپاہی ان کی عدم موجودگی میں بھی شام کا دفاع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ بدھ 18 ذی قعدہ 577ھ (25 مارچ 1182ء) کو فرخ شاہ نے ایک اور بڑی کارروائی کی اور صفد کے زرخیز علاقے میں گھس کر تاخت و تاراج کی۔ جب وہ واپس ہوا تو اس کے پاس بے شمار مالِ غنیمت اور بہت سے عیسائی قیدی تھے۔

سال اسی طرح دبے پاؤں گذرتا جا رہا تھا۔ سلطان مصر میں رہتے ہوئے شام کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ انہیں ریجی نالڈ کے گھناؤنے منصوبوں کی اطلاع بھی مل چکی تھی۔ اگرچہ فرخ شاہ کی مستعدی کے باعث فوری خطرہ ٹل گیا تھا تاہم سلطان نے جان لیا تھا کہ معاہدۂ صلح کی اب کوئی حیثیت باقی نہیں رہ گئی اور شام میں فرزندانِ توحید اور پرستارانِ صلیب کے معرکے دوبارہ شروع ہونے والے ہیں۔ سلطان شام میں اپنی موجودگی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے مگر بہت سے مسائل انہیں گھیرے ہوئے تھے جن میں یمن کے نظامِ حکومت کی اصلاح سرفہرست تھی۔

سلطان کے بھائی توران شاہ نے یمن کا انتظام اچھی طرح سنبھالا ہوا تھا۔ اس کے واپس مصر آنے اور وفات پا جانے کے بعد یمن میں اس کے نائبین باہم الجھ پڑے تھے اور ان میں باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ یہ صورتحال ایوبی سلطنت کے لیے نہایت خطرناک تھی اس لیے سلطان نے مصر کے والی صارم الدین کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیج دیا۔ اس طرح وہاں خانہ جنگی رک گئی۔ [2]

الملک الصالح کی وفات اور حلب کی نئی حکومت ✵ عراق اور شام میں حالات نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ رجب کے مہینے میں سلطان نور الدین زنگی کا جانشین حاکم حلب الملک الصالح شدید بیمار ہوا اور 25 رجب 577ھ (4 دسمبر 1181ء) کو دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

نوٹ ✵ "مصنفِ داستان ایمان فروشوں کی" نے بڑی بے رحمی سے تاریخ کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس پاکباز انسان کو شرابی اور زانی باور کرایا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی موت کا سبب بھی شراب نوشی بیان کیا ہے جبکہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس متقی نوجوان نے ایک قطرہ شراب پینے پر موت کو ترجیح دی تھی۔

[1] الکامل فی التاریخ: 286/7

[2] الکامل فی التاریخ: 287/7؛ کتاب الروضتین: 76/3

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''جب اس کا مرض بڑھ گیا تو طبیبوں نے دوا کے طور پر شراب تجویز کی، اس نے کہا: جب تک علماء سے فتویٰ نہ لے لوں نہیں پیوں گا۔ ایک فقیہ نے ایسی حالت میں جواز کا فتویٰ دے دیا، تب اس نے فقیہ سے کہا: بتائیے اگر موت طے ہو چکی ہے تو کیا شراب سے ٹل جائے گی، اس نے کہا نہیں۔ الملک الصالح نے کہا تو میں حرام شے استعمال کر کے اللہ سبحانہٗ سے نہیں ملنا چاہتا۔''[1]

مؤرخین یہ گواہی بھی دیتے ہیں کہ شراب کی طرح وہ بے حیائی بدکاری سے بھی دور تھا۔

وكان حليماً كريماً عفيف اليد والفرج واللسان

''وہ بردبار اور سخی تھا، کسی پر دست درازی، عصمت دری اور بدگوئی سے پاک تھا۔''[2]

حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں: وہ ان بادشاہوں میں سے تھا جو نہایت پاکباز شمار ہوتے ہیں، کوئی اپنے باپ جیسے اخلاق سے آراستہ ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔[3]

ان حقائق کی روشنی میں الملک الصالح پر بہتان طرازی کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت یہ بیس سالہ خوبصورت اور خوش اخلاق نوجوان اہل حلب کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ حلب کے شہریوں کی اپنے نوجوان حکمران سے محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی خاطر سلطان صلاح الدین سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس دوران جبکہ الملک الصالح کی وفات سے حلب کے گلی کوچوں میں سوگ طاری تھی، موصل کا حاکم عزالدین مسعود نئے حکمران کی حیثیت سے وہاں پہنچ گیا۔ 20 شعبان 577ھ (29 دسمبر 1181ء) کو وہ اپنے امراء کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ مرحوم حاکم الملک الصالح نے موت سے پہلے حلب کی حکومت صرف اس ڈر سے عزالدین کے نام کر دی تھی کہ کہیں شہر پر سلطان صلاح الدین قبضہ نہ کر لے۔ اس طرح گویا سلطان کے بارے میں بداعتمادی ظاہر کر کے ان کے خلاف ریشہ دوانیوں کی ابتداء کر دی گئی تھی۔

یہ عزالدین مسعود کی خوش قسمتی تھی کہ اسے کسی خاص تگ و دو کے بغیر تھوڑی سی مدت میں دو سلطنتیں مل گئی تھیں۔ سیف الدین غازی موصل اس کے سپرد کر گیا اور الملک الصالح اسے حلب کا وارث بنا گیا۔ اس طرح عزالدین مسعود کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ اس قابل تھا کہ سلطان صلاح الدین سے ٹکر لے سکے اور ایوبی امراء کو شام سے بے دخل کر سکے۔ یہ صورتحال سلطان صلاح الدین کے لیے تشویش ناک تھی۔ انہوں نے فوراً حماۃ میں اپنے سالار تقی الدین عمر کو ہدایت بھیجی کہ وہ اپنی افواج کو ہر

---

[1] البدایہ والنہایہ: تحت 577ھ، الکامل فی التاریخ: تحت 577ھ

[2] الکامل فی التاریخ: تحت 577ھ

[3] البدایہ والنہایہ: تحت 577ھ

ممکنہ خطرے سے مدافعت کے لیے تیار رکھے۔[1]

سلطان نے یہ بھی اطمینان دلایا کہ عنقریب وہ خود شام آرہے ہیں مگر پہلے وہ اسکندریہ کے دفاع کو یقینی بنانا چاہتے تھے تاکہ یورپ سے کسی تازہ بحری یلغار کی صورت میں انہیں مصر کی فکر دامن گیر نہ ہو۔ شوال کے مہینے میں سلطان نے اس مقصد کے لیے خود اسکندریہ جاکر فصیل اور قلعے کی تعمیر نو کا جائزہ لیا۔ اس دوران انہوں نے شیخ ابوطاہر بن عوف سے مؤطا امام مالک کی ساعت بھی مکمل کی۔

ذی قعدہ 577ھ میں سلطان اسکندریہ سے قاہرہ پہنچ گئے اور سفر کے انتظامات کرنے لگے۔ انہوں نے امیر قراقوش کو قاہرہ اور فسطاط کی زیرِ تعمیر فصیل جو دونوں شہروں کا ایک ساتھ احاطہ کرتی تھی جلد مکمل کرنے کی تاکید کی۔[2]

شام میں عزالدین مسعود کی نہ صرف طاقت بڑھتی جارہی تھی بلکہ رائے عامہ کو بھی سلطان صلاح الدین کے خلاف ہموار کیا جارہا تھا۔ حماۃ سلطان صلاح الدین کا اہم مرکز تھا مگر وہاں بغاوت کا شدید خطرہ تھا۔ عوام کو عزالدین مسعود کی حمایت اور سلطان ایوبی کی مخالفت پر ابھارا جارہا تھا۔ عزالدین مسعود موقع سے فائدہ اٹھاتا تو اس کے لیے حماۃ سمیت سلطان صلاح الدین کے کئی دوسرے شہروں پر قبضہ کرنا زیادہ مشکل نہ ہوتا مگر قسمت سلطان صلاح الدین کا ساتھ دے رہی تھی۔

حلب عمادالدین کے حوالے: عزالدین مسعود نے ابھی حلب کی حکومت سنبھالے چند ماہ ہی گزارے تھے کہ اس کے بھائی عمادالدین نے جو سنجار کا حاکم تھا، اس پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ حلب اس کے حوالے کرکے بدلے میں اس سے سنجار لے لے۔ عزالدین مسعود اپنے بھائی کا مطالبہ ماننے پر آمادہ نہ تھا مگر عمادالدین نے دھمکی دی کہ اگر حلب اس کے حوالے نہیں کیا جائے گا تو وہ سنجار سلطان صلاح الدین کو دے گا۔ یہ دھمکی کام کرگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ موصل کے وزیراعظم مجاہدالدین قائماز سمیت کئی امراء نے عمادالدین کی تائید کی جس سے عزالدین بالکل مجبور ہوگیا۔ آخر اس نے حلب عمادالدین کے سپرد کردیا اور خود موصل لوٹ گیا۔ سلطان صلاح الدین عزالدین مسعود کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہ صرف شام میں اپنے جہادی مقاصد کے لیے نئی رکاوٹ تصور کررہے تھے بلکہ انہیں محسوس ہورہا تھا کہ اب شام کے حالات ان کے لیے سازگار نہیں۔ تاہم جونہی انہیں حلب پر عمادالدین کے قبضے اور عزالدین کے موصل لوٹ جانے کی خبر ملی ان کی تشویش جاتی رہی۔ یہ خوش آئند اطلاع ملتے ہی انہوں نے شام کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔[3] آدھی فوج مصر کی حفاظت کے لیے چھوڑی اور باقی اپنے ساتھ لے لی۔

[1] سفرنامہ ابن جبیر: 1/60 [2] کتاب الروضتین: 3/88_89 [3] الکامل فی التاریخ: 7/288_289

سلطان کی مصر سے روانگی: نئے ہجری سال 578ھ نے سلطان صلاح الدین کو مصر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے دیکھا۔ 5 محرم (29/اپریل 1183ء) کو وہ قاہرہ کے باہر خیمہ گاہ میں اپنے قافلے کے ساتھ پابہ رکاب تھے۔ امرائے سلطنت، علماء، مشائخ، تجار اور عام لوگ ان سے الوداعی ملاقات کے لیے جمع تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے انداز میں رخصتی کے دعائیہ کلمات کہہ رہا تھا۔ اس بھری پری محفل میں ایک عالم نے جو سلطان کے ایک بیٹے کے استاد تھے، قدیم عرب شعراء کے کلام میں سے یہ شعر پڑھ دیا:

تَمَتَّعَ مِنْ شَمِيْمِ عَرَادِ نَجْدٍ　　　فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَرَادٍ

"نجد کی نرگس کی خوشبو سے لطف لے لو کہ شام گزر جانے کے بعد خوشبوئے نرگس باقی نہیں رہے گی۔"

شاعر نے یہ شعر جس سوز و گداز سے کہا تھا، پڑھنے والے نے اسی کیفیت میں ڈوب کر پڑھا مگر یہ شعر حاضر باش امراء کو ناگوار محسوس ہوا کیونکہ وہ سلطان کو بخیریت واپسی کی دعائیں دے رہے تھے۔ سب جھنجلا گئے اور اسے بے ادبی پر محمول کیا۔

پر رونق محفل میں ایک مغموم سا سناٹا چھا گیا۔ خود سلطان صلاح الدین کے دل پر یہ شعر تیر کی طرح لگا۔ ان کے چہرے کی بشاشت جاتی رہی اور رنج و ملال کا تاثر ابھر آیا۔ حاضرین نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ ہر ایک سوچ رہا تھا کہ کاش یہ شعر اس وقت نہ پڑھا جاتا۔ دلوں کے نہاں گوشوں سے اک آواز ابھر رہی تھی کہ کہیں سچ مچ ایسا ہی نہ ہو جائے۔

کاتب عماد اصفہانی کا بیان ہے کہ اس استاد کا یہ شعر پڑھنا چاہے بے ادبی سہی مگر گویا یہ اک صدائے غیب تھی کیوں کہ سلطان کو اس کے بعد کبھی قاہرہ لوٹ کر آنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد سلطان تقریباً گیارہ سال تک زندہ رہے مگر انہیں کبھی اتنی فرصت نہ مل سکی کہ وہ مصر آسکتے حالاں کہ شام اور مصر میں چند دن کی مسافت تھی۔ [۵]

سلطان اب ایک ایسے سفر پر جا رہے تھے جس کا اختتام القدس کی آزادی پر ہوتا تھا۔ اس سفر میں مہمات کا ایک صحرا اور مصائب کا ایک دریا تھا جسے سلطان نے اللہ کی مدد و نصرت اور اپنی قوت ایمانی کے بل بوتے پر عبور کرنے کا عزم کیا ہوا تھا۔

---

۵ کتاب الروضتین: 3/103_104

فصل:11

ایوبی پایہ تخت کی دمشق منتقلی

آپ پڑھ چکے ہیں کہ مصر میں سلطان کے قیام کے دوران ہی عیسائی امن معاہدہ توڑ چکے تھے اور تاخت وتاراج سے بڑھ کر منظم حملوں پر اتر آئے تھے مگر ہر بار انہیں منہ کی کھانا پڑ رہی تھی۔ ان ناکامیوں نے نصرانیوں کے سلگتے جذبات کو مزید بھڑکا دیا چنانچہ وہ سلطان کی روانگی کی خبر سنتے ہی انہیں روکنے کے لیے سرحدوں پر منڈلانے لگے۔ ان کی بڑی تعداد شام اور مصر کی شاہراہ پر واقع قلعۂ کرک میں جمع ہو رہی تھی۔

عیسائیوں کا سرحد پر اجتماع اور فرخ شاہ کی کارروائیاں ❁ شام میں سلطان کے نائب فرخ شاہ کو سلطان کی روانگی کی اطلاع کے ساتھ خبر ملی کہ عیسائی امراء اپنے جتھوں کے ساتھ مصر کی سرحد کی طرف چلے گئے ہیں اور اب ان کے علاقوں میں محافظوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے چنانچہ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اپنے شہ سواروں کے ساتھ "دبوریہ" نامی بستی پر جا پڑا۔ یہاں سے وہ ایک ہزار نصرانی قیدی اور بیس ہزار مویشی ہانکتا ہوا نکلا اور "جبیس جلدک" کے قلعے پر حملہ آور ہوا جو طبریہ کے حاکم کا تھا اور نصرانیوں کے اطلاعاتی مرکز کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے نہایت پریشانی کا باعث تھا۔ عام حالات میں اسے فتح کرنا آسان نہیں تھا مگر فرخ شاہ نے موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسے فتح کر کے وہاں مسلمانوں کو آباد کر دیا۔ کاتب عماد اصفہانی کہتے ہیں کہ اس کے بعد یہ قلعہ مسلمانوں کے لیے جاسوسی اور خبر رسانی مرکز بن گیا۔ اس کامیابی کے بعد فرخ شاہ سلطان سے ملنے کے لیے مصر کی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔[1]

راستے کے خطرات سے نمٹنے کے لیے سلطان کی تدبیر ❁ سلطان صلاح الدین 5 محرم 578ھ (29 اپریل 1183ء) کو مصر سے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ سپاہیوں کے علاوہ ان تاجروں اور

[1] سنا البرق الشامی: 1/94، کتاب الروضتین: 2/106، البدایہ والنہایہ: 7/839

عام لوگوں کی بھی خاصی تعداد تھی جو شام میں قحط سالی کے سبب سلطان کے ساتھ مصر آ گئے تھے اور اب وطن واپس جا رہے تھے۔ مصری تاجروں کی ایک جماعت بھی تجارتی مال کے ساتھ ان کے ہمراہ تھی۔ پانچویں رات یہ قافلہ ساحلی قصبے ایلہ پہنچا۔ یہاں مخبروں نے انہیں اطلاع دی کہ ریجی نالڈ کرک کے قلعے میں گھات لگا کر حملہ کے لیے تیار ہے۔ [1]

سلطان نے آگے چلنے سے پہلے قافلے کے دونوں اطراف کی حفاظت کا انتظام کیا۔ فرنگیوں پر پہلے سے دھاک بٹھانے کیلئے وہ دائیں بائیں کی عیسائی بستیوں پر چھاپہ مار کارروائیاں کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ ''عقبہ شتار'' سے دو گاؤں آگے نکل کر سلطان نے قافلے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے میں صرف منتخب کہنہ مشق سپاہی شامل کیے اور دوسرے حصے میں باقی لوگوں کو رکھا۔ سلطان نے اپنے بھائی تاج الملک بوری سے کہا:

''ان سب لوگوں کو سارے ساز و سامان اور تجارتی اموال کے ساتھ لے کر شاہراہ کی دائیں جانب سے نکلتے چلے جاؤ۔'' تاج الملوک نے حکم کی تعمیل کی۔

<u>کرک پر سلطان کا حملہ</u>: اب سلطان نے اپنے آزمودہ سپاہیوں کے ساتھ قلعۂ کرک کا رخ کیا جو ان نصرانیوں سے بھرا ہوا تھا جو سلطان کو راستے میں روکنے کا عزم کر کے دور دراز سے جمع ہوئے تھے۔ سلطان کو اس قدر جرأت مندی کے ساتھ اپنے سامنے پا کر ان کی خود اعتمادی جاتی رہی۔ اب وہ محصور ہو کر لڑنے میں ہی عافیت سمجھ رہے تھے۔ سلطان نے کرک کا محاصرہ کر لیا، اردگرد کی فصلوں کو گھوڑوں کا چارہ بنایا اور باغات کے تمام درختوں کو کاٹ ڈالا۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان کے سپاہیوں نے قلعۂ شوبک اور دیگر بستیوں پر بھی چھاپے مارے۔ [2]

سلطان نے دس دن تک کرک کا محاصرہ جاری رکھا مگر نصرانیوں کو باہر نکل کر لڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ادھر سلطان صلاح الدین خود حالتِ سفر میں تھے اور جلد از جلد دمشق پہنچنا چاہتے تھے۔ یہاں زیادہ دن ٹھہرنا اور طویل محاصرہ کرنا اس لیے بھی ناممکن تھا کہ ان کے پاس خوراک و رسد کا انتظام نہ تھا۔ دسویں دن سلطان نے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ مخبروں نے انہیں ''دبوریہ'' میں فرخ شاہ کی فتح کی خبر دی۔ سلطان بصریٰ کے قریب پہنچے تھے کہ فرخ شاہ اپنے سواروں سمیت ان سے آن ملا۔ پیر 17 صفر 578ھ (20 جون 1182ء) کو سلطان دمشق پہنچ گئے۔ [3]

---

[1] الکامل فی التاریخ: 290/7، مفرج الکروب: 93/1
[2] کتاب الروضتین: 105/2، مفرج الکروب: 94/1
[3] مفرج الکروب: 95/1

دمشق سلطان ایوبی کا نیا پایہ تخت سلطان کا شام میں مستقل قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا لیکن اس کے بعد سلطان کو عمر بھر مصر واپس جانا نصیب نہ ہوا چنانچہ مرکز کے تمام سرکاری امور رفتہ رفتہ قاہرہ سے دمشق منتقل ہو گئے اور یہی شہر ایوبی خاندان کا پایہ تخت بن گیا۔

دمشق آ کر سلطان نے شام کے حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا اور اگلے ماہ نصرانیوں کے ان اہم مراکز پر حملے کا فیصلہ کر لیا جنہیں کمزور کیے بغیر القدس کی جانب کامیاب پیش قدمی ناممکن تھی۔ ان دنوں ایوبی سلطنت کے صوبے یمن میں حالات ایک بار پھر بے قابو ہونے لگے تھے۔ وہاں سلطان کے نائب حطان بن منقذ کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ایوبی خانوادے کے لیے تشویش ناک تھا، چنانچہ سلطان نے اپنے بھائی سیف الدین الاسلام طغتگین کو یمن روانہ کر دیا جس نے حطان کو معزول کر کے یمن کے نظم و نسق کو بہتر بنایا۔

نصرانیوں کے سرحدی قلعوں پر حملے اتوار 17 ربیع الاول 578ھ (20 جولائی 1182ء) کو سلطان صلاح الدین نے طبریہ کا رخ کیا، منگل کو بوقتِ سحران کے سپاہی طبریہ پر چھاپے مار رہے تھے۔ سلطانی لشکر کا کیمپ اردن کی سرحدی بستی "اقحوانہ" میں تھا۔ سلطان سے مقابلے کے لیے نصرانیوں کی بہت بڑی تعداد "طبریہ" پہنچ چکی تھی مگر ان کی بزدلی کا یہ عالم تھا کہ وہ سلطان کے آتے ہی قلعہ بند ہو کر بیٹھ سلطان نے بیسان کی طرف کوچ کیا اور فرخ شاہ کو آگے روانہ کر دیا جس نے دریائے اردن عبور کر کے حریف کے مویشیوں کو چھین لیا۔ سلطان کی اگلی منزل بیسان کے قریب نیا تعمیر ہونے والا نصرانیوں کا قلعہ عفربلا (بلفور) تھا۔ سلطان نے یہاں "موراء" کے مضافات میں کیمپ لگا کر قلعے پر حملے کی تیاری کی۔ صلیبی جو "عیون صوریہ" کے علاقے میں خیمہ زن تھے فوراً ادھر لپکے۔ سلطان کو بروقت خبر مل گئی۔ چونکہ ایک عرصے بعد اب کھلے میدان میں صلیبیوں سے مقابلے کی نوبت آنے والی تھی اس لیے اپنی عادت کے مطابق انہوں نے فوج کو جہاد کی ترغیب دے کر اس کا حوصلہ بلند کیا اور اسے از سرِ نو ترتیب دیا۔ تقی الدین عمر کو دائیں اور فرخ شاہ کو بائیں بازو پر مقرر کیا۔ آخر کار 12 ربیع الاول 578ھ کو دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں۔ مسلمان میدان کی خاک کو دشمن کے لہو سے سیراب کرنے کیلئے بے چین تھے۔ ان کی تیاری مکمل اور تعداد بھی زیادہ تھی۔ یہ دیکھ کر نصرانیوں کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ لڑائی کے بغیر "حصن کوکب" کی طرف پسپا ہونے لگے مگر سلطان کے بائیں بازو نے آگے بڑھ کر ان پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ساتھ ہی تقی الدین عمر دائیں بازو کو لے کر آگے بڑھا اور ایک تنگ وادی میں نصرانیوں کو جا لیا۔ یہاں نہایت شدید لڑائی ہوئی۔ آخر کار مسلمانوں کے پے در پے حملوں نے صلیبی فوج کی کمر توڑ دی۔ ان کے بہت سے سپاہی قتل اور گرفتار ہوئے۔ مسلمانوں کے بھی کئی نامور بہادر اس

موقع پر شہید ہو گئے۔ باقی ماندہ عیسائی حصن کوکب میں گھس گئے۔ اس معرکے کے بعد سلطان اپنے کیمپ میں آ کر ٹھہر گئے۔ حلب کی مہم تک ان کی خیمہ گاہ موران ہی میں رہی۔ [1]

بیروت کا محاصرہ اور ایک خوشخبری: سلطان رحمہ اللہ کا اگلا حملہ نصرانیوں کے مضبوط مرکز ''بیروت'' پر تھا جو بڑی مضبوط فصیلوں والا ساحلی شہر تھا۔ سلطان نے مصر کے بیڑے کو حکم بھجوایا تھا کہ وہ سمندر کی جانب سے بیروت پر حملہ کر دے۔ جوں ہی سلطان کو مصری بیڑے کے بیروت پہنچنے کی اطلاع ملی وہ خشکی سے بیروت پر حملہ آور ہو گئے۔ بیڑہ بھی سمندر کی جانب حملے کرتا رہا۔ اس نے دشمن کے بہت سے سپاہی گرفتار کیے اور خاصی مقدار میں مال غنیمت بھی حاصل کیا تاہم خشکی اور سمندر دونوں طرف سے حملوں کے باوجود بیروت سرنگوں نہ کیا جا سکا۔ دراصل سلطان کئی اہم کام چھوڑ کر آئے تھے جن میں سرحدوں کی حفاظت کا مسئلہ اہم ترین تھا چنانچہ محاصرے کو طول پکڑتا دیکھ کر سلطان نے فرخ شاہ کو دمشق بھیج دیا تاکہ وہ سرحدوں کے دفاع پر نظر رکھے۔ چند دن بعد سلطان نے بھی واپسی کا اعلان کر دیا۔ [2]

اس بظاہر ناکام مہم کی کوفت اس وقت دور ہو گئی جب کوچ سے پہلے انہیں بحیرۂ قلزم میں صلیبیوں کے ایک بحری بیڑے کی تباہی کی خبر ملی۔ یورپ کے یہ اڑھائی ہزار سپاہی القدس کی زیارت کے لیے جا رہے تھے مگر یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہاں جا کر وہ سلطان کے خلاف عیسائی امراء کی نئی صف بندی کا حصہ بن جاتے۔ ان کی بدقسمتی سے طوفانی ہواؤں نے انہیں گھیر گھار کر دمیاط کے ساحل پر لا پھینکا۔ ان میں سے بہت سے ڈوب کر مر گئے جب کہ ایک ہزار چھ سو چھہتر (1676) افراد سرحدی محافظوں اور بحری فوج کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہو گئے۔ [3]

---

[1] سلطان ایوبی: 1/66، سوانح سلطان صلاح الدین: 74

[2] سلطان ایوبی: 1/97

[3] سلطان ایوبی: 1/67، کتاب الروضتین: 3/93، الکامل فی التاریخ: 7/202

اسباقِ تاریخ

آپ نے دوسرے حصے کا مطالعہ کیا جو سلطان ایوبی کی شام میں سیاسی سرگرمیوں، مقامی امراء سے جھڑپوں، دمشق پر قبضے، حلب پر حملے، شام ومصر کے اسفار اور شام کے نصرانیوں سے بعض معرکوں پر مبنی ہے۔ ان واقعات پر غور کرنے سے بہت سے اسباق ملتے ہیں مثلاً:

- سیاسی امور بڑے پیچ دار ہوتے ہیں۔ ان کے مختلف پہلو ہوتے ہیں جن کے ہوتے ہوئے صحیح یا غلط راستے کا فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ سلامتی کا راستہ یہ ہے سب سے پہلے انسان ذاتی مفادات اور اغراض سے دستبردار ہو جائے جیسے سلطان ایوبی نے کیا۔ پھر راہِ سیاست میں کوئی بڑا مقصد سامنے رکھ کر چلے جو امت کے مفادات، تحفظ، سلامتی اور ترقی سے ہم آہنگ ہو۔ اس مقصد سے مطابقت رکھنے والے فیصلے اور اقدامات کرے چاہے وہ صلح ہو یا مخالفت، جنگ ہو یا معاہدۂ امن۔ مقصد سے متصادم فیصلوں اور اقدامات سے دور رہے۔
- جس موڑ یا مرحلے پر بھی ہوں سابقہ مراتب، معاہدوں اور اقدار کا بہت خیال کریں جیسا کہ سلطان ایوبی حتیٰ الامکان الملک الصالح کی بادشاہت کو تسلیم کیے رہے اور جب تک ممکن ہوا اس کے وفادار رہے۔
- اختلاف اگر جنگ تک پہنچ جائے تو اسے ضروری حد تک رکھا جائے۔ شدید ضرورت کے بغیر خونریزی سے گریز کیا جائے۔ مخالفین سے حسن سلوک کا ثبوت دیا جائے۔ جب وہ سرنگوں ہو جائیں تو ان کی ہر ممکن رعایت کی جائے۔
- موقع کبھی کبھی ملتا ہے۔ جب ملے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہ لگائی جائے۔ اگر سیف الدین غازی کی طرح سلطان ایوبی بھی ابن مقدم کی دعوت پر دمشق نہ جاتے تو کبھی حکمران شام ومصر نہ بن پاتے۔
- مال ودولت خرچ کرنے کے لیے ہے نہ کہ خزانے کا پیٹ بھرنے کے لیے۔ خزانے کو بھوک محسوس

نہیں ہوتی، ہاں لوگ ضرورت مند ہوتے ہیں۔ ان کی وفاداریاں، دعائیں اور نیک تمنائیں حکمران کا اصل خزانہ ہیں۔

- حکومت کا استحکام عوام کی خوشحالی، دین کی نصرت اور جہاد کے لیے ہونا چاہیے۔ اسلامی سرحدوں کا دفاع اوّلین ترجیح رکھتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے سلطان کا طرزِ عمل ایک مثال ہے۔
- جب تک حکومت کے پائے مضبوط نہ ہوں، حکمران کو متحرک رہنا چاہیے۔ اہم ترین کام سربراہِ حکومت کو خود انجام دینے چاہئیں۔ خالی بیٹھنے والے حکمران کی مملکت امن، ترقی، تحفظ اور خوشحالی سے خالی ہو جاتی ہے۔
- جہاں تک ممکن ہو ہمسایہ ممالک سے معاہدوں کے ذریعے قیامِ امن کا راستہ اپنائے رکھنا چاہیے۔ ایک وقت میں ایک ہی دشمن پر توجہ مرکوز رکھنا دانش مندی ہے۔ بیک وقت سب سے لڑائی مول لینا حماقت ہے۔

باب:4

الجزیرہ اور کردستان کی مہمات

578ھ(1182ء)

......تا......

582ھ(1186ء)

شخصیات

مظفرالدین کوکبری	حران کا حاکم
ناصرالدین شیر کوہ	حاکم حمص، سلطان کا جرنیل اور بہنوئی
اسدالدین	ناصرالدین شیر کوہ کا کم عمر بیٹا اور جانشین
عزالدین مسعود	حاکم موصل، سلطان کا حریف، نورالدین زنگی کا بھتیجا
مجاہدالدین قائماز	موصل کا وزیر اعظم
عمادالدین	حاکم حلب، حاکم سنجار
شیخ الشیوخ صدرالدین	عباسی خلیفہ کے سفیر
فقیہ عیسیٰ ہکاری	سلطان کے مشیر خاص
عماد اصفہانی	سلطان کے کاتب (سکیرٹری)
قاضی فاضل	سلطان کے وزیر
بہاؤالدین ابن شداد	سفیرِ موصل
الملک العادل ابوبکر	سلطان ایوبی کا چھوٹا بھائی
تاج الملوک بوری	سلطان ایوبی کا سب سے چھوٹا بھائی
الملک الافضل علی	سلطان کا سب سے بڑا بیٹا
الملک الظاہر	سلطان کا منجھلا بیٹا
الملک العزیز عثمان	سلطان کا دوسرا بڑا بیٹا
سلیمان بن جندر	سلطان کا دوست، مشیر
تقی الدین عمر	سلطان کے بڑے بھائی شہنشاہ کا بیٹا۔سب سے بہادر کمانڈر
حسام الدین لؤلؤ	سلطان کا ایڈمرل (امیر البحر)
عزالدین جوردیک	سلطان کا پرانا دوست اور کمانڈر
عزالدین جاولی الاسدی	سلطان کا کمانڈر

نورالدین محمد قرا ارسلان	....	حاکم کیفا، سلطان کا حلیف
قطب الدین عثمان	....	نورالدین قرا ارسلان کا بیٹا اور جانشین
سنجر شاہ	....	سلطان کا حلیف، سیف الدین غازی دوئم کا بیٹا
ریجی نالڈ	....	متعصب نصرانی کمانڈر، حاکم کرک
ریمنڈ	....	حاکم طرابلس، نصرانی کمانڈر
شمس الدین پہلوان	....	حاکم آذربائی جان
ارمن شاہ	....	حاکم خلاط
سیف الدین بکتمر	....	ارمن شاہ کا غلام، خلاط کا نیا حاکم
ابن جبیر	....	اندلس کا سیاح

فصل:1

زنگیوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف سلطان کا اِعلان جنگ

نصرانیوں سے ان جھڑپوں کے ساتھ ساتھ سلطان ایوبی کی نظر شام اور عراق کے وسیع رقبے پر حکومت کرنے والے زنگی خاندان کی ریشہ دوانیوں پر بھی تھی۔ اگرچہ اس خانوادے کے موجودہ حکمران عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی کے نسبی وارث ہونے کے باعث سلطان کے لیے قابل احترام تھے مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت تھی کہ زنگی کے موجودہ وارثین سلطان صلاح الدین ایوبی کی حکومت و اقتدار اور فتوحات کو شروع سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے آئے تھے۔ وہ سلطان کو یکسوئی کے ساتھ نصرانیوں سے نبرد آزمائی کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ دو برس پہلے انہوں نے سلطان سے دب کر جو صلح کا معاہدہ کیا تھا اس کا وقت پورا ہونے والا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ سلطان کے خلاف محلاتی سازشوں کا آغاز کر چکے تھے۔ سلطان کے جاسوسوں نے معلوم کیا تھا کہ زنگی کے ورثاء عیسائی حکمرانوں کو بھاری رقمیں دے کر ایوبی سلطنت کی سرحدوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ [1]

اس سازش کے ثبوت فراہم ہو جانے کے بعد سلطان کے لیے نور الدین زنگی کے نام پر دھبہ بننے والے ان حکمران کو سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ تاہم سلطان نے صلح نامے کی مدت ختم ہونے تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ جوں ہی میعادِ صلح ختم ہوئی سلطان نے کہا:

''ہم پر زنگیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا اور جہاد کرنا واجب ہو چکا ہے۔''

کوکبری کا مشورہ ﷺ- اس اعلان کے ساتھ ہی سلطان نے زنگیوں کے مرکز حلب کی طرف کوچ کر دیا۔ بعلبک اور حمص سے گزرتے ہوئے وہ حماۃ میں ٹھہرے اور وہاں کے والی تقی الدین عمر کو شہر کا انتظام اور

[1] سنا البرق الشامی: 1/66

سرحدوں کا دفاع بہتر بنانے کے بارے میں ہدایات دیں۔ دودن بعد سلطان یہاں سے روانہ ہوئے۔ جب وہ حلب سے ایک منزل دور جباب الترکمان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ حران کا حاکم مظفرالدین کوکبری ابن زین الدین حاضرِ خدمت ہوا۔ وہ ایک جنگجو سپاہی اور دوراندیش سیاست دان تھا۔ اس کا باپ زین الدین عراق کی ریاست اربل کا حاکم تھا۔ اس کے انتقال کے وقت مظفرالدین لڑکا تھا اس لیے اربل کی حکومت اس کے چچا نے سنبھال لی اور حاکمِ موصل سیف الدین غازی نے اسے اربل کی جگہ ''حران'' کی حکومت دے کر اپنا تابع دار بنا لیا۔ مظفر نے سیف الدین سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے تل السلطان کے معرکے میں صلاح الدین ایوبی کے خلاف زبردست جنگ لڑی تھی مگر سلطان کا یہ حریف آج اپنی وفاداریاں سلطان کے دربار سے وابستہ کرنے اور ان کا حلقہ بگوش بننے کو تیار تھا۔ بات یہ تھی کہ مظفرالدین کوکبری حلب کا حاکم بننا چاہتا تھا اور اسی جذبے نے اسے زنگیوں کا مخالف بنا دیا تھا۔ گزشتہ سال الملک الصالح کے انتقال کے بعد حلب کو عزالدین مسعود کی تولیت میں دیے جانے فیصلہ ہوا تو اس وقت بھی مظفرالدین کوکبری نے حلب کے قلعے پر قبضے کی کوشش کی تھی مگر جب امرائے حلب نے حلب عمادالدین کی تحویل میں دینے کا فیصلہ کیا تو مظفرالدین کوکبری کو حلب سے بھاگنا پڑا تھا۔ تب سے مظفرالدین کو زنگی خاندان کے باغی کی حیثیت دے دی گئی تھی اور مظفرالدین بھی انہی دنوں سے زنگیوں سے بدلہ لینے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کررہا تھا۔ اب جبکہ سلطان صلاح الدین ایوبی شام میں نئی مہمات شروع کررہے تھے تو اسے زنگیوں سے بدلہ لینے کا بہترین موقع مل گیا تھا۔ مظفرالدین نے اس ملاقات میں سلطان کو یہ قیمتی مشورہ دیا کہ وہ حلب سے پہلے دریائے فرات کے پار واقع شہروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ [1] اس نے کہا:

''میں آپ کا خیرخواہ اور آپ کے کارناموں کا گرویدہ ہوں، آپ زنگیوں کی بدعہدی اور وعدہ خلافی سے خوب واقف ہیں۔ اگر آپ دریائے فرات کے پار والے شہروں پر قبضہ کرلیں تو آپ کو پشت سے مدد حاصل رہے گی اور اس کے بعد آپ اپنے عزم کے مطابق (حلب کی) مہم پر جاسکتے ہیں۔ آپ کو اس وقت عوام کی محبت حاصل ہے اور آپ کی ہیبت سب پر طاری ہے، دریائے فرات پار کرتے ہی شہر آپ کے لیے مسخر ہوجائیں گے، لوگ اطاعت کریں گے۔ آپ نہ صرف حران، رہا، رقہ، خابور اور نصیبین جیسے شہروں پر قبضہ کرسکیں گے بلکہ موصل بھی یقیناً آپ سرنگوں ہوگا۔ ان علاقوں میں کوئی آپ کی نافرمانی کرنے والا نہ ہوگا لیکن اگر آپ

[1] الروضتین: 578ھ

نے پہلے حلب پر حملہ کیا تو یہ شہر (اپنی سنگین فصیلوں کے باعث) آپ کو بہت سے اہم کاموں اور الجزیرہ کی فتح سے روک دے گا۔"[1]

سلطان نے یہ مشورہ غور سے سنا اور مظفر الدین کا شکریہ ادا کر کے اسے واپس بھیج دیا۔ سلطان اس کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے مگر انہوں نے اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ 18 جمادی الاولیٰ کو حلب کے سامنے پہنچ کر تین دن تک ٹھہرے رہے۔ پھر 21 جمادی الاولیٰ کو یکدم ان کا رخ دریائے فرات کی طرف ہو گیا۔ تل خالد سے گذر کر وہ دریا کے چوڑے پاٹ تک پہنچ گئے۔ آگے فرات اور دجلہ کی وادی الجزیرہ ان کی منتظر تھی۔[2]

<u>دریائے فرات کے پار</u>: دریائے فرات کے پار البیرہ کا مضبوط قلعہ تھا جس کا حاکم شہاب الدین ارتقی سلطان سے خط و کتابت کر کے حمایت کا وعدہ کر چکا تھا کیونکہ ان دنوں حاکم ماردین اس کے کئی علاقوں پر قابض ہونے کے بعد البیرہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ سلطان کی پیش قدمی کی اطلاع سن کر حاکمِ ماردین البیرہ سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور ارتقی کی جان میں جان آئی۔ ارتقی چاہتا تھا کہ سلطان صلاح الدین کی سرپرستی حاصل کر کے وہ حاکمِ ماردین کی زیادتیوں سے مستقل طور پر محفوظ ہو جائے چنانچہ سلطان کے آتے ہی وہ حاضرِ خدمت ہو گیا۔ اس نے سلطان کو البیرہ کے قلعے کی چابیاں پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ اسی محفوظ قلعے میں قیام کریں۔ سلطان نے یہ دعوت قبول کی مگر قلعے کی چابیاں اسے لوٹا دیں۔ وہ اس کے مسائل سے واقف تھے اس لیے وعدہ کیا کہ وہ اسے حاکم ماردین کی زیادتیوں سے نجات دلائیں گے۔ جلد ہی سلطان نے حاکم ماردین سے مراسلت کر کے شہاب الدین ارتقی کو اس کے غصب شدہ علاقے واپس دلا دیے۔ اب سلطان نے دریائے فرات پر پل بنوا کر سپاہیوں کو پار اترنے کا حکم دیا۔ بھاری ساز و سامان کشتیوں کے ذریعے منتقل کیا جاتا رہا۔ دریا کے پار سلطان کا خیمہ نصب کر دیا گیا اور سلطان نے وہاں منتقل ہو کر ارد گرد کے امراء کو مراسلے بھیجنا شروع کر دیے کہ وہ حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں...... سب سے پہلے حصن کیفا کے والی نور الدین نے اطاعت کا مکتوب بھیجا۔ پھر دیگر امراء کے اطاعت نامے آنے لگے۔[3]

<u>سلطان مسلم حکام سے لڑنے پر کیوں مجبور تھے؟</u>: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب پر

[1] البرق الشامی: 23/6

[2] النوادر السلطانیہ: 101۔ ابن شداد نے ابن ابی طے کے حوالے سے قیام کی مدت چھ دن بتائی ہے۔

[3] الکامل فی التاریخ: 7/203، مسالک الابصار: 1/103، دار المعارف، تحت 678ھ

ایک بار پھر غور کر لیں جن کی وجہ سے سلطان صلاح الدین ایوبی کو نصرانیوں کی بجائے اپنے کلمہ گو مسلمان بھائیوں سے جنگوں کا یہ طویل سلسلہ شروع کرنا پڑا تھا۔ سلطان کا ان مسلم حکمرانوں سے لڑنا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے خصوصاً اس تناظر میں کہ دنیائے اسلام کے تنزل کے اس دور میں بھی مسلم حکمرانوں میں دینداری، وضع داری اور شرافت کے نمونے عام تھے۔ خود وہ حکمران جن کے خلاف سلطان کو تلوار اٹھانا پڑی تھی قومی اور مذہبی روایات کی بڑی حد تک پاسداری کرتے تھے۔ سلطان کا سب سے بڑا اور ناقابلِ شکست حریف عزالدین مسعود ایک عادل اور رعایا پرور حکمران تھا۔ رات کا تہائی حصہ نمازِ تہجد میں گزارتا تھا۔ اپنے چچا نورالدین زنگی کی طرح وہ بردبار اور کم گو تھا۔ اسے خاندانی شرافت کا عمدہ نمونہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ حکمران سیاسی اغراض کے پردے اور رقابت کی دھند کے باعث سلطان کے مشن اور مقصد کو نہ سمجھ سکے۔ آج نو سو سال بعد ہم سلطان کو جس مقام پر دیکھتے ہیں، اسے ان کے ہم عصر حکمران تو کجا معاصر مورخ بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ معاصرت کے باعث پیدا ہونے والا طبعی حسد انسان کو اپنے زمانے کے بہت سے باعظمت افراد کے مقام و مرتبے کی پہچان سے محروم رکھتا ہے۔ یہی حسد بہت سے مخلص نیک اور شریف لوگوں کو بھی ایسی ہی کسی شخصیت کے خلاف پست اقدامات پر ابھارتا ہے اور انہیں بالکل احساس نہیں ہوتا کہ وہ حالات کے دھارے کو کس قدر تباہ کن رخ دے رہے ہیں اور کل تاریخ میں ان کا مقام کیا ہوگا۔ وہ تنگ نظری کے باعث اپنے ایسے اقدامات کو بھی قوم کی خیر خواہی پر محمول کرتے ہیں جنہیں اگلی نسل کے لوگ حددرجے عاقبت نااندیشی کا نام دیتے ہیں۔

سلطان کے یہ معاصرین جن میں موصل کے شرفاء اور شہزادے سرفہرست تھے اپنے ذاتی نیک اوصاف کے باوجود ایسی ہی خطرناک سیاسی غلطیاں کر رہے تھے لہٰذا سلطان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ بزورِ شمشیر ان مراکز کو زیروزبر کر دیں جہاں اسے مسلمانوں کی فلاح کے زعم میں در حقیقت ان کو کلیسا کی بھینٹ چڑھا دینے کے سودے ہو رہے تھے۔ جب تک سلطان ان حکمرانوں سے نمٹ نہ لیتے نصرانیوں کی طرف یکسوئی سے توجہ دینا اور القدس کی بازیابی کی فیصلہ کن جنگ لڑنا ممکن نہ تھا۔ اگر سلطان موجودہ حالت میں کسی طرح القدس پر قبضہ کر بھی لیتے تو یہ قبضہ ہرگز مستحکم نہ ہوتا۔ سلطان صلاح الدین کی دوراندیش نظریں دیکھ رہی تھیں کہ القدس پر قبضہ برقرار رکھنا اس کی فتح سے کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ یورپ جواب تک القدس کی تولیت اور قبضے پر مطمئن ہے، اس کے چھن جانے کے دھچکے کو برداشت نہیں کر پائے گا اور پہلی صلیبی جنگ کی طرح اس کی ٹڈی دل افواج ایک بار پھر ایشیا کے ساحلوں پر اتر پڑیں گی۔ ایسے میں اگر القدس کے وارثوں کے پاس پہلے سے ایک مضبوط، متحد، منظم

اور مستحکم حکومت نہ ہوئی تو یورپیوں کا یہ نیا سیلاب القدس کو بازیاب کرانے کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی چھوٹی چھوٹی درجنوں ریاستوں کو بھی خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔

یہ وہ خوفناک حقائق تھے جو سلطان پر پوری طرح واضح مگران کے ہم عصروں سے اسی قدر اوجھل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان کی ان لڑائیوں کو جو شام، الجزیرہ اور عراق کے حکمرانوں سے ہوئیں، ان کے معاصرین خانہ جنگی اور برادرکشی پر محمول کرتے رہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ سلطان نے یہ لڑائیاں بادلِ نخواستہ لڑیں اور بار بار جنگ کو ٹال کر مذاکرات سے بات چیت طے کرنے کی کوششیں کیں۔ اکثر مواقع پر صلح وصفائی یا ڈرانے دھمکانے سے مقصد حاصل کرنا چاہا۔ تلوار صرف ناگزیر مواقع پر استعمال کی اور وہ بھی بقدرِ ضرورت۔ ان لڑائیوں میں سلطان نے کہیں بھی فتح کے بعد اپنے کلمہ گو حریفوں سے جانی دشمن جیسا سلوک نہیں کیا بلکہ ان سے انتہائی فراخدلانہ رویہ رکھا۔ چونکہ سلطان کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ اپنے ہم عصر مسلم حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو کر نصرانیوں سے جہاد کے لیے یکسو ہو جائیں اس لیے کئی بار انہوں نے مسلمان حکام سے صلح کے معاہدے کیے اور باہمی تعاون کے عہد و پیمان باندھے مگر جب بار بار وعدہ خلافیاں ہوئیں اور یہ حکام صلیبیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے سے باز نہ آئے تو سلطان کو اپنے تمام جذبات واحساسات کا گلا گھونٹ کر اپنے ہم قوموں کے خلاف مہم جوئی کا وہ فیصلہ کرنا پڑا جس کے بغیر تاریخ کے دھارے کا رخ بدلنا ممکن نہیں تھا۔

سلطان کا ایک حقیقت کشا مکتوب: سلطان کے ان احساسات کی ترجمانی اور ان کے موقف کی وضاحت کے لیے ان کے ایک مکتوب پر نظر ڈالنا ضروری ہے جو انہوں نے دریائے فرات عبور کرنے کے بعد البیرہ کے مقام سے عباسی خلیفہ ناصر کے نام لکھا تھا۔ اس میں سلطان تحریر کرتے ہیں:

> ''ناچیز پر یہ واضح ہو گیا کہ اہل موصل فرنگیوں سے دوستی کے روابط بڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے ان سے جو معاہدہ کیا ہے، اس کی گواہی مجلسِ معاہدہ میں موجود چشم دید گواہوں نے دی ہے۔ یہ گیارہ سال کا معاہدہ ہے جس میں یہ طے کیا گیا کہ فرنگی انہیں سالانہ دس ہزار دینار دیا کریں گے اور اس کے بدلے مسلمانوں کی سرحدیں فرنگیوں کو دے دی جائیں گی جن میں بانیاس، شقیف تیرون، اور حبیس جلدک کے علاقے شامل ہوں گے۔ وہ تمام فرنگی قیدی جو اہل موصل کے یا اس ناچیز کی قید میں ہیں، فرنگیوں کو لوٹا دیے جائیں گے۔

اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد اہل موصل نے یہ سمجھ لیا تھا کہ باطل حق پر غالب آجائے گا اور کفر اسلام پر چھا جائے گا اور یہ ناچیز اگر ان (اہل موصل) کی گوشمالی کرنا چاہے گا تو اسے فرنگیوں سے

سہ کرنا پڑے گی۔ انہوں نے سمجھا کہ میں یہ نہیں کرسکوں گا کہ اپنے لشکر کے دو حصے کر کے ایک ہی وقت میں فرنگیوں اور ان سے ٹکر لے سکوں۔ چنانچہ انہوں نے اس خیال کے مطابق فرنگیوں کو پیش قدمی کی دعوت دے دی۔ اگرچہ فرنگیوں کو پے در پے کئی معرکوں میں زخم لگ چکے تھے مگر اہل موصل کی حوصلہ افزائی نے ان کے قدموں کو توانائی بخشی۔ فرنگیوں نے اپنے لشکر پر وہ دولت کثیر خرچ کی جو اہل موصل نے انہیں بھیجی تھی، گویا مسلمانوں پر فرنگیوں کے جس لشکر نے چڑھائی کی ہے اسے اسلام کے نام نہاد دعوے داروں نے تیار کیا تھا جو عملاً اسلام سے دور ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بندے کی سلطنت پر ایک طرف سے اہل موصل حملہ کریں گے اور دوسری طرف سے فرنگی۔ اہل موصل صرف یہ سوچتے ہیں کہ کس چیز سے بندے کا نقصان ہوگا۔ وہ یہ نہیں دیکھ رہے کہ اس کا اثر اسلام کے مستقبل پر کیا ہوگا۔

چنانچہ موصل کی افواج جمع ہو کر تیزی سے نصیبین تک آ گئیں اور فرنگی جارحانہ انداز میں شام پر حملے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تب الجزیرہ کے امراء اور خواص نے سمجھ لیا کہ ان حالات میں ان کے لیے فرزندان توحید کے گروہ سے الگ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کو راضی کرتے ہوئے اپنے حکمرانوں کی ناراضگی مول لی اور اپنے دین کا ایسا خیال کیا جس سے ان کی پرہیزگاری اور احتیاط عیاں ہوتی ہے۔ انہوں نے حق کا اتباع کیا اور اس کی راہ پر چلے، ہدایت نے ان کے لیے اپنا مینار بلند کیا سو وہ اس کے پیچھے چل دیے جس کی دلیل یہ آیت قرآن مجید ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾[1]

''اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے والوں کو تم کبھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی لگاتا نہ پاؤ گے۔'' پس بندے نے اپنے بھتیجے فرخ شاہ کو فرنگیوں کے مقابلے کے لیے دمشق بھیج دیا اور خود اللہ عزوجل کے عائد کردہ فریضے کی تکمیل کے لیے مصری فوج کے ساتھ اس جانب (دریائے فرات کے پار) چلا آیا۔''[2]

سمندر کے لیے سمندر ہی کافی ہو سکتا ہے ✽ البیرہ کے بعد سلطان سروج پہنچے تو یہاں کے حاکم ال... مالک نے بھی سر تسلیم خم کر دیا، سلطان نے اسے اس کے علاقے پر برقرار رکھا۔ ان فتوحات میں سلطان نے داد و دہش کا خوب مظاہرہ کیا اور حلقہ بگوش ہونے والے امراء پر انعامات کی بارش کر دی۔ وہ ...

[1] سورۃ المجادلہ: آیت 22

[2] کتاب الروضتین: 3/118_121

تھے کہ سیاست دانوں کی وفاداریاں جیتنے کے لیے سخاوت ناگزیر ہے۔ سلطان نے ان فتوحات سے پہلے دمشق میں فرخ شاہ کو جو خط لکھا تھا اس سے ان کی پالیسی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے تحریر کیا تھا:

''تمہارے پاس جو دولت ہے اسے یہاں بھیجنے میں جلدی کرو کیوں کہ شہروں کی فتح کے ساتھ ساتھ یقیناً مال ہڑپ کرنے والے منہ کھلیں گے۔ ہمیں ایسے سمندر سے واسطہ پڑا ہے جسے سمندر ہی کافی ہو سکتا ہے، اور ایسے ہاتھوں سے سابقہ پڑ گیا ہے جو مالدار ہوتے بھی دل کے فقیر ہیں۔'' [1]

الرہا سرنگوں ❊ سلطان کی آمد کی اطلاع پاکر موصل کا حکمران عزالدین مسعود اپنے وزیر اعظم مجاہد الدین قائماز کے ساتھ ایک بڑی فوج لے کر دفاع کے لیے نصیبین پہنچ گیا مگر سلطان کے دریائے فرات عبور کرتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ موصل لوٹ گیا تاہم اس نے مسعود زعفرانی کی کمان میں ''الرہا'' کی حفاظت کے لیے فوج کا بہترین حصہ چھوڑ دیا تھا۔ یہی وہ قلعہ تھا جو عماد الدین زنگی سے پہلے نصرانیوں کی ریاست اڈیسہ کا مرکز تھا۔ عماد الدین زنگی نے 539ھ (1144ء) میں اسے فتح کیا تھا، بعد میں نور الدین زنگی کو بھی اس قلعے پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے صلیبیوں سے سخت معرکے لڑنے پڑے تھے۔ دوسری صلیبی جنگ الرُّہا کی بازیابی کے لیے ہی برپا کی گئی تھی۔

جمادی الاولیٰ 578ھ (ستمبر 1182ء) میں سلطان نے الرہا کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ یہاں زنگیوں کی فوج بڑی تعداد میں جمع تھی لہٰذا شدید لڑائی برپا ہوئی۔ سلطان صلاح الدین نے بذات خود لڑائی میں حصہ لیا۔ تیروں کی بارش میں قلعے پر حملہ کرتے کرتے وہ موت کے منہ سے بال بال بچے۔ آخر مسعود زعفرانی ہتھیار ڈال کر اظہار اطاعت پر مجبور ہو گیا۔ سلطان نے حران کے ساتھ رہا کی تولیت بھی کوکبری کو سونپ دی۔ پھر سلطانی لشکر رقہ پہنچا جہاں سلطان کا پرانا حریف ینال بن حسان مورچہ بند تھا۔ اس بار اسے چوں چرا کی جرأت نہ ہوئی اور رقہ کسی دقت کے بغیر مسخر ہو گیا۔ [2]

فرخ شاہ کی وفات ❊ رہا کے محاصرے سے پہلے ایک المیہ رونما ہو چکا تھا، سلطان کو یہ افسوس ناک خبر موصول ہوئی تھی کہ ان کا بھتیجا فرخ شاہ دمشق میں وفات پا گیا ہے۔ وہ سلطان کے بڑے بھائی شہنشاہ کا بیٹا اور تقی الدین عمر کا بھائی تھا۔ ایک بہترین سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نامور شاعر بھی تھا۔ سلطان کا دست راست اور شام میں ان کا نائب بن کر وہ مثالی وفاداری کا ثبوت پیش کرتا چلا آیا تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں نصرانیوں پر اپنی تلوار اور مسلمانوں پر اپنے حسن انتظام کی دھاک بٹھا دی تھی۔ شام میں سلطان کی فتوحات میں اس کا کردار ناقابل فراموش تھا۔ اس کی وفات سلطان کے

[1] کتاب الروضتین: 116/3 [2] سلطان صلاح الدین...: 105/1

لیے سخت صدمے کا باعث تھی۔ سلطان نے اس کی جگہ شمس الدین ابن مقدم جیسے کہنہ سال امیر کو نائب بنا کر دمشق بھیج دیا جس نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر سلطنت کا امن وامان برقرار رکھا۔ [1]

الجزیرہ میں مزید فتوحات: رہا اور رقہ کی فتح کے بعد سلطانی لشکر عرابان پہنچا تو شہر کے مرد و زن اور بچے بوڑھے سب استقبال کے لیے نکل آئے۔ سلطان نے ان کے ساتھ نہایت فیاضی کا معاملہ کیا اور حکم دیا کہ ان اطراف کے تمام لوگوں سے ہر قسم کا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔ عرابان کے ساتھ خابور کے تمام قلعہ دار سلطان کے حسن سلوک کی شہرت سن کر سرنگوں ہو چکے تھے۔ ایوبی لشکر نے خابور سے دریا کو پل کے ذریعے عبور کیا اور بائیں طرف مڑ کر تین دن کے بعد نصیبین کو جا گھیرا۔ اہل شہر نے منجنیقوں اور دیگر آلات حرب نصب کر کے لڑائی کی تیاری کر لی تھی۔ سلطان نے بلاضرورت خونریزی سے احتراز کرتے ہوئے اردگرد کے راستوں کی ناکہ بندی کرا دی۔ چند ہی دنوں میں نصیبین کے عمائد کو سلطان کی قوت کا اندازہ ہو گیا اور انہوں نے شہر کے دروازے کھول دیے۔ سلطان نے یہاں بھی فراخدلانہ رویے کا مظاہرہ کیا اور تمام ٹیکس معاف کرنے کا اعلان کیا۔ [2]

موصل کی طرف پیش قدمی: الجزیرہ کے کئی اہم شہر فتح ہو چکے تھے۔ اب اصل ہدف موصل سلطان صلاح الدین کے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ سنجار اور جزیرہ ابن عمر بھی خاصے اہم تھے جنہیں فتح کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ سلطان نے مجلس شوریٰ کو طلب کر کے پوچھا:

''سنجار، جزیرہ ابن عمر اور موصل میں سے پہلے کس پر قبضہ کرنا بہتر ہوگا؟''

مظفر الدین کوکبری نے عرض کیا:

''موصل سے پہلے کسی اور شہر کا رخ کرنا مناسب نہیں۔ اس وقت سمجھئے کہ موصل ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اسے بچانے والا کوئی نہیں۔ مجاہد الدین قائماز اور عزالدین مسعود ہمارے موصل پہنچتے ہی شہر چھوڑ کر پہاڑی قلعوں میں چلے جائیں گے۔''

سلطان کے چچازاد ناصر الدین بن شیرکوہ نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ چنانچہ سلطان موصل کی طرف روانہ ہو گئے۔ دریائے دجلہ کے کنارے آباد یہ شہر جو نصف صدی سے زنگی حکمرانوں کا پایہ تخت چلا آرہا تھا بہترین دفاعی انتظامات سے لیس تھا۔ یہاں عزالدین مسعود کے ساتھ زنگیوں کا مدبر اعظم مجاہد الدین قائماز اور دیگر بڑے بڑے کہنہ مشق امراء موجود تھے۔ زنگیوں کی اصل فوجی قوت یہیں محفوظ تھی۔

---

[1] سیرت النبیٰ: 103/3
[2] سیرت النبیٰ: 106/1

شام پر نصرانیوں کے حملے: فرخ شاہ کی وفات سے نصرانیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے، انہیں ہمت دلانے میں موصل کے امراء کا بھی بڑا ہاتھ تھا، جو نامہ و پیام اور مال و دولت کا لالچ دے کر انہیں شام پر قبضے کے لیے ابھار رہے تھے۔ پھر شام کی زیادہ تر فوج سلطان کے ساتھ تھی جس کا نصرانیوں کو اندازہ تھا لہٰذا وہ دمشق کے نواحی دیہاتوں میں لوٹ مار کرنے لگے تھے۔ دمشق کی مقامی فوج نصرانیوں کے ان مظالم کو روکنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ اس سے قبل نصرانیوں کے لیے فرخ شاہ جیسے جری سالار کا نام ہی کافی تھا، جسے سن کران کے چھکے چھوٹ جاتے تھے، مگر اب صورتحال یہ تھی کہ نصرانیوں کی ایک فوج دمشق کے نواح میں ''داریا'' تک پہنچ چکی تھی، وہاں قبضہ کرنے کے بعد وہ علاقے کی جامع مسجد کو شہید کرنے کا اعلان بھی کر چکے تھے۔

دمشق میں سلطان کے نائب نے اس موقع پر سیاسی تدبیر سے کام لیتے ہوئے اپنے علاقے کے چند نصرانیوں کے ہاتھ عیسائی لشکر کے سالار کو ایک خط بھیجا جس میں تحریر تھا:

''اگر تم نے جامع مسجد شہید کر دی تو ہم اسے دوبارہ تعمیر کرالیں گے لیکن اس کے بعد ہم تمہارے ملک کے ہر گرجے کو تباہ کر دیں گے اور کسی کو ان منہدم شدہ گرجوں کی از سرِ نو تعمیر کی اجازت نہیں دیں گے۔''

عیسائی سالار اس دھمکی سے مرعوب ہو گیا اور اس طرح ''داریا'' کی جامع مسجد، محفوظ رہ گئی مگر دمشق کے اردگرد نصرانیوں کی تاخت و تاراج اہلِ شام کے لیے بے حد تشویش و اضطراب کا باعث تھی۔ سلطان صلاح الدین اس صورتحال سے پوری طرح آگاہ تھے مگر ان کے نزدیک موصل کو فتح کرنا ہر کام سے زیادہ اہم تھا۔ جب انہیں دمشق کے مضافات میں نصرانیوں کی اس لوٹ مار کی خبر ملی تو ایک مصاحب نے انہیں واپسی کا مشورہ دیا۔ اس پر سلطان نے اٹل لہجے میں کہا:

''وہ ہمارے دیہات اجاڑتے جا رہے ہیں ہم اس کے بدلے ان کے شہروں پر قبضہ کریں گے، اپنے اجڑے ہوئے گاؤں ہم واپس لوٹتے ہی پھر آباد کرلیں گے۔ اس وقت ہم نصرانیوں کے شہروں پر قابض ہونے کی طاقت حاصل کر چکے ہوں گے۔'' سلطان نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا اور موصل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ مؤرخ ابن اثیر سلطان کے مذکورہ الفاظ کو نقل کرنے کے بعد ان کی سیاسی و عسکری بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''پھر وہی ہوا جیسا کہ سلطان نے کہا تھا۔''[۵]

موصل کا محاصرہ: جمعرات 11 رجب 578ھ (10 نومبر 1182ء) کو سلطان صلاح الدین ایوبی

[۵] الکامل فی التاریخ: 294/7

نے فوج کو موصل سے کچھ فاصلے پر ٹھہرایا اور خود مظفر الدین کوکبری، ناصر الدین بن شیر کوہ اور چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر موصل کی فصیل کے پاس جا پہنچے۔ یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے آباد تھا۔ اس کی بلند و بالا فصیل اور برجوں پر مسلح سپاہیوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے، ان کے علاوہ بہت سے تماش بین بھی تھے جو ایوبی لشکر کا نظارہ کرنے چلے آئے تھے۔ قلعے کو دیکھ کر ناصر الدین بن شیر کوہ کے منہ سے نکلا:

''اس شہر پر قبضے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

سلطان نے بھی شہر پناہ کی سنگینی اور سپاہیوں کی کثرت پر ایک نظر ڈال کر محسوس کیا کہ شاید انہیں موصل سے بے نیلِ مرام واپس جانا پڑے۔ انہوں نے مظفر الدین کوکبری اور ناصر الدین شیر کوہ کو ملامت کرتے ہوئے کہا:

''تم دونوں نے مجھے غلط رائے دی اور ایک نا قابلِ حصول چیز کی امید دلائی۔ اگر میں پہلے کسی اور شہر پر چڑھائی کرتا تو فتح کے لیے ہمارا نام ہی کافی ہوتا لیکن اب یہاں محاصرہ کرنے کے بعد جب ناکام واپسی اختیار کرنا پڑے گی تو ہماری عزت مٹی میں مل جائے گی اور ہمارا رعب و داب جاتا رہے گا۔''[1]

جھڑپوں کا آغاز: اگلی صبح سلطان نے لشکر کو فصیل کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے موصل کے فلک بوس برج دیکھ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ سلطان چند امراء کے ساتھ آگے بڑھے اور فصیل کے گرد ایک چکر لگا کر دفاعی انتظامات کا اندازہ لگایا۔ اس کے بعد محاصرے کی ترتیب طے کی اور لشکر کے مختلف ٹکڑوں کو مختلف سمتوں پر مقرر کر دیا۔ تقی الدین عمر کو مشرق میں اور اپنے بھائی تاج الملوک بوری کو باب عمادیہ کی طرف تعینات کیا۔ سلطان خود اپنے خاص دستے کے ساتھ شہر کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ کئی دن تک محاصرہ جاری رہا، دونوں جانب سے تیر انداز نشانہ بازی کے کمال دکھاتے رہے۔ موصل کے حکام نے فوجیوں کو باہر نکلنے سے سختی سے منع کر دیا تھا البتہ شہر کے من چلے لوگ کبھی کبھار باہر نکل آتے اور سلطان کے سپاہیوں کو چھوٹا موٹا نقصان پہنچا کر بھاگ جاتے۔

جب محاصرہ طول پکڑنے لگا تو ایک دن تقی الدین عمر نے منجنیقوں کے ذریعے فصیل منہدم کرنے کا مشورہ دیا۔ سلطان نے کہا:

''ایسے عظیم الشان شہر کو منجنیقوں کا نشانہ بنانا درست نہیں۔ پھر اگر ہم منجنیقیں نصب کر بھی دیں تو حریف ان کو تباہ کر دے گا۔ مانا کہ ہم سنگ باری سے کوئی برج یا دمامہ گرانے میں کامیاب ہو بھی جائیں جس سے شہر میں داخلہ ہو سکے تب بھی اس کارروائی میں کتنے بے قصور لوگ مارے جائیں گے۔''

[1] الکامل فی التاریخ: 295/7

مگر تقی الدین عمر نے اپنی رائے پر اصرار جاری رکھا اور کہا: ''آزما کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟''
سلطان نے اجازت دے دی۔

پھر وہی ہوا جس کا سلطان نے اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ ابھی ایوبی لشکر نے ایک ہی منجنیق لگائی تھی کہ شہر کی فصیل پر یکدم تو منجنیقیں چڑھادی گئیں۔ یہ دیکھ کر ایوبی لشکر نے اپنی منجنیق آزمانے کا خیال ترک کر دیا۔ اب دونوں فریق فصیل کے اندر اور باہر چپ چاپ وقت گزارنے لگے۔ کبھی کبھار موصل کے ان زندہ دل باشندوں کی کوئی حرکت اس خاموشی کو توڑ دیا کرتی تھی جو گروہوں کی صورت میں ایوبی سپاہیوں کو عجیب وغریب ترکیبوں سے تنگ کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے فوج کو عوام پر ہتھیار اٹھانے سے منع کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ موصل کے لوگ اتنے جری نظر آتے تھے کہ سلطان کے افسران تک کی درگت بنا دیتے تھے۔ [1]

ایسے احمقانہ طریقے: ایک دن ایسا ہی ایک لطیفہ پیش آیا۔ شہر سے عوام کا ایک گروہ نکلا اور سلطان کے سپاہیوں کی نظر بچا کر ان کی نصب کردہ واحد منجنیق کو گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ سلطان کے سپاہی اور افسران دوڑتے ہوئے آئے تو آپس میں زبردست ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ سلطان کا قدیم مصاحب اور اعلیٰ فوجی افسر جاولی اسدی یہ ہنگامہ دیکھ کر بھاگا ہوا آیا۔ اتنے میں موصل کے ایک شخص نے اپنے پاؤں سے بڑا جوتا (فل بوٹ) اتار کر پوری طاقت سے اس کے سینے پر پھینک مارا۔ جوتے کے تلے میں میخیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس سے جاولی زخمی ہوگیا۔ وہ سلطان کی خدمت حاضر ہوا اور جوتا ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا:

> ''موصل کے باشندے ایسے احمقانہ طریقوں سے ہم سے لڑ رہے ہیں کہ آج تک ان کی مثال کہیں دیکھی نہ سنی۔''

جوتا کھانے کے بعد جاولی اسدی نے شرم کے مارے اہل موصل سے کبھی نہ لڑنے کی قسم کھالی۔ [2]

مجاہد الدین قائماز کی چال: ایک شب دریائے دجلہ کے کنارے مشعلیں جلتی نظر آئیں، کچھ دیر بعد مشعلیں بجھ گئیں۔ سلطان کے سپاہیوں کو محسوس ہوا کہ دشمن شب خون کے لیے فوج اتار رہا ہے۔ یہ اطلاع سلطان کو دی گئی۔ سلطان نے حکم دیا کہ فوج شہر سے ذرا دور ہٹالی جائے تا کہ دشمن کے لیے شب خون مارنا آسان نہ رہے۔ چنانچہ لشکرِ ایوبی پیچھے ہٹ گیا۔ اصل میں یہ مجاہد الدین قائماز کی چال تھی۔ اس نے کچھ لوگوں کو مشعلیں جلا کر فصیل کے چور دروازے سے نکالا تھا جنہوں نے دریائے دجلہ کے

[1] الکامل فی التاریخ: 7/295

[2] الکامل فی التاریخ: 7/295

کنارے جا کر چند لمحوں تک مشعلیں جلنے دیں اور پھر بجھا دیں۔اس طرح ان کا مقصد سلطان کی فوج کو پیچھے ہٹانا تھا۔وہ اس میں کامیاب رہے۔ [1]

سنجار کی فوج کی چھاپہ مار کارروائیاں: اس دوران سنجار سے عماد الدین کی فوج نے سلطان کی کمک اور رسد پر چھاپہ مار حملے شروع کر دیے تھے۔مجبور ہو کر سلطان نے تقی الدین عمر کو ایک دستہ دے کر ان چھاپہ ماروں کی روک تھام کے لیے روانہ کیا جس نے ایک صبح ارنجان کے مقام پر باقاعدہ صف بندی کر کے سنجاری چھاپہ ماروں کو گھیر لیا اور انہیں شکست دینے کے بعد ان کا ساز و سامان چھین لیا۔ان کے افسران کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ عام سپاہیوں کو پاپیادہ موصل کی طرف بھاگنے کا موقع دیا گیا۔ [2]

سفیر بغداد کی مصالحانہ بھاگ دوڑ: موصل کو فتح کرنا مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں۔اگر ایوبی امراء چند ماہ کے لیے کمر کس لیتے تو شہر والے خوراک کی کمی کا شکار ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے مگر مجاہد الدین قائماز جیسے سیاست دان نے اس کا علاج بھی پہلے سے سوچ رکھا تھا۔اس نے محاصرے سے پہلے خلیفۂ بغداد ناصر لدین اللہ کے دربار میں عرضی روانہ کر دی تھی کہ سلطان صلاح الدین اور ہمارے درمیان صلح کا انتظام کیا جائے۔خلیفہ ناصر نے اس درخواست پر فوری توجہ دیتے ہوئے شیخ الشیوخ صدر الدین کو فریقین میں مصالحت کے لیے روانہ کر دیا تھا۔

وہ محاذ پر پہنچ کر پہلے سلطان سے ملنے آئے۔سلطان نے گرم جوشی سے استقبال کیا اور قریب بٹھایا۔ سلطان کے پاس آذربائی جان کے حاکم قزل ارسلان اور خلاط کے حاکم شاہ ارمن کے سفیر بھی اہل موصل سے صلح کی سفارش کے لیے پہنچ چکے تھے۔خود لشکر کے کئی امراء بھی سلطان کو مصالحت پر آمادہ کرنے کی کوشش شروع کر چکے تھے مگر سلطان کے نزدیک موصل سے ناکام واپسی کا دوسرا مطلب اپنے تمام نئے مقبوضات میں بغاوت کا خطرہ مول لینا تھا۔اس لیے وہ محاصرے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ان کا مایہ ناز جرنیل تقی الدین عمر اب بھی مشرق کی جانب سے فصیل شہر کو سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔مگر اب جبکہ شیخ الشیوخ خلیفۂ بغداد کے مصالحتی سفیر بن کر آ گئے تھے، سلطان کا نرمانا لازمی تھا، جب شیخ الشیوخ نے سلطان سے کہا:

''میں اہل شہر کی سفارش لے کر آیا ہوں، آپ اپنی روش پر اصرار چھوڑ دیجیے تا کہ میں ان لوگوں سے گفت و شنید کر کے ان کا موقف معلوم کروں۔''

تو سلطان نے فوراً جواب دیا:

[1] الکامل فی التاریخ: 295/7

[2] سلسلۃ الانساب [illegible]: 110/1

"میں نے سنا اور مانا۔"

اب شیخ الشیوخ نے موصل کے حکام کے پاس اپنا نمائندہ بھیج کر ان کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگلے روز اہل موصل کے دو سفیر شیخ الشیوخ کو اپنا موقف بتانے ان کے خیمے میں پہنچ گئے۔ شیخ الشیوخ کے کہنے پر سلطان نے اپنے وزراء قاضی فاضل اور فقیہ عیسیٰ الھکاری کو بات چیت کی ساعت کے لیے ان کے پاس بھیج دیا۔

پہلے دن بے سود گفتگو ہوتی رہی اور کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ موصل کے نمائندے یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ کل ہم حتمی موقف لے کے آئیں گے۔ اگلے دن وہ پینترا بدل کر کئی غیر معقول شرائط منوانے کی کوشش کررہے تھے جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ تمام مقبوضہ شہر موصل کے حکام کو واپس کردیے جائیں۔ کئی دن تک اس بات پر بحث ہوتی رہی۔ سلطان کے لیے یہ مطالبہ مان لینا ناممکن تھا مگر جب مذاکرات کی گفتگو یہاں تک آگئی اور شیخ الشیوخ کو سلطان کے بارے میں یہ بدگمانی ہونے لگی کہ وہ مصالحت میں دلچسپی نہیں لے رہے تو سلطان نے ان کی لاج رکھنے کے لیے یہ تلخ گھونٹ بھی بھرلیا۔ تاہم انہوں نے اس مطالبے کو قبول کرنے کی یہ شرط رکھی کہ حلب ان کے حوالے کردیا جائے۔ مگر حکام موصل اس پر راضی نہ ہوئے تب سلطان کی جانب سے مزید نرمی اختیار کرتے ہوئے صرف یہ کہا گیا کہ اہل موصل حلب کی عسکری مدد نہ کرنے کا وعدہ کریں۔ عزالدین مسعود کی جانب سے اس کا جواب بھی نفی میں ملا اور کہا گیا:

"حاکم حلب میرا بھائی ہے، اس سے ہمارا پیمان وفا ہے جسے توڑنا ممکن نہیں۔"

اس طرح مذاکرات میں ایک ماہ گذر گیا۔ آخر یہ صاف نظر آنے لگا کہ موصل کے حکام مذاکرات میں سنجیدہ نہیں اور صرف وقت ضائع کررہے ہیں۔ یہ دیکھ کر سلطان کے دونوں نمائندوں میں سے پہلے قاضی فاضل اور پھر فقیہ عیسیٰ الھکاری نے مذاکرات میں شرکت ترک کردی۔ اب صرف شیخ الشیوخ اور موصل کے نمائندے گفت وشنید کررہے تھے۔ موصل کے نمائندوں نے مجلس میں سلطان کے نمائندوں کی عدم موجودگی سے مزید فائدہ اٹھایا اور اردگرد کے حکام میں مشہور کردیا کہ ہم تو اتفاق چاہتے ہیں مگر سلطان ایوبی کی طرف سے انکار ہے۔ اس طرح اہل موصل نے دوسرے حکام کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی۔

اس طویل بحث میں ایک موقع پر شیخ الشیوخ کے اصرار اور دلائل کے سامنے موصل کے نمائندے کمزور پڑ گئے اور انہوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ سلطان کی عسکری مہمات میں معاون بنیں گے اور حلب سلطان کے حوالے کردیا جائے گا بشرطیکہ سلطان ان کے دیگر مقبوضات واپس کردے مگر پھر وہ اپنی اس

۱۔ سلطان الناصر: 1/107۔108

بات پر بھی قائم نہ رہے اور کچھ نئے مطالبات رکھ دیے۔ جب نمائندوں کے ذریعے گفتگو بے کار ثابت ہوئی تو شیخ الشیوخ نے خود موصل کے حاکم عزالدین مسعود اور وزیر قایماز کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ جب وہ دربار موصل میں پہنچے تو حکام موصل کا موقف بالکل بدلا ہوا پایا۔ وہ اپنے نمائندوں کی گفتگو اور موقف سے لاتعلقی ظاہر کررہے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

''اگر سلطان ہم سے اتحاد کا خواہش مند ہے تو موصل سے کوچ کر جائے اور ہمارے تمام علاقے لوٹادے، تب ہم حلب پر اس کی فوج کشی سے غیر جانبدار رہیں گے۔ وہ ہم سے یہ امید ہرگز نہ رکھے کہ ہم حلب کے خلاف اس کی مدد کریں گے کیوں کہ حاکم حلب عمادالدین ہمارا بھائی اور حلیف ہے، اس کے خلاف ہم کسی کی مدد نہیں کرسکتے۔ اگر سلطان کو یہ منظور ہے تو ٹھیک۔ ورنہ اب تک کا سب کہا سنا کالعدم۔''

ظاہر کہ یہ موقف سفیروں سے طے کردہ اس بات کے بالکل خلاف تھا جس میں حلب سلطان کے حوالے کرنے اور جنگی مہمات میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔[1]

شیخ الشیوخ کی مایوسی اور سلطان کی واپسی ٭ مایوس کن صورتحال دیکھ کر شیخ الشیوخ نے موصل میں چوبیس گھنٹے گزارنے کے بعد وہیں سے سیدھے بغداد جانے کی تیاری کرلی۔ وہ اتنے دلبرداشتہ تھے کہ سلطان صلاح الدین سے ملنے سے کترا رہے تھے اور اپنے طور صلح کے معاملات سے دامن جھٹک چکے تھے۔ اب حکام موصل کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کررہے ہیں۔ باعزت صلح نہ ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایوبی لشکر بزور شمشیر شہر پر قابض ہوجائے۔ چنانچہ امرائے موصل شیخ کے سامنے گڑگڑا کر کہنے لگے:

''حضرت! آپ سلطان کے پاس تشریف لے جاکر انہیں ہماری معروضات سے آگاہ فرما دیجیے، شاید سلطان کی ناراضگی دور ہو اور وہ کوئی سہل راستہ اختیار کریں۔''

شیخ نے سلطان کے پاس آکر سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ بے سود سفارت کاری ترک کرکے بغداد واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سلطان نے کہا:

''آپ کی تشریف آوری کے اعزاز میں ہم موصل کی مہم ترک کرتے ہیں، ویسے بھی یہ شعبان و رمضان کے بابرکت مہینے ہیں۔ سو ہم واپسی کا ارادہ کرچکے۔'' شیخ یہ سن کر مطمئن ہوگئے۔[2]

11 شعبان 578ھ (9 دسمبر 1182ء) کو سلطان نے موصل کا محاصرہ اٹھادیا۔[3] وہ تو پہلے ہی یہ

[1] البرق الشامی:5/39_40، سنا البرق الشامی:1/109_110
[2] البرق الشامی:5/39_40، سنا البرق الشامی:1/109_110
[3] سنا البرق الشامی:1/109_110

رائے رکھتے تھے کہ موصل کا محاصرہ نہ کیا جائے کہ یہ مہم مہنگی پڑ سکتی ہے۔ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ موصل کو فتح کرنے کے لیے کھلے وقت، مزید طاقت اور خطیر سرمائے کی ضرورت تھی۔

قاضی بہاؤ الدین شداد جو بعد میں سلطان ایوبی کے مشیر اور سفیر بنے، ان ایام میں موصل میں درس وتدریس کے حوالے سے ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی یادداشتوں میں سلطان کی اس مہم کا حال یوں لکھا ہے:

''سلطان صلاح الدین ایوبی نے جمعرات گیارہ رجب 578ہجری کو موصل کے قریب پڑاؤ ڈالا۔میں اس وقت موصل میں تھا۔محاصرے سے چند دن قبل (حاکم موصل عز الدین مسعود کی طرف سے) مجھے بغداد روانہ کر دیا گیا تھا۔میں دریائے دجلہ میں سفر کرتا ہوا تیز رفتاری سے گیا اور دو دنوں اور تیسرے دن کے دو گھنٹوں میں بغداد پہنچ گیا تاکہ خلیفہ سے مدد لوں مگر اتنا ہی ہوا کہ مجھے شیخ الشیوخ کو ساتھ لے جانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ان کے ساتھ حکام موصل کی جانب سے ایک سفیر بھی تھا۔انہیں حکم دیا گیا کہ سلطان ایوبی سے بات کریں اور اصلاح احوال کریں۔ موصل کے والی نے (آذربائیجان کے حاکم) بہلوان کے پاس سفیر بھیج کر اس سے بھی مدد طلب کی مگر اس نے شرط رکھی کہ حاکم موصل اس کا ماتحت ہو جائے۔یہ شرط منظور کرنا سلطان ایوبی سے جنگ کرنے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔سلطان نے کچھ دنوں تک محاصرہ جاری رکھا۔پھر جان لیا کہ اس طرح محاصرے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ یہ بہت بڑا شہر ہے۔اس کی فتح کا طریقہ یہ ہے کہ اردگرد کے قلعوں اور شہروں پر قبضہ کرلیا جائے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ اہل موصل کو کمزور کیا جائے۔چنانچہ سلطان نے موصل سے کوچ کر دیا۔''[1]

---

[1] النوادر السلطانیۃ، ص:102

فصل:2

ریجی نالڈ کا حجازِ مقدس پر حملہ

سلطان صلاح الدین ایوبی کا رخ اب سنجار کی طرف تھا۔ اب تک الجزیرہ کے جتنے بھی شہر سلطان کے قبضے میں آئے تھے ان میں سے الرہا کے سوا کسی کا قلعہ مستحکم نہ تھا۔ اگر سنجار فتح نہ ہوتا تو سلطان کے واپس جاتے ہی یہ تمام نو مفتوحہ علاقے دوبارہ اہلِ موصل کے قبضے میں چلے جاتے۔ پھر یہ شہر ایوبی لشکر کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو رہا تھا۔ موصل کے محاصرے کے دنوں میں سنجار کی فوج ان کی کمک و رسد پر چھاپے مارتی رہی تھی جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سنجار کی اس مہم میں دربارِ خلافت کے سفیر بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔[1]

ادھر موصل میں مجاہد الدین قائماز نے سنجار کی طرف سلطان کی پیش قدمی کا سنتے ہی ایک فوج اہلِ سنجار کی مدد کے لیے روانہ کر دی مگر سلطان صلاح الدین کو پتہ چل گیا، انہوں نے اس امدادی فوج کو راستے میں روک کر اسلحہ اور سواریاں چھین لیں۔[2]

سنجار مسخر ہو گیا: 16 شعبان 578ھ (14 دسمبر 1182ء) کو ایوبی لشکر سنجار کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہ شہر موصل کی طرح مضبوط دفاعی انتظامات رکھتا تھا نہ یہاں عز الدین مسعود اور قائماز جیسے زیرک سیاستدان تھے۔ یہاں کا حاکم ایک کم ہمت امیر شرف الدین بن قطب الدین تھا جسے زیر کرنا کوئی خاص مشکل نہیں تھا۔ سنجار کے قریب میٹھے پانی کے کئی چشمے تھے، سلطان نے ان کے پاس پڑاؤ ڈال کر شرف الدین کو قاصد اور پیام کے ذریعے اطاعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ لڑائی پر بضد تھا۔

سلطان نے منجنیقیں نصب کرا کے شہر پر حملہ شروع کر دیا، کئی دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ ماہِ رمضان شروع ہوا تو سلطان نے لڑائی روکنے کا حکم دیا، تاہم ان کے سپاہی اپنی حفاظت کا پورا پورا بندوبست کرتے رہے، ان کے دستے شہر کی فصیل کے گرد چکر لگاتے رہتے۔ سلطان خود روزانہ فصیل کی طرف

[1] سلطان صلاح الدین: 110/1

[2] الکامل فی التاریخ: 7/286

نکلتے تاکہ حریف پر رعب برقرار رہے۔

ایک رات مخبر نے سلطان کو اطلاع دی کہ فصیل کے ایک گوشے کے پہرے دار غافل ہیں۔ سلطان نے فوراً اپنے بہترین سپاہی ادھر بھیج دیے جنہوں نے فصیل پر چڑھ کر پہرے داروں کو بے خبری کے عالم میں گرفتار کرلیا۔ علامہ ابن اثیر کے بیان کے مطابق ایوبی سپاہ کی اس کامیاب کارروائی میں سنجار کے ایک کرد امیر کا بڑا ہاتھ تھا جس نے خفیہ طور پر سلطان سے ساز باز کرلی تھی۔ [1]

بیرونی فصیل پر قبضے کے باوجود حاکم سنجار شرف الدین چاہتا تو لڑسکتا تھا کیوں کہ اندرونی فصیل اور قلعہ بالکل محفوظ تھے مگر شرف الدین ایسا گھبرایا کہ اسی وقت ہتھیار ڈال دیے۔ سلطان نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ اس کے مال ودولت اور متعلقین کو کوئی گزند نہ پہنچائی۔ شرف الدین اپنے کنبے، خادموں اور سازوسامان کے ساتھ موصل کی طرف نکل گیا، شہر فتح ہونے پر مقامی رؤساء سلطان کے استقبال کے لیے آئے تو سلطان نے ان سے بھی فراخدلانہ برتاؤ کیا اور تمام ٹیکس معاف کردیے۔ یہاں دمشق کے سابق امیر معین الدین انر کے بیٹے سعد الدین کو حاکم مقرر کیا جو ایک نہایت باصلاحیت اور شریف انسان تھا۔

سنجار کی فتح سے الجزیرہ پر سلطان کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ اب سنجار اور الرھا کے ذریعے سلطان کی افواج مفتوحہ علاقوں کو ایک آہنی حلقے میں لے کر دشمن سے مکمل طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہوگئیں تھیں۔ [2]

<u>ریجی نالڈ کی سازش</u>: اِدھر سلطان صلاح الدین عراق اور الجزیرہ کی مہمات میں مشغول تھے اور اُدھر کرک کا شیطان ریجی نالڈ (ارناط برنس) ایک بار پھر مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تیاریاں کررہا تھا۔ اب اسے فرخ شاہ کا خطرہ بھی نہیں تھا جو ہمیشہ اس کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

ریجی نالڈ نے موآب کے جنگلات سے بڑے پیمانے پر لکڑی کاٹ کر ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کیا۔ کرک کے جہاز سازی کے کارخانوں میں کئی جہاز ٹکڑوں کی شکل میں تیار کیے گئے۔ پھر راتوں رات ان ٹکڑوں کو بار برداری کے جانوروں کے ذریعے ایلہ کے ساحل تک پہنچا دیا گیا۔ یہاں ٹکڑوں کو جوڑ کر جہاز بنائے گئے اور بیڑہ بحیرۂ احمر میں اتار دیا گیا۔ اس بحری فوج کا ایک حصہ ایلہ کے قلعے پر حملہ آور ہوا جو سمندر کے بیچوں بیچ ایک جزیرے پر واقع تھا۔ کچھ مدت قبل سلطان نے اس پر قبضہ کیا تھا جس سے ریجی نالڈ کی نیند حرام ہوگئی تھی چنانچہ اس نے ہر قیمت پر اسے مسلمانوں سے چھیننے کا عزم کر رکھا تھا۔ ریجی نالڈ کی فوج کے ایک دستے نے ایلہ کا اس سختی سے محاصرہ کیا کہ اہل قلعہ کا باہر کی دنیا سے رابطہ بالکل ختم ہوگیا یہاں تک کہ ان کے لیے پانی کی فراہمی کی راہ بھی مسدود ہوگئی۔

[1] الکامل فی التاریخ: 290/7   [2] الکامل فی التاریخ: 7/ ...

اُدھر دوسرے دستے نے عیذاب کی بندرگاہ پر حملہ کیا جو بحیرۂ احمر کے افریقی ساحل ''نوبہ'' پر مکہ معظمہ کے بالمقابل واقع ہے۔ یہاں انہوں نے بے انتہا لوٹ مار کی، بستیوں کو اجاڑا، تجارتی قافلے لوٹے اور پورے علاقے کو تاراج کر ڈالا۔ نوبہ کی بندرگاہ اس لحاظ سے نہایت محفوظ تصور کی جاتی تھی کہ یہاں کبھی فرنگیوں کا کوئی جہاز نہیں پہنچ سکا تھا۔ چنانچہ علاقے کے لوگ ریجی نالڈ کے حملے کے وقت اپنی حفاظت سے بے فکر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بندرگاہ کے تمام بحری جہازوں پر فرنگیوں نے قبضہ کر کے انہیں اپنے ساتھ لے لیا۔

ایلہ کے محاصرے اور عیذاب کی بندرگاہ لوٹنے [illegible] فرنگیوں کو پشت سے کسی حملہ کا خطرہ نہیں رہا تھا چنانچہ وہ بے خوف ہو کر حجازِ مقدس کی طرف روانہ ہوئے تاکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کریں۔ وہ یہ بھی طے کر چکے تھے کہ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کے بعد جنوب کی طرف یلغار کرتے ہوئے یمن پر بھی قابض ہو جائیں گے اور یوں پورے بحیرۂ احمر پر ان کا تسلط ہو جائے گا۔ یہ شوال 578ھ (فروری 1183ء) کا واقعہ ہے۔ اس وقت سلطان صلاح الدین سنجار کی فتح کے بعد حران میں قیام پذیر تھے لہٰذا فرنگیوں کو سینکڑوں میل دور بیٹھے سلطان کی جانب سے بھی کوئی تشویش نہیں تھی۔ [1]

حسام الدین لولؤ کا شاندار کارنامہ: مگر اس موقع پر سلطان کے بھائی الملک العادل نے جو مصر میں ان کا نائب تھا، حیرت انگیز مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ''ایلہ'' پر فرنگیوں کے حملے کی ابتدائی اطلاع کے ساتھ ہی امیر البحر حسام الدین لولؤ کو ایک نیا مضبوط بحری بیڑا دے کر ریجی نالڈ کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ حسام الدین لولؤ سلطان کی بحری فوج کا مایہ ناز افسر تھا جس کی جرأت اور عسکری مہارت کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ اس نے نہایت سرعت سے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے اپنی فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصے کے ساتھ وہ ایلہ کے قلعے کا محاصرہ کرنے والی عیسائی فوج پر حملہ آور ہوا۔ حافظ ابن کثیر کے بقول یہ حملہ ایسا تھا جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہو۔ ریجی نالڈ کے بیشتر آدمی مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہو گئے۔ اس دوران اسلامی فوج کا دوسرا حصہ عیذاب کی بندرگاہ پر جا پہنچا تھا مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عیسائی بندرگاہ کو لوٹ کر مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ صورتحال بے حد نازک تھی۔ ایامِ حج شروع ہو چکے تھے اور حجاج کے قافلے مکہ معظمہ میں جمع ہونے لگے تھے، بہت سے قافلے بحیرۂ احمر میں اور ساحلی پٹی پر سفر کر رہے تھے۔ اگر فرنگیوں کا لشکر مکہ معظمہ پہنچ جاتا تو بڑی ہولناک صورتحال درپیش ہو سکتی تھی۔

حسام الدین لولؤ نے بڑی برق رفتاری سے حجاز کی طرف سفر شروع کیا اور آخر کار فرنگیوں کو مقاماتِ مقدسہ تک پہنچنے سے پہلے جا لیا۔ رابغ کے قریب حوراء کے مقام پر جہاں سے حجاز کی ساحلی پٹی کا آغاز

[1] البدایۃ والنہایۃ: 7/297_298

ہوتا ہے، حسام الدین نے ریجی نالڈ کے بیڑے کو سمندر کی سمت سے گھیر لیا۔ بیرۂ احمر کی پرسکون لہروں میں ایک خون ریز جنگ نے تلاطم پیدا کر دیا، حسام الدین نے پے در پے حملے کر کے ان سے لوٹا ہوا مال اور تمام مسلمان قیدی چھین لیے۔ فرنگی ساحل کی طرف پسپا ہوتے رہے، آخر انہیں ریگستانی ساحل پر اترنا پڑا۔ وہ تیزی سے پہاڑی گھاٹیوں کی پناہ لینے لگے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح صحرا کی وسعتوں میں خود کو چھپالیں اور پھر شمال کی طرف بڑھتے ہوئے شام پہنچ جائیں، ریجی نالڈ خود تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کے ساتھیوں کی خاصی تعداد صحرا میں پھنس کر رہ گئی۔ لولو نے ساحل پر اترتے ہی ان کے تعاقب کے لیے مقامی بدوؤں سے مدد لی جو ریگزار کے بھیدی تھے۔ انہوں نے بخوشی اپنے گھوڑے بھی فوج کے حوالے کر دیے۔ حسام الدین لولو نے چٹیل پہاڑوں میں پانچ دن تک نصرانیوں کا پیچھا کیا اور آخر کار انہیں ایک تنگ گھاٹی میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا جہاں دانے پانی کا نام ونشان تک نہ تھا۔

آخر محصور فرنگیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ حسام الدین لولو ایک سو ستر (170) قیدیوں کو اپنے ساتھ قاہرہ لے گیا۔ الملک العادل نے سلطان کو فتح کی خوشخبری دے کر قیدیوں کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ سلطان نے جواب میں الملک العادل کو دو خطوط بھیجے جن میں سے ایک میں لولو کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

''ہمیں اس کے جہاد کے ثواب پر رشک آتا ہے، اس کی جدوجہد کامیاب ہوئی، اس نے خشکی اور سمندر دونوں میں جہاد کیا، خوش قسمت ہے اس گھوڑے کی لگام بھی جو اس جہاد میں استعمال ہوئی اور کیا خوب ہے وہ مال جو اس جہاد میں خرچ ہوا۔''

پھر آگے تحریر کرتے ہیں:

''خدانخواستہ اگر دشمنوں کا یہ وار کارگر ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارا کوئی عذر قبول نہ ہوتا اور مشرق و مغرب میں ہمارے خلاف مذمت کا شور مچ جاتا۔ ارض حجاز کو کفار کی ناپاکی سے اور فضائے حرمین کو ان کے سانسوں سے اس طرح پاک کرنا لازمی ہے کہ ان کا کوئی جاسوس بھی زندہ لوٹ کر نہ جانے پائے جو کفار کو مسلمانوں کی کمزوریوں سے آگاہ کر سکے۔''

چونکہ سرزمین حجاز پر قبضے کی ناپاک جسارت ہرگز قابل معافی نہیں تھی اس لیے سلطان نے الملک العادل کو دوسرے خط میں قیدیوں کے بارے میں لکھا:

''ان قیدیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ اٹل ہے، شریعت میں انہیں زندہ چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ رکھنے میں کوئی مصلحت نہیں۔ اس سے چشم پوشی اور درگزر کا خدا کی بارگاہ میں کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے معاملات میں اللہ کا فیصلہ کیا ہے؟ یہ

اہل علم کے نزدیک ذرا بھی مبہم یا مجہول نہیں۔ انہیں قتل کرنے کے عزم کو پورا کرو تا کہ ایسے دوسرے بدبخت اپنے ارادوں سے باز رہیں۔"

الملک العادل نے سلطان کی حکم کے مطابق اکثر قیدیوں کو قاہرہ ہی میں قتل کرا دیا۔ البتہ کچھ قیدیوں کو اس سے قبل قربانی کے جانوروں کی طرح ہانک کر مکہ معظمہ بھیج دیا گیا تھا، وہاں انہیں منیٰ کے میدان میں 10 ذی الحجہ کو حاجیوں کی موجودگی میں عین اسی وقت ذبح کرایا گیا جب حجاج کرام قربانیاں کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حاجیوں کے دل سے وہ دہشت دور ہو جائے جو فرنگیوں کی حجاز پر یلغار سے پیدا ہوگئی تھی۔ نیز مقامات مقدسہ کی طرف بری نگاہ ڈالنے والے دشمنوں کو بھی اس انجام سے عبرت حاصل ہو۔

حسام الدین لؤلؤ کے اس کارنامے پر اسلامی شعراء نے اسے بڑھ چڑھ کر خراج تحسین پیش کیا۔ ابوالحسن بن الزروی نے کہا:[1]

قُلْتُ بَعْدَ التَّكْبِيْرِ لَمَّا تُبَدِّى ... هٰكَذَا هٰكَذَا يَكُوْنُ الْجِهَادُ

"میں نے اس واقعے کے ظہور پر تکبیر کا نعرہ پڑھتے ہوئے کہا۔ جہاد تو یوں ہوتا ہے، یوں ہی ہوا کرتا ہے۔"

حَبَّذَا لُؤْلُؤٌ يَصِيْدُ الْأَعَادِي ... وَسِوَاهُ مِنَ اللَّآلِيْ يُصَادُ

"یہ موتی کیا خوب ہے جو دشمنوں کا شکار کرتا ہے ورنہ دوسرے موتی تو خود شکار کیے جاتے۔"

(لؤلؤ کا معنی موتی ہے اس لیے شعر میں اس لفظ کی رعایت سے نزاکت پیدا کی گئی ہے)

ابن جبیر کا چشم دید بیان ٭ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ریجی نالڈ کے شکست خوردہ سپاہیوں کو گرفتار کر کے مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پہنچایا گیا تو ان دنوں مشہور سیاح ابن جبیر الاندلسی وہاں موجود تھے۔ وہ اپنے اس ناقابل فراموش سفر کا آغاز کر چکے تھے جو مراکش، شمالی افریقہ، مصر، یمن، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد، شام اور جزیرہ نما صقلیہ (سسلی) تک پھیلا ہوا تھا جس کی تفصیل ان کے سفرنامے "رحلۃ ابن جبیر" میں ملتی ہے جو دنیا کے چند بہترین سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اپنے اس سفرنامے میں جب وہ اسکندریہ میں داخلے کا ذکر کرتے ہیں تو ریجی نالڈ کے حملے کا ذکر تفصیل سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب ہم اسی مہینے (محرم 579ھ میں) اسکندریہ پہنچے تو سب سے پہلے ہم نے لوگوں کا ایک عظیم مجمع دیکھا۔ یہ لوگ فرنگی قیدیوں کا تماشا دیکھنے نکلے تھے جنہیں اونٹوں پر اس طرح بٹھایا گیا تھا کہ ان کے منہ اونٹوں کی دموں کی جانب تھے۔ ان کے اردگرد ڈھول پیٹے جا رہے تھے، بگل بج رہے تھے، ہم نے قصہ دریافت کیا تو ہمیں جو کچھ بتایا گیا اس سے تشویش و اضطراب کے مارے

[1] کتاب الروضتین: 3/134_139، الکامل فی التاریخ: 7/298

جگر پھٹنے لگا۔ ہوا یوں کہ شام کے نصرانیوں کی ایک جماعت جمع ہوئی اور انہوں نے بحر قلزم (بحیرہ احمر) کے قریب ترین علاقے (کرک) میں کشتیاں تیار کیں۔ پھر پڑوس میں بسنے والے ان بدو شتر بانوں کو جوان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، کرایہ طے کر کے یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ کشتیوں کے یہ ٹکڑے اونٹوں پر لاد کر ساحل تک پہنچا دیں۔ جب وہ سمندر تک پہنچ گئے تو اپنی کشتیوں کو تیار کر کے جوڑ جاڑ کے سمندر میں روانہ ہو گئے اور حاجیوں کو لوٹنے لگے۔ پھر وہ بحر نعم پہنچے اور 16 کشتیاں جلا دیں۔ پھر عیذاب پہنچے اور ایک کشتی پر قبضہ کر لیا جو جدہ سے حاجیوں کو لا رہی تھی۔ اس طرح انہوں نے خشکی پر اتر کر ایک بڑے قافلے کو لوٹا جو قوص سے عیذاب آ رہا تھا۔ ان سب اہل قافلہ کو قتل کر دیا۔ کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پھر یمن کے تاجروں کو لانے والی دو کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور ساحل (عیذاب) پر مکہ اور مدینہ (اللہ ان کی عزت برقرار رکھے) کے لیے جمع شدہ بہت سا اناج جلا ڈالا۔ ان فرنگیوں نے ایسے ایسے مظالم کیے کہ اس سے قبل اسلام کی تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ نہ اس سے پہلے کبھی کوئی فرنگی ان علاقوں تک پہنچا تھا۔ ان سب سانحوں سے بڑھ کر وہ سانحہ جو کانوں کو مذمت اور قباحت سے بھر دیتا ہے یہ ہے کہ یہ فرنگی مدینۃ الرسول اللہ J میں داخل ہونے اور جسد اطہر کو نکال کر لے جانے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس ارادے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اس بات کا ذکر ان کی زبانوں پر عام ہو چکا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی گستاخی اور کارستانی پر ایسی گرفت کی کہ اس کی عطا کردہ شان مرتبت، حضور J اور ان فرنگیوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ حالانکہ مدینہ منورہ اور ان فرنگیوں کے درمیان صرف ایک دن کی مسافت رہ گئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے مصر میں ترتیب دیے گئے بحری بیڑے کے ذریعے ان کی بدمعاشی کو روک دیا۔ حاجب جو کہ لولو کے نام سے مشہور ہے، مراکش کے بہترین جہاز رانوں کے ساتھ آن پہنچا اور دشمن کو ایسے وقت میں آ پکڑا جب وہ اپنے عزم میں کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ خداوند جبار کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کیونکہ مصر کے سپاہیوں نے ان فرنگیوں کو خاصی تاخیر سے پکڑا تھا کہ (ان نصرانیوں کو لوٹ مار کرتے ہوئے) اس دوران تقریباً ڈیڑھ ماہ یا اس کے لگ بھگ وقت گزر گیا تھا۔ ان سب فرنگیوں کو قتل کرا دیا گیا یا وہ گرفتار کر لیے گئے۔ قیدیوں کو مختلف شہروں میں تقسیم کر دیا گیا تا کہ انہیں وہاں قتل کیا جائے۔ ان میں سے کچھ مکہ معظمہ اور کچھ مدینہ منورہ میں بھی بھیجے گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو ایک بہت بڑے حادثے سے بچانے میں بخوبی کافی ہو گیا۔ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔""

" رحلۃ ابن جبیر:1/57۔58

فصل:3

حلب کی فتح

سنجار کی فتح کے بعد سلطان نے اپنے مصاحبین سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں مشورہ کیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ موصل پر فی الحال قبضہ بہت مشکل ہے اس لیے کم از کم حلب پر قبضہ کرنا ضروری تھا تاکہ سلطان کی یہ مہم کسی درجے میں نتیجہ خیز شمار ہوتی مگر اب سخت سردیاں شروع ہونے والی تھیں، ایسے میں تھکی ماندی فوج کو مزید مہمات میں جھونکنا مناسب نہیں تھا۔ تجربہ کار امراء نے مشورہ دیا کہ موسم سرما میں کسی محفوظ علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا جائے اور بہار میں اگلی مہمات شروع کی جائیں۔ اب تک بغداد کے معزز سفیر شیخ الشیوخ سلطان کے ہمراہ تھے، سلطان نے انہیں حالیہ مہمات اور اہل موصل کی بدعہدی و مکاری کے حالات پر مشتمل ایک تفصیلی مکتوب دے کر قیمتی تحائف کے ساتھ خلیفہ کی خدمت میں واپس روانہ کر دیا اور خود حران کی طرف بڑھے جو مظفر الدین کوکبری کا علاقہ تھا۔ موسم سرما گزارنے کے لیے اس سے زیادہ محفوظ مقام کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ راستے میں نصیبین سے گزرتے ہوئے انہیں وہاں اپنے مقرر کردہ والی ابوالہیجاء السمین کی بدعنوانیوں کا علم ہوا تو اسے فوراً معزول کر کے ایک دوسرے عامل کو مقرر کیا۔ [1]

ماہ ذی قعدہ کے آغاز (مارچ 1182ء) میں سلطان نے حران پہنچ کر شہر کے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔ کچھ دن بعد انہوں نے افواج کو استراحت کے لیے چھاؤنیوں میں چلے جانے کی اجازت دے دی اور خود ایک محافظ دستے اور چند مصاحبین کے ساتھ وہیں ٹھہر گئے۔ [2]

سلطان کے مخالفین کا باہم گٹھ جوڑ اور متحدہ لشکر کشی ❋ سلطان اپنے طور پر کئی ماہ تک کسی جگہ جدل سے یکسو ہو چکے تھے تاہم انہیں معلوم تھا کہ ان کے حریف اب بھی ان کے خلاف تلوار رہا رہے کر رہے ہیں۔ عزالدین مسعود کے بعد اب خلاط کا حاکم شاہ ارمن بھی سلطان کے سخت ترین مخالفین میں

---

[1] مفرج الکروب: 1/111_112

[2] الکامل فی التاریخ: 7/296؛ مفرج الکروب: 1/11

شامل ہو گیا تھا۔ موصل کے محاصرے کے دوران عزالدین مسعود نے شاہ ارمن کو اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ شاہ ارمن نے پہلے موصل اور پھر سنجار کے محاصرے کے دوران سلطان صلاح الدین کو ان مہم جوئیوں سے باز رہنے کی تاکید کی تھی اور اس کے سفیر نے آخر میں سلطان کو سنگین نتائج کی دھمکی تھی۔ اگرچہ سلطان صلاح الدین نے شاہ ارمن کے سفیر کی غیر معمولی خاطر مدارات کی تھی مگر یہ سفیر بڑا نک چڑھا تھا، اس نے سلطان کی خلعت اور تحائف کو ٹھکرا دیا تھا اور اپنے آقا کی سفارش قبول نہ کیے جانے پر غصے میں بھرا واپس لوٹا تھا۔ اس کے بھڑکانے سے شاہ ارمن نے سلطان کے خلاف فوج کشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلطان کے سنجار فتح کرتے ہی وہ خلاط سے ایک لشکر لے کر چل پڑا تھا۔ راستے میں ماردین، بدلیس اور ارزن کے وہ حکمران جو سلطان کی فتوحات سے خوفزدہ تھے اپنی اپنی فوجوں کو لے کر اس کے ساتھ ملتے گئے اور یہ ایک بہت بڑا لشکر بن گیا۔

عزالدین مسعود جو شروع سے شاہ ارمن کی مہم سے نہ صرف باخبر بلکہ اس ساری متحدہ فوج کشی کا اصل محرک تھا، اپنی فوج کے ساتھ پہلے ہی تیار تھا۔ اس کے آنے سے یہ فوج مزید مضبوط ہو گئی۔ اب یہ متحدہ افواج ایک آندھی کی طرح سلطان صلاح الدین سے لڑنے روانہ ہوئیں۔ آگے حلب کی فوج بھی ان سے آملی۔

سلطان صلاح الدین کو اتحادیوں کی پیش قدمی کی اطلاع ایسے وقت میں ملی جب وہ اپنی افواج کو چھاؤنیوں میں واپس بھیج چکے تھے۔ اب ان کے پاس صرف منتخب سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔ شدید سردی پڑ رہی تھی، پھر ماہ ذی الحجہ شروع ہو چکا تھا اور عیدالاضحیٰ سر پر تھی۔ ایسے میں یہ ناگہانی یلغار ایک عجیب امتحان بن کر سامنے آئی۔ سلطان نے فوراً تیز رفتار قاصد حماۃ بھیج کر تقی الدین عمر کو حکم دیا کہ وہ جلد از جلد اپنی فوج لے کر ان کی مدد کو پہنچے۔ تقی الدین عمر پیغام ملتے ہی بجلی کی طرح حران کی طرف لپکا، پانچویں دن وہ اپنی فوج کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر تھا اور کہہ رہا تھا:

''سلطان عالی وقار! اٹھیے اور ان اتحادیوں کی طرف بڑھیے۔''

سلطان صلاح الدین خود بھی آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے مگر ان کے کئی امراء انہیں دشمن کی غیر معمولی کثرت کے باعث جنگ سے گریز کرنے اور صلح پر غور کرنے کا مشورہ دے رہے تھے اس لیے سلطان نے تقی الدین عمر کے سامنے استفسار کے طور پر یہ پہلو بھی پیش کر دیا تھا اور کہا:

''حریف کی تعداد خاصی زیادہ ہے اور پھر یہ ذی الحجہ کا پہلا عشرہ ہے، اس میں جنگ سے دامن بچا لیا جائے تو کیا حرج ہے؟''[1]

---

[1] سنا البرق الشامی: 114/1

مگر تقی الدین عمر کا اصرار بڑھتا گیا، غالباً خود سلطان کی ذاتی رائے بھی یہی تھی جسے تقی الدین عمر نے بھانپ لیا تھا۔ آخر سلطان نے عید الاضحیٰ کے فوراً بعد اس تھوڑی سی فوج کے ساتھ حریف کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ حریف نے حرزم کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے تھے۔ یہ حاکم ماردین قطب الدین کا علاقہ تھا جہاں ایک مضبوط قلعہ بھی تھا۔ اتحادی سمجھ رہے تھے کہ سلطان کو ان کے اجتماع سے خوفزدہ ہو کر پسپائی اختیار کرنا پڑے گی مگر سلطان کی پیش قدمی کی خبر سن کر وہ دم بخود رہ گئے۔ ان کے قدم شل ہونے لگے۔ سب سے پہلے ارمن شاہ یہ کہہ کر خلاط واپس ہولیا کہ میں مزید فوج جمع کر کے لا رہا ہوں، پھر عز الدین مسعود کی ہمت بھی ٹوٹ گئی اور وہ موصل لوٹ گیا۔ کھیل کے اصل دو کرداروں کے غائب ہوتے ہی اتحادی لشکر کے ہر گروہ نے اپنی اپنی راہ لی۔ [1]

سلطان صلاح الدین ابھی راستے میں تھے کہ انہیں اتحادیوں کے بکھرنے کی خوشخبری ملی۔ عز الدین مسعود دریا کے پار اتر چکا تھا۔ ارمن شاہ خلاط کو سب سے بہتر پناہ گاہ سمجھ کر واپس جا چکا تھا۔ سلطان کے کاتب عماد اصفہانی نے اتحادیوں کی اس بزدلی پر طنز کرتے ہوئے کہا:

”ہم نے آندھی بن کر انہیں ریت کی طرح اڑا دیا جب کہ وہ خود کو پہاڑ تصور کرتے تھے۔ جب وہ آئے تو مرد معلوم ہوتے تھے مگر لوٹے تو ان کے دل عورتوں کی طرح لرز رہے تھے۔“ [2]

سلطان کی اتحادیوں کے قلعوں پر یلغار ❋ اتحادیوں کے فرار کے باوجود سلطان ایوبی نے مخالفین پر نفسیاتی دباؤ بڑھانے کے لیے حرزم کے میدان تک یلغار کی اور حاکم ماردین کے قلعے کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ حاکم ماردین قطب الدین جو کل تک میدان میں صف بندی کر رہا تھا، اب قلعے کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔ قلعے سے کچھ فاصلے پر اس کا نہایت خوشنما محل تھا جو اب خالی رہ گیا تھا۔ اس کے فلک بوس برج اور مینار مرعوب کن معلوم ہوتے تھے۔ عمارت پر نقاشی اور خطاطی کا خوبصورت کام کیا گیا تھا، اندرونی حصے میں بکثرت باغات اور نہریں تھیں۔ سرسبز درختوں کی شاخوں پر خوبصورت پرندے پھدکتے نظر آتے تھے۔ سلطان کے بھائی تاج الملوک بوری نے اس محل کو خالی دیکھ کر کچھ دن کے لیے یہاں رہائش اختیار کر لی۔ [3]

آمد کا محاصرہ ❋ سلطان نے حرزم کے میدان میں چند دن تک ٹھہرنے کے بعد اتحادیوں کے علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس مہم کا پہلا نشانہ آمد کی ریاست بنی جس کا حاکم

[1] الکامل فی التاریخ: 7/297، کتاب الروضتین: 3/142_143
[2] البرق الشامی: 5/83
[3] البرق الشامی: 5/83

مسعود ابن نیسان بھی ان اتحادیوں میں شامل تھا جو حرزم میں سلطان کے خلاف جمع ہوئے تھے۔ مگر اس سے قبل سلطان نے خلیفہ بغداد سے رابطہ کیا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ موصل کے محاصرے میں خلیفہ کی سفارش کے باعث محاصرہ اٹھانا پڑا تھا۔ آمد کی مہم میں بھی اس کا امکان تھا کہ محاصرہ طول پکڑ جائے اور حاکم آمد خلیفہ سے سفارش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ چنانچہ خلیفہ کو غلط فہمی سے بچانے کے لیے سلطان نے پہلے دربار خلافت میں عرضی روانہ کی۔

خلیفہ کی جانب سے جازت ملنے کے بعد 17/ذی الحجہ 578ھ (12/اپریل 1183ء) کو سلطان کی فوجیں آمد کے گرد جمع تھیں۔ اس قلعے کو دھاوے کے ذریعے سرنگوں کرنا مشکل تھا اس لیے حسب توقع محاصرہ طول پکڑنے لگا۔ نئے سال 579ھ کا چاند اس حال میں طلوع ہوا کہ سلطان کی عقابی نگاہیں آمد کی فصیلوں کو ٹٹول رہی تھیں۔

حاکم آمد مسعود بن نیسان ایک بدسیرت اور خود غرض انسان تھا۔ اس کے پاس مال و دولت کے بے پناہ ذخائر تھے جن کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی توجہ رعایا کی ضروریات سے زیادہ اپنے خزانے بھرنے پر تھی، یہی وجہ تھی کہ لوگ اسے ناپسند کرتے تھے۔ اسے ہتھیار ڈالنے کی صورت میں اس مال و دولت سے محرومی کا یقین تھا جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اس لیے اس نے بہر حال مقابلے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

اِدھر سلطان صلاح الدین کسی مسلمان کا خون بہانے سے حتی الامکان بچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شہر کے گرد منجنیقیں نصب کرادی تھیں مگر انہیں استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لشکر کو فصیل سے ذرا فاصلے پر رکھ کر درمیان میں سنگر (حفاظتی پشتے) لگادیے گئے تھے تا کہ حریف کی تیراندازی اور سنگ باری سے محفوظ رہا جا سکے۔ فوج کو یہ تاکید تھی کہ وہ از خود حریف کے کسی فرد پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ سلطان کی غرض یہ تھی کہ اس طرح آمد کے حاکم کو ان کی نرم طبعی کا اندازہ ہو جائے اور وہ لڑے بغیر ہتھیار ڈال دے مگر ابن نیسان نے اسے سلطان کی کمزوری سمجھا، چنانچہ اس کے حکم پر آمد کے سپاہیوں نے موقع پا کر سلطان کے کیمپ پر حملہ کیا اور سنگروں کو آگ لگادی۔ سلطان کی فوج حکم کے مطابق صرف اپنا دفاع کرتی رہتی۔

دشمن کے حملے معمول بن گئے تو سلطان کو بھی لڑنا پڑا۔ وہ ایک دن منتخب سپاہی اپنی کمان میں لے کر حملہ آوروں کی طرف لپکے اور انہیں فصیل کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کے بہت سے سپاہی سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھنے لگے۔ کچھ دیر تک فصیل پر لڑائی ہوتی رہی۔ آخر سلطان کے سپاہیوں نے فصیل پر قبضہ کر لیا۔ حریف کے سپاہی بھاگ کر اندرونی فصیل میں داخل ہو گئے۔ سلطان

کے سپاہی دونوں فصیلوں کے درمیانی حصے میں جمع ہونے لگے۔ سلطان نے حکم دیا کہ اندرونی فصیل میں سرنگیں لگائی جائیں، حکم کی تعمیل ہوئی، سرنگیں کھودی جانے لگیں۔ ابن عیسان نے یہ رنگ دیکھا تو اپنے آدمیوں کو غیرت دلا کر حملے کا حکم دیا۔ ایک بار پھر زوردار لڑائی شروع ہوگئی، ابن عیسان کے سپاہی اندرونی بلند فصیل کے برجوں سے پتھر اور کانچ کے تیز دھار ٹکڑے پھینک رہے تھے۔ چند دن اسی حال میں گزرے۔ ①

سلطان کی کامیاب چال ❊ سلطان شہریوں کو حاکم کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کا سوچنے لگے مگر شہر میں پہلے سے ان کا کوئی جاسوس موجود نہ تھا۔ نامہ و پیام اور سفارت کا راستہ بھی بند تھا۔ اندرونی فصیل میں کوئی رخنہ بھی نہ تھا جس سے راستہ بنایا جاسکتا۔ تب عوام کو متوجہ کرنے کے لیے سلطان نے ایک انوکھا طریقہ اپنایا، انہوں نے کاتبوں کو کہہ کر ایسے بہت سے پرچے تیار کرائے جن میں عوام کو وعدوں اور دھمکیوں کے ذریعے حاکمِ آمد کی مدد سے باز رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ ان پرچوں پر تحریر تھا:

''اپنے ہاتھوں کو روک لو ورنہ اگر ہم تمہاری مسلسل مزاحمت کے باوجود غالب آگئے تو تمہیں تباہ کردیں گے۔ اطاعت کی صورت میں ہم تمہاری ضروریات اور مطالبے پورے کریں گے۔''

یہ پرچے تیروں پر باندھ کر شہر کے اندر پھینکے گئے۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، شہریوں نے شہر کے دفاع میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ حاکمِ آمد اس صورتحال سے سخت پریشان ہوا، اس کے پاس فوج بہت کم تھی، شہریوں کی مدد کے بغیر اس کے لیے لڑنا ناممکن تھا۔ آخر وہ صلح پر آمادہ ہوگیا۔ ②

مصالحت کی گفتگو ایک دن صبح ہی صبح شہر کا دروازہ کھلا اور بہت سی پردہ دار عورتیں سلطان کی خیمہ گاہ کی طرف آتی دکھائی دیں۔ یہ ابن عیسان کے خاندان کی عورتیں تھیں۔ قاضی فاضل نے انہیں اپنے خیمے میں بلوالیا۔ انہوں نے درخواست کی:

''ہم سلطان سے امن کی طلب گار ہیں، جان و مال کی امان دی جائے اور اجازت دی جائے کہ ہم لوگ ساز و سامان سمیت کہیں اور چلے جائیں۔''

قاضی فاضل نے سلطان کو آگاہ کیا۔ سلطان نے امان دے دی اور کہا:

''ابن عیسان اگر یہیں رہنا چاہے تو امن و امان سے ہمارے زیرِ سایہ رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ ہم سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو تین دن تک جتنا مال و دولت شہر سے نکال کر لے جاسکتا ہے، لے جائے۔''

جب یہ عورتیں واپس ہونے لگیں تو سلطان خود انہیں رخصت کرنے آئے۔

① البرق الشامی: 5/84_85، مضمار الحقائق: 1/138_139، کتاب الروضتین: 3/146 ② ایضاً

یہ فراخدلانہ پیش کش ابن نیسان کے لیے توقع سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس نے فوراً شہر سلطان کے حوالے کر دیا۔ وہ خود سلطان سے خائف تھا اس لیے شہر میں رکنا قبول نہ کیا۔ اب اس نے اپنے مال و دولت کے ذخیرے شہر سے باہر منتقل کرنا شروع کیے۔ اس موقع پر اس نے سلطان سے درخواست کی کہ اس کے پاس غلاموں اور خادموں کی کمی ہے، اکثر غلام بھاگ گئے ہیں لہٰذا کچھ آدمی مہیا کیے جائیں جو خزانے کی منتقلی کا کام انجام دیں۔

سلطان نے ایک بار پھر غیر معمولی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے 300 خدام اور افسران کو ابن نیسان کی اعانت کے لیے بھیج دیا، اس کے علاوہ بہت سے بار برداری کے جانور بھی فراہم کر دیے۔ اب خزانہ خالی کرنے کا کام شروع ہوا، دیناروں اور درہموں کے صندوق، ہیروں، موتیوں اور نادر جواہرات کی تھیلیاں، سونے چاندی کے برتن، عمدہ پوشاکیں، قیمتی غالیچے اور طرح طرح کی نادر و نایاب چیزیں تھیں۔ اتنا بڑا خزانہ تھا کہ تین دن تک صرف بیش قیمت اشیاء نکالی جاتی رہیں۔ جب یہ میعاد ختم ہوگئی تو ابن نیسان مال و دولت کے انبار سمیت کرا ایشیائے کوچک کی سمت روانہ ہوگیا۔ اس کے باوجود ابھی تک اس عظیم خزانے کا دسواں حصہ بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ گوداموں اور قلعے کے برجوں میں بھی بہت کچھ تھا، یہ تمام عمارتیں غلے، غذائی اجناس اور عسکری ساز و سامان سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ شہر میں ایک بہت بڑا محل بھی تھا جس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے برجوں میں ایک لاکھ شمعیں روشن کی جاتی تھیں۔ یہ بھی اموال، اجناس، اور قیمتی سامان سے بھرا ہوا تھا۔

اس موقع پر سلطان کی سخاوت کا ایک اور عجیب منظر سامنے آیا۔ سلطان نے کچھ عرصہ پہلے اپنے حلیف نورالدین محمود بن قرا ارسلان کے تعاون کے بدلے میں اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ آمد کی فتح کے بعد شہر اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ دراصل اس سردار کی خدمات واقعی اس کی مستحق تھیں کہ ان کا بہترین بدلہ دیا جاتا، وہ سلطان کے دریائے فرات عبور کرتے ہی اپنے لشکر سمیت ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا تھا اور تب سے ہر مہم میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا تھا۔ محرم 579ھ (مئی 1183ء) کا پہلا عشرہ گزر رہا تھا کہ آمد کے قلعے پر ایوبی پرچم لہرا دیا گیا، تب سلطان پر اپنا وعدہ نبھانا لازم ہوگیا۔ [1] ...... سلطان نے نورالدین محمد بن قرا ارسلان کو بلایا اور شہر کے ساتھ ساتھ ان تمام گوداموں، برجوں اور سرکاری عمارتوں کی چابیاں اس کے حوالے کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر بعض خاص مصاحبین نے عرض کیا:

''شہر کے ساتھ اس ساز و سامان اور غلے کے ذخیروں کو نورالدین محمد کے حوالے کرنا کسی شرط یا

[1] کتاب الروضتین: 146/3

اقرار کے تحت نہیں آتا۔ آپ نے اس سے شہر کا وعدہ کیا تھا نہ کہ مال و دولت کا۔ یہ ذخائر 30 لاکھ دینار کی مالیت سے کم کے نہیں۔ انہیں آپ اپنی اہم ضروریات کے لیے لے لیجیے۔ نورالدین شہر کو بہت کافی سمجھے گا۔"

مگر سلطان نے اٹل لہجے میں کہا:

"میں ان ذخیروں میں سے کچھ بھی لینے کی گنجائش نہیں سمجھتا۔ نورالدین محمد ہمارے تابع داروں اور وفادار ساتھیوں میں سے ہے۔ ہم اس کی دوستی کے مقابلے میں ان چیزوں کی حرص نہیں کریں گے۔ جب ہم کسی کو درخت دے دیں تو شاخوں کے بارے میں بخل کرنا کیسا؟ یہ اہلِ سخاوت کے شایانِ شان نہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ نورالدین محمد ان ذخائر کا ضرورت سے زائد سامان جس میں غذائی اجناس کے علاوہ غالیچے، قالین اور خیمے بھی شامل تھے، سات سال تک فروخت کرتا رہا۔

مؤرخ محمد ایوبی جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے جرنیل تقی الدین عمر کے صاحبزادے تھے، یہ واقعہ نقل کر کے کہتے ہیں:

"سلطان صلاح الدین کے نزدیک ساری دنیا کی دولت کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔"

آمد کے مالِ غنیمت میں کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی ہاتھ لگا۔ ابوشامہ ابن مقدسی کے بیان کے مطابق یہ دس لاکھ چالیس ہزار کتابیں تھیں جو سلطان نے سب کی سب اپنے وزیر قاضی فاضل کو دے دیں۔ ۵

ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان اپنے ساتھیوں میں سے کام کے آدمیوں کو راضی رکھنے اور ان کی وفاداریوں کو برقرار رکھنے کے لیے سارا روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کو مالی لحاظ سے مستحکم کر کے خوش ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اکثر ساتھی دل و جان سے ان کے اطاعت گزار تھے۔ انہیں کوئی دوسری حکومت خرید نہیں سکتی تھی۔ ان میں سے کئی ایک کے لیے دنیاوی مفادات خاصے اہم تھے مگر انہیں سلطان کی داد و دہش کے سامنے دیگر تمام درباروں کی نوازشات ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔ سلطان کی یہ پالیسی ہر موقعے پر ان کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتی رہی۔ مگر ہر کوئی اس پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ جس بلند حوصلے، سخاوت، زہد و قناعت بلکہ ایثار کا تقاضا کرتی ہے اس کے لیے سلطان صلاح الدین جیسا دل و جگر درکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ

۵ سنا البرق الشامی: 1/126_129، کتاب الروضتین: 3/147

سلطان کے مخالفین کبھی بھی ان کے خلاف ایسے وفادار اتحادی نہ فراہم کر سکے۔ ان کے لیے دنیا ہی سب کچھ تھی۔ ہر فتح کے بعد مال و دولت کی تقسیم ان میں ایک نئے جھگڑے کا باعث بنتی تھی۔ وہ سلطان جیسا حوصلہ کہاں سے لاتے جس نے اپنے دوستوں کے لیے بڑی سے بڑی دولت سے دامن جھاڑ دیا۔

ایوبی لشکر کا حلب کی طرف کوچ ❊ سلطان کے نزدیک موصل اور حلب میں سے کسی ایک کی فتح ناگزیر تھی۔ موصل کی مہم ناکام ہو چکی تھی تو حلب کو فتح کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی حریف ایک اتحاد بنانے کے بعد یکدم بکھر کر اپنی بے ثباتی ظاہر کر چکے تھے اور سلطان کو حلب سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ایسے موقعے پر سلطان کا پیش قدمی سے باز رہنا بذات خود ایک نادانی شمار ہوتا۔ چنانچہ سلطان نے آمد سے کوچ کیا اور تیزی سے دریائے فرات عبور کر کے تل خالد کے اہم قلعے کو جا گھیرا، محاصرانہ لڑائی کے بعد 12 محرم 579ھ (6 مئی 1183ء) کو یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ سلطان نے راستے کے ایک اور قلعے عین تاب کے سامنے پڑاؤ ڈالا تو قلعہ دار ابن خمار تگین بہت سے تحائف لے کر اظہار اطاعت کے لیے حاضر ہوا۔ سلطان صرف ایک رات یہاں ٹھہر کر سیدھے حلب تک جا پہنچے اور فصیلِ شہر کے سامنے میدان اخضر کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر طویل محاصرے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ سرسبز و شاداب وادی ایک بہترین چھاؤنی کا کام دے سکتی تھی۔ سلطان کا لشکر روزانہ خیمہ گاہ سے فصیل کی جانب جاتا اور صف بندی کر کے دشمن پر رعب ڈالتا۔ سلطان کا چھوٹا بھائی تاج الملوک بوری ایک جوشیلا نوجوان تھا، وہ سلطان کی اجازت کے بغیر اپنے دستے کے ساتھ محصورین پر حملے کرتا اور انہیں مقابلے کے لیے للکارتا۔ سلطان لڑائی سے منع کرتے رہے اور افسران فوج کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دہراتے رہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا﴾

"اے ایمان والو! ثابت قدم رہو، استقامت اختیار کرو اور مورچوں پر جمے رہو۔"[1]

سلطان کا کہنا تھا:

"ہمارا مقصد صرف شہر پر قبضہ کرنا ہے، ہمیں کسی مسلمان کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب شہر فتح ہو جائے گا اور اس کے معاملات خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں گے تو یہ لوگ از خود دشمنی سے باز آ جائیں گے اور ضرر رسانی چھوڑ دیں گے۔"

دراصل سلطان کو پورا اندازہ تھا کہ حلب میں اب الملک الصالح یا عزالدین مسعود کے دور جیسی طاقت نہیں۔ اب یہاں عمادالدین جیسا کمزور حکمران ہے جسے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ تاہم سلطان کی دوررس

[1] سورۂ آل عمران، آیت: 200

اور احتیاط پسندانہ سوچ کے باوجود تاج الملوک بوری اپنے طور پر موقع پا کر شہر پناہ پر حملے کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ شہر والوں کے ایک جوابی حملے میں تاج الملوک بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کی ران میں گہرا گھاؤ لگا۔ طبیبوں کی تمام کوششوں کے باوجود زخم بگڑتا گیا۔ سلطان نے اس واقعے کے بعد فوج کو میدان اخضر سے ہٹا کر پیچھے جبل جوشن پر ٹھہرا دیا۔ یہاں سلطان نے ایک عجیب منصوبے پر عمل شروع کیا۔ انہوں نے حلب کے بالمقابل ایک اور شہر آباد کرنے کا حکم دے دیا۔ بڑی تعداد میں معمار اور مزدور نئے مکانات بنانے میں جٹ گئے۔ سلطان نے اس کام کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:

''اگر حلب ان لوگوں کا ٹھکانہ ہے تو یہ بستی ہمارا مسکن ہو گی۔ ہم یہاں رہ کر آس پاس کے شہروں پر حکومت کریں گے اور حلب کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔''

سلطان کے اس اقدام کے بعد عماد الدین کو یقین ہو گیا کہ سلطان کو کسی طرح واپس نہیں لوٹایا جا سکتا۔ اب اس نے سفیروں کے ذریعے بات چیت شروع کی۔ ان سفیروں کا انداز نہایت جارحانہ تھا، انہوں نے ابتداء میں سلطان کو حلب کی سابقہ عظمت کے بل بوتے پر مرعوب کرنا چاہا اور درشت کلامی کے ساتھ غیر معقول مطالبات پر اصرار کیا مگر سلطان نہایت تحمل سے سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ ہر بار انہوں نے سفیروں سے اچھا سلوک کیا اور شریفانہ مگر اٹل جواب دے کر واپس بھیجا۔[1]

ادھر عماد الدین محسوس کر رہا تھا کہ اگر محاصرہ طویل ہو گیا تو اسے اپنی ہی فوج کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑے گا، خزانچی نے اسے بتا دیا تھا کہ حالت جنگ میں فوج کا ماہانہ خرچہ تیس ہزار دینار تک پہنچ رہا ہے۔ جنگ طویل ہو جانے کی صورت میں خزانہ خالی ہو جانے کا خطرہ سامنے تھا۔ آخر عماد الدین نے اپنے معتمد وزیر طمان ارتقی سے مشورہ کیا جو دل سے سلطان صلاح الدین ایوبی کا خیر خواہ تھا۔ اس نے سلطان کی اطاعت اختیار کر لینے کا مشورہ دیا۔ عماد الدین نے پوچھا:

''آیا سلطان مجھے حلب کے بدلے سنجار، خابور، نصیبین، رقہ اور سروج کی حکومت دینے پر رضا مند ہو جائے گا؟''

طمان ارتقی نے اسے یقین دلایا کہ سلطان یہ مطالبہ ضرور مان لے گا۔

صلح کے مذاکرات ❊ اپنے آقا سے اجازت لے کر طمان ارتقی رات کی تاریکی میں ایک خفیہ دروازے سے شہر پناہ سے نکل کر سلطان کی لشکر گاہ پہنچ گیا۔ یہ رازداری اس لیے برتی جا رہی تھی کہ عماد الدین کے دیگر امراء اب تک اپنی سابقہ نخوت کی بنیاد پر سلطان کی اطاعت پر تیار نہیں تھے۔ طمان

[1] مفرج الکروب: 1/140_142

ارتقی اس رات سلطان کے جرنیل تقی الدین عمر سے ملا اور اسے عماد الدین کے مطالبے سے آگاہ کیا۔ تقی الدین عمر نے اسی وقت سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ ماجرا سنایا اور رائے دی کہ اس پیش کش کو مسترد نہ کیا جائے۔ سلطان کو یاد تھا کہ سنجار، نصیبین، رقہ اور سروج سمیت الجزیرہ کے علاقے تقی الدین عمر کی تولیت میں دیے جا چکے ہیں، اسی لیے انہوں نے حیرت زدہ ہو کر کہا:

''یہ علاقے جن کا ذکر عماد الدین نے کیا ہے، تمہارے نام ہو چکے ہیں، اب انہیں تم سے واپس لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔''

تقی الدین عمر نے عرض کیا: ''آقا! اس معاملے کو طے ہو جانے دیجیے۔ اس میں گھر کی خیر خواہی ہے۔''

سلطان ایوبی نے بھی جواب میں فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ''اچھا! اگر تم اپنے علاقے عماد الدین کو دے رہے ہو تو میں حلب، اس کا قلعہ اور متعلقہ اضلاع تمہارے نام کرتا ہوں۔''[1]

وہ ایثار کا بدلہ اسی طرح بے پناہ نوازش کی صورت میں دیتے تھے۔

حلب سرنگوں ہو گیا: سلطان نے کچھ دیر بعد طمان ارتقی کو طلب کر لیا اور اپنے ہاتھ سے عماد الدین کے مطالبے کی منظوری کا پروانہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔ طمان ارتقی نے اسی رات کے آخری پہر عماد الدین کی خدمت میں حاضری دی اور سلطان کی تحریر اس کے حوالے کر کے سلطان کے لطف و کرم کا تذکرہ کیا۔ اب عماد الدین کو اپنے مستقبل کے بارے میں اطمینان ہو گیا۔ اس نے شہر کے دروازے کھلوا دیے۔ چونکہ عماد الدین کے اکثر امراء کو اس فیصلے سے اختلاف تھا لہٰذا وہ جل بھن کر رہ گئے مگر جلد ہی سلطان صلاح الدین کے انعامات اور نوازشوں نے ان کا غصہ دور کر دیا۔[2]

ایک عجیب بات: علامہ ابو شامہ المقدسی نے کتاب الروضتین اور سلطان کے بھتیجے محمد بن شاہنشاہ ایوبی نے اپنے روزنامچے ''مضمار الحقائق'' میں حلب کی فتح کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک عجیب واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں:

''مجد الدین ابن جہبل رحمہ اللہ حلب میں فقہ شافعی کے بڑے عالم تھے۔ ایک دن وہ مراکش کے عالم ابو الحکم مغربی کی تفسیر (جو اسی دور میں چند برس پہلے لکھی گئی تھی) پڑھ رہے تھے کہ اس میں سورۃ الروم کی آیت ﴿الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ﴾ پر نظر پڑی۔ یہاں ابو الحکم مغربی رحمہ اللہ نے دلائل دے کر پیش گوئی کی گئی تھی کہ رجب 583ھ میں مسلمان رومیوں کو شکست دے کر بیت المقدس واپس لے لیں

[1] مضمار الحقائق: 1/421_143
[2] مضمار الحقائق: 1/421_143، کتاب الروضتین: 3/170

گے۔ یہ پڑھ کر مجد الدین ابن جہبل کو یقین ہو گیا کہ ایسا ہی ہوگا۔

انہوں نے ایک پرچہ لکھا جس میں سلطان صلاح الدین کو بشارت دی گئی تھی کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ 583ھ میں بیت المقدس آپ ہی کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ حلب فتح ہوا تو ابن جہبل نے یہ پرچہ فقیہ عیسیٰ الھکاری کے حوالے کر دیا کہ اسے سلطان کو پیش کر دیں۔ چونکہ سلطان صلاح الدین عملیت پسند انسان تھے اور قیاسات پر یقین نہیں کرتے تھے اس لیے فقیہ عیسیٰ کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے ایسا پیغام سلطان کو دیں۔ تاہم انہوں نے پرچے میں کی گئی پیش گوئی کا ذکر قاضی محی الدین ابن زکی سے کر دیا۔ قاضی ابن زکی بھی یہ پیش گوئی سن کر حیران ہوئے کہ کوئی ایسا دعوے کیسے کر سکتا ہے مگر وہ ابن جہبل کے علم و تقویٰ سے متاثر تھے۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ یہ واقعہ اسی طرح پیش آئے گا۔ انہوں نے یہ بات سلطان کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ پہلے فتح حلب کا ایک قصیدہ تیار کیا اور اس میں یہ شعر بھی شامل کر دیا:

وفتحکم حلباً بالسیف فی صفر — قضیٰ لکم بافتتاح القدس فی رجب

''صفر میں آپ کے حلب پر بزورِ شمشیر فتح نے طے کر دیا ہے کہ ماہ رجب میں آپ القدس کو فتح کریں گے۔''

جب سلطان صلاح الدین کے سامنے یہ قصیدہ پڑھا گیا تو یہ شعر سن کر انہیں بھی تعجب ہوا۔

آخر کار رجب 583ھ میں بیت المقدس فتح ہوا تب مجد الدین ابن جہبل رحمہ اللہ خود سلطان سے آکر ملے اور عرض کیا:

''چار سال قبل ایک رقعہ بھیج کر اس فتح کی پیشگی خوش خبری میں نے دے دی تھی۔''

سلطان نے چونک کر کہا:

''ہمیں تو ابن زکی نے یہ خوش خبری آپ سے پہلے دی ہے۔ بہر حال ہم آپ کو وہ اعزاز دیں گے جو کسی اور کو نہ ملا ہوگا۔''

یہ کہہ کر سلطان نے انہیں صخرہ مبارکہ پر درسِ فقہ دینے کا موقع دیا۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا انعام تھا۔[1]

سلطان کے بھائی تاج الملوک بوری کی وفات ❁ سلطان کے بھائی تاج الملوک بوری کا زخم خطرناک حد تک بگڑ چکا تھا، اس کا بچنا مشکل نظر آتا تھا۔ عماد الدین سے صلح کی بات چیت طے ہو جانے کے بعد سلطان اپنے جواں سال بھائی کے خیمے میں آئے اور اسے خوشخبری دیتے ہوئے مسرت آمیز

[1] کتاب الروضتین: 3/170؛ مفرج الکروب: 1/143

لہجے میں کہا: ”یہ لو، ہم نے حلب فتح کر لیا۔“
تاج الملوک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:
”اللہ کی قسم! آپ نے یہ شہر بہت گراں قیمت ادا کر کے لیا ہے کہ اس کے بدلے آپ کو مجھ جیسا بھائی ضائع کرنا پڑا۔“
یہ کہہ کر تاج الملوک رو پڑا۔ سلطان کے بھی آنسو بہہ نکلے۔ [1]

سلطان کی قوتِ برداشت ❀ فتح کے بعد شہر میں داخلے سے پہلے سلطان نے اپنی خیمہ گاہ میں عماد الدین اور اس کے امراء کی شاندار ضیافت کی، خوب خاطر مدارت کے ساتھ انہیں بیش قیمت تحائف عنایت کیے۔ محفل میں سلطان نے عماد الدین کو اپنے پہلو میں بٹھایا ہوا تھا۔

حاضرینِ محفل مسرت سے نہال تھے۔ سلطان کی نوازشوں نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ اس دوران کہ محفل کی شادمانیاں عروج پر تھیں، سلطان کے حاجب نے آکر ان کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے یہ دردناک اطلاع دی کہ تاج الملوک دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

سلطان کے لیے یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ پیارے بھائی کی جدائی کا غم دل و جگر کو چھلنی کر رہا تھا مگر مہمانوں کو اپنے رنج و غم میں شامل کر کے مسرتوں کی فضا سے محروم کر دینا سلطان کو گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے چہرے پر ذرا بھی تغیر نمودار نہ ہونے دیا۔ اپنی توجہ مہمانوں کے اعزاز و اکرام پر مرکوز رکھی، البتہ چپکے سے بعض خواص کو کہہ دیا کہ وہ جا کر تاج الملوک کی تجہیز و تکفین کا کام شروع کر دیں۔

سلطان نے عماد الدین کو رخصت کرنے سے پہلے گراں قدر تحائف اور اپنے اصطبل کے بہترین گھوڑے پیش کیے، اس کے امراء میں سے بھی بہت سوں کو خلعتوں سے نوازا۔ جب محفل برخاست ہوئی اور مہمان رخصت ہو چکے تب سلطان صلاح الدین ”انا للہ وانا إلیہ راجعون“ کہتے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ غم واندوہ کے جس طوفان کو اب تک وہ خداداد ہمت کی بدولت دبائے ہوئے بیٹھے تھے وہ اب اشکوں کی صورت میں بہہ نکلا۔ سلطان کچھ دیر اپنے کم عمر بھائی کی وفات پر روتے رہے۔ پھر اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی اور نماز جنازہ ادا کی۔

حلب فتح ہو چکا تھا مگر سلطان نے اس کے بعد بھی شہر میں داخل ہونے سے کسی عجلت کا مظاہرہ نہ کیا جیسا کہ یہ ان کے لیے ایک عام سی بات ہو۔ [2]

---

[1] الکامل فی التاریخ: 302/7
[2] سفرنامہ ابن جبیر: 144/1، مارق اتابکیہ: 130/5، کتاب الروضتین: 166/2-168

جب عماد الدین حلب سے رخصت ہوا 16 صفر 579ھ (9 جون 1183ء) کو عماد الدین کے نمائندے سلطان سے حسب وعدہ جاگیریں طلب کرنے حاضرِ خدمت ہوئے، سلطان نے سنجار، نصیبین اور خابور کی ولایت کی اسناد ان کے حوالے کر دیں۔ ان لوگوں نے حلب کا قلعہ سلطان کے نمائندوں کے سپرد کر دیا۔

سلطان نے عماد الدین پر واضح کر دیا تھا کہ انہیں صرف حلب کی زمین اور دیواریں چاہئیں، اس لیے وہ جو کچھ ساتھ لے جا سکتا ہے لے جائے، چنانچہ عماد الدین نے قلعے اور محل میں جو کچھ تھا، سب سمیٹ لیا تھا۔ جو چیزیں ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا، انہیں فوراً بازار میں فروخت کر ڈالا۔ سلطان نے عماد الدین کو زیادہ سے زیادہ سامان لے جانے میں سہولت کے لیے بہت سے گھوڑے، اونٹ اور خچر بھی دے دیے تھے۔ عماد الدین اور سلطان کے درمیان معاہدے میں یہ طے پا گیا تھا کہ جب بھی سلطان کو ضرورت پڑے گی عماد الدین اپنے لشکر سمیت خود ان کی امداد کے لیے پہنچے گا اور کسی قسم کی کوتاہی روا نہیں رکھے گا۔ گویا اب عماد الدین سلطان کا ماتحت تھا۔ اس کی خود مختاری ختم ہو چکی تھی۔

حلب اب سلطان صلاح الدین کا تھا۔ عماد الدین نے اپنا ساز و سامان اور مال و اسباب سمیٹ کر نور الدین زنگی کے عظیم شہر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ 16 صفر 579ھ (9 جون) کو وہ اپنے خاص مصاحبین کے ساتھ حلب کی فصیل سے نکلا۔ ادھر سلطان بھی اس سے الوداعی ملاقات کے لیے نکلے۔ ان کا آمنا سامنا حلب کی شمالی فصیل کے باہر ہوا۔ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ اسی حالت میں ایک دوسرے کو سلام کیا۔ کچھ دیر بعد عماد الدین کا بیٹا قطب الدین بھی پہنچ گیا، سلطان کو دیکھتے ہی وہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ سلطان نے بھی انتہائی شفقت کا ثبوت دیتے ہوئے گھوڑے سے نیچے اتر کر اسے گلے لگا لیا۔ ان باپ بیٹے کو میدان اخضر کی خیمہ گاہ میں لایا گیا جہاں سلطان نے ان پر انعامات کی بارش کر دی۔ عتابی، اطلس، معتق اور مبرش کپڑوں کے بیس صندوقچے ان کے حوالے کیے۔ یہ اس زمانے کے اعلیٰ ترین قسم کے کپڑے تھیں۔ چمڑے کے دس گرم لباس، پانچ خاص خلعتیں جن پر عماد الدین اور قطب الدین کے نام تھے، ایک سو کرتے، ایک سو ویسٹ کوٹ، ساز و سامان سمیت دو عربی باندیاں، بار برداری کے جانور جن میں خچر اور اونٹ شامل تھے، انہیں ہدیہ کر دیے۔ پر تکلف کھانے سے فارغ ہو کر جب عماد الدین رخصت ہونے لگا تو سلطان بھی گھوڑے پر سوار ہو کر کچھ دور تک اسے چھوڑنے گئے۔ عماد الدین قراحصار کے راستے سنجار کی طرف روانہ ہو گیا۔ [1]

[1] کتاب الروضتین: 166/3

بعض مورخین نے عماد الدین کے حلب سے دستبرداری کے فیصلے کو حماقت سے تعبیر کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عماد الدین کا یہ فیصلہ نہ صرف امت مسلمہ کے بلکہ خود اس کے حق میں بھی مفید ثابت ہوا۔ اگر وہ ضد پر اڑا رہتا تب بھی سلطان کے آہنی عزم کو نہیں بدل سکتا تھا، حلب ایک مستقل محاذ بن جاتا جہاں دونوں حکمرانوں کی طاقت ضائع ہوتی رہتی۔ اب اس کے بدلے عماد الدین کو سنجار اور دیگر وسیع وعریض علاقوں پر عزت کے ساتھ حکومت کرنے اور جہاد کی مہمات میں سلطان کا ساتھ دینے کا موقع مل رہا تھا لہٰذا اس فیصلے میں خیر ہی خیر تھی۔ اس فیصلے نے سلطان کو ان مہمات کے تسلسل سے بھی بچا لیا جو حلب سے محرومی کی صورت میں عراق وشام کے مخالفین کے بار بار سر اٹھانے سے پیش آسکتی تھیں۔ اب سلطان کے لیے القدس کا طویل سفر مختصر ہو گیا تھا۔

اے اللہ! تو ہی بادشاہت کا مالک ہے ❊ 18 صفر 579ھ (11 جون 1183ء) سلطان کا نارنجی پرچم قلعۂ حلب کی فصیل پر نصب کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد سلطان فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو گئے۔ نور الدین زنگی کا حلب اب اس کے اصل وارث کو مل گیا تھا جو اپنے مجاہد آقا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ارض شام وفلسطین اور بیت المقدس سے صلیبیوں کو بے دخل کرنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا فرض تصور کرتا تھا۔

سلطان سب سے پہلے شہر کے عظیم الشان قلعے کی طرف چلے جس کی ہر اینٹ پر سلطان نور الدین زنگی کے شکوہ و دبدبے اور اس کی انتھک جہادی مہمات کی داستانیں نقش تھیں۔ سلطان صلاح الدین باب الجبل سے قلعے میں داخل ہوئے، اس کی بلندی پر پہنچ کر ان کی زباں پر بے اختیار قرآن مجید کی یہ آیت جاری ہو گئیں:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

"کہو اے خدا اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخش دے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔ اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے۔ اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"[۱]

اس لمحے سلطان ماضی کے دھندلکوں میں جھانکتے ہوئے وہ زمانہ یاد کر رہے تھے جب وہ اپنے مربی نور الدین زنگی کے ساتھ یہاں گھوما پھرا کرتے تھے۔ سلطان نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا:

[۱] سورۂ آل عمران، آیت:26

''ایک دن وہ بھی حاجب میں نورالدین رحمہ اللہ کے ساتھ اس قلعے کی بلندی پر چڑھا تھا۔ یہاں میں نے ان سے اسی آیت کی تلاوت سنی۔ وہ پڑھ رہے تھے:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾

سلطان کے چہرے سے مسرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے وہ فرما رہے تھے:

''اللہ کی قسم! مجھے اس شہر کی فتح سے جتنی خوشی ہو رہی ہے اتنی کسی فتح سے بھی نہ ہوئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں سب (مقبوضہ اسلامی) شہروں کو فتح کر لوں گا۔ مجھے اطمینان ہے کہ میری سلطنت اب مستحکم ہو گئی ہے۔''

قلعے کے باب عمادالدین پر پہنچ کر سلطان کے ہونٹوں پر یہ آیت سنائی دے رہی تھی:

﴿وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَؤُهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا﴾

''اور ان کی زمین اور ان کے گھروں کا اور ان کے مال کا اور اس زمین کا جس میں تم نے پاؤں بھی نہیں رکھا تھا تمہیں وارث بنا دیا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''[1]

سلطان نے یہاں ایک جگہ دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی جس میں بہت طویل سجدے کیے۔ پھر پورے قلعے کا ایک چکر لگا کر دوبارہ شہر کے باہر اپنی خیمہ گاہ میں چلے گئے۔ فتح حلب کی خوشی میں ایک مجلس آراستہ کی گئی جس میں امراء نے سلطان کو مبارکباد پیش کی اور شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ یوسف بزاعی نے کہا:

شَرُفَتْ بِسَامِی مَجْدِكَ الشَّهْبَاءُ وَتَجَلَّلَتْهَا بَهْجَةٌ وَضِيَاءُ

''شہر حلب جو اپنے پتھروں کی سفیدی کی وجہ سے) شہباء (کہلاتا ہے) آپ کی عظمت کی وجہ سے شرف پا گیا ہے اور یہاں رونقیں اور روشنیاں پھیل گئی ہیں۔''

اَلْقَتْ عَلَيْكَ قِيَادَهَا وَبِهَا عَلٰى كُلِّ الْمُلُوْكِ تَرَفُّعٌ وَاِبَاءُ

''اس شہر نے خود آپ کو اپنی زمام تھما دی ہے حالانکہ یہ باقی تمام بادشاہوں کے سامنے سربلند اور ڈٹا رہا ہے۔''

مشہور شیعہ مؤرخ ابن ابی طی کے والد ابوطی النجار نے کہا:

حَلَبُ شَامَةُ الشَّامِ وَقَدْ زِيْدَتْ جَلَالًا بِيُوْسُفَ وَجَمَالًا

[1] سورۃ الاحزاب، آیت:27

’’حلب شام کا دل ہے جسے یوسف کے ذریعے ہیبت اور مزید حسن و جمال نصیب ہو گیا۔‘‘

حلب کی باگ ڈور سنبھالتے ہی سلطان نے عدل و انصاف کا بول بالا کر دیا، ٹیکس معاف کر دیے۔ دمشق کے قاضی محی الدین زکی کو حلب بلا کر یہاں کا عہدۂ قضا سونپ دیا، قاضی ابن بانیاس کو ان کا نائب مقرر کیا تا کہ ان ہستیوں کے دم سے اس مرکزی شہر کے باشندوں کو گھروں کی دہلیز پر انصاف میسر ہوا۔ [۱]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’حلب کی فتح سے سلطان صلاح الدین کی حکومت مضبوط ہو گئی۔ اس کے بغیر وہ ڈگمگا رہی تھی مگر اب حلب پر قبضے سے سلطان کے قدم مضبوط ہو گئے۔‘‘ [۲]

صرف اللہ کا کلمہ بلند ہو:* اس موقع پر سلطان نے خلیفۂ بغداد کو ایک اہم مکتوب روانہ کیا جس میں فتح حلب کی خوشخبری دینے کے بعد اپنے مقاصد اور عزائم کی وضاحت اور مخالفین کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے تحریر کیا:

’’خادم صرف اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، انہیں کوئی ضرر نہ پہنچے۔ خادم صرف یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی افواج اپنے دشمن کے خلاف متحد ہو جائیں نہ کہ تکبر کی بناء پر آپس میں حسد کرتی رہیں۔ اگر عسکری امور میں فیصلوں کا اختیار بہت سے افراد میں تقسیم کرنا بہتر ہوتا تو خادم کو ایسی کسی مجلسِ ادارت کا عام سا رکن بننے سے بھی انکار نہ تھا۔ خادم کو یہ بھی برا محسوس نہ ہوتا کہ اس زمین کے حکمران بہت سے رہتے، مگر جنگی معاملات کا نظم و ضبط تب ہی قائم رہ سکتا ہے جب اعلیٰ کمان ایک شخص کے ہاتھ میں ہو۔ جب نظم و ضبط درست ہو جائے تو مقابلے کے لیے پھر صرف وسائل کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

خادم کے تین مقاصد ہیں: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا، اللہ کے بندوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو روکنا، اور خلیفۂ وقت کی اطاعت کرانا۔ شہروں کی فتوحات سے خادم کی صرف یہی آرزو ہے اور دنیا مل جانے پر خادم کا حصہ اس میں سے اتنا ہی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ بندہ نہ تو اس زندگی سے زیادہ آرام دہ زندگی کی خاطر جنگ کر رہا ہے نہ کسی غیظ و غضب کی بناء پر ایسا کر رہا ہے۔ اس کے مقاصد وہی ہیں جو ذکر کیے گئے ہیں۔ خادم اسی بات کی نیت کیے ہوئے ہے کہ جو اعمال نامہ میں لکھی جانے والی باتوں میں بہترین بات ہے۔‘‘ [۳]

---

۱ کتاب الروضتین: 3/167، 168

۲ البدایۃ والنہایۃ: تحت 579ھ

۳ کتاب الروضتین: 3/178، 179

فوج کی دو اہم کامیابیاں: جب سلطان حلب کے محاصرے میں مشغول تھے مصر میں سلطان کی فوج کو دو مزید اہم کامیابیاں نصیب ہو چکی تھیں۔ غزہ سے 12 میل دور مصر کی جانب جاتے ہوئے ''داروم'' نامی ایک چھوٹا سا شہر پڑتا ہے جس کے قلعے کے برجوں سے سمندر صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہاں عیسائی قابض تھے۔ محرم 579ھ (مئی 1183ء) میں داروم اور اس کے گردونواح سے نصرانیوں کی ایک فوج مصر کے دیہاتوں پر شب خون مارنے روانہ ہوئی۔ مصر میں سلطان کے نائب الملک العادل نے یہ اطلاع ملتے ہی سعدالدین اور علم الدین قیصر کی قیادت میں ایک فوج روانہ کردی۔ مسلمان ایلہ سے ہوتے ہوئے انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھے۔ صحرائی راستے میں ان کے پانی کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا، اکثر سپاہی پیاس سے بے حال تھے، انہیں عسیلہ میں پانی ملنے کی امید تھے مگر جب وہ وہاں پہنچے تو عیسائی فوج کو اپنے سامنے پایا۔ یہاں صرف ایک چشمہ تھا جس پر عیسائی پہلے پہنچ کر قبضہ کر چکے تھے۔ یہ شدید گرمی کا موسم تھا، صحرا کی بھاپ اٹھتی تھی، گرم ریت اور سورج کی تمازت ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔ ایسے میں تشنہ لب سپاہیوں کا پانی سے محروم رہ جانا جنگ سے پہلے ہی ہلاکت کا باعث ہوسکتا تھا۔

مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر اس کی غیبی مدد طلب کی۔ دعا قبول ہوئی اور کچھ ہی دیر میں موسم ابر آلود ہوگیا، بادل کھل کر برسا اور مسلمان اچھی طرح سیراب ہوکر مقابلے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس نصرت خداوندی نے ان کی ہمتوں کو بہت بلند کردیا۔ چنانچہ معرکے میں نصرانیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان میں سے چند ایک کے سوا سب کے سب مارے گئے۔ دس محرم 579ھ (4 مئی) کو مصر کی بحری فوج نے یورپ سے آنے والے ایک فوجی جہاز کا راستہ روک لیا جو مال و دولت اور اسلحے کے ذخائر لے کر شام کی عیسائی ریاستوں کی مدد کے لیے جارہا تھا، اس میں تین سو سپاہی تھے۔ مصری مسلمانوں نے انہیں روکا تو جنگ شروع ہوگئی۔ ایک صبر آزما معرکے کے بعد نصرانیوں کو شکست ہوئی، بہت سے قتل ہوئے اور باقی گرفتار کر کے مصر پہنچا دیے گئے۔ ان کا تمام اسلحہ اور مال سرکاری خزانے میں پہنچ گیا۔

سلطان صلاح الدین کو ان دونوں کامیابیوں کی خوشخبری ماہ صفر میں حلب کی فتح کے ساتھ ملی جس سے فتح حلب کی مسرت دوچند ہوگئی۔ [1]

حارم کی فتح: حلب پر قبضہ مستحکم رکھنے کے لیے حارم کے عظیم الشان قلعے کو حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ یہاں کمش تگین کا ایک نائب جو سلطان نورالدین زنگی مرحوم کا کوئی غلام تھا، قبضہ جمائے ہوئے تھا، اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ فرنگیوں سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ سلطان صلاح الدین نے

[1] العبر لابن خلدون: 5/141_143

اسے اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے اس سے خط وکتابت شروع کی۔ اسے بصریٰ کی ولایت، دمشق کے مضافات میں اپنی ذاتی جاگیر، اپنے باپ نجم الدین ایوب کی شاندار حویلی ''دار العقیقی'' اور 30 ہزار دینار دینے کا وعدہ کیا مگر وہ نہ مانا۔ سلطان نے یہاں تک لکھ بھیجا کہ حارم کے بدلے جو علاقے پسند ہوں مانگ لو مگر قلعہ دار مزید سخت شرائط پیش کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے قلعے کا چوب دار سلطان کا خیر خواہ تھا۔ اس نے سلطان سے خفیہ رابطہ کر کے قلعے پر قبضے کی یقین دہانی کرائی مگر اس خدمت کے بدلے معقول معاوضہ طلب کیا۔ سلطان نے وعدہ کر لیا۔ ایک دن قلعہ دار کسی کام سے قلعے سے باہر نکلا تو چوب دار نے قلعے کے دروازے بند کرا دیے اور سلطان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جوں ہی سلطان کو اطلاع ملی انہوں نے فوراً تقی الدین عمر کو روانہ کر دیا مگر قلعے پر قابض چوب دار نے کہا کہ وہ قلعے کے دروازے سلطان کے آنے پر کھولے گا۔ اب سلطان صلاح الدین خود چند مصاحبین اور ایک دستے کے ساتھ حارم کی طرف نکلے۔ جب قلعے کے نزدیک پہنچے تو چوب دار اور قلعے کے دیگر افسران نیچے اتر آئے اور قلعے کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں سلطان نے فوراً قلعے پر قبضہ کر لیا۔ [۵]

ان کی باتوں پر کان نہ دھریں ﷺ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ حارم کا چوب دار اور اس کے ساتھی سلطان سے انعام واکرام وصول کرنے حاضر ہوئے۔ انہوں نے سلطان سے گفتگو کے دوران اپنی کارگزاری سناتے ہوئے قلعہ دار پر الزام لگایا کہ وہ فرنگیوں سے ساز باز کر رہا تھا۔

دربار میں دایہ خاندان کا مشہور امیر بدر الدین حسن ابن دایہ بھی موجود تھا۔ وہ اہل حارم کے خلاف جلا بھنا بیٹھا تھا۔ ان پر سلطان کی عنایات دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور کسی لحاظ کے بغیر بول اٹھا:

''آقا! ان لوگوں کی بات پر کان نہ دھریں، انہوں نے اس قلعہ دار کو اذیت بھی دی، اس پر فرنگیوں سے دوستی کا جھوٹا الزام بھی لگا دیا اور انجام کار اسے ان مراعات وانعامات سے محروم کر دیا جن کا آپ قلعے کی حوالگی کی صورت میں وعدہ کر چکے تھے۔ میں یہ بات ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ جس زمانے میں میں اس قلعے کا والی تھا، ان لوگوں نے مجھ پر بھی جھوٹے الزام عاید کیے تھے اور مجھ سے ایسے معاملات کیے تھے کہ میں بربادی کے قریب جا پہنچا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ بھی بڑا ظلم کیا تھا، ہر بے ہودہ بات مجھ سے منسوب کی، انہوں نے میرا گھر ویران کر دیا، میرے اس قلعے سے معزول کیے جانے کا سبب بھی لوگ تھے۔ انہوں نے اس بے چارے قلعہ دار کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ شہر سے باہر تھا کہ انہوں

۵ کتاب الروضتین: 2/172_173، مفرج الکروب: 1/146، الکامل فی التاریخ: 7/303

نے قلعے کے دروازے بند کر دیے۔ اس پر فرنگیوں سے صلح کا جھوٹا الزام بھی لگایا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور اب مجھے لگ رہا ہے کہ سلطان اس تجربے کے باوجود انہی لوگوں کو اس قلعے کی ذمہ داری سونپ دیں گے۔ تو جناب اگر ایسا ہی کرنا ہے تو ان سے کم از کم محتاط تو ضرور رہیں۔"

وہ سانس لیے بغیر جلے بھنے انداز میں کہتا چلا گیا اور سلطان ہنس پڑے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے پہلے چوب دار اور اس کے ساتھیوں کو ان کی توقع سے بڑھ کر انعام و اکرام سے نوازنے کا حکم دیا۔ پھر ابن دایہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"ابھی ہمارے سامنے کئی مقامات ہیں جنہیں ہم فتح کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے وعدے پورے نہیں کریں گے اور لوگوں کو دل کھول کر نہیں دیں گے تو ہم پر کوئی بھی اعتماد نہیں کرے گا۔"[1]

سلطان ایوبی دو راتیں حارم میں گزارنے کے بعد واپس حلب روانہ ہو گئے تاہم انہوں نے ابن دایہ کی بات کا خیال کرتے ہوئے اتنی احتیاط ضرور برتی کہ چوب دار اور اس کے ساتھیوں کی بجائے حارم کے قلعے کی ذمہ داری ایک اور امیر ابراہیم بن شردہ کو سونپ دی۔[2]

---

1. سنا البرق الشامی: 1/146، کتاب الروضتین: 3/173
2. النوادر السلطانیہ، ص 106، کتاب الروضتین: 3/173

فصل:4

گستاخ نصرانیوں کو سزا دینے کی مہم

حارم سے واپسی پر سلطان صلاح الدین ایوبی 3 ربیع الاوّل 579ھ (25 جون 1183ء) کو دوبارہ حلب پہنچے۔ اب وہ ان بدطینت نصرانیوں کی سرکوبی کرنا چاہتے تھے جو حجازِ مقدس تک کو اپنی ناپاک سازشوں کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ سلطان کے قدم اب شام میں اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ انہیں پشت سے کسی رخنہ اندازی کا خطرہ نہیں تھا۔ صرف موصل میں عزالدین مسعود اب تک سرنگوں نہیں ہوا تھا مگر اس سال اپنے وزیر مجاہدالدین قائماز سے اختلافات نے موصل کی اتابک سلطنت کا رہا سہا وقار بھی ختم کر دیا تھا۔ مجاہدالدین قائماز کو عتابِ شاہی کا نشانہ بن کر جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی جبکہ عزالدین مسعود کے کئی امراء اس ناروا فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ یوں سلطان کے رہے سہے مخالفین خود آپس میں لڑبھڑ رہے تھے اور سلطان کو ان سے کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔

مگر اس سے قبل کہ سلطان عیسائی ریاستوں کی جانب قدم بڑھاتے، انہوں نے مفتوحہ علاقوں کے نظم وضبط کو بہتر سے بہتر بنانے کی طرف توجہ دی، شہروں اور قلعوں کے والیوں کی نئی تشکیلات طے کیں۔ حلب میں عارضی طور پر اپنے بیٹے الملک الظاہر غازی کو انتظامی امور سونپے اور اپنے آزمودہ کار امیر سیف الدین یازکوج کو قلعہ دار بنایا۔ تل خالد کی جاگیر بدرالدین یاروقی کو بخش دی جو کہ پہلے تل باشر کا جاگیردار بھی تھا۔ عزاز کے قلعے کا مسئلہ ذرا پیچیدہ تھا کیوں کہ سابق حاکم حلب عمادالدین نے اسے بیرونی حملہ آوروں کے لیے ناکارہ بنانے کی خاطر تباہ کر دیا تھا۔ سلطان نے اسے علم الدین سلیمان کے حوالے کر کے دوبارہ تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ [1]

حاکم انطاکیہ کی مصلحت پسندی: اب سلطان نے اپنے امراء اور حلیفوں کو خطوط روانہ کیے کہ وہ جہاد کی تیاریاں شروع کر دیں تاکہ گستاخ نصرانیوں کو عبرتناک سزا دی جائے۔ سلطان ایوبی بدبخت

[1] مسمار الحقائق: 146/1؛ الکامل فی التاریخ: 303/7

ریجی نالڈ کو نشانِ عبرت بنا دینا چاہتے تھے جس نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی جسارت کی تھی۔ تاہم ریجی نالڈ کے مضبوط قلعے کرک سے پہلے دیگر کئی علاقوں پر قبضہ ضروری تھا۔

سلطان کی تیاریوں سے عیسائی ریاستوں میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خاص طور پر حلب کے نزدیک انطاکیہ کی عیسائی ریاست کا حاکم اپنے علاقے کو شدید خطرے کی زد میں دیکھ رہا تھا۔ اس سے قبل اس کی سلطان کے ساتھ صلح چل رہی تھی اور بظاہر وہ صلح کو نبھا بھی رہا تھا مگر حلب کی فتح کے ساتھ یہ مدتِ صلح پوری ہو چکی تھی۔ آخر حاکم انطاکیہ نے مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے سفیر سلطان کی خدمت میں بھیج دیے جن کے ساتھ بہت سے مسلمان قیدی بھی تھے جنہیں سلطان کی خوشنودی کے لیے آزاد کیا گیا تھا۔ سفیروں نے سلطان سے صلح نامے کی تجدید کی درخواست کی۔ سلطان نے اسے قبول کرلیا کیوں کہ اس طرح دشمن کی طاقت خود منتشر ہو رہی تھی۔ ①

دمشق میں 24 دن: فرنگیوں پر حملے شروع کرنے سے پہلے سلطان نے دمشق پہنچ کر رعایا کو حلب اور دیگر تازہ فتوحات کی خوشیوں میں شریک کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ہفتہ 22 ربیع الثانی 579ھ (13/ اگست 1183ء) کو وہ حلب سے دمشق روانہ ہو گئے، الجزیرہ اور حلب کی افواج ان کے ہمراہ تھیں۔ قنسرین، حلِ سلطان اور جباب سے ہوتے ہوئے دو دن بعد یہ لشکر حماۃ پہنچا تو تقی الدین عمر نے یہاں سلطان اور امراء کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کی۔

سلطان یہاں آدھے دن سے زیادہ نہ رکے اور مسلسل کوچ و قیام کرتے ہوئے حمص اور بعلبک کے راستے سے 3 جمادی الاولیٰ 579ھ کو (23 اگست) دمشق پہنچ گئے۔ عوام نے شہر سے باہر آ کر فاتح حکمران کا پر جوش استقبال کیا۔ سلطان نے دارالحکومت میں صرف 24 دن گزرے اور اس کے فوراً بعد فوج کو اردن کی عیسائی ریاست بیسان پر حملے کے لیے کوچ کا حکم دیا۔ ②

جہاد کے لیے روانگی: 27 جمادی الاولیٰ 579ھ (16 ستمبر) کو وہ اپنے لشکر کے ساتھ دمشق سے نکلے اور دریائے اردن کے چوبی پل کے پاس پڑاؤ ڈال دیا۔ نو دن تک سلطان کی افواج یہاں جمع ہوتی رہیں۔ 8 جمادی الثانیہ (27 ستمبر) کو سلطان نے "فوار" پہنچ کر فوج کو جنگی ساز و سامان تیار کر لینے کا حکم دیا اور تمام تیاریوں کے ساتھ آگے بڑھے۔ قصیر میں رات گزار کر اگلے دن وہ اسلامی اور عیسائی ریاستوں کی سرحدی لائن "الحسینیہ" کے مشہور دریائی گھاٹ کو عبور کر چکے تھے۔

سلطان نے اپنے ہراول دستے کو عزالدین جردیک اور جاولی جیسے آزمودہ کار امراء کی قیادت میں

① سلطان:1/144_146 ② سلطان:1/161

آگے بھیج دیا تھا۔ 10 جمادی الثانیہ (29 ستمبر) کو اس دستے کا فرنگیوں کی اس فوج سے تصادم ہو گیا جو مشہور عیسائی نائٹ ہمفری کے نوجوان بیٹے کی کمان میں "شوبک" اور "کرک" سے چلی آ رہی تھی، یہ فوج مقامی نصرانیوں کی کمک کے لیے بھیجی گئی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی منزل تک پہنچتی سلطان کے ہراول نے اسے جا لیا۔ ایک خون ریز جھڑپ کے بعد فرنگی بھاگ نکلے، ان کے بیسیوں افراد قتل ہوئے جبکہ سو کے قریب گرفتار ہو گئے۔ مسلمانوں کا صرف ایک آدمی کام آیا۔

ادھر سلطان جب بیسان پہنچے تو دیکھا عیسائی یہ علاقہ چھوڑ کر جا چکے ہیں، وہ بھاری بھر کم سامان کے سوا سب کچھ لاد کر لے گئے تھے، سلطان کی فوج نے وہاں باقی ماندہ ذخائر کو لوٹ لیا اور جو سامان اٹھا کر لے جانا ممکن نہ تھا اسے نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد سلطان عین جالوت کے مشہور چشمے کے کنارے ٹھہر کر نصرانیوں کی ٹوہ لینے لگے۔ [1]

فولہ کا معرکہ: 11 جمادی الثانیہ کو سلطان نے صفوریہ میں عیسائی افواج کے زبردست اجتماع کی خبر سنی جو فولہ (بالفور) کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سلطان نے بلا تاخیر ادھر کا رخ کیا۔ عیسائی بھی بڑھے چلے آ رہے تھے، یہ پندرہ ہزار پیادے، پندرہ سو نیزہ باز اور پندرہ سو گھڑسوار تھے۔ لین پول کے مطابق اس فوج میں یورپ اور شام کے بڑے بڑے سورما اور بہادر شامل تھے، عیسائی اتنی بڑی تعداد میں پہلے کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔

فولہ سے کچھ فاصلے پر دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں نصرانیوں کے بہت سے افراد قتل اور بہت سے زخمی ہو گئے پھر بھی وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے مگر کچھ دیر بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ کھلے میدان میں شکست یقینی ہے چنانچہ انہوں نے منظم انداز میں پسپائی شروع کر دی۔ سلطان کے سپاہی ان کا تعاقب کر کے حملے کرتے رہے مگر نصرانیوں کے پیادہ اور سوار ایک دوسرے کی ڈھال بن کر کسی خاص نقصان کے بغیر مسلسل ایک طرف بڑھتے رہے۔ یاد رہے کہ اس دور میں پیش قدمی یا پسپائی میں صلیبیوں کا انداز بڑا منظم ہوتا تھا۔ اس تکنیک میں وہ مسلمانوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کی رفتار بڑی سست ہوتی تھی مگر لشکر اس طرح چلتا تھا کہ کوئی سپاہی اپنی جگہ سے ذرا بھی ادھر اُدھر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی قد آدم ڈھالیں اس انداز میں تان کر چلتے تھے کہ پورا لشکر لوہے کی ایک چادر میں چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا اور دائیں بائیں سے تیر اندازی یا گھڑسواروں کی نیزہ بازی ان میں کوئی رخنہ نہیں ڈال سکتی تھی۔

صلیبی لشکر اسی طرح سرکتا ہوا اپنی چھاؤنی تک پہنچ گیا جو ایک چشمے کے کنارے پہاڑ کے دامن میں

[1] الروضتین: 3/185، سلطان صلاح الدین: 1/162

تھی اور اس کے تین اطراف میں چوڑی اور گہری خندق کھودی گئی تھی۔ مسلمان جب وہاں پہنچے تو صلیبی محفوظ دفاعی ہیئت میں تھے۔ پشت پر پہاڑ کی وجہ سے ان کا عقب بھی محفوظ تھا۔ سلطان نے اس حالت میں ان پر حملہ کرنا بے سود سمجھا اور کچھ فاصلے پر رک کر انہیں موقع دیا کہ وہ تیار ہو کر نئی صف بندی کے ساتھ مقابلے پر آئیں مگر نصرانیوں نے آخر تک دفاعی حکمت عملی اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلطان کے سپاہیوں کی تیراندازی، سنگ باری اور مقابلے پر ابھارنے والے نعروں کے باوجود وہ اپنی جگہ جمے رہے۔ اردگرد کی بستیوں پر مسلمانوں کے شب خون کا سلسلہ بھی انہیں مقابلے پر برانگیختہ نہ کر سکا۔ اگرچہ اس جگہ ان کے پاس کمک و رسد کا کوئی انتظام نہ تھا اس لیے سلطان کی جانب سے باقاعدہ محاصرے کی صورت میں ان کے سخت مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں مگر اس کے باوجود وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ تھے نہ لڑنے پر۔ دراصل انہیں یہ اطمینان تھا کہ کم از کم اس حالت میں مسلمان ان پر حملہ نہیں کر سکیں گے اور شاید انہیں جلد ہی کسی اور مہم پر جانا پڑے گا لہٰذا وہ زیادہ دنوں تک انتظار بھی نہیں کر سکیں گے۔

لین پول نے فرنگیوں کے میدان میں نکل کر داد شجاعت نہ دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ عیسائی امراء میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ ممکن ہے ایسا بھی ہوا ہو۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ یورپ کے صلیبی کھلے میدان میں مسلمانوں کی ہم پلہ فوج سے لڑنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ یہ ان کا خاص انداز جنگ تھا کہ وہ جہاں چھاؤنی لگاتے وہاں مدتوں جمے رہتے۔ اپنے پڑاؤ کو خندقوں، مٹی کی قد آدم دیواروں اور چپے چپے پر تیراندازوں کے ذریعے اس قدر محفوظ بنا لیتے تھے کہ ان پر شب خون مارنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ یہ تدابیر وہ عموماً طاقتور دشمن کے مقابلے میں اختیار کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا دفاعی ہیئت کو نہیں چھوڑتے تھے۔ ہاں جب دیکھتے کہ دشمن کمزور یا غافل ہو گیا ہے تو پھر طوفان کی طرح کھلے میدان میں نکل آتے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ تیسری صلیبی جنگ میں بھی یورپی نصرانیوں نے جگہ جگہ اسی انداز سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔

بہرکیف عیسائی امراء محصور رہے۔ ان کا اندازہ درست تھا کہ مسلمان زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ پانچ دن تک ان کی طرف سے حملے کے منتظر رہنے کے بعد جمعرات 16 جمادی الثانیہ 579ھ (15 اکتوبر) کو سلطان نے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ واپسی کا اصل مقصد یہ تھا کہ دشمن کچھ ہمت کر کے میدان میں آجائے۔ چنانچہ سلطان نے کچھ فاصلے پر جا کر کوہ طور کے دامن میں پڑاؤ ڈال دیا اور خندق کی پناہ لینے والے نصرانیوں کی نقل و حرکت کے منتظر رہے مگر جوں ہی نصرانیوں نے سلطان کو غائب پایا، وہ پہاڑی سلسلے اور خندق کے حصار سے نکل کر اپنے شہروں کی طرف بھاگے۔

سلطان نے اپنا پڑاؤ چھوڑ کر ان کا تعاقب کیا اور بار بار کوشش کی کہ کسی طرح وہ رک کر باقاعدہ کھلے میدان کی جنگ پر آمادہ ہوں مگر عیسائی رکے بغیر بھاگتے چلے گئے اور فولہ (بالفور) کے قلعے میں جا کر دم لیا۔ وہاں سے وہ اپنے اپنے علاقوں کو لوٹ گئے۔

سلطان نے اس مہم میں جنین، عفربلا، زرعین اور بیسان سمیت نصرانیوں کی متعدد بستیاں ویران کر ڈالیں اور کامیاب وکامران ہو کر جمعرات 24 جمادی الاخریٰ 579ھ (13/اکتوبر 1183ء) کو دمشق واپس پہنچے۔ [5]

قاضی بہاؤالدین شداد سلطان کی اس طوفانی مہم کا ذکر کر کے کہتے ہیں:

''اس ہمت وحوصلے کو دیکھئے کہ حلب کی فتح وکامرانی بھی سلطان کو جہاد سے بے فکر نہ رکھ سکی، بلکہ سلطان رحمہ اللہ کا شہروں کی فتح سے صرف یہ مقصد تھا کہ جہاد کی قوت حاصل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں آخرت میں ایسا ہی بہترین بدلہ عطا کرے جیسا کہ دنیا میں انہیں اپنے پسندیدہ اعمال کی توفیق عنایت کی ہے۔'' [6]

کرک کی مہم: بیسان میں نصرانیوں کی شرمناک پسپائی کے بعد سلطان صلاح الدین نے اذرعات کے علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا اور پوری تیاری کر کے رجب 579ھ (نومبر 1183ء) میں کرک کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، اس کے گرد نوے فٹ گہری خندق تھی۔ خندق کے اردگرد شہری آبادی تھی۔ بزدل ریجی نالڈ میں باہر نکل کر مقابلے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ حسب عادت محصور ہو گیا۔ سلطان کی فوج نے آبادی پر قبضہ کر لیا مگر خندق کو عبور کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ سلطان کے حکم سے سات منجنیقیں وہیں نصب کر دی گئیں اور فصیل پر بھاری پتھر پھینکے جانے لگے۔ سلطان نے اپنا خیمہ پڑاؤ سے آگے منجنیقوں کے قریب لگوا لیا تھا تاکہ سنگ باری کے نتائج کا بذات خود مشاہدہ کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تیر اندازوں کے گروہوں کو اس ترتیب سے قلعے کے گرد پھیلایا کہ جونہی محصور عیسائی قلعے کے جھروکوں سے جھانکتے تیروں کا نشانہ بن جاتے۔ اس کے باوجود قلعہ سر ہونے کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شدید سردی شروع ہو چکی تھی۔ کچھ نصرانیوں کے ''الوالہ'' میں جمع ہونے کی خبریں بھی ملنے لگیں تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان منجنیقوں کی کارکردگی سے اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ ہتھیار اتنے بڑے قلعے کو کبھی سرنگوں نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے مزید تیاری کی ضرورت ہے۔ سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ وہ تھک چکے تھے جبکہ سلطان شعبان کے ختم ہونے سے قبل واپس جا کر ماہ

[5] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/124_187، مفرج الکروب: 1/151_153 [6] النوادر السلطانیہ، ص 110

مبارک یکسوئی کے ساتھ عبادت میں گزارنا چاہتے تھے۔ ان وجوہ کی بناء پر سلطان نے محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا، انہوں نے امرائے فوج کو حوصلے بلند رکھنے کے لیے انہیں کہا:

''یہ محاصرہ طویل ہوتا جا رہا ہے، ہم قلعے کی ناکہ بندی کر چکے ہیں، اس محنت کے ضائع ہونے کا ڈر نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس قلعے پر اس وقت تک حملے کرتے رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ اس کی فتح کو آسان نہیں کر دیتا۔ اب جبکہ فرنگی ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں انہیں ہماری فوج ہی جا کر منتشر کر سکتی ہے۔''

امرائے فوج کو محاصرہ اٹھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کے باوجود سلطان ماہ رجب کے آخر تک وہیں ٹھہرے رہے۔ شعبان میں انہوں نے دمشق کا رخ کیا۔

الوالہ میں جمع ہونے والے فرنگیوں کی پھر کوئی سن گن نہ ملی، شاید وہ سلطان کے خوف سے منتشر ہو گئے تھے۔ سلطان 14 شعبان 579ھ (یکم دسمبر 1183ء) کو دمشق پہنچ گئے۔ [5]

مصر اور شام کی نئی عہدے داریاں ❀ الملک العادل سلطان کا بھائی اور قابل اعتماد ساتھی تھا۔ سلطان اس کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ سلطان کے مستقل طور پر شام منتقل ہو جانے کے بعد زمینی فاصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ الملک العادل سے بہت سے امور میں مشورہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لیے سلطان چاہتے تھے کہ الملک العادل کو شام بلا لیا جائے۔ حلب کی فتح کے بعد یہ ضرورت اور بڑھ گئی تھی، اس لیے کہ نور الدین زنگی کے پایۂ تخت کا انتظام سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا، پھر سلطنت میں بہت سے نئے علاقوں کی شمولیت نے انتظامی مشکلات بڑھا دی تھیں۔ سلطان یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ بیت المقدس کی آزادی کے لیے فیصلہ کن جنگ کا وقت قریب آ چکا ہے اور اس کے لیے انہیں انتظامی معاملات کا بوجھ کم کرنے کی ضرورت ہے، یہ سہولت الملک العادل جیسے رفیق کار ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی تھی۔

ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے سلطان نے حلب کی فتح کے بعد طے کر لیا تھا کہ اپنے بھائی کو مصر سے بلا لیں گے مگر چونکہ مصر کی حکومت سے محرومی کی صورت میں الملک العادل کی دل شکنی یقینی تھی اس لیے سلطان یہ بھی سوچ چکے تھے کہ اسے حلب کی عظیم الشان ولایت دے کر اس کی حوصلہ افزائی کر دیں گے۔ اگرچہ حلب کی ولایت تقی الدین عمر کو دی جا چکی تھی اور نیابت کے طور پر وہاں سلطان کا لڑکا الملک الظاہر غازی تمام امور کا ذمہ دار تھا مگر سلطان نے الملک العادل کو راضی رکھنے کے لیے اپنے بیٹے کو آزمائش میں ڈالنا قبول کر لیا تھا۔ تقی الدین عمر کے بارے میں وہ بہرحال کوئی اور حوصلہ افزا فیصلہ

[5] مفرج الکروب: 153/1_154، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 190/3، الکامل فی التاریخ: 305/7

کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس کی خدمات اسی لائق تھیں۔

اس موقع پر قاضی فاضل کی فراست کام آئی اور انہوں نے سلطان کو مخمصے میں پڑا دیکھ کر مشورہ دیا کہ تقی الدین عمر کو مصر کا والی بنادیا جائے۔ سلطان کو یہ مشورہ پسند آیا۔ انہوں نے طے کرلیا کہ مصر تقی الدین کو اور حلب الملک العادل کو دے دیا جائے۔ جہاں تک ان کے اپنے لڑکے الملک الظاہر کا تعلق تھا سلطان کو اس کی دل شکنی کا یقین تھا مگر وہ اپنے اس سب سے باصلاحیت اور ہونہار بیٹے کی خوشی کو ملکی مصالح کے لیے قربان کررہے تھے۔ انہیں اعتماد تھا کہ ان کا فرماں بردار بیٹا یہ کڑوا گھونٹ خاموشی سے پی لے گا۔

آخر سلطان نے حلب کی فتح کے کچھ دنوں بعد الملک العادل کو لکھ بھیجا کہ وہ اپنے اہل خانہ، سپاہیوں، خادموں اور مال ودولت سمیت شام چلا آئے۔ اس خط میں انہوں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ ان کا حلب کی حکومت کے بارے میں کیا ارادہ ہے۔ الملک العادل کے لیے یہ حکم نہایت گراں تھا تاہم اس نے بھی دل میں یہی سوچا کہ اگر سلطان مصر کی حکومت اس سے واپس لیتے ہیں تو اسے حلب کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اس شش وپنج میں اس نے سلطان کے وزیر قاضی فاضل کو خط لکھ کر مشورہ مانگا کہ آیا مصر کے بدلے حلب کا مطالبہ کرنا درست ہوگا؟

قاضی صاحب نے جواباً تحریر کیا:

"آپ ایک برستا بادل ہیں جسے اللہ تعالیٰ جس طرف موڑتا ہے وہ مڑ جاتا ہے۔ سلطان دنیا کی سیاست کا زیادہ علم رکھتے ہیں اور اس کی تدبیر وہی بہتر سمجھتے ہیں۔"

<u>حلب الملک العادل کے حوالے</u> ﷺ اب الملک العادل نے شام منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا اور کسی ولایت کا مطالبہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ادھر سلطان نے کرک کے محاصرے سے پہلے الملک العادل کو پھر لکھا کہ وہ کرک کے باہر ان سے آملے۔ رجب 579ھ (نومبر 1183ء) میں جب سلطان کرک کے محاصرے میں مشغول تھے، الملک العادل مصر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے خاندان، مال واسباب اور خدام کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ تب اسے امید ہورہی تھی کہ سلطان کرک کا قلعہ اس کے حوالے کردیں گے مگر جب محاصرہ ناکامی پر ختم ہوگیا اور سلطان اسے اپنے ساتھ لے کر دمشق روانہ ہوئے تو الملک العادل اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش کا شکار ہوگیا۔

سلطان نے بھی اب تک اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ شاید وہ الملک العادل کی وفاداری کا ایک کڑا امتحان لے رہے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ الملک العادل مصر کے سرکاری خزانے سے جو مال ودولت ساتھ لایا ہے، وہ توقع سے کم ہے۔ انہوں نے ایک رات الملک العادل کو

اپنے پاس بلوایا اور کہا:

''مرکز کو مصر کے خزانے سے ڈیڑھ لاکھ دینار قرض درکار ہے جو مالی حالات بہتر ہونے پر ادا کر دیا جائے گا۔''

''بہت بہتر'' الملک العادل یہ جواب دے کر چلا آیا اور ایک رقعہ لکھا:

''سب مال و دولت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، میں آپ کا غلام ہوں، چاہتا ہوں کہ یہ ساری دولت سلطان کی خدمت میں چلی جائے، بس مجھے حلب کا شہر اور قلعہ معاوضے میں دے دیا جائے۔''

سلطان نے اس کے جواب میں لکھا:

''اللہ کی قسم! میں نے تمہیں حلب کی حکومت دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔ جب تمہارے دل میں بھی یہی خیال آرہا ہے تو گویا اس بات پر ہم دونوں متفق ہیں۔''

اب الملک العادل پوری طرح مطمئن ہوگیا۔ دمشق پہنچ کر سلطان نے اپنے بیٹے الملک الظاہر کو حلب چھوڑنے کا حکم دیا۔ 2 رمضان 579ھ (19 دسمبر 1183ء) کو انہوں نے حلب کی سندِ ولایت الملک العادل کے حوالے کردی۔ الملک العادل نے اسی دن حلب کی طرف کوچ کر دیا۔

اس سے قبل سلطان نے تقی الدین عمر کو مصر کا پروانہ ولایت دے کر اسی مصری فوج کے ساتھ جو الملک العادل کے ساتھ آکر کرک کے محاصرے میں شریک رہی تھی، مصر روانہ کر دیا تھا۔ تقی الدین عمر شعبان ہی میں مصر پہنچ گیا تھا اور امورِ حکومت کو بحسن و خوبی انجام دینے لگا تھا۔

ادھر الملک الظاہر نے باپ کے فیصلے کو خاموشی سے مان تو لیا تاہم وہ دلی طور پر بے حد رنجیدہ تھا، اسے حلب آئے ہوئے چھ ماہ ہی گزرے تھے، یہ شہر اسے بے حد پسند تھا، اس کی آب و ہوا اور خوشنمائی نے اسے بے حد متاثر کیا تھا اور وہ ہمیشہ یہیں رہنا چاہتا تھا، حلب چھوڑتے ہوئے اپنی کیفیت کو ایک موقع پر اس نے خود یوں بیان کیا:

''جب مجھے اطلاع ملی کہ سلطان نے حلب میرے چچا الملک العادل کو دے دیا ہے تو مجھے اتنا غم ہوا جسے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا، میں نے تمنا کی کہ کاش میں نے حلب دیکھا ہی نہ ہوتا اور اس میں داخل نہ ہوا ہوتا کیوں کہ میں دل سے اس شہر سے محبت کرتا تھا اور اسے پسند کرتا تھا، اس کی آب و ہوا مجھے موافق آئی تھی۔ جب میں نے حلب چھوڑا تب بھی میرا دل وہیں اٹکا ہوا اور اسی کی جانب مائل تھا۔''

بہرکیف ایک نیک بیٹے کی طرح اس نے باپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ الملک العادل جمعہ 22 رمضان کو حلب کے قلعے میں داخل ہوا اور نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ الملک الظاہر اپنے دست راست سیف الدین یازکوج کے ساتھ حلب کو الوداع کہہ کر دمشق روانہ ہوگیا۔ 18 شوال 579ھ (3 فروری 1184ء) کو وہ سلطان کی خدمت میں حاضر تھا۔

سلطان کو اپنے بیٹے کے دل کا حال اچھی طرح معلوم تھا، وہ اس کی بہادری، فرمانبرداری اور حکومتی امور میں بصیرت کے باعث سب بیٹوں سے زیادہ پیار کرتے تھے مگر فی الحال وہ اس کا دل توڑنے پر مجبور تھے۔ الملک الظاہر کی سعادت مندی تھی کہ وہ حسب سابق پوری توجہ، فرض شناسی اور وفاشعاری کے ساتھ باپ کی طرف سے مجوزہ خدمات انجام دیتا رہا۔ [5]

---

[5] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 190/2_198، الکامل فی التاریخ: 306/7

فصل:5

عراق کے امراء کا سلطان کی طرف جھکاؤ

شوال اور ذی قعدہ 579ھ (فروری، مارچ 1184ء) میں سلطان صلاح الدین کو ایک اور بڑی سیاسی کامیابی حاصل ہوئی۔ موصل کی حکومت کے ماتحت کئی صوبے دار سلطان کی طرف جھکنے لگے، دراصل جب سے حاکمِ موصل عزالدین مسعود نے اپنے وزیر اعظم مجاہد الدین قائماز کو قید کیا تھا، سلطنت میں افراتفری پھیل گئی تھی اور باقی ماندہ امراء بھی ایک مدبر اور مخلص سیاست دان کا یہ انجام دیکھ کر اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے لگے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سلطان کا وہ اعلامیہ نقل کر دیا جائے جو اس موقع پر نشر کیا گیا تھا جس سے سلطان کے اعلیٰ وارفع مقاصد اور عزائم کی وضاحت ہوتی ہے، اس اعلامیہ میں درج تھا:

''جب اللہ نے ہمیں زمین میں حکومت عطا کی اور فرض کی ادائیگی کے لیے حق کی تعظیم اور اظہار کی توفیق بخشی تو ہم نے جہاد فی سبیل اللہ کو ہر چیز پر ترجیح دینا ضروری سمجھا۔ پس ہم نے اس کا راستہ واضح کیا، دین کی سربلندی کے لیے جٹ گئے اور اس کے حامیوں کی مدد کرنے لگے۔ ہم نے عالم اسلام میں اللہ کے دوستوں کو اللہ کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے لیے بلایا اور زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مسلمانوں کی رائے کو متفق کیا تاکہ اللہ کی مدد آسمان سے نازل ہو۔ پس جو اس فرض کی ادائیگی اور اس فضیلت کے حصول کے لیے ہماری مدد کرے گا وہ اچھی کارکردگی کی بدولت ہماری بڑی عنایات کا حقدار ہوگا اور جو دنیا کی طرف جھکا اور خواہش نفسانی کا پیروکار بنا اور باطل کی طرف متوجہ ہو کر دین حق سے بے پروا ہوا، اگر وہ باز آ گیا تو ہم عذر قبول کرلیں گے، اگر وہ اپنی سرکشی پر ڈٹا رہا تو ہم اپنا دست حمایت ہٹا کر اسے الگ کر دیں گے۔''●

سنجر شاہ کا اظہارِ اطاعت: موصل کے منحرف امراء میں معز الدین سنجر شاہ سب سے نمایاں تھا۔

● البرق الشامی: 163/5

موصل کے سابق حکمران سیف الدین غازی دوئم کا بیٹا تھا اور خود کو موصل کے تخت و تاج کا اصل وارث تصور کرتا تھا۔ اس سوچ میں وہ کسی حد تک حق بجانب بھی تھا اس لیے کہ اس کے باپ نے اپنے بعد بطور حکمران اسی کو نامزد کیا تھا مگر پھر اس کی کم عمری کو دیکھ کر امرائے سلطنت نے اس کے چچا عزالدین مسعود کو حکمران چن لیا۔ تب سے سنجر شاہ اپنے چچا کے ماتحت صرف الجزیرہ کا والی چلا آرہا تھا، مگر اس کے دل میں برابر یہ خیال جما ہوا تھا کہ چچا اس کے حق کا غاصب ہے۔

چونکہ اس میں اپنے چچا سے سلطنت چھیننے کی ہمت تھی نہ ہی وہ خود مختاری کا دعویٰ کرسکتا تھا اس لیے اس نے سلطان صلاح الدین سے تعلق استوار کر کے اپنے چچا کے اقتدار کو کمزور کرنے کا سوچا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ سلطان ایوبی کی سرپرستی میں آکر وہ اپنے چچا کے کسی بھی انتقامی اقدام سے محفوظ رہے گا۔ چنانچہ حلب پر سلطان کے قبضے کے بعد دولتِ ایوبی کو مضبوط تر دیکھ کر وہ ادھر مائل ہوگیا۔ معزالدین سنجر شاہ کے علاوہ اربل کے والی زین الدین یوسف اور تکریت اور الحدیثیہ کے حکام نے بھی اپنے اپنے سفیر سلطان کی خدمت میں بھیج دیے کہ انہیں موصل کی بجائے دمشق کے وفاداروں میں شامل کرلیا جائے۔ سلطان نے اسے بخوشی قبول کرلیا۔ [1]

<u>حکومت موصل کی سفارت</u>: امراء اور والیان حکومت کے انحراف سے عزالدین مسعود بڑا اسٹپٹایا۔ اس نے فوری طور پر دربار خلافت سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو سلجھائے۔ خلیفہ ناصر نے شیخ الشیوخ صدرالدین اور شہاب الدین بشیر کو اس قضیے کے حل کے لیے سلطان صلاح الدین کے پاس بھیج دیا۔ ان کے ساتھ موصل کے سفیر قاضی محی الدین ابن کمال بھی تھے۔ سلطان دربار خلافت کے معزز سفیروں کے اعزاز میں استقبال کے لیے خود نکلے۔ انہیں دیکھ کر سواری سے اتر پڑے، بغداد کے سفیر بھی سواریوں سے اتر کر سلطان سے ملے۔ سلطان نے مذاکرات سے قبل ان کی خوب خاطر مدارت کی۔ قاضی بہاؤالدین ابن شداد جو بعد میں سلطان کے خاص مصاحب بنے، ان دنوں حکومت موصل کی خدمات انجام دے رہے تھے، وہ اس موقع پر موصل کے سفارتی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے پہلی بار سلطان سے ملے اور سلطان کے اخلاق و انداز جہانبانی سے بے حد متاثر ہوئے۔ سلطان نے بھی ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا اور نہ صرف ان کی خدمات حاصل کرنے کے امکان کو ذہن میں رکھ لیا تھا بلکہ شیخ الشیوخ صدرالدین کی وساطت سے انہیں مصر میں ایک اعلیٰ منصب کی پیش کش بھی کی مگر قاضی ابن شداد نے معذرت کردی۔ [2]

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/196، بیصار الیاد لی: 1/162 [2] ایضاً

شیخ صدر الدین کو صدمہ: شیخ الشیوخ صدر الدین ایک طرف تو موصل کے سفیر قاضی محی الدین کمال کے بچپن کے دوست تھے، دوسری طرف ان کے سلطان صلاح الدین کے ساتھ بھی بہت اچھے مراسم تھے، اس لیے وہ اس معاملے کو سلجھانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ سلطان خلافت کے وفادار اور اتحادِ امت کے علمبردار ہیں اس لیے دربارِ خلافت کی جانب سے وہ حکومتِ موصل کے سفارشی بن کر آنے کے باوجود اس معاملے کا زمینی حقائق کے مطابق بہتر تصفیہ کرانا چاہتے تھے۔ مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ان کا جواں سال بیٹا احمد جو سفر میں ان کے ساتھ تھا، بیمار پڑ گیا اور پھر دمشق پہنچنے کے دوسرے دن اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس سے قبل ان کے اور بھی کئی بیٹے انہیں جدائی کا غم دے چکے تھے۔ اب اس جوان بیٹے کی ناگہانی موت نے شیخ الشیوخ کو بالکل نڈھال کر دیا۔

سلطان صلاح الدین اور دمشق کے امراء تعزیت کے لیے ان کے پاس آئے اور حتی الامکان تسلی دی تاہم شیخ الشیوخ کی طبیعت اتنی گر گئی تھی کہ وہ اب دو حکومتوں کے درمیان نازک سیاسی معاملات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے یکسو نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جب مذاکرات شروع ہوئے تو شیخ الشیوخ صدر الدین اس میں کوئی کردار ادا نہ کر سکے۔

ان دنوں سلطان کے دربار میں دیگر کئی حکمرانوں کے سفیر آئے ہوئے تھے جن میں عجم کے حاکم طغرل بن پہلوان، قزل برادر پہلوان، حاکمِ خلاط ارمن شاہ، حاکمِ سنجار عماد الدین اور ایشیائے کوچک کے بادشاہ قلیج ارسلان کے نمائندے بھی تھے۔ ان سب کے خطوط اہم مندرجات پر مشتمل تھے جن کے جوابات کے لیے سلطان کو الملک العادل کا مشورہ لینا ضروری محسوس ہوا۔ الملک العادل حلب کے حکومتی انتظامات کو اچھی طرح ترتیب دے چکا تھا، سلطان کا پیغام ملتے ہی وہ 17 ذی قعد 579ھ (2 مارچ 1184ء) کو حلب سے چل پڑا۔ پیر 4 ذی الحجہ (19 مارچ) کو اس کے دمشق پہنچتے ہی سلطان نے اسے بلوا کر یہ تمام خطوط اور اپنی طرف سے ان کے لیے لکھوائے گئے جوابات سنوائے اور اس کے اظہارِ اطمینان کے بعد اسے واپس حلب بھیج دیا۔[1]

سفیرِ موصل کا جارحانہ رویہ: موصل کے سفیر محی الدین بن کمال شہرزوری ایک خالص علمی شخصیت تھے اور سفارتی امور کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے حکومتِ موصل کا موقف سخت انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا:

"سلطان کو موصل کے ان امراء سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے جو اپنی حکومت سے منحرف ہو کر

[1] البرق الشامی: 164/5

سلطان سے ساز باز کر رہے ہیں۔ سلطان کو حکومت موصل سے اپنے معاہدے کی تجدید کر کے اس کا مددگار بن جانا چاہیے۔ سلطان کو چاہیے کہ حکمرانِ موصل جس سے صلح کرے سلطان بھی اس سے صلح کر لیں اور جس حکومت سے حکمرانِ موصل کی جنگ ہو، سلطان بھی اس سے برسرِ پیکار ہوں۔"

سفیر کا مقصد یہ تھا کہ چوں کہ منحرف امراء موصل کی حکومت کے باغی ہو چکے ہیں لہٰذا سلطان کو موصل سے دوستی نبھاتے ہوئے ان امراء کے خلاف موصل کا ساتھ دینا چاہیے اور انہیں نہتا کر کے دوبارہ موصل کی اطاعت پر مجبور کرنا چاہیے۔ موصل کے سفیر کا جارحانہ اندازِ گفتار ایک برتر ذہنیت کی عکاسی کر رہا تھا۔ گویا اہلِ موصل سلطان کو اپنا حلیف نہیں ماتحت حکمران تصور کر رہے تھے۔ تاہم سلطان نے پوری بشاشت سے ان کا موقف سنا اور سفیرِ بغداد کی سفارش کی وجہ سے انہیں نہایت نرم جواب دیا۔ سلطان نے کہا:

"میں آپ کا مطالبہ آپ کی مرضی کے مطابق پورا کر دیتا ہوں مگر میں ان امراء کو (جنہیں موصل کی حکومت سلطان کی حمایت کی وجہ سے اپنا باغی قرار دے رہی تھی) باہمی مدد و نصرت کا حلف دے چکا ہوں۔ لہٰذا معاہدہ اس طرح طے ہونا چاہیے کہ ان امراء کو مستثنیٰ کر دیا جائے۔"

سلطان کا مقصد یہ تھا کہ دیگر حکومتوں سے صلح و جنگ کی مشترکہ پالیسی چونکہ اب تک طے نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس کا نفاذ آئندہ کے لیے تو ضرور ہو، مگر ان حکام کو خارج از بحث رکھا جائے جو اس سے قبل کسی فریق سے معاملات طے کر چکے ہیں۔ موصل کے سفیر نے اس سے بھی اتفاق نہ کیا اور اصرار کیا کہ صلح نامے میں موصل کے منحرف امراء کے بارے میں، یہ وضاحت کرنا لازمی ہے کہ وہ اب موصل کے ماتحت رہیں گے۔ سلطان نے اسے تسلیم کرنے میں توقف کیا۔ چنانچہ مذاکرات میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ ۵

عماد اصفہانی کا مشورہ: سلطان کے کاتب شیخ عماد اصفہانی کہتے ہیں کہ ایک دن علی الصبح سلطان نے مجھے بلایا اور کہا:

"مجھے معاہدے کے لیے ایسا نکتہ لکھ دیں جو باہمی اتحاد کے لیے لائحہ عمل بن جائے۔"

مگر عماد اصفہانی اس موضوع پر ایک دوسرے انداز سے غور کر رہے تھے۔ وہ سلطان کی جانب سے غیر معمولی نرمی کو نقصان دہ سمجھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ سلطان اپنے حمایتی امراء کی بھرپور وکالت کریں، چاہے وہ امراء پہلے موصل کے ماتحت رہے ہوں یا کسی اور حکومت کے۔ سلطان کو بہر حال اپنا یہ اختیار واضح کر دینا چاہیے کہ وہ کسی بھی خود مختار یا نیم خود مختار حاکم سے معاملات طے کرنے میں آزاد ہیں اور اسی طرح دوسرا فریق بھی ان کی حمایت اور مخالفت میں آزاد ہے۔ شیخ عماد اصفہانی کا خیال تھا کہ

۵ صلاح الدین الایوبی للصلابی، ص: ۱۵۵/۲

اگر سلطان نے اپنے حلیف امراء کی وکالت میں کمزوری دکھائی تو آئندہ کے لیے ان امراء کا اعتماد اٹھ جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے سلطان کی بات پر توجہ دینے سے پہلے ایک چبھتا ہوا سوال کر ڈالا اور کہا:

''آپ اپنی حمایت کرنے والے امراء کو کیسے خارج از بحث قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ ان امراء کو یقین ہے کہ ان کا آپ سے پختہ معاہدہ ہو چکا ہے۔ انہیں آپ کے وعدے پر اعتماد ہے۔ ادھر اہل موصل کی یہ حالت ہے کہ وہ آپ کی جانب سے معاہدے میں کسی کے استثناء پر راضی نہیں ہیں اور اس سے مسلسل انکار کر رہے ہیں۔ اس صورتحال میں اگر کوئی معاہدہ طے پا بھی گیا تو کیا آپ پر دوستوں سے بے وفائی کا الزام نہیں لگے گا؟ اور کیا یہ معاملہ دوستوں اور دشمنوں میں شہرت نہ پائے گا؟''

یہ سن کر سلطان نے معاملہ عماد اصفہانی ہی کے سپرد کرتے ہوئے کہا:

''اچھا آپ مجھے صرف ایک بات تحریر کر دیں جس سے مجھ پر کسی سے وعدہ خلافی کا الزام نہ لگے اور حلیفوں سے سابقہ معاہدے بھی برقرار رہیں۔''

وہ بولے:

''آپ حکمرانِ موصل سے تو دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کا معاہدہ کریں اور دیگر حکمرانوں کے معاملے کو انہی کے اختیار پر چھوڑ دیں۔ معاہدے میں طے کریں کہ دیگر امراء میں سے جو چاہے حاکم موصل کی سرپرستی میں آجائے اور جو چاہے ہماری اطاعت قبول کرلے۔''[1]

سلطان مطمئن ہو کر بولے:

''تم اسی وقت معاملے کو اسی انداز میں شیخ الشیوخ صدرالدین کے سامنے پیش کرو اور انہیں بتاؤ کہ اس طرح معاملہ طے پا جانے میں حکمرانوں اور عوام دونوں کی مصلحت ہے۔ پھر موصل کے سفیر قاضی شہرزوری کو اس سے آگاہ کر کے بتاؤ کہ ہم اس انداز میں معاہدے اور حلف پر تیار ہیں۔''

<u>مذاکرات کا نتیجہ</u>: عماد اصفہانی نے شیخ الشیوخ کو معاملے کا یہ حل بتایا تو وہ مطمئن ہو گئے اور پرزور تائید کی مگر موصل کے سفیر نے اسے سنتے ہی کہا:

''ہم اسے قبول نہیں کرتے، یہ ایک محال بات ہے۔ ہمارے منحرف امراء جب یہ دیکھیں گے کہ آپ ان سے معاہدے پر قائم ہیں تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور وہ ہم سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ لہٰذا آپ ان کی مدد نہ کیجئے۔ آپ ان سے یہ کہہ کر معذرت کرلیں کہ ہم نے تمہیں اس وقت سرپرستی میں قبول کیا تھا جب موصل سے ہمارے تعلقات بگڑے ہوئے تھے مگر اب

ہماری ان سے مکمل صلح ہو چکی ہے لہٰذا تم بھی سابقہ دستور کے مطابق رہو۔"[1]

اس پر سلطان کے نمائندوں نے کہا:

"ہم نے پوری احتیاط کے ساتھ تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے شرائطِ معاہدہ مرتب کی ہیں۔ آپ مزید تاخیر کے بغیر ان پر ہم سے حلف لے لیں اور ناممکن باتوں کی راہ اختیار نہ کریں۔"

مگر قاضی شہرزوری اس موقف پر ڈٹے رہے کہ منحرف امراء کو تمام حکمرانوں سے قطع تعلق کرتے ہوئے صرف حکومت موصل کی حلقہ بگوشی اختیار کرنا ہوگی۔ اس غیر لچکدار رویے کی وجہ سے مذاکرات کسی نتیجہ کے بغیر ختم ہو گئے۔

سلطان نے مذاکرات کی ناکامی کے باوجود موصل کے سفیروں کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ انہیں افسوس تھا کہ شیخ الشیوخ جیسے بزرگوں کی تشریف آوری کے باوجود بات چیت ثمر آور نہیں ہوئی۔[2]

<u>سلطان کی مروت</u>: شیخ الشیوخ صدرالدین اور موصل کے سفیر دمشق سے نکل کر شہر کے باہر قصیر کے مقام پر خیمہ زن تھے کہ سلطان صلاح الدین نے اپنے مشیروں سے کہا:

"مجھے شرم آرہی ہے کہ شیخ الشیوخ صدرالدین جب بھی کسی معاہدے کے لیے سفارشی بن کر آئے انہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ شیخ کی بات من و عن مان لوں، معاہدے کی عبارت وہ جس طرح چاہیں لکھوادیں۔ کیوں کہ بہرحال ایسے بزرگوں کو رضامند کرنا ضروری ہے۔"

کاتب عماد اصفہانی نے اسی وقت جاکر شیخ الشیوخ کو سلطان کے اس ارادے سے آگاہ کردیا۔ کچھ دیر بعد سلطان خود اپنے خاص امراء کے ساتھ شہر سے نکلے اور شیخ الشیوخ کے خیمے میں حاضری دے کر انہیں بتایا کہ وہ دربارِ خلافت کے نمائندے کی رضامندی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ فریقین میں صلح کے لیے جس طرح پسند کریں معاہدے کی شقیں طے کردیں۔ شیخ الشیوخ نے سلطان کی اس وسعتِ ظرفی پر مسرت کا اظہار کیا اور قاضی شہرزوری کو سلطان کی اس فراخدلانہ پیش کش سے آگاہ کرکے گفت و شنید کے لیے حاضر ہونے کا کہا۔

مگر قاضی شہرزوری نے سلطان کی مروت دیکھ کر مزید نخوت کا مظاہرہ کیا اور سلطان کو کہلوایا: "ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد مجھے گفت و شنید کے لیے حاضر ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ شاید آپ نے سمجھ لیا ہے کہ ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمارے ایسے حامی ہیں جو ہماری خیر خبر لیتے ہیں اور ہماری حفاظت کرتے ہیں۔"

---

[1] البرق الشامی: 167/5 [2] ایضاً

قاضی شہرزوری کا اشارہ عراق کے حکمران شمس الدین پہلوان کی طرف تھا جو کہ حکومت موصل کا قریبی حلیف اور سلطان ایوبی کا سخت مخالف تھا۔ [1]

سلطان کو موصل کے سفیر کا یہ تلخ جواب سنایا گیا تو وہ مسکرا دیے۔ انہوں نے وفد کو عزت واحترام سے رخصت کیا اور خاموشی سے دمشق واپس چلے آئے۔ موصل کے سفیر کے طرز عمل نے انہیں باور کرا دیا تھا کہ ان بدعہدوں سے خیر کی توقع رکھنا فضول ہے۔ سلطان اس واقعے سے پہلے موصل کی آزاد اور خود مختار حیثیت بحال رہنے دینے پر مطمئن تھے اور وہاں کسی فوج کشی کا ارادہ نہیں رکھتے تھے مگر اب انہوں نے سوچ لیا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ موصل کا رخ کریں گے تاکہ اہل موصل کے غرور وتکبر کا بت پاش پاش کیا جا سکے۔ [2]

سفارت کی ناکامی کا یہ پہلو سلطان کے حق میں تھا کہ سلطان کی جانب سے اسے کامیاب کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی گئی تھی۔ اب اس کی ناکامی کی مکمل ذمہ داری خود موصل پر عائد ہوتی تھی جبکہ سلطان کا دامن بالکل بے داغ تھا۔ نقصان موصل ہی نے اٹھایا تھا کہ ان کے منحرف امراء اب بھی سلطان کے دامن سے وابستہ تھے۔ یوں سلطان کی سیاسی حیثیت مزید مضبوط ہو گئی تھی۔

<u>اہل موصل کی ساکھ مزید گر گئی</u>❁ نیا اسلامی ہجری سال 580ھ شروع ہوا تو شدید جاڑے کا موسم تھا اور بارشیں بھی خلاف معمول بکثرت ہو رہی تھیں، سرزمینِ شام میں ہر طرف جل تھل کا عالم تھا۔ [3]

ادھر عراق میں سلطان کے خلاف سازشیں ایک بار پھر زوروں پر تھیں۔ عزالدین مسعود نے مجاہد الدین قائماز کے بغیر نظام حکومت کو درہم برہم دیکھا تو اسے آزاد کر کے سابقہ عہدے پر بحال کر دیا اور اسے سلطان کے خلاف ایک نیا اتحاد بنانے کی مہم سونپی۔ اس مقصد کے لیے قائماز کو سب سے پہلے ہمدان کے حاکم شمس الدین پہلوان اور اس کے بھائی قزل کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ انہیں سلطان اور ان کے حامی امراء سے جنگ پر آمادہ کیا جا سکے۔

قائماز پہلے قزل کے پاس پہنچا جو آذربائیجان کا حاکم تھا اور اسے عراق کے ان امراء کے خلاف ابھارا جو دو ماہ پہلے سلطان کے حلقہ بگوش بنے تھے چنانچہ قزل تین ہزار کا لشکر ترتیب دے کر فوراً اربل پر حملہ آور ہوا جو سلطان کے نئے حامی زین الدین یوسف کا علاقہ تھا۔ قزل کے سپاہیوں نے اربل کے قریب پہنچتے ہی نواحی بستیوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا، گھر بار ویران کر ڈالے اور مرد وزن کو قیدی بنا لیا۔ <u>مجاہد الدین قائماز جو اس مہم میں قزل کے ساتھ تھا، سلطان صلاح الدین کا مخالف ہونے کے باوجود سلجھا</u>

1. البرق الشامی: 5/168
2. [illegible]: 1/163
3. کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/202

ہوا انسان تھا۔ اس نے قزل کو عوام پر دست اندازی سے منع کرنے کی بہت کوشش کی مگر قزل نے اس کی ایک نہ مانی۔

ادھر اربل کے دیہاتوں پر قزل کے حملے کی خبر سنتے ہی زین الدین یوسف اپنے سپاہیوں کے ساتھ مقابلے پر نکل آیا۔ قزل کے سپاہی اس وقت مختلف بستیوں میں پھیل کر گھروں کو خاکستر کر رہے تھے۔ زین الدین یوسف کے سپاہیوں نے انہیں اسی حالت میں جالیا اور بری طرح روند ڈالا، قزل کے سپاہی لوٹے ہوئے مال اور قیدیوں کے علاوہ اپنا بیشتر اسلحہ، سواریاں اور جنگی ساز وسامان چھوڑ کر واپس بھاگے۔ اس شکست سے سلطنت موصل کے اتحادیوں کی ساکھ کو مزید دھچکا لگا، جب کہ سلطان صلاح الدین کے اتحادی امراء کے رعب داب میں اضافہ ہو گیا۔

مجاہد الدین قائماز اس شکست کے بعد نہایت مردہ دلی کے ساتھ موصل لوٹ آیا۔ اسے بے گناہ عوام پر اپنے اتحادیوں کے سفاکانہ مظالم کا افسوس بھی تھا اور سلطان کے ایک حلیف امیر کے ہاتھوں اپنے اتحادیوں کی شکست پر ندامت بھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب سلطنتِ موصل کی آزادی وخودمختاری کے دن گنے جا چکے ہیں کیوں کہ ظلم کی سرپرستی کرنے والی حکومت پائیدار نہیں ہوتی۔ مجاہد الدین قائماز اس واقعے کے بعد کہا کرتا تھا:

> ''میں اہل عجم کی بداعمالیوں پر ایک عرصے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی عذاب کا منتظر تھا۔ کیوں کہ میں نے ان کی وہ کارستانیاں دیکھی ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان سے ان کے سرزد ہونے کا گمان تک نہیں کر سکتا۔ میں انہیں منع کرتا رہا مگر وہ نہیں سنتے تھے۔ آخر کار انہیں شکست ہونا تھی وہ ہو کر رہی۔''[1]

کرک پر حملہ: ادھر سلطان صلاح الدین کرک کے گستاخ ریجی نالڈ کو سزا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ جوں ہی بارشوں کا سلسلہ تھما اور موسم کچھ معتدل ہوا، انہوں نے کرک پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تقی الدین عمر کو افواج کے ساتھ مصر سے ''کرک'' پہنچنے کا حکم دیا اور مشرقی شہروں کی افواج کو بھی بلا بھیجا۔ حلب سے الملک العادل، آمد سے نور الدین بن قرا ارسلان اور سنجار سے عماد الدین کا نائب حسام الدین طمان اپنی اپنی فوجوں سمیت دمشق کے لیے چل پڑے۔ ادھر یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سلطان صلاح الدین اچانک شدید بیمار پڑ گئے۔ کئی دن تک ان کی حالت غیر رہی مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی ان سے بہت کچھ کام لینا منظور تھا اس لیے وہ ایک بار پھر نئی توانائی کے ساتھ بستر سے اٹھ بیٹھے اور فوجوں کو ترتیب

[1] الکامل فی التاریخ: 306/7

دینے لگے۔ الملک العادل اور نور الدین بن قرا ارسلان ایک ساتھ دمشق آرہے تھے۔ سلطان نے دمشق سے باہر جا کران کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ یہ واقعہ 9 ربیع الاول 580ھ (20 جون 1184ء) کا ہے۔ [1]

کچھ دن دمشق میں گزار کر سلطان فوج کے ایک حصے کے ساتھ شہر کے باہر "راس الماء" کے مقام پر ٹھہر گئے۔ 2 ربیع الثانی کو کوچ کر کے وہ 5 ربیع الثانی (15 جولائی) کو کرک سے کچھ فاصلے پر "اور" کے نواح میں فروکش ہوئے اور مصری افواج کا انتظار کرنے لگے۔ [2]

چار دن بعد تقی الدین عمر مصری افواج کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ سلطان کے وزیر قاضی فاضل بھی تھے۔ سلطان کی وہ فوجیں جو دور دراز کے شہروں سے آرہی تھیں یہاں جمع ہوتی رہیں۔ 14 جمادی الاولیٰ (22 اگست) کو سلطان نے افواج کے جمع غفیر کے ساتھ کرک کا محاصرہ کرلیا۔ لین پول اور ہیرلڈ لیمب کے بیان کے مطابق شہر پر سلطان کے حملے کے وقت ریجی نالڈ بالکل بے فکر تھا۔ یروشلم کے بادشاہ بالڈون نے اپنی سوتیلی بہن ازابیلا کا رشتہ مشہور صلیبی نائٹ ہمفرے آف ٹورون سے کر دیا تھا اور اس شادی کا جشن کرک میں منایا جارہا تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دولہا ریجی نالڈ کا عزیز تھا۔ اس موج مستی میں شہر کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا تھا۔

مسلمانوں نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور اچانک حملہ کر کے بیرونی فصیل پر قبضہ کرلیا اور شہری آبادی میں داخل ہوگئے۔ اگر وہ چاہتے تو نصرانیوں سے انتقام لینے کے لیے یہاں قتل وغارت کا بازار گرم کر سکتے تھے مگر سلطان صلاح الدین کی طرف سے فوج کو عام لوگوں پر دست درازی کی اجازت نہیں تھی۔ سلطان کی توجہ کرک کے قلعے پر تھی جو آبادی کے آگے ایک پہاڑ کی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔ آبادی اور قلعے کے درمیان خوفناک خندق موت کی وادی کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اگر یہ خندق نہ ہوتی تو سلطان کی فوج قلعے کی فصیل تک پہنچ چکی ہوتی۔

سلطان نے شہر پر قبضے کے بعد حاکم شہر کی خالی رہائش گاہ میں قیام کیا اور اسی جگہ کو قلعے پر سنگ باری کے لیے چن لیا۔ اس بار مسلمان اپنے ساتھ نو بڑی منجنیقیں لے کر آئے تھے۔ انہیں صف کی شکل میں قلعے کے ایک دروازے کے بالمقابل نصب کر دیا گیا۔ سلطان نے بہترین نشانہ بازوں کو سنگ باری کا کام سونپا جنہوں نے قلعے کی فصیل اور برجیوں کو نشانہ بنانا شروع کیا مگر قلعے کی دیواریں جو سنگ خارا سے بنی ہوئی تھیں شکستہ نہ ہوسکیں۔ دن رات سنگ باری ہوتی رہی اس کے باوجود قلعہ سر ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 203/3 [2] مفرج الکروب: 188/1

خندق یا وادی 1 آخر سلطان نے محسوس کیا کہ جب تک خندق عبور کر کے قلعے پر دھاوا نہیں بولا جاتا، کامیابی مشکل ہے مگر اتنی بڑی خندق کو پُل، کے بغیر عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ سلطان نے حکم دیا کہ خندق کو پاٹ کر راستہ بنایا جائے۔ یہ کام پہاڑ کھودنے کے مترادف تھا کیوں کہ ایک تو خندق تیس گز گہری تھی، شیخ عماد اصفہانی کے بقول: ''یہ عام خندق نہیں تھی بلکہ کشادہ وادی تھی۔''

دوسرے اس علاقے کی زمین سخت اور پتھریلی تھی، اسی لیے خندق کو پُر کرنے کے لیے مٹی کہاں سے آتی؟..... سلطان نے اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ نکالا، ان کے حکم کے مطابق کچی اینٹیں تیار کی جانے لگیں، سپاہی دور دور سے درخت کاٹ کاٹ کر لانے لگے۔ جب اینٹوں اور لکڑیوں کا یہ انبار خندق میں پھینکا جانے لگا تو قلعۂ کرک سے زبردست مزاحمت شروع ہوگئی۔ تیروں اور پتھروں کی ایسی بارش ہوئی کہ مسلمانوں کے لیے خندق کو پُر کرنے کا کام جاری رکھنا ناممکن ہوگیا۔ سلطان نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔ ان کے حکم سے خندق تک دوطرفہ دیواروں میں گھرا ہوا ایک گلی نما کشادہ راستہ بنایا جانے لگا۔ جب یہ گلی تیار ہوگئی تو اس پر مضبوط پلاستر کی چھت ڈال دی گئی، اب سلطان کے سپاہی اس محفوظ گلی سے گزر کر خندق کے کنارے پہنچ جاتے اور اسے بھرتے رہتے۔ [1]

نصرانیوں کی تیراندازی اور سنگ باری اب ناکام ہوگئی تھی، مسلمان دن رات یہ کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ عماد اصفہانی کا بیان ہے کہ محاصرے کے آخری ایام میں خندق اس قدر پُر ہوچکی تھی کہ ایک مسلمان قیدی نے قلعے سے خود کو خندق میں گرا دیا اور زندہ سلامت نکل آیا، حالاں کہ فرنگی اس پر مسلسل پتھر پھینکتے رہے تھے۔

اس دوران منجنیقوں نے قلعے کی چند برجیوں اور فصیل کے کچھ حصے کو قدرے شکستہ بھی کر دیا تھا گویا قلعہ فتح ہونے کے قریب تھا کہ اچانک سلطان کو یروشلم سے ریمنڈ کی قیادت میں نصرانیوں کے ایک بھاری امدادی لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔ اگر یہ لشکر کسی طرح کرک پہنچ جاتا تو محصورین کی قوت دوچند ہوجاتی۔ [2]

مسلمانوں کے لیے اس حالت میں محاصرہ جاری رکھنا نقصان دہ تھا کیوں کہ اس طرح وہ اس دشوار گزار پہاڑی علاقے میں وہ دونوں طرف سے دشمن کے درمیان گھر جاتے۔ اس کے علاوہ کرک کے قریب اس لشکر کی موجودگی کے باعث مصر سے شام کی شاہراہ بند ہوچکی تھی اور مسلمانوں کی امدادی افواج اور قافلوں کی آمد و رفت ناممکن ہوگئی تھی اس لیے مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے نصرانیوں کے امدادی لشکر سے نمٹا جائے اور پھر کرک کا رخ کیا جائے۔

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/200، مفرج الکروب: 1/120

[2] الکامل فی التاریخ: 7/307

ریمنڈ سے مقابلے کے لیے روانگی: چنانچہ سلطان نے محاصرہ اٹھا کر کرک کے عقب میں الوالہ کی طرف کوچ کیا جہاں مخبروں کی اطلاع کے مطابق ریمنڈ کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ سلطان نے فوج کے پڑاؤ کا بھاری ساز و سامان قریبی شہروں میں بھجوا دیا اور فوج کو ہلکا پھلکا رکھ کر پوری احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بلقاء کے قریب حسان نامی ایک گاؤں میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ جگہ فرنگیوں کے عین راستے پر تھی۔ اس سے آگے نہایت تنگ اور دشوار گزار گھاٹیاں شروع ہو جاتی تھیں اس لیے مسلمانوں کا آگے بڑھنا خلاف احتیاط تھا۔

یہاں ٹھہر کر مسلمان پانی کے چشموں پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔ اگر وہ تاخیر سے یہاں پہنچتے یا اب اس جگہ کو چھوڑتے تو فرنگی پانی کے ان وسائل پر قبضہ کر لیتے جس کے بعد مسلمان کرک کے چٹیل علاقے میں گھر کر شام کی جانب سے آنے والی کمک اور پانی کے ذرائع دونوں سے محروم ہو جاتے۔ اس لیے سلطان چند دن 'حسان' میں ٹھہر کر فرنگیوں کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتے رہے تاکہ کھلے میدان میں ان سے دو دو ہاتھ کیے جاسکیں مگر فرنگی پہاڑوں کی اوٹ میں دبکے رہے۔ کئی دن اس طرح گزر گئے تو سلطان نے ان کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور امرائے افواج سے کہا:

"میری رائے یہ ہے کہ ہم یہاں سے کوچ کر کے ان کی راہ سے دور ہٹ جائیں تاکہ وہ تنگ گھاٹیوں سے کھلے علاقے میں نکل آئیں، تب ہم پلٹ کر ان پر ٹوٹ پڑیں اور غلبہ حاصل کر لیں۔"

امرائے لشکر کے اتفاق کے بعد سلطان نے امیر عزالدین جاولی کو راستے میں فرنگی لشکر کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کر دیا اور خود فوج کے ساتھ چند میل دور ماعین کے مقام تک ہٹتے چلے گئے۔

ریمنڈ کا لشکر 26 جمادی الاخریٰ 580ھ (3/اکتوبر 1184ء) تک الوالہ کے پہاڑی علاقے میں رکا رہا، پھر راستہ صاف دیکھ کر آگے بڑھا اور حیرت انگیز طور پر سلطان کے مخبروں کی نگاہوں سے بچ کر راتوں رات دشوار گزار غیر معروف پہاڑی راستوں سے کرک کی طرف نکل گیا۔ سلطان کے جاسوسوں اور سپاہیوں کو اس کا اندازہ خاصی دیر سے ہوا۔ ان کے بعض افسران اپنے دستوں کے ساتھ اس فوج کے پیچھے لپکے اور انہیں روکنے کے لیے اگلے دن سورج ڈھلنے تک ان پر حملے کرتے رہے مگر فرنگی لشکر رکے بغیر آگے بڑھتا رہا اور بالآخر کرک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم یہ غیر معروف راستہ اتنا کٹھن تھا کہ فرنگیوں کی اکثر سواریاں ضائع ہو گئی تھیں۔ سلطان کو یہ اطلاع ملی تو وہ کف افسوس مل کر رہ گئے۔ نئی فوج کے آجانے سے کرک کا دفاع بہت مضبوط ہو چکا تھا، اس لیے محاصرے پر وقت ضائع کرنا بے سود تھا۔[1]

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/204؛ مفرج الکروب: 1/189

نابلس پر حملہ اور واپسی سلطان نے کرک کی مہم ملتوی کردی اور فوج کو ساحلی علاقوں کی طرف بڑھنے کا حکم دیا جہاں اس وقت فرنگیوں کی قوت بہت کم رہ گئی تھی۔ پہلے نابلس پر حملہ کیا اور بہت سا مال غنیمت حاصل کرنے کے بعد شہر کو آگ لگا دی۔ پھر فوج کو یہاں سے مختلف سمتوں میں پھیلا کر فرنگیوں کی بستیوں پر چھاپہ مار حملے شروع کردیے۔

ایک دن سلطان نے ایک جگہ رک کر اس بکھری ہوئی فوج کو جمع کیا اور پھر پوری قوت سے سبسطیہ پر حملہ کیا۔ یہ وہ بستی ہے جہاں مشہور تاریخی روایات کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کو شہید کیا گیا تھا۔ ان کے مقامِ شہادت پر نصرانیوں نے گرجا بنایا ہوا تھا جس میں بے اندازہ مال و دولت جمع تھا۔ پادریوں اور راہبوں کی ایک بڑی جماعت اس گرجے میں مقیم تھی۔ گرجے میں ایک جیل خانہ بھی تھا جس میں بہت سے مسلمان ایک عرصے سے قید تھے۔ سلطان سے خوفزدہ ہو کر پادریوں نے جان کی امان طلب کی اور تمام مسلمان قیدی آزاد کردیے۔ ان کارروائیوں میں ''سمرۃ'' فرقے کے یہودی بھی زد میں آئے۔ یہ ''سامرا'' نامی پہاڑ کی طرف منسوب متعصب یہودی فرقہ تھا۔ سلطان نے ان کے بہت سے افراد کو قیدی بنایا اور ان سے خوراک اور مویشیوں کے بڑے بڑے ذخائر غنیمت میں حاصل کیے۔ ان علاقوں میں قید بے شمار مسلمانوں کو آزاد کرا لیا گیا۔ اس دوران سلطان کو خلافت عباسیہ کے سفیروں کے دمشق پہنچنے کی اطلاع ملی جس کی وجہ سے ان کی واپسی ضروری ہوگئی۔ [1]

وہ اکثر فوج کو وہیں چھوڑ کر فوراً دمشق کی طرف روانہ ہوگئے۔ سلطان کی فوج نے ان کی عدم موجودگی میں بھی کئی دن تک چھاپہ مار کارروائیاں جاری رکھیں اور جنین کو بھی ویران کردیا۔ نابلس کے صرف دو قلعے ان کی دست برد سے محفوظ رہ گئے۔ ان کارروائیوں کے بعد فوج نے واپسی اختیار کی اور دمشق کے قریب راس الماء کے مقام پر سلطان سے آملی۔ [2]

مشہور مسلم سیاح ابن جبیر اندلسی سلطان کی اس مہم کے دوران شام کی سیاحت کر رہا تھا، وہ لکھتا ہے:

''اس جہاد کی مثال دنیا میں نہیں سنی گئی۔ جب ہم دمشق سے نکل رہے تھے تو مسلمانوں کے ابتدائی قافلے مال غنیمت سے لدے پھندے آرہے تھے۔ قیدیوں کی تعداد کا کوئی حد و حساب نہ تھا۔ سلطان دمشق سے ہماری روانگی کے بعد ہفتے کے دن شہر میں داخل ہوئے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ تھوڑی فوج کے ساتھ لوٹے ہیں اور اس مہم پر دوبارہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔'' [3]

---

[1] سلطان الناصر: 1/189
[2] [illegible] ص 113 بحوالہ [illegible] الکرک
[3] رحلہ ابن جبیر: 1/209

دربارِ خلافت کے سفیر ❊ 7 جمادی الثانیہ کو سلطان دمشق پہنچے، دربار خلافت کے سفیر شیخ الشیوخ صدر الدین اور علامہ شہاب الدین بشیر بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ وہ ایک بار پھر حکومت موصل اور سلطان کے درمیان بہتر تعلقات استوار کرنے کی غرض سے نکلے تھے اور سلطان کے محاصرہ کرک کے دوران ہی دمشق پہنچ گئے تھے مگر جب سلطان دمشق پہنچے تو یہ دونوں بزرگ شدید بیمار پڑ گئے تھے۔ سفارتی وفد کے کئی دیگر ارکان کا بھی یہی حال تھا بلکہ ان میں سے بعض اس بیماری میں فوت ہو گئے تھے۔ سلطان کو اس ناگہانی المیے پر بے حد رنج ہوا۔ وہ روزانہ ارکان وفد کی عیادت کے لیے منیع کی مہمان سرائے جاتے جہاں یہ حضرات قیام پذیر تھے۔ سلطان نے ان کی بھرپور مہمان نوازی کی اور علاج معالجے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سفارت جس مقصد کے لیے آئی تھی اس پر گفتگو کی نوبت نہ آسکی تاہم شیخ الشیوخ نے سلطان کو دربار خلافت کی جانب سے خلعت پہنائی۔ اس کے ساتھ انہوں نے خلیفہ کی جانب سے الملک العادل اور ناصر الدین محمد بن شیرکوہ کو بھی خلعتیں دیں۔ سلطان کے امیر نور الدین محمد بن قرا ارسلان کے لیے بھی دربار خلافت سے خلعت آئی تھی جو سلطان نے خود اسے پہنائی۔ [1]

بغدادی عالم کا قصیدہ ❊ اس موقع پر بغداد کے جید عالم محمد بن عبید اللہ الکاتب کا ارسال کردہ ایک قصیدہ سلطان کی خدمت میں پڑھ کر سنایا گیا۔ شاعر نے کہا تھا:

وَغَضِبْتَ لِلدِّیْنِ الْحَنِیْفِ وَلَمْ تَزَلْ ... فِی اللهِ تَرْضیٰ مُنْذُ کُنْتَ وَتَغْضَبُ

آپ دین اسلام کے لیے غضبناک ہوئے اور جب سے آپ موجود ہیں، آپ ہمیشہ اللہ ہی کی خاطر راضی اور غضبناک ہوتے ہیں۔

فَادَرْتَ اَهلَ البَغْیِ بَیْنَ مُجَنْدِلٍ ... لَقِیَ الْحَمَامَ وَخَائِفٍ یَتَرَقَّبُ

آپ نے سرکشوں کو اس حال تک پہنچا کر چھوڑا کہ ان میں سے کچھ ادھ موئے موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں اور کچھ خوفزدہ ہو کر اس کے منتظر ہیں۔

أوھاربٍ ضاقَتْ علیهِ بِرُحْبِهَا ... الارضُ القضاءُ واینَ منك الْمَهْرَبُ

اور کچھ فرار ہو رہے تھے جن پر کشادہ زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو چکی تھی اور بھلا آپ سے بچ کر وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ [2]

سفرائے بغداد کی وفات ❊ جب سفارتی وفد کے قیام کو کئی دن گزر گئے تو شیخ الشیوخ صدر الدین نے

---

1. النوادر السلطانیہ: ص 113، ذکر خروجہ اخری الی الکرک۔ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 204/3
2. مسالک الابصار: 190/1

واپسی کی اجازت طلب کی مگر سلطان نے انہیں قدرے آرام آجانے تک دمشق میں ٹھہرنے کی تاکید کی کہ ان کی طبیعت اب تک ناساز تھی۔

کچھ دنوں بعد شیخ الشیوخ نے ایک بار پھر واپسی پر اصرار کیا، سلطان نے بادل نخواستہ اجازت دے دی اور انہیں اعزاز واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔ عمادالدین کا دست راست حسام الدین طمان کرک کی مہم میں سنجاری سپاہیوں کی کمان کرتے ہوئے سلطان کے ساتھ تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔ سلطان نے اسے تاکید کی کہ شیخ الشیوخ اور شہاب الدین بشیر کو اپنے ساتھ ہی لے جائے اور ان کا پورا پورا خیال رکھے۔ یہ شعبان (نومبر) کا مہینہ تھا، موسم شدید تھا، اس لیے سفرائے بغداد کو رخصت کرنے کے بعد بھی سلطان کو ان کے متعلق برابر فکر دامن گیر رہی۔ سلطان کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ یہ دونوں بزرگ راستے میں نیم جان ہوگئے۔ شہاب الدین بشیر نے راستہ میں سخنہ کے مقام پر وفات پائی اور صدرالدین نے بغداد پہنچتے ہی رحبہ میں جان جان آفریں کو سونپ دی۔ سلطان کو ان کی وفات کا گہرا دکھ ہوا۔ [۴]

<u>یوسف بن عبدالمؤمن کی وفات</u> ❁ انہی دنوں (ربیع الاول 580ھ میں) مراکش کے حکمران یوسف بن عبدالمؤمن کا اندلس کی عیسائی ریاست شنترین پر یلغار کے دوران انتقال ہوگیا۔ اس نے مؤحدین کے دوسرے حکمران کی حیثیت سے مراکش اور اندلس پر بائیس سال تک بڑی آن بان سے حکومت کی تھی۔ یورپی حکمران اسے اپنا خطرناک دشمن تصور کرتے تھے۔ علامہ ابن اثیر کے قول کے مطابق ''وہ ایک نیک سیرت حکمران تھا۔ علماء سے محبت کرتا تھا۔ انہیں قریب رکھتا اور مشوروں میں شریک کرتا تھا۔'' [۵]

---

۴ کتاب الروضتین: حوادث 580ھ، فصل رجوع السلطان الی دمشق
۵ مرآۃ الجنان: 1/194

فصل:6

موصل پر فوج کشی کی تیاری

سلطان صلاح الدین ایوبی نے ماہِ رمضان سے پہلے مختلف شہروں کی افواج کو اپنے اپنے مقام پر واپس بھیج دیا۔ مصری فوج 15 شعبان کو تقی الدین عمر کے ساتھ مصر روانہ ہوگئی۔ سلطان صلاح الدین عموماً ماہِ رمضان پورے اطمینان سے عبادت میں معروف رہ کر گزارتے تھے، اسی لیے ہم ان کی جہادی مہمات کا دورانیہ اکثر شوال سے شروع ہوتا دیکھتے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے رمضان دمشق میں گزارا اور پورے اہتمام سے روزے، تراویح اور دیگر عبادات ادا کیں۔

شوال میں عید کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد سلطان نے موصل پر فوج کشی کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ دو وجوہ سے یہ کام ناگزیر تھا۔ اول تو اہلِ موصل اور عراق کے حکمرانوں قزل بن پہلوان اور شمس الدین پہلوان کے گٹھ جوڑ اور سلطان کے خلاف ان کے اتحاد سے دونوں حکومتوں کے درمیان تعلقات کشیدہ تر ہو چکے تھے۔ دوسرے موصل سے معاہدوں کے ایفاء، سفارتی آداب کے لحاظ اور مذاکرات میں کوئی معقول رویہ اختیار کرنے کی امید بھی باقی نہیں رہی تھی۔ پھر موصل کا اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر سلطان کے حلیف زین الدین یوسف کے علاقے اربل پر حملہ کر کے وہاں کے باشندوں کو قتل کرنا اور بستیوں کو خاکستر بنا دینا سلطان صلاح الدین ایوبی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ زین الدین یوسف کے سفیر سلطان کے پاس یہ فریاد لے کر آچکے تھے کہ انہیں اہلِ موصل کے مظالم سے نجات دلائی جائے اور سلطان اس پکار سے بے توجہی نہیں برت سکتے تھے۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے سلطان صلاح الدین اب نہ صرف موصل بلکہ عراق و شمالی ایران کے ان تمام حکمرانوں کی گوشمالی ضروری سمجھتے تھے جن کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ ان کے خلاف کسی بھی اتحاد میں شمولیت کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔[1]

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 211/3، الکامل فی التاریخ: 310/7

حماۃ میں پڑاؤ ماہ ذی قعدہ 580ھ (فروری 1185ء) میں جبکہ موسم معتدل ہو چکا تھا سلطان ایوبی نے جنگی مہم کی تیاری کا حکم دیا۔ افواج کے تیار ہونے تک سلطان چستی برقرار رکھنے کے لیے روزانہ شکار پر نکل جاتے تھے۔ جب افواج جمع ہو گئیں تو سلطان نے کوچ کیا اور 24 گھنٹوں کے سفر کے بعد 20 ذی قعدہ (23 فروری) کو بعلبک پہنچ گئے۔ پھر حمص سے ہو کر حماۃ میں پڑاؤ ڈالا۔ ذی الحجہ کے آخر تک وہ یہیں رک کر اطراف کے انتظامی معاملات بہتر بنانے میں مصروف رہے۔ [1]

مظفر الدین کوکبری پر عتاب نئے ہجری سال 581ھ کے آغاز میں سلطان نے حماۃ سے کوچ کیا اور حلب جا پہنچے جہاں الملک العادل نے شہر سے باہر آ کر تل السلطان کے مقام پر ان کا استقبال کیا۔ سلطان چند دن حلب کے باہر ٹھہرے رہے۔ مختلف شہروں کی افواج یہاں جمع ہوتی رہیں۔ ماہ صفر (مئی 1185ء) میں وہ اصل ہدف موصل کی طرف روانہ ہوئے۔ دریائے فرات پر آس پاس کے شہروں اور قلعوں سے کشتیاں جمع کی گئیں اور مزید بہت سی نئی چھوٹی بڑی کشتیاں بنائی گئیں۔ البیرہ سے چھ میل دور برسا کے مقام سے لشکر تین دن تک دریا کے پار اترتا رہا۔ [2]

سلطان دریا عبور کر کے پہلے حران جانا چاہتے تھے جس کے حاکم مظفر الدین کوکبری نے گزشتہ بار کی طرح اس مرتبہ بھی موصل پر فوج کشی کے لیے کئی ترغیبی خطوط بھیجے تھے۔ اس کے سفیر ابن ماہان نے سلطان کے دریا پار کرنے سے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں اپنے آقا کا دستخط شدہ رقعہ بھی دیا تھا جس میں سلطان کو موصل پر فوج کشی کے لیے پچاس ہزار دینار بطور اخراجات پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ سلطان کے حران پہنچتے ہی پہلے دن یہ رقم نذر کر دی جائے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو ان دنوں رقم کی شدید ضرورت تھی اس لیے انہوں نے اس رقم کی وصولی کو غیر معمولی اہمیت دی۔ البیرہ میں مظفر الدین نے ان کا استقبال کیا مگر رقم کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ حران پہنچ کر سلطان منتظر رہے کہ مظفر الدین اپنا وعدہ پورا کرے۔ تاہم کئی دن تک حران کے باہر پڑاؤ ڈالے رہنے کے باوجود مظفر الدین کی جانب سے مکمل خاموشی نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا۔ مظفر سلطان کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ پہلے تو سلطان مروت کی وجہ سے برداشت کرتے رہے مگر جب مظفر الدین کی جانب سے کوئی یقین دہانی یا عذر سامنے نہ آیا تو سلطان نے عماد اصفہانی اور قاضی شمس الدین بن فراشی سے کہا:

---

[1] الاول فی التاریخ: 310/7؛ سنا البرق الشامی: 200/1

[2] سنا البرق الشامی: 212/1؛ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 224/3

''مظفر کے پاس جا کر اس کے حال کی خبر لو اور اسے بتاؤ کہ اس کے سفیر نے اس کی جانب سے ایک رقم نذر کرنے کا وعدہ کیا تھا۔''

یہ دونوں مظفر الدین سے ملنے گئے تو ان کا سامنا ہوتے ہی وہ قرآن مجید ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور قسم کھا کر کہا کہ ابن ماہان نے سلطان سے دروغ گوئی کی تھی، اور یہ کہ اس کی جانب سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا گیا جس کا ابن ماہان نے ذکر کیا تھا۔ عماد اصفہانی اور قاضی شمس الدین نے سلطان کو یہ ماجرا سنایا تو سلطان سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے۔

اگلے دن صبح سویرے سلطان نے میدان میں گشت کے دوران مظفر الدین کو ساتھ لے لیا، پھر اسے اپنے ساتھ شاہی قنات میں لے گئے اور وہاں اسے ایک خیمے میں نظر بند کر دیا۔

مظفر الدین کوکبری بہت بڑا سردار تھا، اس کی گرفتاری کا فیصلہ یقیناً خوش آئند نہیں تھا۔ اس سے ان تمام امراء کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی جو کوکبری کی تقلید میں سلطان کے حامی بنے تھے، چنانچہ پورے لشکر میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ اگرچہ بعض امراء اس فیصلہ کی حمایت کر رہے تھے مگر دور اندیش لوگوں نے اسے ایک غیر معقول کارروائی تصور کیا۔ ادھر کئی امراء جو کوکبری سے پرخاش رکھتے تھے، اسے مزید عتاب کا نشانہ بنوانے پر تل گئے۔ وہ خدشہ ظاہر کر رہے تھے کہ کہیں کوکبری کے سپاہی سلطان کے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔ انہوں نے سلطان سے عرض کیا:

''اس شخص کے شر سے بے فکر نہ رہیے گا، ہماری رائے یہ ہے کہ اسے حلب کے قلعے میں منتقل کر کے جیل خانے میں ڈال دیا جائے۔''

مگر ان امراء کے جاتے ہی فقیہ عیسیٰ الہکاری اور قاضی شمس الدین سلطان کے پاس حاضر ہوئے اور انہیں عفو و درگزر کی تلقین کی۔ سلطان کو احساس ہو چلا تھا کہ کوکبری پر اس طرح ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے فقیہ عیسیٰ الہکاری سے کہا:

''آپ جا کر کوکبری کو تسلی دیں اور اس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کریں۔''

ادھر گرفتاری کے بعد مظفر الدین کوکبری کو موت کا خطرہ سر پر منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ فقیہ عیسیٰ نے جا کر اسے تسلی دی تو اس کی جان میں جان آئی، وہ عاجزی سے بولا:

''سلطان میری گردن کے مالک ہیں، میں اپنے تمام شہر ان کے حوالے کرنے اور ان کی خدمت میں ایک عام غلام کی طرح رہنے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔''

فقیہ عیسیٰ نے کہا:

"اس کی ضرورت نہیں مگر سلطان چاہتے ہیں رُھا اور حران کے قلعے آپ ان کے سپرد کردیں۔"

"بسروچشم۔۔۔۔" کوکبری نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

فقیہ عیسیٰ نے سلطان کو یہ اطلاع دی تو ان کی بدگمانی خاصی حد تک دور ہوگئی تاہم تادیب کے لیے انہوں نے کچھ دنوں تک اسے نظر بند رکھا اور احتیاطاً پہلے اس سے رہا اور حران کے قلعے لے لیے۔

ربیع الاول کا چاند طلوع ہوا تو سلطان نے مظفرالدین کوکبری کو آزاد کردیا اور اسے اپنے پاس بلا کر خلعت سے نوازا۔ بعد میں اس کی حسن کارکردگی نے یہ ثابت کردیا کہ وہ سچا وفادار ہے۔ چنانچہ سلطان نے چند ماہ بعد حران اور رُہا اسے واپس کردیے۔ ۵

2ربیع الاول 581ھ (2جون 1185ء) کو سلطان نے حران سے کوچ کیا اور اسی دن راُس عین پہنچ گئے، یہاں قلیج ارسلان کے سفیر نے آکر سلطان کو اطلاع دی کہ مشرقی علاقوں کے تمام حکمران ان سے مقابلے پر آمادہ ہیں اور اگر سلطان نے موصل پر یلغار کی تو وہ سب کے سب ایک صف میں کھڑے ہوکر سلطان سے کھلے میدان میں لڑیں گے۔ یہ سلطان کے لیے ایک خطرناک دھمکی تھی مگر سلطان اسے خاطر میں لائے بغیر راُس عین میں صرف ایک دن قیام کرکے دنیسر (دارا) پہنچے جہاں 8ربیع الاول کو دیار بکر اور آمد کی افواج آملیں جو نورالدین بن قرا ارسلان کے بھائی عمادالدین کی قیادت میں تھیں، نورالدین خود شدید بیماری کے باعث اس مہم میں حاضر نہیں ہوسکا تھا۔ آگے بین النہرین کے علاقے میں معزالدین سنجر شاہ بھی آن پہنچا، اب سلطان نے عام شاہراہ کو چھوڑ کر دریائے دجلہ کی جانب جانے والا ایک مختصر ترین راستہ اختیار کیا۔

14ربیع الاول 581ھ (14جون) کو انہیں اطلاع ملی کہ ان کا مضبوط حلیف نورالدین بن قرا ارسلان شدید بیماری کے باعث دنیا سے رخصت ہوگیا ہے، سلطان نے یہ افسوسناک خبر سنتے ہی اس کے بھائی عمادالدین کو جو سلطان کے ہمراہ تھا، واپس بھیج دیا تاکہ وہ اپنے بھائی کے بعد ان علاقوں کا انتظام سنبھال لے۔

ربیع الاول کے آخر میں سلطان دریائے دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے موصل زیادہ دور نہ تھا۔ سلطان نے آگے بڑھ کر موصل کی ایک نواحی بستی اسماعیلیات میں پڑاؤ ڈالا۔ مظفرالدین کوکبری کا بھائی حاکم اربل زین الدین یوسف بھی یہاں اپنی فوج کے ساتھ سلطان کے لشکر میں شامل ہوگیا۔ ۶

---

۵ سیرۃ صلاح الدین: 212/1

۶ صلاح الدین الایوبی، الصلابی 2/228، 230، سیرۃ صلاح الدین: 214/1

موصل کا محاصرہ اور خلیفہ کے نام مکتوب: ربیع الثانی 581ھ (جولائی) کے آغاز میں موصل کا محاصرہ شروع ہوا۔ روزانہ ایک دستہ روانہ ہو کر موصل کی فصیل کے سامنے پہنچنے لگا۔ سلطان نے افسران فوج کو تاکید کی تھی کہ وہ حملے میں جلدی نہ کریں اور لڑائی کو حتی الامکان مؤخر کرتے رہیں۔ سلطان چاہتے تھے کہ حملے سے پہلے خلیفہ بغداد ناصر کو مطمئن کر دیا جائے تا کہ اہل موصل دربار خلافت کو سلطان کے خلاف ورغلا نہ سکیں۔ چنانچہ سلطان نے کیمپ لگانے کے پہلے دن ہی خلیفہ کے نام ایک تفصیلی مراسلہ لکھوایا جس میں موصل کے محاصرے پر مجبور کرنے والے حالات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اہل موصل فرنگیوں سے خط و کتابت کر رہے ہیں، وہ انہیں اسلامی سرحدوں پر حملے کے لیے ابھار رہے ہیں اور امت مسلمہ میں تفرقہ پھیلا رہے ہیں۔ سلطان نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی حدود مملکت میں اضافے کے لیے یہاں نہیں آئے بلکہ ان کا مقصد فقط اہل موصل کو خلیفہ کے حلقہ اطاعت میں واپس لانا اور اسلام کی نصرت کرنا ہے۔ وہ ان مظالم کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جن کے اہل موصل عادی بن چکے ہیں اور انہیں پڑوسیوں کے حقوق کی نگہداشت اور صلہ رحمی کا سبق سکھانا چاہتے ہیں۔

سلطان نے اس خط میں اہل موصل کی قطع رحمی کی مثال میں حاکم موصل عزالدین مسعود کی اپنے بھتیجے سنجر شاہ سے بدسلوکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ سنجر شاہ کو اس کے باپ نے موصل کا ولی عہد مقرر کیا تھا مگر امرائے موصل نے اسے اپنے موروثی حق سے محروم رکھا اور اس کی پرورش و تربیت میں رکاوٹ ڈالی، اس کے گھرانے کی خواتین کو خوفزدہ کیا اور قطع رحمی کا ثبوت دیا، اگر ممکن ہوتا تو وہ اسے قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے زین الدین یوسف کی ریاست پر اہل موصل کے مظالم کا تذکرہ کر کے یہ بھی ثابت کیا کہ حکومتِ موصل کو حقوق ہمسائیگی کا بھی کوئی پاس نہیں ہے۔ یہ مراسلہ قاضی ضیاء الدین شہروزی کو دے کر خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔

سلطان نے موصل کے محاصرے کے ساتھ ان کرد قبائل کے قلعوں کو فتح کرنا بھی ضروری سمجھا جو عماد الدین زنگی کے دور سے اتابک سلطنت کے مضبوط بازو شمار ہوتے تھے۔ سلطان نے سیف الدین مشطوب ھکاری کو کرد امراء اور سپاہیوں کے ساتھ ھکاریہ کی طرف اور حمیدیہ قبائل کے امراء کو "عقر" اور اس کے نواحی علاقے فتح کرنے روانہ کر دیا۔ [5]

اہل موصل کی زنانہ سفارت: موصل کا محاصرہ ہوا تو عزالدین مسعود کو اپنا کوئی مددگار نظر نہ آیا۔ اتحادی جو سلطان کے خلاف شانہ بشانہ لڑنے کے دعوے دار تھے، اپنی اپنی جگہ دبک گئے۔ آخر

5 کامل 11

عزالدین مسعود کو بھی مناسب معلوم ہوا کہ اپنا پہلو کمزور ظاہر کیے بغیر سلطان کو بہلا پھسلا کر مصالحت پر آمادہ کرے۔ اس مقصد کے لیے سلطان کے آقا نورالدین زنگی کے گھر کی خواتین کو واسطہ بنایا گیا۔ نورالدین زنگی کی صاحبزادی کو چند امرائے سلطنت، عزالدین مسعود کی والدہ اور کچھ دوسری معزز خواتین کے ہمراہ سلطان کی خدمت میں بھیجا گیا۔

سلطان صلاح الدین نے اس وفد کا غیر معمولی اعزاز و اکرام کیا تاہم جب انہوں نے سفارش کی کہ سلطان مصالحت کر لے اور محاصرہ چھوڑ کر واپس چلا جائے تو سلطان شش و پنج میں پڑ گئے۔ انہوں نے اپنے امراء اور مشیروں کی مجلس طلب کر کے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔

بہت سے امراء نے سلطان نورالدین زنگی کی صاحبزادی کے بیچ میں پڑنے کا لحاظ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ مصالحت کر لی جائے مگر کرد امراء خصوصاً فقیہ عیسیٰ ہکاری اور علی بن احمد مشطوب نے دوٹوک انداز میں کہا:

"موصل جیسے شہر کو ایک عورت کی سفارش پر ہاتھ سے نہیں جانے دیا جائے گا، عزالدین مسعود نے انہیں اس لیے ہمارے پاس بھیجا ہے کہ وہ شہر کی مدافعت سے عاجز آ چکا ہے۔"[5]

علامہ ابن اثیر الجزری کا بیان ہے کہ سلطان نے کرد امراء کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مصالحت سے انکار کر دیا اور ان خواتین کو بے نیل مرام واپس کر دیا۔ اس پر موصل کے عوام غیظ و غضب اور نفرت سے بھر گئے۔ انہوں نے سلطان کا اس پامردی سے مقابلہ کیا جس کی سلطان کو بالکل توقع نہ تھی، سلطان کو اپنے فیصلے پر ندامت ہوئی اور انہوں نے ان امراء کو برا بھلا کہا جنہوں نے یہ غلط مشورہ دیا تھا۔ سلطان کے وزیر قاضی فاضل نے بھی خط لکھ کر سلطان کے اس فیصلے پر تنقید کی۔ یاد رہے کہ علامہ ابن اثیر الجزری، سلطان صلاح الدین کے ہم عصر مؤرخ تھے جن کی شہرۂ آفاق تاریخ "الکامل فی التاریخ" اس دور کے حالات کا ایک اہم مأخذ ہے۔ ابن اثیر موصل سے تعلق رکھتے تھے اور یہاں کے حکمرانوں کے مداح تھے۔ سلطان کے اس محاصرے کے دوران وہ موصل میں موجود تھے۔

آئندہ دنوں میں سلطان نے پل باندھ کر موصل کے قریب سے گزرنے والی نہر عبور کر کے شہر کے ارد گرد پھیلے ہوئے خشک میدانی علاقے میں قدم رکھ دیا۔ یہاں لشکر کو نیم دائرے کی شکل میں شہر کے گرد تعینات کر دیا گیا۔ زین الدین یوسف اور مظفرالدین کوکبری جیسے امراء کو شہر کی مشرقی جانب متعین کر دیا گیا۔ باب عمادی کے باہر فریقین میں ہلکی پھلکی چھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ بہرکیف محاصرے کے کچھ دنوں بعد ہی سلطان کو اندازہ ہو گیا موصل کی فوج کی کمزوری کے باوجود شہر کی مضبوط فصیل ناقابل تسخیر ہے،

[5] الکامل فی التاریخ: 311/7، تحت 581ھ

اس لیے محاصرہ لامحالہ طویل تر ہوگا۔ موصل کے باشندے اب تک کامیاب مزاحمت کر رہے تھے خصوصاً ان کے بعض گروہ جو دریائے دجلہ عبور کر کے لشکر پر مشرق سے حملے کر رہے تھے سخت پریشانی کا باعث تھے۔

اس موقع پر سلطان کو بعض امراء نے یہ مشورہ دیا کہ اگر دریائے دجلہ کا رخ موڑ کر شہر کو پانی کی فراہمی بند کر دی جائے تو جنگ اور طویل محاصرے کی نوبت نہیں آئے گی اور شہر والے خود ہی مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیں گے۔ اگرچہ یہ تجویز بڑی عجیب تھی تاہم سلطان نے اس پر غور کیا اور پھر مشہور ماہر تعمیرات فخر الدین بغدادی سے جو موصل کے باشندے تھے اور ان دنوں سلطان کے سایۂ عاطفت میں چلے آئے تھے، اس بارے میں رائے طلب کی۔ فخر الدین بغدادی نے غور وفکر کے بعد بتایا کہ ایسا بالکل ممکن ہے اور یہ کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہوگا۔ سلطان کے سوانح نگاروں میں سے عماد اصفہانی، محمد بن تقی الدین اور المقدسی یہ بتاتے ہیں کہ سلطان نے اس مقصد کے لیے آلات منگوا لیے تھے، ماہر کاریگروں اور مزدوروں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود یہ کام شروع نہ کیا جا سکا۔[1]

ابن اثیر کے بیان سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مسئلے میں سلطان کو غلط معلومات دی گئی تھیں اور حقیقت میں یہاں دریا کا رخ موڑ کر بھی اہل شہر کو پانی سے مکمل طور پر محروم کر دینا ممکن نہ تھا۔ جب سلطان پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی تو انہوں نے اس بے فائدہ کام کو، جو خطیر اخراجات، طویل مدت اور بھاری پیمانے پر افرادی قوت کا تقاضا کر رہا تھا روک دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو ملامت بھی کی جنہوں نے اس فضول منصوبے کا مشورہ دیا تھا۔[2]

محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ اور اس کے اسباب ❊ موسم گرما کے آغاز کے ساتھ ہی سلطان کے لیے ایک اور صبر آزما مرحلہ شروع ہو چکا تھا، موصل کے آس پاس کی گرم صحرائی آب وہوا میں لو کے تھپیڑے ناقابل برداشت ہونے لگے تھے۔ سپاہی شدید گرمی کے باعث بھاری فوجی لباس اور فولادی زرہوں میں بڑی تکلیف محسوس کر رہے تھے، خطرہ تھا کہ وہ سب بیمار نہ پڑ جائیں۔ چنانچہ ربیع الثانی 581ھ (جولائی 1185ء) کے اختتام پر سلطان نے محاصرہ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

موسم کی شدت کے علاوہ محاصرہ اٹھانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اہل موصل کا ایک مضبوط اتحادی شاہ ارمن جو خلاط کا حکمران تھا، وفات پا گیا تھا۔ وہ لاولد تھا، مرنے سے پہلے اس نے کسی کو جانشین بھی مقرر نہیں کیا تھا، چنانچہ خلاط میں ایک سیاسی بحران پیدا ہو گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو افراد خلاط پر قابض ہونے کی کوشش کر رہے تھے، ایک شاہ ارمن کا غلام بکتمر تھا اور دوسرا اہدان اور

[1] سنا البرق الشامی: 216/1، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 230/3
[2] الکامل فی التاریخ: 311/7، حوادث 581ھ

آذربائیجان کا حکمران شمس الدین بہلوان تھا جو مرحوم شاہ ارمن کا سسر بھی تھا۔ ❶

کہا جاتا ہے کہ شمس الدین بہلوان نے اپنی لڑکی اسی مقصد کے لیے ارمن شاہ کے نکاح میں دی تھی کہ مستقبل میں وہ اس رشتہ کا فائدہ حاصل کر کے خلاط کا اقتدار حاصل کر سکے۔ ارمن شاہ کی وفات 9 ربیع الثانی 581ھ (9 جولائی 1185ء) کو ہوئی تھی، اس کے مرتے ہی اس سلطنت کا بااثر مملوک بکتمر حکومت پر قابض ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ادھر شمس الدین بہلوان نے اپنے داماد کا ملک ہڑپ کرنے کے لیے ایک لشکر کے ساتھ خلاط کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اہل خلاط شمس الدین بہلون سے جان بچانا چاہتے تھے، چنانچہ فوراً سلطان صلاح الدین کو خطوط بھیجے کہ وہ آ کر خلاط کی حکومت سنبھال لیں ورنہ شمس الدین بہلون اس پر قابض ہو جائے گا۔

سلطان کو شاہ ارمن کی وفات کی خبر اور اہل خلاط کی پیش کش 20 ربیع الثانی کو پہنچی۔ وہ پہلے ہی موصل کے محاصرے کے طول پکڑ جانے سے اکتا چکے تھے، اس لیے فوراً امراء کو جمع کر کے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ امرائے لشکر نے مختلف آراء دیں۔ کچھ کا کہنا تھا کہ موصل کا محاصرہ ہرگز نہ ختم کیا جائے اور شہر فتح ہونے تک یہ مہم جاری رکھی جائے۔ بعض امراء کہہ رہے تھے کہ موصل کا محاصرہ کچھ دنوں بعد دوبارہ کیا جا سکتا ہے، جبکہ خلاط جیسے مضبوط اور اہم شہر کی حکومت جو آج ہمیں مفت مل رہی ہے، بعد میں لاکھ جتن کرنے سے بھی نہیں ملے گی۔

ان امراء کا یہ کہنا اس لحاظ سے درست تھا کہ خلاط کا قلعہ اور شہر پناہ ناقابل تسخیر شمار ہوتے تھے۔ یہ شہر ایسے مقام پر واقع تھا جہاں سے عراق، ایران، گرجستان، شام اور ایشیائے کوچک پر بیک وقت نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی فاتح عرب و عجم اور اہل روم کو شکست دے کر ان سب پر اپنا قبضہ مستحکم رکھنا چاہے تو اس کے لیے خلاط سے بہتر مرکز کوئی نہیں۔

ظاہر بات تھی کہ ایسے اہم شہر پر اہل موصل کے قدیم حلیف شمس الدین بہلون کا قبضہ عراق پر سلطان کی گرفت کو کمزور اور اہل موصل کے متحدہ محاذ کو بہت مضبوط کر دیتا۔ چند مشیروں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ایک موصل کا محاصرہ بدستور جاری رکھے اور دوسرا جا کر خلاط پر قبضہ کر لے۔

ابھی یہ مشورے جاری تھے کہ خلاط کے امراء میں سے عماد الدین ملک خود سلطان سے آ کر ملا اور سلطان کو فی الفور کوچ کی ترغیب دی۔ سلطان صلاح الدین نے رات بھر غور کیا اور اگلی صبح محاصرہ ختم کر کے پوری فوج کے ساتھ خلاط کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ❷

❶ الاعلاق الخطیرۃ/الکامل فی التاریخ: 312/7   ❷ سلسلہ ارمان شاہ: 217/1

اواخر ربیع الثانی 581ھ (اواخر جولائی) میں سلطان نے موصل سے کوچ کیا۔ ہراول دستے کے طور پر ناصر الدین شیر کوہ اور مظفر الدین کوکبری کو بھیجا جنہوں نے مختصر ترین راستے سے پیش قدمی کر کے نواح خلاط میں بطوانہ کے مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ ❶

اہل خلاط کی عجیب سیاست مگر وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ارمن شاہ کے مملوک سیف الدین بکتمر نے خلاط کا اقتدار سنبھال لیا ہے اور خلاط کے عوام بھی اس کے حامی ہیں تو وہ ششدر رہ گئے۔ ادھر شمس الدین پہلوان بھی اپنے لشکر کے ساتھ آن پہنچا اور شہر کی دوسری سمت خیمہ زن ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل خلاط سلطان کی فوج کے لیے دروازے کھول دیتے مگر ایسا نہ ہوا۔ خلاط کا وزیر مجد الدین ابن رشیق جو اس کھیل کا اہم کردار تھا، اپنے نمائندوں کے ذریعے سلطان سے محبت اور دوستی کا اظہار کرتا رہا، اس نے سلطان کے سالار ناصر الدین محمد کو یہاں تک کہا کہ وہ فوجیں مزید آگے لا کر فصیل کے بالکل قریب پڑاؤ ڈالے تا کہ اس کی گرفت مضبوط رہے مگر اس کے باوجود اہل خلاط نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور شہر سلطان کے حوالے کرنے میں ٹال مٹول کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شمس الدین پہلوان سے بھی خط و کتابت کر رہے تھے جو شہر کی دوسری سمت موجود تھا۔ سلطان کی افواج کو پہلے سے خلاط کے سامنے پا کر اسے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے شہر پر حملہ کیا تو اہل خلاط کسی پس و پیش کے بغیر سلطان کی حمایت کا اعلان کر کے شہر کو شامی فوجوں کے حوالے کر دیں گے۔ اس لیے وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اسے بہتر یہی محسوس ہوا کہ شہر پر سلطان کا قبضہ ہو نہ اس کا۔ یہی ہوا، خلاط پر کسی کا قبضہ نہ ہو سکا۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اہل خلاط کی سلطان سے خط و کتابت ایک فریب تھی، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ سلطان کے ذریعے شمس الدین پہلوان سے اپنی مدافعت کریں اور پہلوان کے ذریعے سلطان کا راستہ روکیں۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ ❷

آخر میں اہل خلاط، شمس الدین پہلوان اور سلطان کے نمائندوں کے مذاکرات ہوئے اور طے پایا کہ دونوں بیرونی فوجیں خلاط کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس چلی جائیں گی۔ چنانچہ سلطان کی افواج واپس چلی آئیں۔ اس طرح خلاط کے نئے حاکم بکتمر اور وزیر مجد الدین نے اپنے سے بڑے دو نامور سیاست دانوں کو آپس میں الجھا کر اپنا دامن صاف بچا لیا۔

بعد کے دنوں میں اہل خلاط کا شمس الدین پہلوان کی طرف جھکاؤ اس وقت واضح ہو گیا جب انہوں

❶ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 231/3، الکامل فی التاریخ: 312/7

❷ مفرج الکروب: 217/1، الکامل فی التاریخ: 312/7

نے اپنے ہاں بہلوان کی سیاسی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے اس کے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔ ❶

غرض خلاط کی مہم سلطان کے لیے مکمل طور پر ناکامی کا مرقع ثابت ہوئی۔ اگر سلطان موصل کے محاصرے پر ڈٹے رہتے تو یہ اس ناکام مہم میں وقت ضائع کرنے سے کہیں بہتر ہوتا۔ درحقیقت سلطان کو موصل کا محاصرہ چھوڑنے پر آمادہ کرنے والے امراء میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو سلطان نورالدین زنگی کے خانوادے کی نسبت سے اتابکی حکمرانوں کا دل سے احترام کرتے تھے اور سلطان کا ان سے الجھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ علامہ ابن اثیر جزری اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو امراء اتابکی خانوادے کی تکالیف کو ناپسند کرتے تھے، انہوں نے سلطان کو موصل سے کوچ کر جانے کا مشورہ دیا اور کہا: خلاط کی مملکت وسیع اور بڑی ہے اور وہ کسی حکمران سے محروم ہے جبکہ موصل کا ایک بادشاہ ہے جو اس کی حفاظت اور مدافعت کر رہا ہے۔ جب ہم وہاں (خلاط) پر قابض ہو جائیں گے تو اس (موصل) کا اور دوسرے شہروں کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔'' ❷

معاملے کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سلطان دوطرفہ دھوکے کا شکار ہوئے تھے۔ ایک طرف ان کے کچھ امراء نے مشورے میں اپنی حکومت کی بجائے اہل موصل کی خیرخواہی کو پیش نظر رکھا اور سلطان کو بہکانے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسری طرف خود خلاط کے امراء نے سلطان کو فریب دیا اور ان کے ذریعے اپنا مفاد حاصل کر لیا۔

آمد اور میافارقین کا مسئلہ ❁ خلاط کی مہم تو کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی مگر سلطان صلاح الدین کی بلند اقبالی نے اس ناکام سفر کو بھی فتوحات کے پھولوں سے سجا دیا۔ جن دنوں سلطان کے ہراول کے افسران ناصرالدین محمد اور مظفرالدین خلاط کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، سلطان ان کے پیچھے آتے ہوئے دیار بکر کے علاقے میافارقین کے سامنے رک گئے تھے تاکہ اس علاقے کے سیاسی منظرنامے کا مشاہدہ کرتے ہوئے جائیں۔

دیار بکر دریائے دجلہ کے مغرب میں نصیبین کے قریبی پہاڑوں سے شروع ہو کر ایشیائے کوچک کی حدود تک پھیلا ہوا علاقہ ہے۔ آمد، ارزن، میافارقین اور ماردین اس کے اہم شہر شمار ہوتے ہیں۔ یہاں جگہ جگہ پہاڑی قلعے تھے جن میں جنگجو کرد سرداروں کی حکومت تھی، یہ سارا علاقہ کردستان میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقے کی دفاعی اہمیت کے لحاظ سے سلطان کی ایک مدت سے اس پر نظر تھی۔ پھر یہ سلطان کے ہم قبیلہ لوگوں کا وطن تھا جو سلطان کے بہترین حامی ثابت ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان

---

❶ الکامل فی التاریخ: 312/7

❷ الکامل فی التاریخ: 312/7

نے موصل کے محاصرے کے ساتھ ہی اپنے بعض امراء کو دیار بکر سے متصل کردستان کے علاقوں ہکاریہ اور عقر وغیرہ کے قلعے فتح کرنے بھیج دیا تھا۔ دیار بکر میں سلطان کے قیام کی سب سی بڑی وجہ یہاں آمد اور میافارقین جیسے دو اہم شہروں کے سیاسی معاملات تھے۔

آمد کی ولایت سلطان نے نورالدین محمد بن قرا ارسلان کو دی تھی مگر نورالدین سلطان کی حالیہ مہم موصل کے دوران 14 ربیع الاول 581ھ (14 جون 1185ء) کو انتقال کر گیا تھا۔ سلطان نے اس وقت آمد کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے نورالدین کے بھائی عمادالدین کو وہاں روانہ کر دیا تھا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی نورالدین کا کم عمر بیٹا سقمان (جس کا لقب قطب الدین تھا) باپ کی گدی پر براجمان ہو گیا تھا۔ سقمان کو یہ ڈر تھا کہ کہیں سلطان صلاح الدین اس سے باپ کی وراثت چھین نہ لیں، اس لیے جب سلطان نے اس کے چچا کو آمد کے معاملات سنبھالنے کے لیے بھیجا تو اس نے چچا کو اقتدار پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ دیا۔

میافارقین پر بنوارتق کی حکومت تھی، یہ شام کا وہ مشہور قبیلہ ہے جس کے بہادر امراء نے پانچویں صدی ہجری میں بیت المقدس کی بڑی پامردی سے حفاظت کی تھی۔ پھر شام پر سلجوقیوں اور بیت المقدس پر فرنگیوں کے قبضے نے انہیں دیار بکر کی حدود میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا، تب سے یہ خاندان نسل در نسل دیار بکر کا وارث چلا آ رہا تھا، ماردین اور میافارقین اس وقت بھی اسی خاندان کے پاس تھے مگر ایک سال قبل جمادی الثانیہ 580ھ میں میافارقین کے حکمران قطب الدین ایلغازی کے وفات پا جانے کے بعد سے یہ شہر ایک سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے اس بحرانی کیفیت سے بروقت فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور میافارقین کی طرف بڑھے۔ اس دوران آمد کا بحران حل کرنے کے لیے سلطان نے طے کر لیا تھا کہ شہر کی حکومت مرحوم امیر نورالدین کے بیٹے سقمان ہی کے پاس رہنے دی جائے گی۔ اس وقت سلطان کے بعض امراء نے انہیں آمد پر قبضے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:

''آپ نے یہ شہر نورالدین کو عطا کیا تھا، اب اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس کے لڑکے سے جو کم عمر ہے، یہ ولایت واپس لے لی جائے۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ آپ کی خدمت میں حاضری سے کترا رہا ہے۔''

سلطان نے اس مشورے کو مسترد کرتے ہوئے کہا:

''اس طرح تو یہ معاملہ اتنا بگڑ جائے گا کہ تلافی ناممکن ہو جائے گی۔ ہم قابل اعتماد افراد کے ذریعے

پہلے تحقیق کریں گے کہ اصل صورتحال کیا ہے؟ اور اپنا معاملہ یقینی معلومات پر انجام دیں گے۔"

اب سلطان نے قاضی الدین محمد بن فراش کو آمد بھیجا تا کہ وہ حالات کا رخ بھانپیں۔ قاضی صاحب نے وہاں جا کر دیکھا کہ مرحوم نورالدین کا لڑکا نہ صرف سلطان کی اطاعت پر آمادہ ہے بلکہ خدمت میں حاضر ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔

اس دوران سلطان میا فارقین کی طرف گامزن تھے جہاں سابق حاکم قطب الدین ایلغازی کی موت کے بعد اس کا ایک کم سن بیٹا علامتی طور پر تخت نشین تھا، حکومت کے معاملات مرحوم کی بیوی نے سنبھال رکھے تھے جبکہ افواج کی باگ ڈور ایک بہادر تجربہ کار سالار اسدالدین برنقش کے ہاتھ میں تھی۔ ان لوگوں نے سلطان سے ڈٹ کر مقابلے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ یکم جمادی الاولیٰ 581ھ (30 جولائی 1185ء) کو سلطان نے میا فارقین کا محاصرہ کر لیا۔ ①

اسدالدین برنقش نے زبردست دفاعی انتظامات کے ساتھ شہر پناہ اور قلعے کو مسلح سپاہیوں سے بھر دیا تھا۔ منجنیقیں اور عرادے نصب کر دیے تھے۔ اس لیے کئی دنوں کے محاصرے کے بعد بھی شہر کے سر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

سلطان کے سپاہی بار بار کے دھاووں کے باوجود کوئی کامیابی حاصل نہ کر پائے۔ ان کی منجنیقیں شہر پناہ کو شکستہ نہ کر سکیں۔ ایک دن میا فارقین کے چھاپہ ماروں نے شہر سے نکل کر ایک طوفانی حملے میں سلطان کی خاص منجنیق کو نذر آتش کر دیا، اس دن زبردست معرکہ ہوا اور فریقین کے بہت سے سپاہی کٹ مرے۔ سلطان کا بہترین افسر یوسف منجنیقی بھی اس دن کی لڑائی کی نذر ہو گیا۔ ②

میا فارقین کی بہادر ملکہ ✵ میا فارقین کے سپاہیوں کی مدافعت میں جہاں ان کے سالار اسدالدین کی صلاحیتوں کا دخل تھا، وہاں ان کی بلند ہمتی کا بڑا سبب سابق حاکم کی بیوی کا حوصلہ تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں میں آخر دم تک لڑنے کی روح پھونک چکی تھی۔ یہ خاتون بڑی پارسا اور غیرت مند تھی۔ اس کی کئی بیٹیاں تھیں جن کی پرورش اور حفاظت کے لیے وہ فکر مند رہتی تھی۔ سلطان کو اس کی نیکی اور شرافت کا علم ہوا تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح لڑائی کا سلسلہ ختم کر کے محصورین کو گفت شنید اور مصالحت پر آمادہ کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے سلطان نے حریف سالار اسدالدین کو مراسلے بھیجنے شروع کیے۔ کسی میں حسن سلوک کے وعدے اور خاص عنایات کی پیش کش تھی اور کسی میں باز نہ آنے پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں۔ اسدالدین پر اس نامہ و پیام کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے جواب میں کہلوا دیا:

① کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/232، سلطان صلاح الدین: 1/218، الکامل فی التاریخ: تحت 581ھ ② سلطان صلاح الدین: 1/219

"میں اپنے آقا کا حق ادا کر رہا ہوں۔"

اس نے سلطان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کے آقا قطب الدین ایل غازی کی وفات کے بعد اصل اختیارات آقا کی بیگم کو حاصل ہیں لہٰذا سلطان کو اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اس وضاحت کے بعد سلطان نے کئی مراسلے بھیج کر ملکہ کو ہتھیار ڈالنے کی تلقین کی مگر بے سود۔ آخر سلطان نے لکھوا بھیجا:

"ہم بہر صورت اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک شہر فتح نہ ہو جائے۔ مگر ہم آپ کے گھرانے کی نگہداشت اور آپ کے حقوق کی ادائیگی کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ ہم اس شہر کو فتح کرنے کے بعد بھی آپ کی رضامندی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم آپ کی بیٹیوں میں سے کسی ایک سے اپنے ایک بیٹے کا رشتہ کرنا چاہیں گے۔"

سلطان نے اس قسم کی فراخ دلانہ پیش کشوں پر مشتمل کئی پیغامات پے در پے بھیجے اور ملکہ کو اطمینان دلایا کہ میافارقین اور نواحی علاقوں پر اسی کا حکم چلتا رہے گا۔ آخر کار ملکہ کو سلطان کی باتوں پر یقین آ گیا اور اس نے شہر حوالے کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ [1]

سلطان نے اس کے فوراً بعد حریف فوج کے سالار اسد الدین برنقش کو پیغام بھیجا:

"جھگڑا اور بے کا نگی ترک کر دو، تمہاری ملکہ ہم سے مصالحت اور رشتہ داریوں پر آمادہ ہے۔"

اسد الدین یہ پیغام ملتے ہی نرم پڑ گیا اور جنگ روک دی۔ میافارقین کا گرم محاذ جہاں طاقت کی زبان کام نہ آئی، افہام و تفہیم سے کام چل گیا۔ شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ سلطان نے ملکہ کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ اس نے جو مانگا بلا تکلف دے دیا، کسی وعدے کی تکمیل میں ذرا بھی دیر نہ لگائی گئی، خاتون نے ذاتی رہائش کے لیے "ہتاخ" کا قلعہ مانگا اور سلطان نے بلاتردد اس کے نام کر دیا۔

بدھ 29 جمادی الاولی 581ھ (27/ اگست 1185ء) کو سلطان میافارقین شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں عماد اصفہانی اور قاضی نجم الدین عصرون نے سلطان کے حکم سے ان کے بیٹے الملک المعز اسحق اور ملکہ کی بیٹی کے مابین عقد نکاح کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ سلطان کی جانب سے عماد اصفہانی اور خاتون کی طرف سے قاضی نجم الدین عصرون نکاح کے وکیل تھے۔ سلطان اور میافارقین کے امراء اور عمائد کی موجودگی میں عقد نکاح ہوا۔

رسم نکاح کے بعد سلطان ایوبی مبارکباد وصول کرنے کے لیے شادی کی قنات میں بیٹھے رہے۔ یہاں شہر کے رؤساء اور اہم شخصیات آ کر ان سے ملتی رہیں۔ سلطان نے ملکہ کی خدمت میں دلہن کے لیے پیش

[1] سنا البرق الشامی: 1/220

قیمتی تحائف پیش کیے، امیر اسد الدین برتقش کو بھی اس موقع پر گراں قدر انعامات سے نوازا۔

اسی دن سلطان کو ایک اور خوشی دیکھنے کو ملی۔ آمد کے سابق حاکم نور الدین کا کم سن بیٹا سقمان اظہار اطاعت کے لیے ان کی خدمت میں آن پہنچا، سلطان نے اپنے امراء کو آگے بڑھ کر اس کے استقبال کا حکم دیا اور پھر خود بھی ان کے پیچھے چلے آئے۔ سقمان کے لیے اعزاز واکرام کا یہ منظر حیران کن تھا۔ وہ سلطان کی فیاضی اور حسن سلوک کا قائل ہو گیا۔ ①

سلطان نے سقمان کو آمد سمیت اس کے والد کی تمام ولایت کا حاکم مقرر کر دیا اور اس کی رہنمائی کے لیے اس کے باپ کے ایک معتمد امیر کو ذمہ دار بنا دیا۔ سلطان نے اس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اپنے تمام اہم فیصلوں اور احکام میں مرکز سے رجوع کا پابند رہے گا۔ ②

یوں دیار بکر کی مہم جو ابتداء میں ناکام نظر آرہی تھی، فتوحات اور مسرتوں کے ملاپ کے ساتھ نہایت خوشگوار انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔

---

① کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/233،234؛ سنا البرق الشامی: 1/221

② محولہ بالا

فصل:7

خود احتسابی اور اصل مقصد کے لیے تجدید عزم

دیار بکر اور کردوں کے تمام علاقے سلطان صلاح الدین کے لیے مسخر ہو چکے تھے۔ اب سلطان پورے اطمینان کے ساتھ موصل کا رخ کر سکتے تھے تاہم اس سے پہلے خلاط کے معاملے کو دوبارہ ایک نظر دیکھنا ضروری تھا جسے فتح کرنے کے لیے وہ موصل کا محاصرہ ادھورا چھوڑ کر آئے تھے مگر خلاط ان کے بس سے باہر ہی رہا تھا۔

سلطان میا فارقین سے چل کر شاطئی قرامان نامی ایک بستی میں ٹھہر گئے اور شمس الدین بہلوان سے مراسلت شروع کی جواب تک خلاط کے باہر اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ سلطان کو معلوم ہوا تھا کہ اہل خلاط شمس الدین بہلوان کی حمایت پر آمادہ ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی سابق حکمران خلاط ارمن شاہ کی بیوی شمس الدین بہلوان کی بیٹی تھی، وہ اہلِ خلاط کی طرف سے گراں قدر تحائف اور مال و دولت لے کر اپنے باپ کے پاس گئی تھی اور اسے راضی کر لیا تھا۔ اس کے بعد خلاط میں بہلوان کے نام کا سکہ جاری کر دیا گیا تھا اور جمعہ کے خطبے میں خلیفہ کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جانے لگا تھا۔ [1]

<u>فقیہ عیسیٰ الھکاری خلاط میں</u> ❋ سلطان صلاح الدین نے اہل خلاط کی اس وعدہ خلافی اور فریب کاری پر احتجاج کے لیے اپنے مصاحب فقیہ عیسیٰ الھکاری کو خلاط بھیج دیا۔ وہ خلاط کے وزیر مجد الدین ابن رشیق سے ملے اور اسے سلطان کی تشویش سے آگاہ کیا۔ وزیر نے شمس الدین بہلوان کی بالادستی اور دباؤ کو ان تمام تبدیلیوں کا سبب قرار دے کر اپنی گلو خلاصی کی کوشش کی اور ساتھ ہی کہا:

”اگر آپ جلدی کر لیتے اور بہلوان سے پہلے خلاط پہنچ جاتے تو یقیناً اپنا مقصد حاصل کر لیتے مگر اب ہم مجبور ہیں۔“

خلاط میں قیام کے ان دنوں میں فقیہ عیسیٰ الھکاری نے بہلوان کی عسکری قوت کا اندازہ لگانے کے

[1] مفرج الکروب: 221/1

لیے ایک جاسوس اس کے کیمپ میں بھیجا تھا جو پکڑا گیا، تاہم اس نے ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سلطان کے سفیر فقیہ عیسیٰ کا نمائندہ کہہ کر متعارف کرایا، اس پر بہلوان کے امراء نے اسے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ فقیہ عیسیٰ کو خود یہاں آنا چاہیے۔ فقیہ عیسیٰ نے سلطان کو خط لکھ کر اجازت طلب کی اور اثبات میں جواب ملنے پر بہلوان کے کیمپ پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے بہترین سفارت کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہلوان کو دونوں حکومتوں کے مابین صلح وصفائی اور اتحاد و تعاون کی ضرورت کا احساس دلایا۔ بہلوان بھی سلطان کی طاقت سے خوب واقف تھا اور یہ اندازہ بھی لگا چکا تھا کہ اہل موصل کے اقبال کے دن گنے جا چکے ہیں چنانچہ اس نے سلطان سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے لچک دار رویہ اختیار کیا اور فقیہ عیسیٰ کو اعزاز و اکرام اور اس یقین دہانی کے ساتھ واپس بھیجا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ واپس لوٹ جائے گا۔ [1] ...... اگرچہ اس طرح سلطان کو خلاط سے کچھ حاصل نہ ہوا مگر وہ جانتے تھے کہ اس مضبوط ترین شہر کو مسخر کرنے کے لیے انہیں پہلے شمس الدین بہلوان سے لڑنا پڑے گا اور پھر طویل مدت کے لیے شہر کا محاصرہ کرنا ہوگا، ظاہر ہے کہ موصل کی مہم کے ادھورے ہوتے ہوئے یہ دونوں کام ممکن نہ تھے۔ اس وقت یہی غنیمت تھا کہ انہوں نے موصل کے ایک اہم اتحادی کو کسی قدر رام کر لیا تھا۔

موصل کا آخری محاصرہ ❋ ماہ رجب 581ھ (اکتوبر 1185ء) میں سلطان شاطئ قرمان سے روانہ ہو کر نصیبین پہنچے۔ رجب کے آخر میں یہاں پورا لشکر جمع ہو گیا تو سلطان نے موصل کی طرف پیش قدمی کی۔

راستے میں ایک حادثہ پیش آ گیا، ان کا قدیم نمک خوار امیر عزالدین جاؤلی جو ان کے مرحوم چچا اسدالدین شیرکوہ کا خاص رفیق کار رہا تھا، گھوڑے کے بدک جانے کے سبب زخمی ہو گیا، اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اسے دمشق لے جایا گیا مگر زخم بگڑتا چلا گیا اور آخر چند ماہ بعد یہی زخم اس کی موت کا سبب بنا۔

4 شعبان 581ھ (30/اکتوبر) کو سلطان صلاح الدین کی فوج دریائے دجلہ کے کنارے موصل کی نواحی بستی "کفرزمار" کے مقام پر پڑاؤ ڈال چکی تھی۔ افق کے دھندلکے پر موصل کی فصیل اور برج دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں شدید سردی پڑ رہی تھی تاہم سلطان نے موسم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شہر کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ یہ موصل پر ان کی تیسری فوج کشی تھی اور اس بار وہ فتح کے بغیر واپس نہ جانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ محاصرے کے انتظامات کا معاینہ کرنے کے لیے وہ کبھی کبھار خود گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کے گرد گشت کرتے تھے اور افسران و سپاہ کی ہمت بلند رکھتے تھے۔

جہاں تک اہل موصل کا تعلق ہے وہ نہایت سراسیمہ تھے، عزالدین مسعود نے شہر کے دروازے

---

[1] سلطان الناصر: 222/1

مضبوطی سے بند کر کے سخت پہرہ مقرر کر دیا تھا، فصیل پر جگہ جگہ سپاہیوں کو چوکس کر دیا گیا تھا مگر اس کے باوجود اس بار اسے سلطان کی گرفت سے بچ نکلنا ناممکن محسوس ہو رہا تھا، اس کا آخری سہارا اس کے اتحادی تھے جو بالکل بے حس نظر آتے تھے۔ [1] اہل موصل کی اس وقت جو حالت تھی اس کا اندازہ قاضی بہاؤالدین شداد کے درج ذیل بیان سے لگایا جاسکتا ہے:

"عزالدین حاکم موصل نے امداد حاصل کرنے کے لیے مجھے خلیفہ کے پاس بھیجا۔ وہاں سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا، جب میں بغداد سے لوٹا اور اسے مکتوب کا جواب پہنچایا تو وہ کمک سے ناامید ہو گیا۔"

اب موصل سے مختلف عمائد کو صلح کی درخواست کے لیے سلطان کے پاس بھیجا جانے لگا۔ [2]

اتابکی خواتین کا وفد اور مذاکرات کا آغاز: اس دوران موصل کے گردونواح سے بھی سرکردہ افراد کے کئی وفود سلطان کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ اکثر سلطان کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلا رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو سلطان سے محصورین کے ساتھ بہتر سلوک کی درخواست کر رہے تھے۔ عزالدین مسعود کے بھیجے ہوئے وفود میں سے ایک خواتین کا تھا جن میں اتابک خانوادے کی معزز بیگمات شامل تھیں۔ مسعود کو یقین تھا کہ سلطان اس بار ان معزز عورتوں کی درخواست نہیں ٹھکرائے گا۔ اس وفد نے عاجزانہ لہجے میں التماس کی کہ جنگ بندی کر کے مصالحت کر لی جائے اور اہل شہر سے لطف و مہربانی کا معاملہ کیا جائے۔ سلطان نے مستورات کا بے حد اعزاز و اکرام کیا اور ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے کہا:

"بہر صورت ہمارے اور اہل موصل کے درمیان کوئی ایسا معاملہ طے تکمیل طور پر طے پایا جانا ضروری ہے جس پر دل جڑ جائیں، ذہن مطمئن ہو جائیں اور جس کا فائدہ سب کو ہو۔" [3]

سلطان کے ان الفاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محاصرے کے ابتدائی دنوں میں جہاں وہ اپنی کامیابی کے بارے میں پرامید تھے وہاں پوری وسعتِ قلبی کا ثبوت بھی دینا چاہتے تھے اور فریق مخالف کی بے بسی کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی اس کی خاندانی شرافت کا پورا لحاظ کرنا چاہتے تھے۔ سلطان کا مقصد موصل کے قلعے اور شہر پر قبضہ کرنا تھا نہ اس کی فوجی قوت کو پارہ پارہ کرنا۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح موصل کے حکام ان کے دست و بازو بن کر اپنی قوت جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کریں اور ان کے خلاف روزانہ نت نئی سازشوں کے جال پھیلانے کی بجائے اپنی صلاحیتوں کو اس حکومت کی

[1] کتاب الروضتین: 3/ 237، 247، معمار انسانیت: 1/ 223
[2] النوادر السلطانیہ، ص: 116
[3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/ 234

حمایت میں استعمال کریں جو بیت المقدس کی آزادی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے۔

بعض مورخین نے یہاں تاثر دیا ہے کہ سلطان موصل پر قبضے سے عاجز آگئے تھے۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ موصل کی فتح دیر طلب ضرور تھی مگر ناممکن نہیں۔ اگر سلطان اس بار شہر فتح کرنے پر تل جاتے تو شاید دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی تھی مگر یہ سلطان کی عالی ظرفی تھی کہ انہوں نے از خود صلح کو ترجیح دی کیوں کہ ان کی یہ لڑائی کفار سے نہیں، مسلمانوں سے تھی، اس لیے وہ اس میں حتی الامکان نرمی سے کام لینا چاہتے تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر گفت وشنید کے ذریعے اہل موصل کو اطاعت پر آمادہ کرلیا جائے تو ان کا مقصد بہتر انداز میں پورا ہوجائے گا، اس وقت مذاکرات کی کامیابی کے امکانات اس لیے بہت روشن تھے کہ اہل موصل پہلے کبھی اتنے تنہا نہیں تھے جیسا کہ اس وقت۔ اتابک خاندان کی مستورات کا خود آکر صلح کی التماس کرنا مجبوری کی انتہا ہی تو تھی۔

آخر کار اہل موصل کی مجبوری اور سلطان کی نرم خوئی نے مذاکرات کا دروازہ کھول دیا، دونوں جانب سے سفیروں کی آمد ورفت شروع ہوگئی۔ موصل کی حکومت کا وزیر با تدبیر مجاہد الدین قائماز اس میں سرگرم کردار ادا کر رہا تھا۔ چونکہ اہلِ موصل کو سلطان سے شدید عداوت رہی تھی اور سلطان کو بھی ان کے عہد وپیان پر اعتماد نہ تھا اس لیے درمیان میں کسی ایسے ثالث کا پڑنا ضروری تھا جس پر دونوں فریق بھروسہ کرسکتے ہوں۔ سلطان کو حاکم سنجار عماد الدین اس مقصد کے لیے سب سے موزوں دکھائی دیا۔ اہل موصل بھی اس پر مطمئن ہوگئے کیوں کہ وہ حاکمِ موصل عزالدین کا بھائی اور سابق اتحادی تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنا قاصد بھیج کر عماد الدین سے اس کا نمائندہ بطور ثالث طلب کیا، اس نے اپنے وزیر شمس الدین الکافی کو بھیج دیا، اِدھر سلطان کی جانب سے قاضئ عسکر قاضی شمس الدین کو سفیر مقرر کیا گیا تھا، اس طرح مصالحتی وفد میں دونوں طرف سے "شمس الدین" آمنے سامنے ہوگئے۔

اب انہیں حکام موصل سے مل کر صلح کے نکات طے کرنا تھے۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اس صلح نامہ میں سلطان صلاح الدین فاتح اور حکام موصل مفتوح تھے، معاملات برابری کی سطح پر نہیں تھے بلکہ سلطان کی بالادستی مسلم تھی۔ حکام موصل سلطان کی خوشنودی کے لیے شہرزور، قرابلیہ، بنو قفچاق اور بوازیج ورستاق کے علاقے قلعوں اور جاگیروں سمیت حوالے کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن ابھی صلح کی بات چیت جاری تھی کہ اچانک سلطان کی شدید بیماری نے اس سلسلے کو روک دیا اور تقریباً دو ماہ تک اس علاقے کے سیاسی معاملات معلق رہے۔ ۵

۵ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/235، مفرج الکروب: 1/224

سلطان کی شدید ترین بیماری ❊ سلطان کی بیماری کی یہ روداد بڑی عجیب ہے۔ موصل کا محاصرہ شعبان 581ھ (اکتوبر 1185ء) میں شروع ہوا تھا۔ غالباً اس کے ساتھ ہی سلطان صلاح الدین کی طبیعت ناساز ہو چلی تھی مگر انہوں نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ وہ کئی سالوں سے مسلسل جنگی مہمات میں مشغول تھے، درمیان میں کوئی وقفہ آتا تو دو چار ماہ سے زیادہ کا نہ ہوتا۔ اتنے سالوں میں سلطان نے گنے چنے کچھ دن فصیل بند شہروں اور محفوظ عمارتوں میں گزارے تھے۔ ان کا زیادہ تر قیام معسکر کے اپنے سادے سے خیمہ میں رہتا۔ محرم 578ھ میں مصر سے شام چلے آنے کے بعد اکثر جنگی مہمات کی کمان وہ خود کر رہے تھے۔ ان کے بڑے بڑے جرنیل رخصت پر جاتے رہتے تھے مگر سلطان کے لیے تعطیل یا آرام کا لفظ اجنبی تھا۔ ان کی زندگی اب مسلسل کٹھن اور طویل سفروں میں بسر ہو رہی تھی۔ شب و روز مختلف علاقوں کے سرد و گرم موسموں کا سامنا کرنے میں گزرتے۔ بدنی مشقتوں کے ساتھ ساتھ وہ اکثر سوچ بچار میں مصروف رہتے۔ اس کے علاوہ عبادات اور ذکر و وظائف کا بھی ناغہ نہ کرتے، اسی ذہنی اور جسمانی ریاضت نے انہیں اندرونی طور پر تھکا کر کئی امراض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور اب ان امراض کا اثر آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگا تھا۔

سلطان نے بیماری کے اس حملے کا بڑے حوصلے سے سامنا کیا۔ وہ موصل کی فیصلہ کن مہم پر نکلے تھے اور بے نتیجہ واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان کی بیماری کا شہرہ صورتحال کا پانسا پلٹ سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی خداداد ہمت کے بل بوتے پر تمام کام معمول کے مطابق انجام دیتے رہے۔ طبیب ان کی بیماری کی سنگینی کو بھانپ چکے تھے اور انہیں مکمل آرام کا مشورہ دے رہے تھے مگر سلطان خود کو ہشاش بشاش اور چاق و چوبند ظاہر کرتے رہے۔ وہ گھوڑے پر ایک صحت مند آدمی کی طرح سواری کرتے تھے حالاں کہ ان کی حالت کے پیش نظر یہ مناسب نہ تھا۔

رمضان کا مقدس اور بابرکت مہینہ شروع ہوا تو سلطان کی محنت و ریاضت اور بڑھ گئی، اس بار خلاف معمول وہ ماہ مبارک حالت جنگ میں گزار رہے تھے۔ انہوں نے روزوں کا کوئی ناغہ نہ ہونے دیا۔ روزوں اور مرض کی وجہ سے ان کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ جنگی امور کے ساتھ ساتھ وہ عبادت کا بھرپور اہتمام کر رہے تھے۔ زیادہ وقت تلاوت کلام اللہ میں صرف کر رہے تھے۔ انہیں قرآن مجید حفظ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ وقت نکال کر وہ اسے تھوڑا تھوڑا حفظ کرتے رہتے تھے۔ اس ماہ کی مبارک ساعات میں انہوں نے حفظ قرآن کا اہتمام زیادہ شروع کر دیا۔ ناساز طبیعت پر یہ اضافی مجاہدہ آخر کار ان کے مرض کی شدت کا باعث بن گیا۔[1]

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 237،235/3

موصل سے کوچ، حران میں قیام اور بیماری کی شدت ❊ صلح کی بات چیت شروع ہونے کے ساتھ ہی موصل کا محاذ ٹھنڈا پڑ گیا تھا، اگرچہ برتری کا تاثر برقرار رکھنے کے لیے سلطان کا وہاں ٹھہرے رہنا بہتر تھا مگر ان کی صحت اجازت نہیں دے رہی تھی۔ موصل کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی تھی، پھر محاذ کے ماحول میں آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ ماہ رمضان کے آخر میں اچانک موصل کا محاصرہ اٹھالیا گیا اور عید الفطر سے ایک دن پہلے سلطان نے کوچ کر دیا۔ 8 شوال 581ھ (یکم جنوری 1186ء) کو سلطان ''نصیبین'' پہنچے اور آخری عشرے تک ٹھہرے رہے۔ اس دوران موصل کے حکام سے سفیروں کے ذریعے مذاکرات جاری رہے اگرچہ ان کی رفتار بہت سست تھی۔

شوال کے آخر میں سلطان صلاح الدین نے دمشق کا رخ کیا مگر حران پہنچ کر بیماری اتنی شدت اختیار کرگئی کہ وہ بستر سے لگ گئے۔ سفر موقوف ہو گیا اور تمام معروفیات معطل ہو گئیں۔ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دن طبیبوں نے سلطان کی خلوت گاہ سے نکلتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا:

''کوئی امید باقی نہیں ہے، ہر شخص کی عمر طے ہے۔''

اس جملے سے سلطان کے وفاداروں پر بجلی گر پڑی جبکہ کچھ لوگ اپنی خدمات کی وابستگیاں تبدیل کرنے پر غور کرنے لگے، خطرہ تھا کہ سب کچھ الٹ پلٹ نہ ہو جائے۔ حلب میں الملک العادل ابوبکر یہ المناک خبر سنتے ہی منزلیں پھلانگتا ہوا چند دن میں حران پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ بہترین طبیب تھے جنہوں نے سلطان کے علاج معالجے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔ الملک العادل نے اس موقع پر ذمہ داری کا سب سے بڑھ کر ثبوت پیش کیا۔ سلطان کی اُمورِ سلطنت سے لاتعلقی بہت بڑے بحران کا سبب بن سکتی تھی مگر الملک العادل نے قائم مقام حکمران کے طور پر سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی اور تمام معاملات کو خوش اسلوبی سے انجام دینا شروع کر دیا۔[۵]

اس وقت سلطان کی جانشینی کے بارے میں بھی چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ سلطان نے یہ دیکھ کر یہ وصیت لکھوادی:

''اگر مجھے موت آجائے تو میں نے ابوبکر و عمر عثمان و علی کو پیچھے وارث چھوڑ دیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو میں اپنی مراد کے مطابق جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کافی محسوس کرتا ہوں۔''[۵]

(ابوبکر سے سلطان کے بھائی الملک العادل ابوبکر، عمر سے مراد سلطان کے چچا زاد تقی الدین عمر، عثمان

---

[۵] سنا البرق الشامی: 1/227؛ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/238، 239

[۵] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/240

سے اپنے بیٹے الملک العزیز عثمان اور علی سے دوسرے بیٹے الملک الافضل علی کی طرف اشارہ ہے)

مرض میں سلطان کی بلند ہمتی: عام طور پر بیماری اور تکلیف انسان کو چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیتی ہے۔ خصوصاً حاکموں کی نازک مزاجیاں ایسے حالات میں بہت شدت اختیار کر لیتی ہیں مگر سلطان کی حالت یہ تھی کہ جسم ناتواں مگر حوصلہ جواں تھا، طبیعت کی گراوٹ کا اخلاق پر کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے خدمتگاروں، ملاقاتیوں، مصاحبین اور منصب داروں سے وہ عام دنوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ شفقت اور مہربانی کے ساتھ پیش آتے رہے۔ [1]

بیماری کے باعث اگرچہ وہ امور سلطنت کی انجام دہی سے قاصر تھے مگر انہوں نے گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ علماء، فقہاء، مشائخ، امراء، ادیب اور شاعران کی محفل میں ستارے بن کر جھلملاتے رہتے۔ کبھی فقہی مسائل اور شرعی احکام پر گفتگو ہوتی اور کبھی شعر و ادب کے نکات زیر بحث آجاتے۔ کبھی سلطان کی روح کو نئی توانائی بخشنے والے موضوع "جہاد" کے تذکرے چھڑتے، قرآن و حدیث میں مذکور اس عمل کے فضائل بیان کیے جاتے جنہیں سن کر سلطان کو ہر بار اک نیا سرور محسوس ہوتا تھا۔

کبھی کبھی سلطان کے لیے محفلِ سماع بھی منعقد کی جاتی جس میں شرعی آداب کے مطابق خوش الحانی کیساتھ حمد و نعت اور عارفانہ کلام پیش کیا جاتا۔ باجے، ساز اور طبلے سارنگی کا اس محفل میں قطعاً گزر نہیں ہوتا تھا۔ [2]

مرض کی شدت کی حالت میں بھی سلطان حران کے شہری علاقے کی کسی شاندار عمارت کی بجائے فوجی کیمپ کے خیمے میں ہی مقیم رہے۔ تاہم جب بیماری طول پکڑتی چلی گئی تو انہوں نے خیمے کے ساتھ ایک مکان اور حمام تعمیر کرا لیا۔ یہ سادہ سی تعمیر چار پانچ دن میں مکمل ہوگئی۔ اس دوران دمشق سے سلطان کے چھوٹے بیٹے توران شاہ اور ملک شاہ اپنی والدہ سمیت آگئے تھے۔ سلطان نے انہیں بھی اس نئے گھر میں ٹھہرا لیا۔ بعد میں جب سلطان صحت یاب ہو کر دمشق چلے گئے تو یہ مکان مسافروں کے لیے خیراتی سرائے کے طور پر وقف کر دیا گیا اور سلطان کی شفایابی کی یاد میں اس کا نام "دار العافیۃ" رکھ دیا گیا۔ [3]

ملکہ عصمت الدین کی وفات: بیماری کے دنوں میں سلطان پر ایک اندوہ گین حادثہ گزرا۔ ماہِ ذی قعدہ میں جبکہ ان کی بیماری انتہائی حدود کو چھو رہی تھی، ان کی اہلیہ ملکہ عصمۃ الدین کا دمشق میں انتقال ہوگیا۔ عصمۃ الدین دمشق کے عظیم جرنیل معین الدین انر کی بیٹی تھی، سلطان نے 572ھ میں اس سے نکاح کیا۔ یہ نہایت نیک سیرت، پرہیزگار اور صدقہ اور خیرات کی عادی خاتون تھی۔ سلطان کو اس سے

[1] کتاب الروضتین تحت 581ھ [2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 239/3 [3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 241/3

اتنی محبت تھی کہ عماد کاتب کے بقول "وہ بیماری کی اس شدت میں بھی روزانہ اسے ایک طویل خط لکھا کرتے تھے، حالانکہ لکھنے کی تکان اور تفکر سے سلطان کے ضعف میں مزید اضافہ ہورہا تھا۔" جب ملکہ عصمۃ الدین کی وفات کی خبر حران پہنچی تو سلطان کے خواص نے کئی دنوں تک اسے راز میں رکھا کہ کہیں اس شدید صدمے سے سلطان کی طبیعت مزید نہ بگڑ جائے۔[1]

بستر مرگ پر بھی نوازشوں کا سلسلہ ❊ سلطان کی خطرناک بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح مشرق ومغرب میں پھیل گئی تھی، جگہ جگہ سلطان کی صحت یابی کے لیے بے تابانہ دعائیں کی جارہی تھیں۔ جہاں تک سلطان کا تعلق ہے وہ خود صاحب فراش ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر بھرپور اعتماد اور توکل کا مظاہرہ کررہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ان کی سخاوت اور فیاضی ان دنوں حد سے متجاوز ہوگئی تھی۔ عماد کاتب اصفہانی جو سلطان کے اس سفر میں بھی ان کے شب وروز کے ساتھی تھے، ان المناک دنوں کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہاتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند تھے اور نیتیں اخلاص کے ساتھ سفارش کررہی تھیں، کفر کی دھڑکنیں تیز ہورہی تھیں اور تقدیر اپنے فیصلے کررہی تھی۔ جب بھی سلطان کی تکلیف بڑھتی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے ان کی امید میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ جب بھی وہ کمزور ہوتے اللہ تعالیٰ پر ان کا بھروسہ اور طاقتور ہوجاتا تھا۔ میں رات دن ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔ وہ ہر وقت مجھے وصیتیں املاء کراتے رہتے، اور میرے قلم سے اپنے تیمارداروں پر عطایا نچھاور کرتے رہتے۔"[2]

وہ مزید لکھتے ہیں:

"ایک رات ان کی حالت اس قدر بگڑ گئی کہ طبیب بھی ان کی زندگی سے مایوس ہوگئے۔ ناامیدی غالب آگئی اور امید جاتی رہی، صبح ہوئی تو ان کے تیماردار، آستانے کے درباری اور ان کی بارگاہ سے امید وابستہ رکھنے والے لوگ جمع ہوگئے، ان کی سسکیوں کا یہ عالم تھا کہ اس سے اندھیری رات ڈر جائے اور ٹھوس چٹان پگھل جائے۔ سلطان نے اس بارے میں دریافت کیا تو عرض کیا گیا: یہ آپ کے ملاقاتی ہیں جو آپ کے دروازے پر جمع ہیں اور آپ کی حالت پر غمزدہ ہیں۔ سلطان نے مجھے بلوا کر ان لوگوں کے نام تحریر کرنے اور خزانے میں موجود سارا مال ان میں تقسیم کردینے کا حکم دیا۔ ہم نے شام کو دیکھا کہ ان کی چوکھٹ پر کوئی سوالی باقی نہیں رہا۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ سلطان اپنی تکلیف کے سوا کسی چیز پر توجہ نہیں دے سکیں گے مگر سلطان نے اس فیاضی کی وجہ سے ہی آرام محسوس کیا۔"

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/243، 244 [2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/238

سلطان صلاح الدین نے اپنی بیماری کے ایام میں نہ صرف خود اسی طرح مال و دولت خرچ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ دیگر عہدے داروں کو بھی اس کی تاکید کرتے رہے۔ عماد کاتب سے شام اور مصر کے نائبین کے نام حکم نامے لکھوائے کہ فقراء اور مساکین پر صدقہ و خیرات کے دروازے کھول دیے جائیں۔ سلطان کے سوانح نگاروں کے بقول ان دنوں میں سلطنت کا کوئی غریب ایسا نہ رہا جسے اس فیاضی سے حصہ نہ ملا ہو۔[1]

اپنا محاسبہ، قاضی فاضل رحمہ اللہ کا مشورہ اور سلطان کی زندگی کا اہم موڑ: بیماری کے دنوں میں سلطان صلاح الدین ایک سچے خدا ترس مسلمان کی طرح اپنے اعمال اور کردار کا تنقیدی جائزہ بھی لے رہے تھے اور اپنی زندگی کا محاسبہ کر رہے تھے۔ بادشاہ ہوتے ہوئے انہوں نے دنیا پرستی اور عیش و آرام سے جس طرح منہ موڑ رکھا تھا اس کی بدولت انہیں دنیا چھوڑنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ تاہم موت کو اتنا قریب دیکھ کر انہیں یہ خوف ضرور تھا کہ ان کی سالہا سال کی جدوجہد اور جاں سوزی کہیں رائگاں نہ چلی جائے اور ان کے بعد آزادئ القدس کی منزل کی طرف بڑھنے والا قافلہ اپنی راہ سے بھٹک نہ جائے۔ سلطان کو اس کا پختہ یقین تھا کہ موت کا وقت اٹل ہے جس میں لمحہ بھر کی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن اگر وہ اس وقت دنیا سے رخصت ہو جاتے تو یقیناً القدس کی صبح آزادی کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنے کا صدمہ انہیں آخری سانس تک بے چین رکھتا۔ وہ جینا چاہتے تھے القدس کو غاصب نصرانیوں سے چھڑانے کے لیے ...... پیغمبروں کی سجدہ گاہ کو جبین کی نیاز مندیوں سے سجانے کے لیے ...... مسجدِ اقصیٰ میں سلطان نور الدین زنگی کا منبر نصب کرانے کے لیے ...... وہ بسترِ علالت پر بارگاہ خداوندی میں بڑی بے قراری سے اس تمنا کے برآنے کی دعائیں کر رہے تھے۔ نہ صرف ان کے تیاردار اور مصاحبین بلکہ عالم اسلام کے کونے کونے میں مسلمان اس دعا میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

اس موقع پر اپنے اعمال کے احتساب کے دوران سلطان نے بڑی شدت سے یہ محسوس کیا کہ ان کے اوقات اور وسائل کا ایک بڑا حصہ اپنے معاصر مسلمان حکمرانوں سے تنازعات اور معرکوں میں صرف ہوتا رہا ہے۔ اگرچہ حالات نے ہی انہیں ایسے تنازعات میں الجھنے پر مجبور کیا تھا اور القدس کی آزادی کی خاطر اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری تھا مگر اس موقعے پر انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ انہی بکھیڑوں میں کہیں وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے اور فرشتۂ اجل آن پہنچے۔ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اپنوں سے اس کش مکش میں کہیں اس ہوسِ اقتدار کا دخل نہ ہو جس سے عموماً کوئی بادشاہ خالی نہیں ہوتا۔

[1] مختصر الروضتین فی اخبار الدولتین: 240/3

سلطان ایوبی یہ بھی جانتے تھے کہ اوّل تو ہر حکمران کا نفس اسے تمام ناروا مہمات کے لیے وجہ جواز سُجھا ہی دیتا ہے اور پھر حاشیہ بردار ہر فیصلے کو خوشنما تاویلات کے ذریعے اس قدر معقول، ضروری اور مستحسن ثابت کرتے چلے جاتے ہیں کہ خود اسے کبھی اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی خوش قسمت تھے کہ انہوں نے اب تک خود کو ظلم کے بارِ گراں سے محفوظ رکھا تھا...... اتنا محفوظ کہ صدیوں بعد آنے والا کوئی مؤرخ بھی ان کی کسی مہم اور فوج کشی پر ظلم وستم، بے جا قتل وغارت اور عوام کی ایذاء رسانی کا دھبہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ سلطان ایوبی کا غیر معمولی احساسِ ذمہ داری اور خوفِ آخرت تھا کہ انہوں نے اپنے معقول طرزِ عمل کو بھی زندگی کے مسلسل کم ہوتے لمحات کی ٹمٹماتی روشنی میں جانچا، پرکھا اور پھر ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے پیچھے ان کی اپنی حساس طبیعت اور عاقبت اندیش فکر کے علاوہ ان کے وزیر قاضی فاضل رحمہ اللہ کے مشورے کا سب سے زیادہ دخل تھا۔

مؤرخین کے مطابق جب سلطان کی شفایابی کے تمام ظاہری امکانات ختم ہوگئے اور ذاتِ باری تعالیٰ سے فریاد کے سوا کوئی سہارا نہ رہا تو قاضی فاضل رحمہ اللہ نے جو انہی دنوں مصر سے شام آگئے تھے، انہیں دعاؤں کو مؤثر بنانے کی ایک تدبیر بتاتے ہوئے کہا:

''تمناؤں کے برآنے اور مشکلات سے نجات پانے کے لیے ایک تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں قرب کا ذریعہ بننے والے کسی بہترین عمل کی نذر مان لی جائے۔ اگر سلطان کسی بڑی نیکی کی نذر مانیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول اعمال کا وسیلہ پیش کریں تو اس مشکل کے دور ہونے کی بڑی امید ہے۔''

مزید وضاحت کرتے ہوئے قاضی صاحب نے کہا:

''اس وقت سب سے بڑی نیکی یہ ہوگی کہ مسلمانوں سے قتل وقتال کو مکمل طور پر ترک کر کے اہل کفر وشرک سے جہاد کی طرف پوری توجہ دی جائے۔ القدس کو آزاد کرانے اور گستاخ رسالت نصرانی امراء کو سزا دینے سے بڑھ کر خیر کا کام اور کوئی نہیں ہوسکتا لہٰذا سلطان کو اس کی نذر مان لینی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے ان نیک اعمال کی تکمیل کا پختہ وعدہ کرنا چاہیے۔''

سلطان صلاح الدین کو پہلے ہی ان باتوں کا احساس ہو چلا تھا۔ اب قاضی صاحب کی بات ان کے دل کو ایسی لگی کہ انہوں نے فوراً اللہ تعالیٰ سے عہد وپیمان کرلیا کہ وہ آئندہ کسی مسلمان حکمران سے جنگ وجدال نہیں کریں گے اور صرف فرنگیوں سے جہاد کے لیے وقف ہوجائیں گے۔ اگرچہ بظاہر کسی بھی

حکمران کے لیے اپنے معاصرین سے ہمیشہ دوستانہ روابط رکھنا قابل عمل نظر نہیں آتا مگر سلطان کو اطمینان تھا کہ ان کی نیک نیتی اور حسن تدبیر کی بدولت آئندہ ایسی نوبت نہیں آئے گی کہ کسی مسلمان سے لڑنا پڑے۔ ویسے بھی ان کے تقریباً تمام حریف زیر ہو چکے تھے یہاں تک کہ اہل موصل بھی سلطان کی بالا دستی عملاً تسلیم کر چکے تھے۔ حافظ ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سلطان نے نذر مانی کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بیماری سے شفایاب کر دے تو وہ اپنی پوری توجہ فرنگیوں سے جہاد پر مرکوز کر دیں گے، آئندہ کسی مسلمان سے جنگ نہیں کریں گے اور ان کی سب سے پہلی ترجیح القدس کی فتح ہوگی، اس کے لیے اگر انہیں اپنے تمام مال و دولت اور خزانوں کو خرچ کرنا پڑے تو بھی وہ دریغ نہیں کریں گے۔''

سلطان نے اس موقع پر یہ قسم بھی کھائی تھی کہ وہ کرک کے حاکم ریجی نالڈ کو ضرور قتل کریں گے۔ ریجی نالڈ کا روضۂ رسول ﷺ کی بے حرمتی کے ارادے سے حجاز پر چڑھائی کرنا اور پھر مصر سے شام آنے والے حاجیوں کے ایک قافلے کو لوٹ کر قتل کر دینا سلطان کے لیے ایک عرصے سے شدید غیظ و غضب کا باعث بنا ہوا تھا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ ریجی نالڈ نے حاجیوں کو قتل کرنے سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرتے ہوئے ان سے کہا تھا: ''تمہارا احمد کہاں ہے؟ اسے بلاؤ کہ تمہاری مدد کرے۔''

سلطان نے اللہ تعالیٰ سے القدس کو کفار سے آزاد کرانے اور گستاخ ریجی نالڈ کو قتل کرنے کا عہد و پیمان کرتے ہوئے اس کی شانِ رحمت کو جھنجوڑا اور اپنا دامن امید پھیلا دیا۔

آہ جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس سے قبل سلطان کی شفایابی سے متعلق دعاؤں کے اَن گنت عریضے بارگاہ خداوندی میں پہنچ چکے تھے مگر شاید قبولیت کسی بہت بڑے نیک عمل کے وسیلے پر موقوف تھی۔ جوں ہی سلطان کا یہ عزم بارگاہ الٰہیہ میں پیش ہوا، سلطان کے دامن میں شفایابی کا عطیہ ڈال دیا گیا۔[1]

جب شفایابی کے اثرات ظاہر ہوئے ☆ نذر ماننے کے بعد شفایابی کے اثرات ظاہر ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ تب سلطان کو یقین ہو گیا کہ یہ شدید بیماری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے گناہوں کی مغفرت، ان کے رخ کی اصلاح اور انہیں زیادہ اہم محاذ پر متوجہ کرنے کے لیے ایک تنبیہ تھی۔ ماہ ذی الحجہ 581ھ (مارچ 1186ء) کے پہلے عشرے میں سلطان کی طبیعت سنبھلنے لگی اور ہر طرف مسرت و شادمانی کا سماں ہو گیا، بقر عید کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ اس موقع پر موصل سے سفارتی وفد بھی سلطان

[1] البدایۃ والنہایۃ: 7/845 ط دارالفکر، الکامل: 3/239 تحت 583ھ

سے مذاکرات کو حتمی شکل دینے کے لیے حران آیا ہوا تھا، وفد کے قائد قاضی بہاؤ الدین ابن شداد اس سفارت کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

"جب حکامِ موصل کو سلطان کی بیماری کی خبر پہنچی تو انہوں نے اسے اچھا موقع سمجھا اور جان لیا کہ سلطان اس وقت نرم دلی کا مظاہرہ کریں گے اور بات جلد مان لیں گے، لہٰذا انہوں نے مجھے اور بہاؤ الدین الربیب کو بھیجا اور معاہدے کی تشکیل کے کاغذات میرے حوالے کرتے ہوئے کہا: جہاں تک تمہارا بس چلے اور ممکن ہو کوشش کر گزرو۔ ہم روانہ ہو گئے۔ جب سلطان کے معسکر میں پہنچے تو وہاں لوگ سلطان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ہم ذوالحجہ کی ابتداء میں وہاں پہنچے تھے۔ سلطان نے ہمارا غیر معمولی اعزاز و اکرام کیا اور ہمارے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھے۔ بیمار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی مجلس میں تشریف لائے تھے۔"[۵]

رقیب دوست بن گئے سلطان نے بیماری سے ذرا افاقہ پاتے ہی موصل کے وفد کو باریابی کا موقع دیا تھا۔ بابرکت دن یعنی یوم عرفہ، 9 ذی الحجہ 581ھ (3 مارچ 1186ء) کو معاہدے پر حلف اٹھایا گیا جس کے مطابق اہل موصل الزاب سے پرے کے علاقوں اور شہرزور، بنی قفچاق، قرابیلہ، عانہ اور بوازیج کے تمام قلعوں اور جاگیروں سے دست بردار ہو گئے۔ یہ بھی طے پا گیا کہ اہل موصل سلطان صلاح الدین کے احکام کے تابع ہوں گے اور ضرورت پڑنے پر ہمیشہ سلطان کو فوج مہیا کریں گے۔ جمعہ و عیدین میں خلیفہ کے ساتھ سلطان کا نام لیا جائے گا اور ان کے علاقوں میں سلطان کے نام کا سکہ رائج ہوگا۔ معاہدے کے مطابق سلطان نے اہل موصل کو "بین النہرین" کا علاقہ واپس کر دیا جو سلطان نے عزالدین مسعود کے بھتیجے سنجر شاہ سے لیا تھا۔

سلطان کی عادت تھی کہ وہ دشمنی میں حدود و اصول پر قائم رہتے تھے اور دوستی میں وفاداروں کو حد سے زیادہ نوازتے تھے چنانچہ اس خوشی کے موقع پر انہوں نے عزالدین مسعود، اس کی والدہ اور سلطان نورالدین زنگی کی صاحبزادی کے لیے دس ہزار دینار کے تحائف روانہ کیے۔ ان کے علاوہ بہت سے گھوڑے، خوشبوئیں اور عجیب و غریب اشیاء بھی ہدیہ کیں۔ اس طرح وہ اہل موصل کے دل جیت لینے میں کامیاب ہو گئے۔ بہتر تعلقات کا یہ سلسلہ نہایت پائدار ثابت ہوا اور سلطان کی وفات تک اس میں کوئی رخنہ نہیں آیا۔[۵]

غموں کی اطلاعات دنیا خوشیوں اور غموں کا سنگم ہے، یہاں ایک طرف شادمانی کے نقارے بجتے

۵ النوادر السلطانیہ: ص 119 تا 121 ملخصاً

۵ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/ 227، 241، مفرج الکروب: 1/ 223

ہیں تو دوسری طرف مصائب کی آندھیاں چلتی ہیں۔ سلطان کی شفایابی کی مسرت بھی غموں کی کدورت سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ان کی اہلیہ عصمۃ الدین کچھ دنوں پہلے وفات پا گئی تھیں مگر یہ خبر اب تک سلطان سے چھپائی گئی تھی۔ اُدھر 9 ذی الحجہ کو جب سلطان بیماری سے قدرے افاقے کے بعد اہل موصل کے ساتھ معاہدے پر حلف اٹھا رہے تھے، حمص میں ان کے چچازاد بھائی ناصر الدین محمد کا انتقال ہوگیا۔ سلطان کے کاتب عماد اصفہانی نے جب انہیں ناصر الدین محمد کے انتقال کی خبر دی تو ساتھ ہی ملکہ عصمۃ الدین کی وفات کی اطلاع بھی دے دی۔ سلطان کے لیے یہ دو بہت بڑے صدمے تھے۔ عصمۃ الدین جیسی وفا شعار بیوی ان کی مجاہدانہ زندگی کے ہر قدم پر حوصلے اور ولولے کا پیام بن کر ساتھ نباہ رہی تھی۔ اس کی موت سلطان کو نڈھال کرنے کے لیے کافی تھی۔ ناصر الدین محمد، ایوبی خاندان کے بزرگ شیرکوہ کا نہایت قابل اور ہونہار بیٹا تھا، جس کی بہادری، وفاداری، فنون حرب میں کامل مہارت اور قائدانہ صلاحیتوں کے باعث سلطان اس پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ سلطان کی کئی جنگوں میں اس نے شاندار کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ سلطان کا بہنوئی بھی تھا، رفاہی کاموں کے حوالے سے تاریخ میں نام پانے والی سلطان کی بہن ست الشام بنت ایوب اس کے نکاح میں تھی۔ اس بہنوئی کا عین جوانی میں اچانک رخصت ہوجانا سلطان کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا، اس کے باوجود سلطان نے ان اطلاعات کو بڑے صبر وتحمل کے ساتھ سنا۔[1]

بچے کو تعزیتی مکتوب ❋ ناصر الدین محمد کا ایک کم عمر بیٹا اسد الدین اب اس کا وارث تھا، سلطان نے اسے تعزیتی خط لکھا جس میں لڑکے کو مکمل سرپرستی کا اطمینان بھی دلایا۔ انہوں نے لکھا:

''ہم آپ کے والد کے سانحۂ ارتحال سے آگاہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائے اور ہمیں اور انہیں اس سانحے پر اجرِ عظیم سے نوازے۔ بہرکیف وہ رخصت ہوگئے تو اب ہمارے بچے اسد الدین تم بہترین اور نیک جانشین کے طور پر موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جیتا رکھے۔ اگر تمہارے والد دار بقا کی طرف منتقل ہوگئے تو بھی تم ان کی جگہ عزت وعظمت کے ساتھ ثابت قدم ہو۔ شہروں اور جاگیروں کی نیابت تمہارے لیے باقی اور تمہارے سپرد ہے۔ ہمارے بچے! تم اپنا سینہ کشادہ رکھو۔ مرحوم کے خاص مصاحبین، منصب دار اور حمص ورحبہ وغیرہ میں ان کے نائبین یہ جان لیں کہ وہ سب اپنے عہدوں پر برقرار ہیں۔''

سلطان نے قاضی نجم الدین کو یہ خط دے کر حمص بھیجا اور یوں مرحوم ناصر الدین کے پس ماندگان کی

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/243، 244

بھرپور سرپرستی کر کے ایک اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا۔ ❶

دو ضعیف روایتیں ✿ یہاں ابن اثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں سلطان صلاح الدین سے متعلق دو انتہائی کمزور روایات نقل کی ہیں۔ یاد رہے کہ ابن اثیر رحمہ اللہ موصل کے باشندے اور سلطان صلاح الدین کے معاصر تھے۔ عام اہل موصل کی طرح وہ بھی کسی حد تک سلطان کے سیاسی مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سلطان کے بارے میں کوئی بھی منفی روایت نقل کرتے ہوئے زیادہ جانچ پڑتال سے کام نہیں لیتے۔

✦ یہاں 581ھ کے حالات کے ضمن میں انہوں نے نامعلوم راویوں کے حوالے سے یہ روایت نقل کر دی ہے کہ سلطان ایوبی نے ناصر الدین محمد کو قتل کرایا تھا۔ روایت کے مطابق جب سلطان کی حالت نازک ہوگئی تو ناصر الدین محمد نے دمشق پر قبضے کی تیاری شروع کر دی اور امراء کو ساتھ ملانے لگا، سلطان کو اس کی خبر ہوگئی اور انہوں نے ایک امیر ناصح بن عمید کو اس کے قتل کا منصوبہ سمجھا کر حمص بھیج دیا، نو 1 اور دس ذی الحجہ کی درمیانی شب وہ ناصر الدین سے ملا اور شراب نوشی کی مجلس جما کر اسے اتنی شراب پلائی کہ وہ صبح کو مردہ پایا گیا، جبکہ امیر ناصح راتوں رات سلطان کے کیمپ کی طرف نکل گیا۔ ❷

......اس روایت پر کئی سوال اٹھتے ہیں؟

1- ابن اثیر رحمہ اللہ کے سوا کسی اور مورخ نے اس واقعے کا ذکر کیوں نہیں کیا؟
2- ابن اثیر رحمہ اللہ نے اس کی ذمہ داری نامعلوم راویوں پر کیوں ڈالی ہے؟
3- اگر ناصر الدین واقعی غداری کر رہا تھا تو کیا سلطان اسے معزول یا گرفتار نہیں کر سکتے تھے؟ وہ تو اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی حد درجے کشادہ دل تھے۔ ناصر الدین نہ صرف ان کا چچازاد بلکہ بہنوئی بھی تھا، کیا وہ اپنے وفادار جرنیل اور قریبی رشتہ دار کو اتنی بے دردی سے کیسے قتل کرا سکتے تھے؟
4- اگر سلطان نے ناصر الدین کو مروایا ہوتا تو اس کی جگہ اس کے کم سن بچے کو مقرر کیوں کیا۔ کیا یہ بچہ کل اپنے باپ کے قاتل کے خلاف بغاوت نہ کر دیتا۔ سلطان اگر ناصر کے قاتل ہوتے تو اس کے بعد اس کی آل اولاد کو اس عہدے سے کوسوں دور رکھتے۔ اپنے کسی قابل اعتماد جرنیل کو وہاں تعینات کرتے۔ مگر سلطان نے ناصر الدین ہی کے لڑکے کو حمص جیسے اہم شہر کا والی بنائے رکھا۔
5- نامعلوم راوی کی یہ روایت اس لحاظ سے بھی ناقابل اعتبار ہے کہ یہ صحیح روایت سے متصادم ہے۔ اس کے مطابق ناصر الدین 9 اور 10 ذی الحجہ کی درمیانی شب فوت ہوا اور صبح کو اپنے بستر پر مردہ

❶ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 248/3
❷ الکامل فی التاریخ: 314/7 تحت 581ھ

پایا گیا تھا، جب کہ صحیح روایت کے مطابق ناصر الدین اتوار 11 ذی الحجہ شام کو فوت ہوا تھا۔ [1]

6- روایت کے مشکوک ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان اور مرحوم کی زوجہ یعنی سلطان کی بہن ست الشام کے درمیان آخر تک بہت اچھے تعلقات رہے۔ ست الشام نے سلطان کی وفات پر بے اندازہ صدقہ وخیرات کے ذریعے ایصال ثواب کا اہتمام کیا؟ [2] کوئی وفادار بیوی اپنے شوہر کے قاتل کے لیے (چاہے وہ سگا بھائی ہی ہو) ایسے پیار بھرے جذبات کیسے رکھ سکتی ہے؟ ان حقائق کی موجودگی میں ابن اثیر کی اس کمزور ترین روایت پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

❖ ابن اثیر نے دوسری ضعیف روایت یہ نقل کی ہے کہ سلطان نے ناصر الدین محمد کے بعد اس کے وارث اسد الدین کے اکثر مال و دولت پر زبردستی قبضہ کرلیا تھا۔ علامہ ابن اثیر نے یہ روایت بڑے اعتماد سے بیان کی ہے اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اسد الدین نے کم سنی کے باوجود سلطان کو یتیموں کا مال ہڑپ کرنے پر قرآن پاک کی وعید سنائی تھی جس پر سلطان حیران رہ گئے تھے۔

یہ روایت حقائق کے بالکل منافی ہے۔ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ سلطان ایوبی نے ناصر الدین محمد کے اس بیٹے پر نوازشات میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ یہ لڑکا سلطان کا بھانجا بھی تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ سلطان اپنی بہن کی وراثت پر قبضہ کرتے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان نے اس لڑکے کو ناصر الدین کا جانشین مانا اور مکمل سرپرستی کی۔

سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ سلطان ایوبی کو کیا پڑی تھی کہ وہ ناصر الدین محمد کا مال ہڑپ کرتے اور اس کے لیے باپ کو قتل کرا کے یتیم اولاد کی بے کسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جائداد پر ڈاکہ ڈالتے؟ سلطان کی زندگی کا حرف حرف گواہ ہے کہ وہ مال و دولت کو پرکاہ کی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ خصوصاً اپنے جرنیلوں پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان کو ناصر الدین مرحوم کا مال و دولت ہڑپ کرنا ہوتا تو اس کی زندگی ہی میں اسے عہدے سے ہٹا کر سب کچھ چھین سکتے تھے۔ مگر سلطان کی مہربانی کا یہ عالم تھا کہ ناصر کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اور دوستوں کو بھی انہی عہدوں پر فائز رہنے دیا اور ہر طرح اس کی یتیم اولاد کی سرپرستی کی۔

ہاں تاریخ سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ سلطان نے ناصر الدین مرحوم کے خزانوں میں محفوظ مال و دولت کے ذخائر کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، مگر اس کا مقصد یتیموں کا مال ہڑپ کرنا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں عماد اصفہانی کی وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان کے دو مقاصد تھے، ایک یہ کہ مرحوم

[1] کتاب الروضتین: 244/3 [2] تاریخ اسلام ذہبی: 126/9 ش

کا ترکہ ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہو جائے۔ دوسرے جو ورثاء نابالغ ہیں، ان کا حصہ ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔

چنانچہ سلطان نے حمص پہنچتے ہی مرحوم بہنوئی کے مال و دولت کو جمع کر کے کسی تاخیر کے بغیر شریعت کے مطابق تقسیم کر دیا تھا مگر چونکہ اسدالدین ابھی صرف تیرہ سال کا تھا اس لیے اس کی کم سنی کے باعث اس دولت کے ضیاع کا خوف تھا، لہٰذا سلطان نے خاندان کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے اس دولت کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسدالدین کا حق کالعدم کیا گیا تھا۔ ❶

غالباً ابن اثیر رحمہ اللہ ان تفاصیل سے ناواقف تھے اس لیے جو کچھ آس پاس کے ذرائع سے سنا وہ نقل کر دیا۔

نئے علاقوں کا انتظام: اہل موصل سے معاہدے کے بعد سلطان ایوبی نے نئے مملوکہ علاقوں کا اختیار سنبھالنے اور انتظام بہتر بنانے کے لیے اپنے قابل اعتماد امراء کو بھیج دیا۔ شہرزور میں ترکمان ایوانیہ نامی قبائل نے غلبہ حاصل کیا ہوا تھا، سلطان کے فرستادہ امیر مجاہدالدین ایاز نے وہاں جا کر ان کا زور توڑ دیا اور علاقے کا نظم و نسق بخوبی چلانے لگا۔ بوازیج اور دیگر علاقوں کے لیے بھی چند نائبین مقرر کیے گئے اور ان کی رہنمائی قاضی شمس الدین بن فراشی کے ذمہ لگائی۔ بوازیج کی ایک جاگیر ''بافیلا'' کو سلطان نے اپنے مشفق بزرگ مرحوم شیخ الشیوخ صدرالدین بغدادی کے ورثہ کی کفالت کے لیے وقف کر دیا۔ جبکہ رہا اور حران کے قلعے جو مظفرالدین کوکبری سے تنبیہ کے طور پر لے لیے گئے تھے ایک بار پھر اس کے سپرد کر دیے گئے کیونکہ اس نے خود کو ایک وفادار مصاحب ثابت کر دکھایا تھا۔ عیدالاضحیٰ کی مسرتوں کے ساتھ الجزیرہ، اور دیار بکر کے تمام علاقوں پر سلطان کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ ❷

قاضی فاضل کا بشارت نامہ: قاضی فاضل نے اس موقعے پر مصر کے گورنر تقی الدین عمر کو بشارت نامہ روانہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''سلطان کی صحت و عافیت کی تکمیل ہوئی، اس کی خبریں نشر ہوئیں، اندھیرے کے بعد روشنیاں طلوع ہوئیں، بیماری چلی گئی، اس کا غبار دور ہو گیا، اس کی چنگاریاں ٹھنڈی ہو گئیں، یہ ایک اچانک حادثہ تھا جس کی برائی اور صدمے سے اللہ نے بچا لیا، یہ ایک بلائے عظیم تھی جس کی رسوائی سے اسلام کو بچانے کے لیے اللہ کافی ہو گیا، یہ ایک موقع توبہ کا تھا جس سے اللہ نے ہمارا امتحان

---

❶ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 253/3
❷ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 247،238/3

لیا، پس اس نے اس پر ہمارا صبر بہت کم پایا مگر اللہ تعالیٰ تعالیٰ دعاؤں کو ضائع نہیں کرتا جبکہ دل مخلص ہوں اور قبولیت نہیں رکتی اگرچہ راستے گناہوں نے بند کر دیے ہوں، اور وہ مشکل سے نجات دینے کا وعدہ نہیں توڑتا اگرچہ دعا کرنے اور کرانے والا مایوس ہوتے جا رہے ہوں۔ سلطان معظم الملک الناصر نے نئی تازگی حاصل کی ہے۔ ان کا عزم پختہ اور تیز دھار ہے، ان کا نشاط جہاد کی طرف ہے، ہم بندوں کے پروردگار کے سامنے توبہ تائب ہیں، جنت کے قالین بچھا دیے گئے ہیں، حساب نمٹ چکا، پل صراط سے ہم گزر چکے۔ ہم پر ایسے ہولناک مصائب آئے کہ جن کے خوف سے اونٹ سوئی کے ناکے سے گزرنے پر مجبور ہو جائے۔''[1]

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 242/3

فصل:8

فرات سے دمشق تک

نئے ہجری سال 582ھ کا سورج طلوع ہوا تو سلطان صلاح الدین ایوبی مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے حران سے رخت سفر باندھا اور دمشق روانہ ہو گئے۔ ان کے دو بیٹوں الملک الافضل اور الملک الظاہر کے علاوہ ان کا بھائی الملک العادل بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اتوار 14 محرم (6 اپریل 1186ء) کو وہ حلب پہنچے، پھر حماۃ سے ہوتے ہوئے حمص میں رکے جہاں مرحوم ناصر الدین بن شیر کوہ کا 13 سالہ بیٹا اسد الدین باپ کی مسند پر بیٹھ چکا تھا۔ سلطان نے علاقے سے ان غیر شرعی ٹیکسوں کے ازالے کا حکم دیا جو ناصر الدین کے دور سے چلے آرہے تھے، اسد الدین کو حمص، سلمیہ، تدمر، وادی بنی حصین، رحبہ اور زلبیا کا پروانہ حکومت عطا کر کے امیر ارسلان بوغا کو اس کی سرپرستی کے لیے مقرر کر دیا۔ یہاں سلطان نے ناصر الدین مرحوم کے ترکے کی تفتیش بھی کی جو دس لاکھ دینار سے بھی زیادہ تھا۔ سلطان نے خاندان کے والی ہونے کی حیثیت سے اس ترکے کو شرعی اصول کے مطابق ورثاء میں تقسیم کرا دیا، ناصر الدین کی بیوی (اپنی بہن) ست الشام کو شریعت کے مطابق آٹھواں حصہ دیا اور باقی مرحوم کی اولاد میں تقسیم کر دیا، خود ایک پیسہ بھی نہ لیا۔[1]

2 ربیع الاول (23 مئی) کو سلطان صلاح الدین دمشق پہنچے، شہر میں جوش و مسرت کا ایک غیر معمولی سماں تھا، قاضی ابن شداد کے بقول "ایسی فرحت اور خوشی کا دن پہلے کبھی نہ دیکھا گیا تھا" دمشق کے لوگ سلطان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے سلطان کی بیماری کی خبریں بڑی تشویش سے سنی تھیں۔ ان کی صحت یابی کے لیے دمشق کے ہر گھر اور ہر مسجد میں گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتی رہی تھیں۔ اب جبکہ سلطان صحیح وسالم ان کے سامنے تھے، ان کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے ایک جلوس کی شکل میں سلطان کا والہانہ استقبال کیا۔ سلطان عوام کی نگاہوں کے محبت بھرے پیام وصول کرنے کے

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 252/3

بعد قلعے میں گئے اور ایک طویل عرصے بعد اپنے اہل و عیال سے ملے۔ [1]

آئندہ کی منصوبہ بندی اور اولاد کو اہم عہدے دینے پر غور ✽ سلطان صلاح الدین ایوبی اب صلیبیوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ القدس کی آزادی میں مزید تاخیر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ القدس کی فصیلوں کے سامنے لڑی جانے والی فیصلہ کن جنگ کے بعد انہیں طویل عرصے تک ساحلِ شام کی عیسائی ریاستوں اور یورپ کے صلیبیوں کی مشترکہ قوت کا واحد نشانہ بننا پڑے گا۔ انہیں خدشہ تھا کہ آئندہ سالوں میں انہیں جنگوں کے ایک ایسے سلسلے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جس کے آغاز کے بعد شاید ہی انہیں زندگی میں کہیں آرام کا موقع نہ مل سکے۔ ویسے بھی بسترِ علالت سے اٹھنے کے فوراً بعد ان کا اتنی بڑی جنگ میں کود پڑنا مناسب نہ تھا۔ اس سوچ کے پیشِ نظر سلطان نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے، بڑی ہوش مندی کے ساتھ یہ پورا سال صرف منصوبہ بندی اور تیاریوں میں صرف کیا۔

اس منصوبہ بندی کا پہلا مرحلہ امورِ سلطنت کی ترتیب کو مستحکم بنانا تھا۔ گزشتہ سال سلطان صلاح الدین کے کئی قابلِ اعتماد نائبین اور حکام جن میں توران شاہ، شہاب الدین حارمی، فرخ شاہ، ناصر الدین شیرکوہ اور جاولی الاسدی قابلِ ذکر ہیں، فوت ہو چکے تھے۔ ان باصلاحیت افراد کا خلاء اب تک پُر نہیں ہوا تھا۔ کئی عہدوں پر اب تک مناسب تقرریاں عمل میں نہیں آ سکی تھیں۔ دوسری طرف سلطان کے اپنے کئی بیٹے جوانی کے دور میں داخل ہو چکے تھے مگر سلطان نے جان بوجھ کر انہیں کوئی بڑا کام نہیں سونپا تھا۔ وہ قابلیت کے باوجود عملی طور پر عضوِ معطل بنے ہوئے تھے اور امورِ سلطنت سے تقریباً لاتعلق تھے۔ سلطان کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ابھی سے ان لڑکوں پر سلطنت کے انتظامات کا بوجھ نہ ڈالا گیا تو ان کی عملی تربیت کا وقت نکل جائے گا۔ اب تک سلطان نے ان لڑکوں کو بڑے عہدے دینے سے اس لیے بھی گریز کیا تھا کہ وہ ''اولاد پروری'' کی تہمت سے خود کو بچانا چاہتے تھے مگر پہلے ان کے پاس قابلِ اعتماد ساتھیوں کی ایک پوری جماعت موجود تھی۔ اب رجال کار ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ بھیانک حقائق اور سنگین تقاضے منہ کھولے سامنے کھڑے تھے جن کی موجودگی میں ''اولاد پروری'' کی تہمت سے خود کو بچانا اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ مگر سلطان ایوبی ان پہلوؤں کو دیکھنے کے باوجود اپنی اولاد کو اُمورِ سلطنت میں شامل کرنے میں ایک مدت تک متذبذب ہی رہے۔

سلیمان بن جندر کا مشورہ ✽ سلطان ایوبی نے اپنے شہزادوں کو اہم عہدے دینے پر غور اس وقت

[1] النوادر السلطانیہ: 120، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/253

شروع کیا جب ان کے بے تکلف دوست امیر سلیمان بن جندر نے انھیں اس طرف توجہ دلائی۔ جب سلطان مہلک مرض سے شفایاب ہوکر شام کی طرف روانہ ہوئے تو ایک دن امیر سلیمان نے راستے میں ان کی بیماری اور صحت یابی پر تبصرہ کرتے ہوئے باتوں باتوں میں اچانک کہا:

''اللہ کی قسم 1 پرندے بھی اپنی اولاد کے بارے میں آپ سے زیادہ دوراندیش ہوتے ہیں''۔

''وہ کیسے؟''

سلطان نے حیران ہوکر پوچھا، انھیں اپنے اس پرانے دوست کی بات پر ہنسی آ گئی تھی۔

''وہ ایسے کہ جب کوئی پرندہ اپنے بچوں کے لیے گھونسلہ بناتا ہے تو درخت کی بلند شاخوں کا انتخاب کرتا ہے تاکہ اپنے بچوں کو محفوظ رکھ سکے...... مگر آپ نے کیا کیا ہے؟ اپنی اولاد کو زمین سے لگا رکھا ہے۔ حلب آپ کے بھائی الملک العادل کے پاس ہے، حماۃ تقی الدین عمر کے ہاتھ میں ہے، حمص ابن شیرکوہ کی تولیت میں ہے۔ حال یہ ہے کہ آپ کا ایک بیٹا الملک العزیز مصر میں تقی الدین عمر کی ماتحتی میں ہے، تقی الدین جب چاہے اسے نکال دے، دوسرا (الملک الظاہر) آپ کے بھائی (الملک العادل) کے خیمے میں ہے۔ وہ آپ کے بیٹے سے جو چاہے سلوک کرے۔''

''تم سچ کہتے ہو'' سلطان نے جواب دیا۔ مگر اپنی اولاد کے بارے میں کوئی فوری فیصلہ نہیں کیا۔ [۵]

ایسا نہیں تھا کہ سلطان محض ایک ساتھی کی رائے سن کر اپنے بچوں کو امورِ سلطنت پر مسلط کرنے کی فکر میں پڑ گئے ہوں۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ وہ الملک العادل اور اس جیسے دیگر نائبین سے بدگمان ہوں یا سلیمان بن جندر نے انھیں اپنے نائبین سے بداعتماد کیا ہو، دراصل سلیمان بن جندر نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے سلطان لاعلم ہوں۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ ان کے بیٹے کلیدی عہدوں پر نہیں تھے۔ مگر سلطان صرف اولاد کو نوازنے کے لیے عہدوں کی تبدیلیاں کرنے کا تصور نہیں کر سکتے تھے: اگر ایسا کرنا ہوتا تو وہ بہت پہلے کر گزرتے۔ ویسے وہ اولاد کو امورِ سلطنت میں جزوی طور پر پہلے سے دخیل کرنے لگے تھے۔ الافضل کی مصر میں اور الظاہر کی حلب میں تقرری اس کی مثالیں ہیں مگر وہ اس قسم کے فیصلوں میں بھی بنیادی طور پر اپنی رعایا اور ملک کے مفاد اور سب سے بڑھ کر اپنے مقصدِ حیات جہاد فی سبیل اللہ کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ جب تک ان حوالوں سے کوئی ٹھوس وجہ ان کے سامنے نہ آجاتی وہ اولاد کو سلطنت پر مستقل طور پر مسلط کرنے کے حق میں نہیں تھے، کبھی انھیں عہدے دے بھی دیتے اور کبھی انھیں معزول بھی کر دیتے۔ تاہم اب حالات تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ سلیمان کی باتوں نے سلطان

۵ الکامل فی التاریخ: 318/7

کو زیادہ سنجیدگی سے یہ سوچنے پر آمادہ کر دیا کہ ان کے لڑکے قابل، جوان اور تجربہ کار ہو چکے ہیں، ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھانا انہیں ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

چونکہ سلطان پہلے ہی نئے حالات اور آئندہ کی متوقع شدید جنگوں کے پیش نظر عہدوں میں بڑی تبدیلیاں کرنے پر مجبور تھے اس لیے آخر انہوں نے سمجھ لیا کہ اپنے لڑکوں کو سلطنت کے کلیدی عہدوں پر فائز کرنا ضروری ہے۔

یاد رہے کہ بیماری سے افاقہ پاتے ہی انہیں محکمہ خبر رسانی نے ایسی خبریں بھی دی تھیں جن کے مطابق ان کے بعض امراء نے ان کی صحت یابی سے مایوس ہونے کے بعد خود مختاری کے لیے باہم گٹھ جوڑ شروع کر دیا تھا۔ اگر خدانخواستہ سلطان اس حالت ہی میں دنیا سے رخصت ہو جاتے تو ان کی سلطنت چند دنوں کے اندر اندر کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتی اور القدس کی بازیابی کی منزل بہت دور ہو جاتی۔

عہدوں کی نئی ترتیب ❁ ان حقائق کے پیش نظر سلطان نے سلطنت کے کلیدی عہدوں میں اہم تبدیلیوں کا فیصلہ کر لیا۔ ان تبدیلیوں کی مشترکہ اور بنیادی وجوہ تو وہی تھیں جو تفصیل سے اوپر ذکر کر دی گئیں ہیں۔ مگر ان کے علاوہ ہر تبدیلی اور تقرری اپنا الگ پس منظر بھی رکھتی تھی جسے ذکر کیا جا رہا ہے۔

مصر کی حکومت سلطان کے چچازاد تقی الدین عمر کے پاس تھی۔ سلطان کا بڑا بیٹا الملک الافضل معاون کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا مگر ان دونوں میں انتظامی معاملات کے بارے میں اتفاق رائے مشکل سے ہوتا تھا۔ تقی الدین عمر قواعد و ضوابط کا پابند تھا اور بے لچک رویہ رکھتا تھا جبکہ الملک الافضل میں نرمی اور مروت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ٹیکسوں یا تاوان وغیرہ کی بابت حکومت کی زد میں آتا تو الملک الافضل سے سفارش کروا کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس صورتحال سے تقی الدین عمر کی بے چینی فطری تھی۔ چنانچہ اس نے سلطان کو خط و کتابت کے ذریعے اس الجھن سے آگاہ کیا جو کار حکومت میں خلل کا سبب بن رہی تھی۔ [1]

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس صورتحال میں یہی مناسب سمجھا کہ مصر کا انتظام اپنے دوسرے بیٹے الملک العزیز عثمان کے حوالے کر دیا جائے جو کہ مدبر، معاملہ فہم اور زیرک نوجوان تھا۔ مگر چونکہ اس میں تجربے کی کمی تھی اس لیے الملک العادل کو بھی سرپرست کی حیثیت سے اس کے ساتھ بھیجنا ناگزیر تھا مگر الملک العادل اس وقت حلب کا حاکم تھا جو ملک شام میں اہم ترین حیثیت رکھتا تھا۔ الملک العادل کو یہاں سے ہٹا کر مصر بھیجنے کی صورت میں وہاں کوئی ایسا شخص مقرر کیا جانا ضروری تھا جسے اہل حلب دل

[1] الکامل فی التاریخ: 7/317، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/255

وجان سے چاہتے ہوں اور سلطان بھی اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکیں۔ سلطان کی یہ الجھن الملک العادل نے خود ہی دور کر دی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سلطان کے وفادار بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔ سلطان کی منشاء سے آگاہ ہونے کے بعد اس نے دمشق میں سلطان کے بیٹے الملک الظاہر سے ملاقات کی۔ دراصل اس وقت الملک العادل کے بعد یہی شہزادہ حلب کی حکومت کے لیے سب سے موزوں تھا۔ اول اس لیے کہ وہ اس سے قبل حلب پر چھ ماہ حکومت کر کے وہاں کے عوام میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکا تھا، پھر سلطان کو اس پر کامل بھروسہ تھا، نیز کچھ عرصے پہلے اس کا الملک العادل کی بیٹی سے نکاح ہو چکا تھا۔ اس لیے الملک العادل اپنے بھتیجے اور داماد کے لیے حلب کی حکومت چھوڑنا، ناگوار محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے الملک الظاہر سے مل کر نہایت شفقت سے کہا:

''میں نے تمہاری خاطر حلب سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا ہے، مجھے میرا بھائی جہاں کہے اور جو بھی جاگیر دے میں اس پر قناعت کر لوں گا۔ میں سلطان کی وفاداری سے انحراف نہیں کروں گا۔ اب اگر تمہیں حلب کی حکومت لینا پسند ہو تو میں تمہارے والد سے اس کی درخواست کروں گا۔''

الملک الظاہر تو پہلے ہی حلب کا دلدادہ تھا، اسے چند سال پہلے حلب کی ولایت سے معزولی کا بہت رنج ہوا تھا، لہٰذا اس پیش کش سے اسے بھلا کیسے انکار ہو سکتا تھا؟ اس کی رضامندی سے آگاہ ہونے کے بعد الملک العادل نے سلطان صلاح الدین کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا:

''حلب سے اپنی طبعی دل بستگی اور اس کی حکومت کی پسندیدگی کے باوجود میں آپ کی اولاد کو اس کا زیادہ حق دار سمجھتا ہوں۔ الملک الظاہر ہمارا بچہ ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ حلب کی حکومت کے لیے اسے خود پر ترجیح دوں۔''

سلطان نے اس بات سے اتفاق کرنے کے بعد کہا:

''مصر میں بھی ہمارا ایک بیٹا ہونا چاہیے جس پر میں بھروسہ کر سکوں اور حکومت مصر کی نسبت اس کی طرف کروں۔''

الملک العادل کو معلوم تھا کہ سلطان، الملک الافضل کو مصر سے واپس بلانا چاہتے ہیں، اس صورت میں وہاں سلطان کے کسی دوسرے بیٹے کی تقرری ناگزیر ہے۔ سلطان نے الملک العادل پر واضح کر دیا کہ وہ الملک العزیز عثمان کو مصر کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہتے ہیں اور الملک العادل کو اس کا سرپرست بن کر اس کے ساتھ جانا چاہیے۔ دراصل خود الملک العزیز کی بھی یہی خواہش تھی کہ چچا اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ اسے اپنی ناتجربہ کاری کا احساس اور چچا کی شفقتوں اور مہربانیوں کا اعتراف تھا، اس لیے کچھ دنوں پہلے جب

اسے یہ معلوم ہوا کہ سلطان اسے مصر بھیجنا چاہتے ہیں تو اس نے از خود دربار سلطانی میں درخواست کی تھی کہ چچا کو اس کے ساتھ سرپرست بنا کر روانہ کیا جائے۔ جب سلطان نے الملک العادل کو یہ ذمہ داری سونپی تو اس نے اسے بسروچشم قبول کر لیا۔ تاہم ساتھ ہی یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے حلب کے بدلے مصر کے کچھ شہر اور دیہات دے دیے جائیں۔ سلطان نے اسے قبول کر لیا۔ [1]

اس سے قبل سلطان نے الملک الافضل اور تقی الدین عمر کا تنازعہ دور کرنے کے لیے الملک الافضل کو اس کی والدہ، بیوی، بچوں اور حشم وخدم سمیت مصر سے دمشق طلب کر لیا تھا اور تقی الدین عمر کو لکھ بھیجا تھا کہ اب وہ مصر میں کسی کی مداخلت کے بغیر آرام سے انتظام چلا سکتا ہے۔ پیر 23 جمادی الاولیٰ 582ھ (10/اگست 1186ء) کو الافضل دمشق پہنچ گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار شام دیکھا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے الملک العادل سے حلب میں الملک الظاہر کی تعیناتی اور مصر میں الملک العزیز کی حکومت کے معاملات کی بابت مشورے کر کے تمام امور طے کر لیے۔ الملک الافضل کو دمشق میں اپنا نائب مقرر کر دیا اور الملک العادل اور الملک العزیز کو بلا تاخیر مصر روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب یہ امور طے ہو گئے تو الملک العادل اپنے دونوں بھتیجوں الملک العزیز عثمان اور الملک الظاہر سے ملا۔ ان کو دائیں بائیں بٹھایا، الملک العزیز سے کہا:

"سلطان نے مجھے تمہاری خدمت کے لیے مصر ساتھ جانے کا حکم دیا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ دنیا میں فسادی لوگوں کی کثرت ہے۔ کل وہ میرے بارے میں تمہارے کان بھریں گے اور تمہیں مجھ سے خوفزدہ کریں گے۔ اگر تم ان کی باتوں پر کان دھرنا چاہتے ہو تو مجھے ابھی بتا دو تا کہ میں تمہارے ساتھ نہ چلوں۔"

الملک العزیز نے کہا: "میں بھلا ایسا کیوں کروں گا، میں ہرگز ایسی باتیں نہیں سنوں گا۔"

الملک الظاہر نے بھی چچا کو آڑے وقت میں ہر تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے بعد الملک الظاہر سلطان کے حکم سے حلب روانہ ہو گیا۔ ہفتہ 9 جمادی الاخریٰ 582ھ (26/اگست 1186ء) کو اس نے حلب کے قلعے میں پہنچ کر انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حلب کے لوگوں نے اس کی آمد پر بڑی خوشی ظاہر کی۔ [2]

تقی الدین عمر کی مصر سے معزولی: ادھر مصر میں تقی الدین عمر کا جاہ واقتدار عروج پر تھا، اس کے قدم اچھی طرح وہاں جم چکے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے دو آزاد کردہ غلام قراقوش اور یوزبا افریقہ میں دور

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/256، ابن خلدون: 5/301
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/257

دراز مقامات تک یلغار کر چکے تھے۔ برقہ پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا اور ان کے دھاووں سے مراکش کی سلطنت مؤحدین دہل رہی تھی۔ اگر تقی الدین عمر افریقہ کو فتح کرنے میں سنجیدہ ہوتا اور سلطان کی جانب سے بھی ایسی مہمات کی بھرپور تائید کی جاتی تو قراقوش اور یوزبا پورے شمالی افریقہ کو ایوبی سلطنت کا حصہ بنا سکتے تھے۔ مگر مرکز کی توجہ ایسی مہمات کی بجائے شام و عراق کے محاذوں پر مرکوز تھیں اس لیے تقی الدین عمر نے بھی فتح افریقہ میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ اس جرنیل کے ہاتھوں میں مصر کی مکمل باگ ڈور تھی اور اس کا پلہ بہت بھاری تھا۔ الملک الافضل کے شام چلے جانے کے بعد مکمل اختیارات اس کے پاس آ گئے تھے اور وہ بڑے اطمینان سے نظام حکومت چلا رہا تھا مگر دو تین ماہ بعد سلطان کی جانب سے اسے پھر نیا حکم ملا کہ الملک العادل اور الملک العزیز مصر کی حکومت کی اسناد اور اختیارات کے ساتھ قاہرہ آ رہے ہیں، لہٰذا وہ شام آ جائے۔ جب تقی الدین عمر کو معلوم ہوا کہ مصر کی حکومت اس سے واپس لی جا رہی ہے تو اس کا دل ٹوٹ گیا مگر وہ ایک اطاعت شعار اور مخلص انسان تھا، اس نے مرکز کے خلاف بغاوت کے خیال کو دل میں جگہ نہ دی۔

تاہم اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب دربار سلطانی سے دور ہی رہے گا اور اپنی دنیا آپ بسائے گا۔ اس سوچ میں اس کے مملوک جرنیلوں، قراقوش اور یوزبا کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ آمادہ ہو تو افریقہ میں یلغار کر کے کئی دیگر ممالک پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

تقی الدین عمر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے قاہرہ سے جیزہ کی راہ لی مگر اس کی وفاداری اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ یہ اقدام سلطان ایوبی کی سرپرستی میں کرے چنانچہ اس نے سلطان کو خط بھیج کر درخواست کی کہ وہ افریقہ میں یلغار کر کے ایک نیا ملک حاصل کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اسے اس مہم سے نہ روکا جائے۔ [5]

<u>قاضی فاضل کا ناصحانہ خط</u>:: سلطان کو تقی الدین عمر کا خط ملا تو سمجھ گئے کہ اس مخلص ساتھی کی دل شکنی ہوئی ہے اور اسے خود سے دور کر کے وہ اپنے بہترین مددگار کو کھو دیں گے جس کے نتیجے میں القدس کی آزادی کی مہم کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ یہ خط پڑھتے ہی وہ حاضرین سے گویا ہوئے:

''میری جان کی قسم! افریقہ کی فتح اہم ہے مگر بیت المقدس کی بازیابی اس سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر تقی الدین عمر افریقہ کی مہم پر چلا گیا تو ایسے لوگوں کو جمع کرنے میں ہماری عمر بیت جائے گی۔ ہاں جب القدس اور شام کا ساحلی علاقہ فتح ہو جائے گا تو ان افریقی ممالک کے فاصلے بھی سمٹ جائیں گے۔''

---

[5] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/258

یہ کہہ کر سلطان نے تقی الدین عمر کو حکم نامہ بھیجا کہ وہ تمام مصروفیات اور مہمات ترک کر کے فوراً دمشق کے دربار میں حاضری دے۔ تقی الدین عمر یہ حکم نامہ پڑھ کر سرتابی نہ کر سکا اور شام روانہ ہو گیا۔

اسے دمشق حاضری پر آمادہ کرنے میں قاضی فاضل کے مکتوب کا خاص دخل تھا، انہوں نے اس کے افریقہ کی طرف کوچ کرنے اور مرکز سے دوری اختیار کرنے کو نامناسب قرار دیتے ہوئے لکھا تھا:

"اے ہمارے سردار! کیا دنیا اپنی وسعت کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی ہے؟ کیا ہم اسباب دنیوی سے محروم ہو گئے ہیں؟ بخدا ایسا نہیں ہے۔ اے ہمارے سردار! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ کیا ہماری گزران تنگ ہے یا ہماری تعداد کم ہے؟ یا ہمارے پاس ملک نہیں، یا ہمیں مال سے محرومی کا شکوہ ہے؟ بھلا ہم کیسے مسلمانوں سے جنگ کی طرف جا سکتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہے؟ جبکہ ہمیں حربی کافروں سے لڑنے کے لیے بلایا جا رہا ہے؟"

اس خط نے تقی الدین کو شمالی افریقہ کے مؤحدین سے لڑنے سے روک کر سلطان ایوبی کے ہاں حاضری پر آمادہ کر دیا۔ 23 شعبان 582ھ (7 نومبر 1186ء) کو تقی الدین عمر دمشق پہنچا۔ سلطان نے اس کے اعزاز میں دمشق سے باہر برج صفر کے مقام پر آ کر اس کا استقبال کیا اور غیر معمولی مسرت ظاہر کی۔ پھر اس کی ہر ممکن دلجوئی کی اور حماۃ، منبج اور معرۃ کی حکومت اس کے حوالے کر دی۔ یہ علاقے ماضی میں بھی اسی کے پاس تھے۔ کچھ دنوں بعد سلطان نے میافارقین کی ولایت بھی اسے دے دی۔ یوں تقی الدین مطمئن ہو گیا۔ [1]

اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے مصر کی ان افواج کو جو افریقہ میں مہم جوئی کے لیے پابہ رکاب تھیں، حکم بھیجا کہ اس مہم کو ترک کر کے نصرانیوں سے جہاد کے لیے شام چلی آئیں۔

اس دوران سلطان نے الملک الظاہر کو حلب اور الملک العادل اور الملک العزیز کو مصر کے انتظامات کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ یہ دونوں چچا بھتیجے رمضان کو قاہرہ پہنچے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ [2]

<u>سلطان کے تفریحی مشاغل</u>: جیسا کہ اس باب کے شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے بستر علالت سے اٹھنے کے بعد 582ھ کو آئندہ کی منصوبہ بندی، ملکی نظم و نسق کی بہتری اور اپنی صحت و تندرستی کا خیال کرتے ہوئے گزارا تھا۔ منصوبہ بندی میں نئی تقرریاں اور عہدوں کی تبدیلیاں سب سے اہم تھیں جن کا ذکر اوپر خاصی تفصیل سے ہو چکا۔ دوسری چیز افواج کا نظم و نسق تھا جس کے لیے سلطان بطور خاص سوچ بچار کرتے رہے۔ انہوں نے افواج کے نظام کو ہر ممکن پہلو سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد

[1] البدایہ والنہایہ: 7/848؛ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/258
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/257

بہتر بنایا، اس کے علاوہ آئندہ کے معرکوں کے لیے مصر سے افواج کو بھی شام طلب کر لیا تھا۔

اس کے ساتھ وہ اپنی صحت اور آرام کا بھی خیال کر رہے تھے تاکہ صلیبی جنگوں کے طویل تر سلسلے سے پہلے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کر سکیں۔ وہ تفریح اور ورزش کے لیے دمشق کے نواحی جنگلات میں نکل جاتے تھے، چند خاص مصاحبین ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ سلطان گھوڑے پر سوار ہو کر اکثر تل راہط تک چلے جاتے۔ یہاں وہ سدھائے ہوئے بازوں کے ذریعے شکار کھیلتے۔ سلطان کے ایک عقاب کا نام ''بحری'' تھا۔ یہ سمندر کی موج کی طرح شکار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا، اور روزانہ درجنوں پرندے پکڑ لاتا تھا۔ ①

<u>رمضان اور عید الفطر کی رونقیں</u>: ماہ رمضان و شوال 582ھ سلطان کے لئے کئی خوشیوں کا پیغام لائے۔ الملک الظاہر کا الملک العادل کی بیٹی سے نکاح ہو چکا تھا مگر رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ یہ رسم بدھ 26 رمضان (9 دسمبر 1186ء) کو انجام پائی۔ شوال میں سلطان کے بڑے بیٹے الملک الافضل کی شادی مرحوم ناصر الدین محمد بن شیر کوہ کی لڑکی یعنی سلطان کی بھانجی سے ہوئی۔ کاتب عماد کے مطابق رمضان کا مہینہ سلطان نے اس طرح گزارا کہ روزانہ صبح شہر سے علماء، واعظین، حفاظ کرام، قراء حضرات اور دیگر لوگ سلطان سے ملنے آتے تھے۔ سلطان کی مجلس جو روزانہ قلعے کے ایوان میں منعقد ہوتی تھی، ایمانی و روحانی رنگ سے رنگی ہوئی تھی۔ روزانہ ایمان، تقویٰ، موت، آخرت اور جنت و جہنم جیسے موضوعات پر ایک عالم یا واعظ کی تقریر ہوتی۔ دو ہفتے گزر جانے کے بعد اس مجلس میں فقہاء کو بیانات کا موقع دیا گیا چنانچہ کبھی ''المدرسۃ المعمورۃ النوریۃ'' کے مدرس برہان الدین مسعود تقریر کرتے، کبھی شیخ بدر الدین عسکر بیان فرماتے جو دمشق کے سب سے بڑے حنفی عالم تھے۔ کبھی شافعی علماء و فقہاء تقریر کرتے۔ یہ تقاریر خالص فقہی موضوعات پر ہوتیں اور اس دوران حنفی اور شافعی علماء کے درمیان سنجیدہ علمی بحثیں بھی ہوتی رہتیں جن سے سلطان خوب لطف اندوز ہوتے۔ سلطان کی جانب سے محفل میں آنے والے علماء، فقہاء، قراء اور واعظین کو خلعتوں سے بھی نوازا جاتا۔ ②

① کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/268، 270
② ایضاً

فصل:9

صلاح الدین کا شام

مجموعی طور پر سال 582ھ امن وسکون سے گزر رہا تھا۔ سلطان کے حالات کے مآخذ میں ہم ان دنوں سلطان کو زیادہ تر علمی محفلوں، وعظ ونصائح کی مجلسوں اور دمشق کے گرد ونواح کی شکار گاہوں میں دیکھتے ہیں۔ ان حالات سے اس دور کی معاشرت کے مختلف رنگ سامنے آتے ہیں۔ صلاح الدین کے دور میں شام کیسا تھا؟ دمشق کے لوگ کیسے تھے؟ ان تہذیبی وثقافتی حالات کے کئی دلچسپ اور حیرت انگیز پہلو سفر نامہ ابن جبیر سے سامنے آتے ہیں۔ اہل ذوق کو اس سفر نامے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

سلطان کے حالات پر نگاہ ڈالنے والا کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ مرد مجاہد علماء، فقہاء اور صوفیہ کرام کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ویسے تو سلطان کے ہاں ادیبوں، شاعروں اور دیگر اصحاب فن کی بھی خاطر خواہ قدردانی کی جاتی تھی مگر جو مقام ان کے ہاں کتاب وسنت کے ماہرین اور مشائخ تصوف کا تھا وہ کسی اور کا نہیں تھا۔ سلطان کو یہ ذوق عقیدت اپنے والد نجم الدین ایوب اور اپنے پیشرو سلطان نور الدین محمود زنگی سے ملا تھا۔

سلطان نور الدین زنگی کے زمانے سے ہی شام میں علوم دینیہ اور سلوک واحسان سے وابستہ لوگوں کی عزت افزائی کا ایک مثالی ماحول بن چکا تھا جو دیگر ممالک اسلامیہ میں کم دیکھنے میں آتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں اس رجحان کو مزید تقویت ملی۔ طلبہ کے لیے بکثرت مدارس بنائے گئے جن کے خرچے کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں۔ سلطنت کے امراء میں عام رجحان تھا کہ وہ صوفیاء کے لیے خانقاہیں اور لنگر خانے بنواتے، بڑی بڑی عمارتیں مدارس کے لیے وقف کر دیتے۔ طلبہ کو ان درسگاہوں میں ضروریات زندگی کی ہر شئے فراہم کی جاتی تھی۔

ابن جبیر اندلسی جب سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں دمشق آیا تو اسے یہ ایمان پرور ماحول دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ وہ دمشق کے تذکرے میں ایسے مکانات کا ذکر کرتا ہے جو سلطان نور الدین

زنگی کے دور سے قراء حضرات کی رہائش کے لیے وقف تھے، وہ لکھتا ہے:

"اس شہر میں پردیسیوں سے حسن سلوک کے طور طریقے شمار کرنا ممکن نہیں۔ خصوصاً قرآن مجید کے حفاظ اور علم کے طالبین کے احترام میں یہاں کے لوگوں کی عادات بڑی عجیب ہیں۔"

وہ لکھتا ہے:

"ہمارے ممالک کے لوگوں میں سے جو بھلائی حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان شہروں کے لیے رخت سفر باندھے اور علم کی طلب میں دور نکل جائے۔ یہاں وہ (طلب علم میں) سعادت بخشنے والی بہت سی چیزیں پائے گا جن میں سے سب سے پہلی چیز روزی کمانے کی فکر سے آزادی ہے۔"

وہ بیان کرتا ہے:

"یہاں کی مالدار اور بااثر خواتین بھی مساجد، مسافر خانوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لیے دل کھول کر خرچ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو بھی نئی مسجد، مدرسہ یا خانقاہ تعمیر ہوتی ہے اس میں سلطان ایوبی تعاون کرتا ہے اور اس کے اخراجات کے لیے جاگیریں وقف کرتا ہے۔"

دمشق کے گردونواح کے لوگوں میں نیکی کا رجحان بہت عام تھا۔ غریب مفلس لوگ بھی علماء، طلبہ، درویشوں اور مسافروں کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ابن جبیر نے شام کے دیہاتوں میں اس خصلت کو بہت راسخ پایا۔ وہ لکھتا ہے:

"بسا اوقات کوئی فقیر ان لوگوں میں سے کسی کا پیش کیا ہوا کھانا قبول کرنے سے معذرت کرتا ہے تو صاحب خانہ زاروقطار روتا ہے اور کہتا ہے: "اگر اللہ کو مجھ میں کوئی خیر نظر آتی تو فقیر میرا کھانا کھالیتا۔"

ابن جبیر کے سفرنامے سے صلاح الدین ایوبی کے دمشق کی شان وشوکت اور رعنائی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ وہ دمشق کی مشہور تاریخی مسجد الجامع الاموی کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ کرتا ہے اور اس کی وسعت کو پوری پیمائش کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ وہ جامع اموی کے مرکزی گنبد کی بناوٹ سجاوٹ اور نقاشی کی دلکش تصویر یوں کھینچتا ہے:

"آباد زمین کی سطح پر بیت المقدس کے گنبد کے سوا، کوئی عمارت اس گنبد سے زیادہ خوش منظر، بلند وبالا اور عجیب وغریب نہیں ہے۔"

وہ بتاتا ہے کہ الجامع الاموی صبح شام قرآن مجید پڑھنے پڑھانے والوں سے آباد رہتی ہے۔ یہاں تدریس کے بڑے بڑے حلقے لگتے ہیں۔ ناخواندہ لوگوں کی تعلیم قرآن کے لیے صبح وشام کی کلاسیں لگتی تھیں جن میں پانچ سو سے زائد افراد بیٹھتے ہیں۔ یہ لوگ سبق لینے کے بعد مسجد کے ستونوں کے ساتھ بیٹھ

جاتے ہیں اور ہر آدمی اپنا پڑھا ہوا سبق کسی بچے کو پڑھاتا ہے۔

وہ ذکر کرتا ہے کہ یہاں بچوں کو ناظرہ قرآن کے ساتھ ساتھ انہیں لکھنا بھی سکھایا جاتا ہے مگر اس کے لیے قرآن مجید کے الفاظ کی بجائے عربی اشعار لکھوائے جاتے ہیں تاکہ قرآن مجید کی آیات بار بار لکھنے اور مٹانے کی بے ادبی نہ ہونے پائے۔ لکھائی کا استاد الگ ہوتا ہے جسے مُکَتِبْ کہا جاتا ہے اور پڑھانے کے لیے الگ استاد ہوتا ہے جسے مُلَقِن کہتے ہیں۔

وہ شہر میں سو کے لگ بھگ حماموں، چالیس وضوخانوں اور یتیم بچوں کے ایک وقف مدرسے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ شہر کے بازاروں کی رونق، حسن انتظام اور حفاظتی اقدامات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ دمشق شہر میں پانی کی فراہمی کا انتظام نہایت عمدہ ہے اور شاہراہوں کے علاوہ تقریباً ہر گلی میں راہ گیروں اور مسافروں کو پانی پلانے کے لیے سبیلوں کا انتظام ہے۔

دمشق کے تاریخی مقامات میں وہ جامع اموی سے متصل حضرت زکریا علیہ السلام کی شہادت گاہ اور جبل قاسیون کے دامن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے ولادت کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق مولدِ ابراہیم علیہ السلام ایک تنگ مستطیل غار ہے جس کے اوپر ایک بلند اور وسیع مسجد ہے۔ مسجد میں بہت سے جھروکے ہیں اور اس کے اوپر ایک بڑا گنبد ہے۔ ابن جبیر اس علاقے میں جگہ جگہ مدفون انبیائے کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ان کی تعداد ستر ہزار یا سات سو ہے۔ شہر کے مغربی حصے میں قبورِ شہداء کا ذکر کرتا ہے جہاں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین مدفون ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''دمشق کے عین وسط میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قیام گاہ کے طور پر منسوب ربوۃ (ٹیلہ) ہے۔ یہ دنیا کا خوبصورت ترین مقام ہے جو ایک بلند اور مضبوط محل کی طرح ہے، اس کے چاروں طرف سڑکیں ہیں اور ٹیلے پر جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ یہاں نہایت خوبصورت تالاب ہے جس میں بلندی سے پانی بہہ کر آتا ہے۔ پھر نالیوں سے گھروں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ٹیلہ شہر کے باغوں میں مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سے شہر کو پانی تقسیم ہوتا ہے۔ پانی کی سات نہریں الگ الگ جانب نکل جاتی ہیں۔ اس ٹیلے سے شہر کے تمام باغات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ نظارہ نہایت خوش نما ہوتا ہے کہ سات نہریں ملتی اور جدا ہوتی نظر آتی ہیں۔''

دمشق امن وامان کا گہوارہ ہونے کے باوجود شیعہ سنی منافرت سے محفوظ نہ تھا۔ ابن جبیر اس کشاکشی کا حال یوں بیان کرتا ہے:

''ان شہروں میں شیعوں کے حالات بڑے عجیب ہیں، ان کے کئی فرقے ہیں: ایک فرقہ رافضیہ

ہے، یہ لوگ گالم گلوچ کرتے ہیں، امامیہ اور زیدیہ بھی ہیں جو تفضیل (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برتری) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسماعیلی اور نصیری ہیں۔ یہ کافر ہیں کیوں کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہتے ہیں۔"

پھر وہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان شیعوں پر سنیوں کی ایک جماعت کو مسلط کر دیا ہے جس میں لڑنے، بھڑنے والے مردانگی کے پیکر نوجوان شامل ہیں۔ یہ لوگ شیعوں کو جہاں دیکھتے ہیں مارتے ہیں۔

شہر کی وسعت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"اس کے آٹھ دروازے ہیں۔ باب مشرقی پر وہ سفید مینار ہے جس پر روایت کے مطابق نزول عیسیٰ علیہ السلام ہوگا۔ شہر کا رقبہ لمبائی کی طرف مائل ہے۔ مکانات مٹی اور بانسوں سے بنائے جاتے ہیں، لہٰذا یہاں آتش زدگی بہت کم ہوتی ہے۔ شہر تین حصوں پر مشتمل ہے اسی لیے اس کی آبادی تین شہروں کے برابر ہے۔ شہر میں بیس (بڑے) مدارس ہیں اور دو ہسپتال ہیں۔ طبیب حضرات صبح سے شام تک یہاں مریضوں کو مشورہ اور دوا دیتے ہیں، یہاں کے شفاخانے اور مدارس اسلامی دنیا کے لیے فخر ہیں۔ یہاں دنیا کا سب سے خوبصورت مدرسہ، مدرسہ نورالدین ہے، سلطان نورالدین کی قبر بھی اسی میں ہے۔ یہ مدرسہ حسین محلات میں سے ایک محل ہے۔"

شہر کی تفریح گاہوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ شہر کے اردگرد باغوں کا سلسلہ دور تک چلا جاتا ہے۔

وہ سلطان صلاح الدین کی رہائش گاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"شہر میں ایک قلعہ ہے جہاں سلطان کی سکونت ہے۔ یہ شہر کے مغربی حصے میں باب الفرج کے سامنے ہے۔ یہیں ایک جامع مسجد ہے جس میں سلطان جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے قریب مغرب کی طرف دو میدان ہیں، سبزے کی زیادتی کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہاں سبز مخمل بچھی ہوئی ہے۔ میدانوں کے گرد جنگلات ہیں اور ان کے درمیان سے ایک نہر گزرتی ہے۔ میدانوں کے ساتھ ساتھ بید کے درختوں کا جھنڈ ہے، اس طرح یہ میدان نہایت دلفریب منظر پیش کرتے ہیں، سلطان یہاں آتے ہیں، چوگان کھیلتے ہیں اور گھڑ دوڑ میں حصہ لیتے ہیں۔ ہر رات سلطان کے بیٹے ان میدانوں میں نشانہ بازی کرتے ہیں، گھڑ دوڑ اور چوگان کھیلتے ہیں۔"

وہ دمشق کے لوگوں کی عجیب عادات بھی ذکر کرتا ہے مثلاً یہ کہ:

"ان کے چھوٹے بڑے سب چلتے ہوئے اپنے ہاتھ کمر پر باندھ کر چلتے ہیں، ایک ہاتھ اوپر

ہوتا ہے دوسرا نیچے، اسے یہ شرافت اور تمیز شمار کرتے ہیں۔ایک دوسرے سے ملتے ہوئے یہ سلام کرتے ہیں تو رکوع کی طرح جھک جاتے ہیں، ایسے میں ان کے عمامے بھی گر پڑتے ہیں۔“

وہ افسوس کے ساتھ کہتا ہے:

”ہم سمجھتے تھے ایسا ادب محفل میں گانے بجانے والی عورتیں اور باندیاں بجالاتی ہیں مگر عجیب بات ہے کہ یہاں مرد ایسا کیا کرتے ہیں۔“

ابن جبیر اندلسی دمشق سے متعلق اپنی معلومات کے لیے حافظ ابن عساکر دمشقی رحمہ اللہ کی تاریخ دمشق کا حوالہ بھی دیتا ہے اور حیرت وستائش کے ساتھ بتاتا ہے کہ یہ عظیم تصنیف سو کے لگ بھگ جلدوں میں ہے۔ ❶

ابن جبیر 579ھ میں دمشق آیا تھا، اس سے آٹھ سال قبل حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ وفات پا چکے تھے، تاہم دمشق اب بھی بڑے بڑے علماء وفضلاء اور مشائخ سے آباد تھا جن میں شیخ الشیوخ ابوالفرج ابن الصابونی تھے، یہ سلطان نورالدین زنگی کے زمانے سے یہاں آباد تھے۔سلطان صلاح الدین ایوبی کے والد نجم الدین کو ان سے گہری عقیدت تھی۔اسی لحاظ سے سلطان خود بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

ان میں محمد بن ابی المعالی بھی تھے جو صاحب کرامات بزرگ تھے، سن رسیدگی کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور تھے مگر جمعہ کو پالکی میں جامع مسجد جایا کرتے تھے اور تقریر کیا کرتے تھے۔ ❷

ان میں شیخ نجم الدین الخبوشانی بھی تھے جو نامور فقیہ اور عابد وزاہد انسان تھے۔سلطان نے ان کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ان میں قطب الدین نیشاپوری بھی تھے جو مدرسہ غزالیہ میں حدیث پڑھاتے تھے اور فقہ شافعی کے امام تھے۔ ❸

دمشق کی ان بلند پایہ شخصیات کے علاوہ خود سلطان کا اپنا دربار زمانے کے بہترین علماء، فضلاء، اور ادباء سے آراستہ تھا۔سلطان سے قریبی تعلق رکھنے والے اہل علم وادب میں ایک نام اسامہ بن مرشد کا بھی ہے۔اسے اسامہ بن منقذ بھی کہا جاتا ہے کہ منقذ اس کے پردادا کا نام تھا۔جب سلطان نے دمشق کو دارالحکومت بنایا تو اس کی عمر 80 برس سے تجاوز کر چکی تھی۔یہ بوڑھا بیک وقت نابغۂ روزگار شاعر، بہترین ادیب اور بلا کا شمشیر زن تھا۔اس کی پوری زندگی جنگی کارناموں سے بھرپور تھی۔عمادالدین زنگی کے زمانے سے لے کر اب تک وہ بے شمار جنگیں لڑ چکا تھا اور درجنوں انقلابات میں صف اول کا سپاہی ثابت ہوا تھا۔اس کے آباؤ اجداد ”شیزر“ کے سرحدی علاقے کے جاگیردار تھے، اسامہ بھی یہاں رہ کر

❶ رحلۃ ابن جبیر، ص: 180_200
❷ سیر اعلام النبلاء: 358/21
❸ سیر اعلام النبلاء: 204/21

فرنگیوں سے اسلامی سرحدوں کا دفاع کرتا رہا۔ جب 552ھ (1157ء) کے ہولناک زلزلے نے شیزر کو تہہ وبالا کر دیا تو اسامہ کا خاندان بنو منقذ بھی ادھر ادھر بکھر گیا۔ اس وقت اسامہ کی عمر 50 سال سے اوپر ہو چکی تھی، تب وہ ایک عرصے تک حصن کیفا میں زندگی بسر کرتا رہا۔ جب 570ھ (1175ء) میں سلطان صلاح الدین نے دمشق فتح کیا تو اسامہ کی شہرت سے متاثر ہو کر اسے اپنے دربار میں طلب کر لیا۔ اسامہ سلطان ایوبی کے دربار میں آیا تو 68 سال کا ہو چکا تھا۔

اس کی بقیہ زندگی سلطان کے دربار میں ان کی مدح سرائی اور اپنے ایام شباب کے کارناموں کے تذکرہ کرنے میں گذری۔ اس کی کتب میں سے ''کتاب الاعتبار'' بہت مشہور ہے جس میں پانچویں صدی ہجری کی صلیبی ریاستوں اور مسلمانوں سے ان کے تعلقات کے علاوہ شکار اور جنگوں کے انوکھے پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ ①

سلطان کے مصاحبین میں رشید بن البونجی بھی تھا جو بہترین شاعر وادیب اور مزاح نگار تھا۔ اس کے علاوہ مرد میدان بھی تھا سلطان کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک بار اسے خلیفہ بغداد کے ہاں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ ②

سلطان کے دربار میں فقیہ عیسیٰ الہکاری جیسے صاحب سیف وقلم بھی تھے جو سیاست میں سلطان کے بہترین مشیر اور دربار کے سب سے بلند پایہ امیر تھے۔

علم وفضل میں ان سب سے بڑھ کر درجہ قاضی القضاۃ شرف الدین تمیمی کا تھا جو 573ھ میں دمشق کے قاضی مقرر ہوئے تھے، یہ اپنے زمانے میں شوافع کے امام شمار ہوتے تھے۔

ملکی انتظام وانصرام کے لحاظ سے تمام امور کا مدار قاضی فاضل رحمہ اللہ پر تھا جو سلطان کے وزیر اعظم تھے۔ یہ ضرورت کے لحاظ سے کبھی مصر اور کبھی شام میں قیام کرتے تھے۔ جید عالم دین اور بلند پایہ ادیب تھے۔ سلطان کے اہم ترین مکتوبات یہ تحریر کیا کرتے تھے۔

دمشق میں سلطان کے مستقل کاتب کی حیثیت سے شیخ عماد کاتب اصفہانی کو حاصل تھی۔ سلطان کے نام آنے والے خطوط کو پڑھنے اور جواب تحریر کرنے کے علاوہ دفتری امور کی پوری ذمہ داری انہی پر تھی۔ یہ سلطان کے سب سے بڑے وقائع نگار بھی تھے۔ بعد کے تمام مؤرخین کو سلطان کی سیرت سے واقف کرانے میں ان کا سب سے بڑا کردار ہے۔

اس حوالے سے قاضی بہاؤالدین ابن شداد کے کردار کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ وہ اگرچہ دربار سلطانی سے خاصی دیر میں وابستہ ہوئے تھے مگر سلطان کے حالات کو قلم بند کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

① دائرہ معارف: 1/195_196 ② تاریخ اسلام ذہبی: 41/216

دمشق کے ان باکمال لوگوں میں ایک نام مشہور طبیب اسعد بن الیاس کا ہے جو سلطان کا بھی ذاتی معالج تھا۔ خاندانی لحاظ سے نصرانی تھا۔ نوجوانی میں اسلام قبول کرلیا اور علم طب میں بڑی شہرت پائی۔ ①

ابن جبیر نے دمشق سے شام کے ساحلی علاقوں کی طرف جاتے ہوئے یہاں مسلمانوں اور نصرانیوں کے باہم تعلقات کا بھی گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں اور نصرانیوں میں جنگوں کا سلسلہ جاری رہنے کے باوجود معاشرتی سطح پر ایک دوسرے سے برتاؤ فراخدلانہ تھا۔ اسلامی شہروں کے باشندے عیسائی ریاستوں میں اور نصرانیوں کے قافلے اسلامی شہروں میں آزادانہ طور پر آتے جاتے تھے۔ ان میں پیشہ ور افراد تاجر، اور ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے قافلے شام کے ساحل تک جانے کے لیے عیسائی ریاستوں سے گزرتے تو انہیں ٹیکس دینا پڑتا تھا، اسی طرح عیسائی تاجر اسلامی ریاستوں کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے تجارتی ٹیکس ادا کرتے تھے۔ سلطنتوں کی جنگوں کے باوجود تجارتی تعلقات اور راہداری کی سہولیات موجود تھیں۔ جنگ وجدل سے ریاستوں کے تجارتی، مواصلاتی اور معاشرتی تعلقات پر کوئی منفی اثر نہیں پڑتا تھا۔

ابن جبیر اس کی مثال میں دمشق سے نصرانیوں کے ایک شہر عکا کی طرف اپنی روانگی کا منظر بیان کرتا ہے کہ مسلمانوں کے قافلے فرنگیوں کے علاقوں کی طرف جا رہے تھے جبکہ عیسائی قیدی اسلامی شہروں میں لائے جا رہے تھے۔ ابن جبیر اس صورتحال کی تعریف کرتے ہوئے اسے سیاسی اعتدال کا واضح ثبوت قرار دیتا ہے۔

دنیا بھر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین ایسی دوطرفہ رواداری کہیں اور نہیں تھی۔ شاید سلطان صلاح الدین ایوبی کے دبدبے اور سطوت نے اکثر عیسائی حکام کو انتہاپسندی سے گریز کرنے اور اعتدال کی راہ اپنانے پر مجبور کر رکھا تھا ورنہ اس دور میں اور اس کے بعد بھی نصرانیوں کو جہاں آرام پسند مسلم حکمرانوں کا پڑوس ملا وہ سنگین زیادتیوں کے مرتکب ہوتے رہے۔

سلطان ایوبی کے شہروں میں نصرانیوں کے قانونی حقوق کا پورا خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے تاریخی آثار کو باقی رکھا گیا تھا۔ ابن جبیر دمشق میں رومی دور کے اس چرچ کا ذکر کرتا ہے جسے ''کلیسائے مریم'' کہا جاتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ بیت المقدس کے بعد نصرانیوں کے نزدیک اس سے افضل جگہ اور کوئی نہیں۔

وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نصرانیوں سے جہاد کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

''دمشق سے آگے کوئی اسلامی شہر نہیں ہے اور شام کا اکثر (ساحلی) علاقہ فرنگیوں کے قبضے میں

① تاریخ اسلام ذہبی: 263/41

ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے سلطان کو ان علاقوں کے مسلمانوں کے لیے رحمت بنا دیا ہے، یہ بادشاہ نہ راحت و آرام کا خوگر ہے نہ عیش پسند۔ اس کی نشست ہمیشہ گھوڑے کی زین پر ہوتی ہے۔"[۵]

ابن جبیر اندلسی کے سفرنامے سمیت اس دور کی تحریروں سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ سلطان صلاح الدین اپنی رعایا کو ہر ممکن راحت و آرام پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے تھے، یہ ان کی تعمیری سوچ اور عوام پروری کا اثر تھا کہ اس دور کا شام اپنی تعمیر و ترقی میں اپنی مثال آپ تھا۔

---

۵ رحلۃ ابن جبیر، ص: 201۔210

اسباقِ تاریخ

اس حصے میں ہم سلطان صلاح الدین ایوبی کو شام کے دوسرے بڑے مرکز حلب پر قابض ہوتا اور الجزیرہ کے پایہ تخت موصل تک یلغار کرتا دیکھتے ہیں۔ اس مطالعے میں زیادہ تر سیاسی جوڑتوڑ کے مناظر سامنے آتے ہیں جن پر غور کرنے سے بہت سے اسباق ملتے ہیں مثلاً:

- مسلمانوں کے مرکزِ وحدت خلافت کا قیام، استحکام اور اس کا احترام نہایت ضروری ہے۔ خلیفہ بغداد اور اس کے نمائندوں سے سلطان کا برتاؤ اس بارے میں ہمیں اچھا درس دیتا ہے۔
- انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، کسی کو اپنا بڑا بنا کر رکھے۔ سلطان نے عالم اسلام کا سب سے طاقتور بادشاہ بن کر بھی دربارِ خلافت کے سامنے خود کو غلام ظاہر کیا۔ مشائخ اور بزرگوں کے آستانوں پر دوزانو بیٹھے۔ جو درخت پھل دار ہوتا ہے وہ جھکتا ضرور ہے۔
- حرمین شریفین کا تحفظ مسلم حکمرانوں پر فرض ہے۔ اس میں کوئی کوتاہی روا نہیں۔ سلطان اور ان کے ماتحتوں نے اس ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا۔ پس ریجنالڈ جیسے بدباطن منہ کی کھاتے رہے۔
- بیماری اور آزمائش کے وقت اپنا احتساب ضروری ہے۔ اپنی غلطیوں کی تلافی کر کے انسان آزمائش کے منجدھار سے نکل سکتا ہے۔
- اپنے نیک ارادوں کی تکمیل میں دیر نہ کی جائے کہ موت کا کچھ پتا نہیں۔ سلطان نے موت کو سامنے دیکھ کر اپنے نیک عزم کی تجدید کی اور اللہ سے مہلت مانگ کر پھر خود کو اس کے لیے وقف کر دیا۔
- قائد وہ ہے جو اچھے اور باصلاحیت لوگوں کی تلاش میں رہے۔ ایسے لوگوں کو کسی بھی قیمت پر اپنے ساتھ رکھے اور ان سے کام لے۔ ان کی دل جوئی کو اہم سمجھے نہ کہ دولت کو۔ سلطان میں یہ خوبی بہت راسخ تھی۔
- شہروں میں ترقیاتی کام کرانا، انہیں پرسہولت، محفوظ اور خوبصورت بنانا مسلم حکمرانوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ سلطان ایوبی کا دمشق، قاہرہ اور حلب اس کی مثال تھے۔

- قابل حکمران علماء وفقہاء کے مسلکی اختلافات میں فریق نہیں بنتا۔ سب کو احترام دیتا ہے۔ تعصب سے پاک اور بالغ نظر ہوتا ہے۔ سلطان ایوبی شافعی ہوتے ہوئے بھی دیگر مسلکوں کے علماء کے لیے کشادہ دامن تھے۔
- مملکت کے مفاد کو عہدے داروں کی ذاتی خواہش، ذوق یا پسند پر ترجیح دینا ضروری ہے چاہے وہ عہدے دار اپنا بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ سلطان کا شہزادہ ظاہر اور الملک العادل کو ان کے پسندیدہ شہروں سے دوسری جگہوں پر منتقل کرنا اس کی ایک مثال ہے۔
- ماتحتوں کی ذمہ داریوں کو تبدیل کرتے رہنا چاہیے۔ ان کا تجربہ بھی بڑھے گا اور ان کی وفاداری کی آزمائش بھی ہوتی رہے گی۔ عوام پر زیادہ دن ایک شخص مسلط رہے تو مطلق العنان ہو جاتا ہے۔ سلطان کسی کو اس طرح بے لگام چھوڑنے کے عادی نہیں تھے۔

باب:5

شاہراہِ بیت المقدس

محرم 583ھ (مارچ 1187ء)

......تا......

شعبان 583ھ (ستمبر 1187ء)

شخصیات

ریمنڈ	....	طرابلس کا حاکم، القدس کا منتظم
گائی اوف لوسگنان	....	شاہ یروشلم
ازبیلا (سبل)	....	یروشلم کی ملکہ
ہرکولیس	....	یروشلم کا بڑا پادری
ریجی نالڈ	....	کرک کا قلعہ دار
کونرڈ مارکوئیس	....	یورپی نواب، صور کا نیا حکمران
بالیان بن بارزان	....	القدس کا عارضی حاکم
الملک الافضل	....	سلطان کا بیٹا، فوج کے ایک حصے کا سالار
حسام الدین محمد بن لاجین	....	سلطان کا بھانجا
مظفر الدین کوکبری، بدر الدین		
ولدرم یاقوتی اور صارم الدین قائماز	....	سلطانی افواج کے امراء
تقی الدین عمر	....	سلطان کا بھتیجا، مصری افواج کا سالار
الملک العزیز عثمان	....	سلطان کا بیٹا۔ مصر کا گورنر
الملک العادل	....	سلطان کا بھائی
قاضی فاضل	....	سلطان کے وزیر اعظم
قاضی ابو المعالی	....	دمشق کے قاضی القضاۃ
زین الدین ابن نجیہ	....	سلطان کے درباری، عالم، نامور خطیب

فصل:1

تاج وتخت یروشلم

سلطان ایوبی کے شام پر قبضے سے 78 برس قبل القدس پر فرنگیوں کا قبضہ ہوا تھا اور سلطنتِ یروشلم وجود میں آئی تھی۔ نواب گاڈ فرے ڈی بوئلین جو بالڈون اوّل کے لقب سے مشہور ہوا، اس سلطنت کا پہلا تاجدار تھا۔ اس نے شام کے ساحلی علاقے ارسوف پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ ساحل کے دیگر شہر عکا، قیساریہ اور عسقلان کے حکام اسے خراج دیا کرتے تھے۔

یروشلم کی مسندِ حکومت شام کے عیسائی امراء کے لیے شروع سے پر کشش چلی آرہی تھی اور بڑے بڑے کاؤنٹ اس مسند پر براجمان شخصیات کو رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان امراء میں اپنے حمایت یافتہ شہزادوں کو شاہِ یروشلم بنانے کے لیے چپقلشیں بھی چلتی رہتی تھیں، خصوصاً جب یروشلم کا کوئی حکمران فوت ہوتا تو محلاتی سازشیں عروج پر پہنچ جاتیں اور تمام عیسائی ریاستوں کے امراء حرکت میں آجاتے۔ ۵

بالڈون اوّل: یعنی گاڈ فرے رمضان 493ھ (جولائی 1100ء) میں فوت ہوا تو اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی جو اڈیسا کا حاکم تھا، تخت نشین ہوا۔ اس نے عکا کو فتح کرکے مسلمانوں کا قتل عام کیا، 512ھ (1118ء) میں مصر پر حملہ کرکے واپس آتے ہوئے بیمار پڑ کر مرگیا۔ اسی کے دور میں نصرانیوں نے طرابلس فتح کیا جہاں عالم اسلام کے عظیم کتب خانے کی تین لاکھ کتب کو خاکستر کیا گیا۔

بالڈون دوئم: اب اس کا چچیرا بھائی بالڈون ڈی بورگ بالڈون دوئم کے لقب سے یروشلم کا تاجدار بنا۔ اس نے شام کے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ آخرکار یہ ایک لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوگیا۔ مگر حلب کے امیر حسن الدین ابن غازی کو چوبیس ہزار دینار اور کچھ جاگیر کے دے کر رہائی حاصل کرلی۔ بالڈون دوئم نے مسلمانوں کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر سلطنتِ یروشلم کو بے حد وسیع اور مستحکم کرلیا۔ صور جیسے مضبوط اسلامی مرکز پر اسی نے قبضہ کیا۔ اس کے دور میں ٹمپلرز اور

۵ دیکھئے: 229/1

ہاسپٹلرز کے عیسائی فرقوں کو عروج ملا اور ان کی طاقت نے مسلمان حکام کو عاجز کر دیا۔ بالڈون دوئم رمضان 525ھ (اگست 1131ء) میں فوت ہوا۔

اس کے بعد اس کا داماد فلپ کاؤنٹ آف انجو بادشاہ بنا۔ اس نے شوال 531ھ (جولائی 1137ء) میں عماد الدین زنگی سے شکست فاش کھائی۔ مئی 538 (نومبر 1143ء) میں اس کا انتقال ہوا۔ ❶

بالڈون سوئم ﷫ فلپ کے بعد اس کا بڑا بیٹا بالڈون صرف تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اسے بالڈون ثالث کا لقب ملا۔

اس کی تخت نشینی کے تیسرے برس عماد الدین زنگی کا انتقال ہو گیا اور نور الدین زنگی نے مسلمانوں کی قیادت شروع کی۔ اسی کے دور میں دوسری صلیبی جنگ چھڑی۔ بالڈون ثالث نے اس وقت غیر ملکی بادشاہوں اور افواج کی میزبانی کی اور انھیں لے کر دمشق پر چڑھائی کی جو ناکام رہی تاہم چند سالوں بعد اسی بالڈون نے 548ھ (1153ء) میں عسقلان پر قبضہ کر کے نصرانیوں سے خوب داد حاصل کی۔ پھر دمشق پر بھی حملہ کیا جسے نجم الدین ایوب نے پسپا کر دیا۔ ذی قعدہ 556ھ (نومبر 1161ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ❷

ایلمرک (اماری) ﷫ اب اس کا بھائی ایملرک تخت نشین ہوا، جسے عرب مؤرخین "مری" یا "اماری" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ نور الدین زنگی سے اس کے معرکے جاری رہے۔ نور الدین زنگی کی وفات کے کچھ عرصے بعد ذوالحجہ 569ھ (جولائی 1174ء) میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ ❸

بالڈون چہارم ﷫ ایملرک کے بعد اس کا 13 سالہ لڑکا بالڈون چہارم کے لقب سے تخت نشین ہوا، یہ جذام کا مریض تھا، اس لیے عرب اسے "الملک المجذوم" کہا کرتے تھے۔ چند ہی سالوں میں اس نے خود کو سلطان صلاح الدین ایوبی کا سخت ترین حریف ثابت کر دیا۔ کم عمری اور بیماری کے باوجود وہ انتظامی امور پر مضبوط گرفت رکھتا تھا۔ اس نے سلطان سے کئی جنگیں لڑیں۔ ایک لڑائی میں جب اس کا سامنا سلطان کے شیر دل جرنیل فرخ شاہ سے ہوا تو وہ مرتے مرتے بچا۔ اگر عیسائی نائٹ ہمفری نہ ہوتا تو بالڈون چہارم کی لاش ہی میدان جنگ سے واپس جاتی۔ ❹

بالڈون چہارم کی موت اور بالڈون پنجم ﷫ اس کے کچھ دنوں بعد بالڈون نے شکست کا انتقام لینے کے لیے خود سلطان صلاح الدین کی زیر قیادت فوج سے ٹکر لی مگر اس بار نہ صرف اسے عبرتناک شکست

❶ ولیم صوری: 2/78
❷ منتخب تاریخ ... ص: 162_163، الروضتین: 2/272_275
❸ الروضتین: 2/272_275
❹ ایضاً

ہوئی بلکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔اس نے ڈیڑھ لاکھ دینار اور ایک ہزار مسلمان قیدیوں کا فدیہ دے کر اپنی جان چھڑائی۔اس کے بعد اس نے سلطان صلاح الدین سے دوسال کی مدت کے لیے عارضی صلح نامہ کرلیا۔یہ اس کے لیے ناگزیر تھا، بچپن سے وہ جزام کے موذی مرض میں مبتلا تھا،جس کی وجہ سے اس کے اعضاء گل سڑ رہے تھے۔چہرہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا تھا۔آخر 580ھ (85-1184ء) کے موسم سرما میں اس کی آنکھوں کے سامنے موت کے سائے لہرانے لگے،وہ بے اولاد تھا،اس لیے اپنے پیچھے سلطنت یروشلم کے وارث کا انتظام کر کے رخصت ہونا چاہتا تھا۔اس کی نگاہ انتخاب اپنی بہن شہزادی سبل (سبیلا،ازابیلا) کے آٹھ نوسالہ لڑکے یعنی اپنے بھانجے پر پڑی۔شہزادی سبل کی پہلی شادی ولیم صاحبِ شمشیر سے 1176ء میں ہوئی تھی۔شادی کے ایک سال بعد ولیم مرگیا تھا۔اس کے بعد سبل کی دوسری شادی مشہور عیسائی نواب گائی آف لوسگنان سے ہوئی جس سے ایک بیٹا ہوا تھا۔اب بالڈون کو بہن کا یہی بچہ تاج وتخت کا واحد حق دار نظر آرہا تھا،اس نے سلطنت کا فیصلہ اس کے حق میں کردیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے خالہ زاد بھائی ریمنڈ حاکم طرابلس کو اس بچے کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔

کچھ دنوں بعد وہ مرض کے انتہائی درجے سے گزر کر سسکتے ہوئے مرگیا۔اب سبل کا آٹھ سالہ لڑکا بالڈون پنجم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔امراء نے اس کی کم عمری کو مدنظر رکھتے ہوئے ریمنڈ کو اس کا سرپرست مقرر کردیا۔ ①

ریمنڈ: ریمنڈ افواج یروشلم کا سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ طرابلس اور گیلیلی (طبریہ) کا حاکم بھی تھا۔اس وقت عیسائی حکمرانوں میں وہی ایسا باحشمت اور جہاں دیدہ آدمی تھا کہ کم سن بادشاہ کی تربیت اور سرپرستی کی ذمہ داری نبھا سکتا تھا۔ریمنڈ کو عرب مؤرخین نے قومص ابن قومص کے نام سے یاد کیا ہے۔مگر قومص یا ریمنڈ کوئی نام نہیں بلکہ لقب تھا جو اس علاقے کے حکمران کے لیے مخصوص تھا جہاں ریمنڈ کی حکومت تھی۔جیسا کہ بوہیمنڈ انطاکیہ کے حاکم کا لقب ہوا کرتا تھا۔

"طرابلس" ساحل شام پر واقع عیسائی پٹی کے لیے جغرافیائی لحاظ سے ایک اہم معسکر تھا جہاں یورپی حملہ آوروں کے جہاز آکر آسانی سے لنگر انداز ہوسکتے تھے۔ریمنڈ کو اس ریاست کا والی ہونے کے علاوہ اپنی دلیری، معاملہ فہمی، اور مذہبی غیرت کی بناء پر شام کی عیسائی ریاستوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔تاہم شہزادی سبل کا دوسرا شوہر گائی اس کا شدید مخالف تھا اور اسے کسی توقع پر نیچا دکھانے سے باز نہیں رہتا تھا۔ ②

① وکی پیڈیا بامقالہ: مملکت یروشلم ② الکامل فی التاریخ: 7/319-320 مع حاشیہ: صلیبی جنگیں، ہیرولیمب، ص 20-24

گائی آف لوسگنان ؒ: لوسگنان خاندان یروشلم کی سیاست میں خاصا اثر و رسوخ رکھتا تھا، یہ یورپی خاندان تھا، اس کے مشہور فرد گائی کو یورپی تاریخ میں ایک کم عقل مگر بہادر اور خوش شکل قائد کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ گائی کی ابتدائی زندگی مسائل اور جھمیلوں سے بھرپور تھی۔ وہ پوشو کا نائٹ تھا، اسے طنزاً بے ریاست نواب کہا جاتا تھا۔ اس کا باپ لوئی، شاہ بالڈون کے خاص سالاروں میں سے تھا۔ گائی حکومتِ انگلستان کے معتوب افراد میں شمار ہوتا تھا۔ انگلستان میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ مشہور تھا کہ اسے کسی ڈیوک کے قتل کے الزام میں جلاوطن کیا گیا تھا۔ تب اس نے شام کے لیے رختِ سفر باندھا اور سلطنت یروشلم کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ وہ ایک دلیر سپاہی کے طور پر مشہور تھا اور پھر اس کا چھوٹا بھائی امالریک پہلے ہی یروشلم میں نائٹ کانسٹیبل کے معزز عہدے پر تعینات تھا۔ امالریک کے علاوہ گائی کا ایک بھائی جیفرے اوف لوسگنان بھی سلطنت یروشلم کا ایک اہم رکن تھا، یوں گائی کا پلہ خاصا بھاری تھا۔

گائی کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں اس کی شادی شاہ یورشلم بالڈون چہارم کی بہن شہزادی سبل سے جو بیوہ تھی، طے ہوگئی اور یوں اس کے لیے اقتدار کا راستہ ہموار ہوگیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شہزادی پہلے ہی اس پر دل و جان سے فدا تھی مگر اس نے کسی کو اپنے دلی راز کی بھنک نہ پڑنے دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادی سبل خود شادی پر آمادہ نہ تھی مگر بالڈون چہارم نے اسے محض اس جذبے کے تحت شادی پر تیار کر لیا کہ شاید اس طرح یروشلم کو تخت کا وارث مل جائے۔ بالڈون چہارم خود تو بے اولاد تھا، مگر چاہتا تھا کہ اس کی بیوہ بہن شادی کر لے، شاید اسے اولادِ نرینہ نصیب ہو تو وہ اس تخت پر یروشلم کی وارث بن سکے۔

بہر صورت یروشلم میں اس شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔ جہیز کے طور پر گائی کو عسقلان اور جافا کے شہروں کی حکومت بھی عطا کی گئی۔ پھر شادی کے کچھ عرصے بعد سبل کی گود بھی ہری ہوگئی، بالڈون پنجم پیدا ہوا اور یوں گائی کی وقعت اور بڑھ گئی۔

بالڈون چہارم نے مرنے سے پہلے اسے یروشلم کا ناظم الامور بھی مقرر کر دیا تھا۔ جب کہ ولی عہد کی تربیت ریمنڈ کے سپرد کر دی تھی۔

گائی کو اوّل تو یہی گوارا نہ تھا کہ اس کی موجودگی میں اس کے بیٹے کو بادشاہت دی جائے۔ مگر جب اس کا فیصلہ ہو چکا تو اسے یہ اور بھی برا لگا کہ اس کی جگہ ولی عہد کی تربیت اور سرپرستی ریمنڈ کو دی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اس کو عقل و فراست اور بھروسے کے اعتبار سے ریمنڈ سے کم سمجھا جاتا ہے۔ [۵]

۵ دی لیڈ ہسٹار: کنگڈم آف یروشلم ساؤتھ ایسٹ لیکس ہال۔ ص 80 ٹیکی مگیل ریورولیس۔ ص 44-60

ٹیمپلرز اور ہاسپٹلرز ✻ ٹیمپلرز کا مطلب ہے عبادت گاہ کے خدام اور ہاسپٹلرز کا مطلب ہے شفاخانے کے خدام۔ اس تصنیف میں ان کا ذکر کئی بار آ چکا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں دراصل نیم مذہبی اور نیم عسکری قسم کی تنظیمیں تھیں۔ عرب ٹیمپلرز کو الداویہ اور ہاسپٹلرز کو الاسبتاریہ کہتے تھے۔ ان کے سردار گرینڈ ماسٹر (مقدم) کہلاتے تھے۔ یہ تنظیمیں براہ راست روم کے پوپ کے تابع شمار کی جاتی تھیں اور سلطنتِ یروشلم کی قانونی اطاعت سے بالاتر تھیں۔ قانون کے مطلوب افرادان کے ہاں پناہ لے کر خود کو محفوظ تصور کرتے تھے۔ شام کی عیسائی ریاستوں میں ان کا بے حد زور تھا۔ چند ایک کے سوا سرحدوں کے تمام قلعے ان کے پاس تھے۔ وہ زمینیں جو کلیسا کی ملکیت نہیں تھیں، انہی تنظیموں کے قبضے میں تھیں۔ یہ خود کو سرزمین مقدس کا خادم باور کراتے تھے مگر درحقیقت پرلے درجے کے سفاک قاتل تھے۔ مسلمانوں کے حق میں نہایت خوں خوار تھے۔ یہ مقامی عیسائی حکمرانوں کے بھی شدید مخالف تھے اور ان کی سیاسی چپقلشوں میں لگائی بجھائی کا کردار ادا کرتے تھے۔ ٹیمپلرز ریمنڈ کے شدید مخالف تھے اور ہاسپٹلرز گائی کے بدخواہ تھے۔ یہ بدلگام گروہ یروشلم کے ہر حکمران کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا نیم مذہبی و عسکری گروہ ''ٹرکوپولز'' بھی تھا۔ یہ یروشلم کے کلیسا سینٹ جان کے راہبوں کی جماعت تھی جو بڑی گنوار اور جنگجو تھی۔ ۵

ریمنڈ کا سلطان صلاح الدین سے صلح نامہ ✻ جب ریمنڈ، کم سن بادشاہ بالڈون پنجم کا سرپرست بنا تو شام کے نصرانیوں کے درمیان نا اتفاقی پیدا ہو گئی۔ ریمنڈ یہ چاہتا تھا کہ صلاح الدین ایوبی سے صلح کر لی جائے۔ صیدا، طرابلس اور انطاکیہ کے عیسائی روساء بھی اس کے حق میں تھے مگر دوسری طرف ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز بہرصورت لڑائی پر مصر تھے۔ کرک کا بدقماش ریجی نالڈ بھی آمادۂ پیکار تھا۔ یوں عیسائی دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

عجیب بات یہ تھی کہ ریمنڈ کو جنگ بندی کے موقف میں اپنے سب سے بڑے سیاسی حریف گائی کی حمایت حاصل تھی، غالباً ریمنڈ کی طرح گائی بھی مستقبل میں نصرانیوں کا مرکزی رہنما بننے کے لیے فی الوقت بیرونی خطرات سے تحفظ چاہتا تھا۔ بہرکیف اختلاف رائے کے باوجود فیصلہ دو بڑی شخصیتوں ریمنڈ اور گائی کی تجویز کے مطابق ہو گیا اور مسلمانوں سے چار سالہ صلح طے پا گئی۔ اس طرح سلطان اور عیسائی روساء کے درمیان جاری جنگ ایک عرصے کے لیے رک گئی۔ ۵

---

۵ ٹیمپلرز۔ ہاورن بکس، ص 16_32

۵ سوانح صلاح الدین، لین پول، ص 82۔ صلیبی جنگیں۔ میروڈلیمب، ص 61_55

ریمنڈ اور گائی کی چپقلش ❁ صلح کے اس زمانے میں ریمنڈ اور گائی اپنا سیاسی قد و کاٹھ مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ ریمنڈ ہوشیار تھا اور گائی خوش نصیب۔ ریمنڈ نے اپنا دائرۂ اثر بڑھانے کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس نے ریاست طبریہ کی ملکہ سے شادی کر لی جس سے طرابلس اور یروشلم کے ساتھ ساتھ طبریہ بھی اس کی عملداری میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے صلاح الدین سے تعلقات بڑھانا شروع کیے حالانکہ وہ پہلے سلطان کا سخت ترین مخالف تھا۔ 576ھ (1180ء) میں جب بالڈون نے سلطان سے دو سال کے لیے صلح کی تھی تو ریمنڈ نے سب سے زیادہ مخالفت کی تھی مگر اب اپنے سیاسی مفادات کے لیے ریمنڈ خود کو سلطان کا بہترین دوست ثابت کرنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے 581ھ (1185ء) کے قحط میں دمشق کو بھاری پیمانے پر غلہ فراہم کیا تھا۔ پھر اپنے حریف گائی کو مغلوب کرنے کے لیے اس نے سلطان سے باقاعدہ امداد طلب کی اور سلطان کی خوشنودی کے لیے طرابلس کی جیل سے تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریمنڈ مسلمانوں کے نزدیک بھی ایک اعتدال پسند نصرانی حکمران کے طور پر معروف ہو گیا۔

اب ریمنڈ کو اطمینان تھا کہ یروشلم کا آئندہ بادشاہ وہی ہوگا اور اگر موجودہ شاہی خاندان کے رؤساء اور اس کے حریف گائی نے کوئی رکاوٹ ڈالی تو مسلمان اس کی مدد کریں گے۔ لین پول بتاتا ہے کہ ریمنڈ سلطان سے تعلق مضبوط کرنے کے لیے خود ان سے ملنے آیا تھا۔ بعض مسلم مورخین ان دنوں ریمنڈ کے مسلمانوں سے اچھے تعلقات کی تعریف کرتے ہوئے یہاں تک لکھتے ہیں کہ ریمنڈ کو اگر اپنی قوم کا خوف نہ ہوتا تو وہ مسلمان ہو جاتا۔

بہر حال ریمنڈ نے سلطان سے صلح کر کے خاطر خواہ سیاسی فوائد حاصل کیے اور اپنی پشت مضبوط کر لی۔ تاہم 583ھ (1187ء) میں سلطان صلاح الدین کی عیسائی ریاستوں سے فیصلہ کن جنگ کی تیاری سے قبل ریمنڈ کو زندگی کے تلخ ترین تجربہ سے گزرنا پڑا۔[1]

بالڈون پنجم کی موت اور گائی کی بادشاہت ❁ یروشلم کا کم سن حکمران بالڈون پنجم بھی مختصر مدت کی رسمی تخت نشینی کے بعد اچانک مر گیا۔ اس کی عمر کے دس برس بھی پورے نہ ہوئے تھے۔ اب ریمنڈ اپنے زعم میں اس کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے یروشلم کی فرمانروائی کا حق دار تھا مگر فرنگی امراء اس پر تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے مشورہ کر کے شہزادی سبل کو تخت پر بٹھا دیا، ان کی نظر میں سابق حکمران کی ماں ہونے کے ناطے وہی اس اعزاز کی حق دار تھی، ریمنڈ کو اب بھی امید تھی کہ شہزادی سبل رسمی تخت نشینی کے

[1] الفتح القسی، عماد اصفہانی: ص: 43_46 تحت سن 583ھ، صلاح الدین لین پول: 87، الکامل: تحت سن 583ھ

بعد سب اختیارات اسے منتقل کر دے گی مگر شہزادی نے اس کا خواب پورا نہ ہونے دیا اور سلطنت اپنے شوہر گائی کی نذر کر دی۔

یروشلم میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد ہوئی جس میں ملکہ نے عیسائی بطریقوں، پادریوں، نوابوں، ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے جنگجوؤں اور تمام رؤساء کے سامنے یروشلم کی بادشاہت اپنے شوہر گائی کو سونپ دی۔ گائی تخت شاہی پر بیٹھا اور یروشلم کی بادشاہت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ [1]

سلطنت کے دو دعوے دار ❊ یہ سب کچھ ریمنڈ کے لیے ناقابل برداشت تھا، اس کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ شہزادی سبل نے اس سے ان اموال کا حساب طلب کر لیا جو وہ اپنے دورِ اقتدار میں یروشلم کے خزانے سے خرچ کرتا رہا تھا۔ ریمنڈ نے یہ ثابت کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ رقم اس نے دیانت داری سے بالڈون پنجم کے اخراجات میں صرف کی ہے مگر سبل نے اس پر یقین نہ کیا اور اس طرح ریمنڈ کی ساکھ کو زبردست دھچکا لگا۔ اب وہ انتقامی حربوں پر اتر آیا۔ اس نے گائی کو یروشلم کے جائز حکمران کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کئی امراء کو اپنا ہم خیال بنا کر شاہ املرک کی چھوٹی بیٹی ازابیل کے شوہر ہنری آف ٹورون کو یروشلم کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ اس طرح ایک ہی وقت میں یروشلم کی سلطنت کے دو دعوے دار ہو گئے اور دونوں کے ساتھ عیسائی امراء کی ایک بڑی جماعت تھی۔ شام کے نصرانیوں کی مرکزی حکومت کو پہلے کبھی اتنے بڑے بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اس کے ساتھ ریمنڈ نے سلطان صلاح الدین ایوبی سے اپنے تعلقات مزید مضبوط کر لیے۔ وہ جانتا تھا کہ یروشلم میں اپنی مخالف جماعت کو سلطان ایوبی کی پشت پناہی کے بغیر مغلوب کرنا ناممکن ہے۔ اس وقت گائی یروشلم کے بادشاہ کی حیثیت سے ریمنڈ کو باغی قرار دے کر اس کے خلاف فوج کشی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ریمنڈ نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو اس صورتحال سے آگاہ کیا تو سلطان نے اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ [2]

عیسائی ریاستوں میں اس جتھہ بندی سے پیدا شدہ سیاسی بحران مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ نصرانیوں کے اس انتشار کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

"یہ صورتحال نصرانیوں کے شہروں کی فتح اور بیت المقدس کی بازیابی کا سب سے بڑا سبب بن گئی۔" [3]

سلطان صلاح الدین ایوبی نے محسوس کیا کہ القدس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے بہتر موقع شاید پھر کبھی نہ مل سکے۔ چنانچہ انہوں نے القدس کی طرف بڑھنے کے لیے حتمی منصوبہ بندی کر لی۔

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/253، سیمی اسمتھ، ہیرو ولیم: ص 60_64

[2] الروضتین: تحت 582ھ، الفتح القسی فی الفتح القدسی، عماد اصفہانی: ص 42_46، تحت سن 683ھ ... ص 67_70 ... ص 90، سیمی اسمتھ، ہیرو ولیم: ص 67_70

[3] الکامل فی التاریخ: تحت 582ھ

فصل:2

حطین کی رزمگاہ

583ھ (1187ء) معرکوں اور فتوحات کا سال بن کر نمودار ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اب نصرانیوں سے بھرپور انداز میں نبرد آزمائی کے لیے تیار تھے۔ القدس کی آزادی کے لیے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ نفیرِ جہاد سن کر مصر، عراق اور کردستان کی باقاعدہ افواج کے علاوہ رضا کار مجاہدین کی جماعتیں بڑی تعداد میں سلطان کے معسکر کا رخ کر رہی تھیں۔ ان میں سے ہر شخص بیت المقدس کو فرنگیوں کے ناپاک تسلط سے آزاد کرانے کے لیے جان کا نذرانہ پیش کر دینا اپنی خوش بختی تصور کرتا تھا۔

یہ نئے ہجری سال کا پہلا دن تھا، اس دن کا آفتاب اسلام کے مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی کو ایک عجیب شان کے ساتھ دمشق کی فصیل سے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ سلطان کی عمر اب 45 برس سے زیادہ ہو چکی تھی، ان کے سنجیدہ اور باوقار چہرے سے گزشتہ 20 سالہ عسکری اور سیاسی تجربات کی پختگی عیاں تھی۔ ان 20 سالوں میں انہوں نے جنگی اور سیاسی دنیا کے سینکڑوں رنگ دیکھے، زمانے کے ہزاروں نشیب و فراز عبور کیے اور اَن گنت آزمائشوں سے گزرے مگر درحقیقت ان کی زندگی کے وہ معرکے اب شروع ہو رہے تھے جن کے باعث اسلامی تاریخ میں انہیں تمام سلاطین سے بلند مقام ملنے والا تھا۔ اگر سلطان کی زندگی میں جاں گسل امتحانات کا یہ دور نہ آتا تو یقیناً تاریخ میں انہیں وہ جگہ نہ ملتی جسے آج تک نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اب شروع ہونے والی یہ جنگیں جو سلطان کی وفات تک جاری رہیں سلطان کی داستانِ حیات کا مرکزی حصہ اور ان کی کہانی کا نقطۂ عروج ہیں۔

ان جنگوں کا آغاز ناگزیر تھا کہ سلطان کی زندگی کا مقصد ان کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا...... پہلے ان میں کچھ تاخیر ممکن تھی...... مگر جب بدبخت ریجی نالڈ کی گستاخیاں عام ہوئیں تو سلطان کی طرف سے التواء اور پس و پیش جیسے الفاظ بے معنی ہو گئے۔ گزشتہ سالوں میں سلطان کی جانب سے اس کے خلاف پے در پے مہمات جاری رہی تھیں جن سے گھبرا کر اس نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر جنگ بندی کی

مدت کے دوران اس نے ایک بار پھر بدعہدی کا ثبوت دیتے ہوئے مصر سے شام آنے والے ایک بڑے قافلے پر حملہ کیا تھا اور اہل قافلہ کو گرفتار کر کے ان کے اموال پر قبضہ کرلیا تھا۔ سلطان کی جانب سے تنبیہی پیغامات اور دھمکیوں نے بھی اس پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس سے سلطان کا برانگیختہ ہونا لازمی تھا۔ پھر اپنی شدید بیماری کے دنوں میں سلطان نے اسے قتل کرنے کی نذر بھی مان لی تھی جس کے ایفاء میں تاخیر انہیں گوارا نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اب نصرانیوں کے باہمی تنازعات نے حالات کو فوج کشی کے لیے سازگار بنا دیا تھا، لہٰذا سلطان اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

حجاج کے قافلوں کی حفاظت ❊ سلطان کے ساتھ اس مہم میں ان کا بیٹا الملک الافضل بھی تھا۔ راس الماء پہنچ کر سلطان نے اسے ٹھہرنے کا حکم دیا کیونکہ فوج کا ایک بڑا حصہ جس میں عرب بدو، ترک اور قبائلِ عجم کے مجاہدین شامل تھے، پیچھے آرہا تھا۔ سلطان نے الافضل کو ہدایت کی کہ وہ ان سب کو لے کر آئے۔

سلطان نے خود بصریٰ پہنچنے تک کہیں پڑاؤ نہ ڈالا۔ بصریٰ میں ٹھہرنا اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ مصر کے حاجیوں کے قافلے فریضۂ حج ادا کر کے اب اسی راستے سے اپنے وطن کی طرف جا رہے تھے۔ جن میں سلطان کی بہن اور بھانجا حسام الدین محمد بھی تھے۔ سلطان کو اطلاع مل گئی تھی کہ حجاج کرام کی واپسی کے موقع پر ایک بار پھر دست درازی کے لیے تیار ہے۔ اس سے معلوم ہوا تھا کہ حجاج کو لوٹنے کے بعد وہ مصر کی طرف بڑھ کر شام کی کمک کا راستہ بند کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے سلطان بذاتِ خود حجاج کرام کے قافلوں کے تحفظ کے لیے بصریٰ میں رکے رہے۔

کرک پر حملہ ❊ ماہِ صفر 583ھ (مئی 1187ء) کے آخر تک حجاج کرام بحفاظت گزر گئے، اب سلطان نے سب سے پہلے اسی رخ پر آگے بڑھتے ہوئے کرک پر حملہ کیا۔ اس مہم میں لشکر کا صرف ایک منتخب حصہ تھا، حملے کا مقصد شیطان ریجی نالڈ کو حجان میں مبتلا کرنا اور اسے خوفزدہ کرنا تھا۔

اس حملے میں کرک کے گرد و نواح سے انگوروں کے باغ اجاڑ دیے گئے، درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ کھیتوں میں فصل کا کوئی دانہ نہ رہنے دیا گیا۔ نواحی بستیوں سے کمک و رسد کے لیے خاصے ذخائر لوٹ لیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان کے سپاہیوں نے شوبک کے قلعے کے آس پاس بھی اسی طرح تاخت و تاراج کی اور خاصا مالِ غنیمت حاصل کیا۔ ریجی نالڈ اس دوران اپنے محفوظ قلعے میں پناہ گزین رہا، اسے معمولی مزاحمت کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

❶ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/276، الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ

چوں کہ دیگر عیسائی ریاستوں میں بھی سلطان کی آمد آمد کا غلغلہ تھا اور سلطان کی فوج کا بڑا حصہ جو راس الماء میں الملک الافضل کے زیر انتظام جمع ہو رہا تھا نصرانیوں کو بری طرح بدحواس کیے دے رہا تھا، اس لیے سب عیسائی حکمران اپنے اپنے قلعوں میں دبک چکے تھے اور ریجی نالڈ کے لیے کسی امداد کا حصول ناممکن تھا۔

اس دوران مصر سے سلطان کی ندائے جہاد پر لبیک کہنے والے امدادی دستے آ گئے۔ سلطان نے ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کرک اور شوبک کے قلعوں اور نواحی بستیوں کی نگرانی کا حکم دیا اور خود بھی اپنے عساکر کے ساتھ اس علاقے میں پڑاؤ کر کے تقریباً دو ماہ قیام کیا۔ ① ریجی نالڈ کو سزا دینے کا فیصلہ بہر حال حتمی تھا مگر سلطان نے قلعہ کرک کا محاصرہ اس لیے نہیں کیا کہ وہ سابقہ تجربات کی روشنی میں بخوبی جانتے تھے کہ محاصرے کا نتیجہ اس بار بھی مختلف نہیں ہوگا اس لیے سلطان ریجی نالڈ کو کھلے میدان میں لانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ القدس پر کامیاب اور بھرپور حملے کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ ریجی نالڈ سمیت تمام عیسائی امراء کو ان کے محفوظ قلعوں سے نکلنے پر ابھارا جائے اور اس سے پہلے یہ بھی ناگزیر تھا کہ نصرانیوں کو چھوٹی چھوٹی مہمات کے ذریعے اچھی طرح تھکا دیا جائے اور ان کا اس قدر جانی و مالی نقصان کر دیا جائے کہ جب وہ مقابلے کے لیے باہر نکلیں تو اسلامی لشکر کے لیے زیادہ سخت حریف ثابت نہ ہوں۔

عکا کے گردونواح میں چھاپہ مار حملے ❁ اس منصوبے کے تحت سلطان نے الملک الافضل کو پیغام بھجوایا کہ وہ لشکر کے بہترین سپاہیوں پر مشتمل چند دستوں کو عکا اور نواحی قصبات پر چھاپہ مار حملوں کے لیے روانہ کر دے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ سلطان اس وقت دمشق کے جنوب میں کوئی سو میل دور فوج کے منتخب حصے کے ساتھ قیام پذیر تھے جبکہ دمشق سے چلنے والا بھاری لاؤ لشکر جنوب مغرب کی طرف پیش قدمی کر کے طبریہ کے قریب رکا ہوا تھا، مگر اتنے فاصلے کے باوجود سلطان کے احکام وہاں برابر پہنچ رہے تھے اور لڑائی کا پورا نقشہ جسے سلطان نے مربوط حکمت عملی کے ساتھ مرتب کر کے عیسائی ریاستوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا تھا، انہی کی ہدایات کے مطابق تشکیل پا رہا تھا۔ ②

پرجوش نوجوان الملک الافضل پہلے ہی نصرانیوں کے خلاف کارروائی کے لیے بے چین تھا اور اس نے کئی بار سلطان کو خطوط لکھ کر عیسائی ریاستوں کی طرف پیش قدمی کی اجازت طلب کی تھی مگر سلطان بعض مصلحتوں کی بناء پر تاخیر کرتے رہے، اسی انتظار میں دو ماہ گزر گئے تھے، اب جوں ہی الملک الافضل کو سلطان کا حکم ملا اس نے موقع محل کو ملحوظ رکھتے ہوئے مظفر الدین کوکبری، دلدرم یاقوتی اور صارم الدین قایماز جیسے سرکردہ امراء کو عکا کی طرف روانہ کر دیا۔

---

① الروضتین: تحت 583ھ، وقعۃ حطین، روایۃ العماد ② الکامل فی التاریخ: تحت 582ھ ... 302/5، البدایہ والنہایہ: تحت 583ھ

یہ ماہ صفر 583ھ (مئی 1187ء) کے آخری ایام تھے، راتیں اندھیری تھیں، یہ جانباز رات بھر سفر کرتے رہے اور صبح کے وقت جھیل طبریہ سے تقریباً 25 کلومیٹر مغرب میں صفوریہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ وہ عیسائیوں کے فصیل بند شہر طبریہ کو پیچھے چھوڑ آئے تھے جو سلطان کے سابق حریف اور موجودہ حلیف ریمنڈ کی عشرت گاہ تھا۔[1]

طبریہ کا راحت کدہ ❊ طبریہ کے راحت کدے میں ریمنڈ اپنی بیوی کے ساتھ عیش وطرب کے دن گزار رہا تھا۔ یہ قلعہ اصل میں اس کی بیوی کا تھا، ریمنڈ کو یہاں کا قیام بہت لطف دیتا تھا۔ جھیل طبریہ کے کنارے یہ ایک بڑا خوبصورت شہر تھا۔ سیاہ سنگ خارا سے تعمیر شدہ قلعہ دور سے خاصا ہیبت ناک نظر آتا تھا مگر اس کے اندر کیف وسرور کو انتہا تک پہنچانے والا ہر سامان میسر تھا۔ قلعے کے محلات اور میناروں کا سلسلہ جھیل کے شفاف پانی تک چلا گیا تھا۔ اونچی فصیلوں کے سائے میں ڈھلوانی چٹانوں پر ماہی گیروں کا ایک انبوہ صبح سے شام تک مچھلیاں شکار کرتا رہتا تھا۔ قلعۂ طبریہ سے مشرق کی طرف وہ سرمئی پہاڑیاں نظر آتی تھیں جو سلطان ایوبی کی سرحد تھیں اور جہاں مسلمان محافظ سواروں کے گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہتے تھے۔ ان پہاڑوں سے کئی راستے نکل کر طبریہ کی جانب آتے تھے۔ دمشق کی شاہراہ بھی یہیں سے گزرتی تھی۔ قلعۂ طبریہ سے ان سب راستوں کی ناکہ بندی کی جاسکتی تھی۔ ریمنڈ جانتا تھا کہ مسلمان عن قریب ساحل شام پر حملے کے لیے انہی راستوں سے گزریں گے مگر اس کے باوجود وہ اس راستے کی ناکہ بندی نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ سلطان سے اس کا معاہدۂ صلح برقرار تھا اور اسے یقین تھا کہ سلطان سے وعدہ خلافی کا انجام اچھا نہیں ہوسکتا۔ بہرصورت ایک انجانا خطرہ اسے بے چین کیے دے رہا تھا، اس خوف سے نجات پانے کے لیے وہ اس موسم بہار میں بے تحاشا شراب نوشی کرتا رہا۔[2]

اس کی عیش ومستی کے انہی دنوں میں سلطان صلاح الدین کی جانب سے فوج کشی شروع ہوگئی اور پھر ایک دن سلطان کے کچھ سپاہی الملک الافضل کی قیادت میں یہاں سے گزرے۔

الملک الافضل طبریہ میں ❊ لین پول بتاتا ہے کہ الملک الافضل نے ریمنڈ سے اجازت مانگی کہ وہ دریائے اردن کے پار ریمنڈ کی عملداری میں سیر وتفریح کرنا چاہتا ہے اس کے جواب میں ریمنڈ نے یہ شرط عائد کی کہ مسلمان کسی کے جان ومال کو گزند پہنچائے بغیر سیر کرکے غروب آفتاب سے پہلے پہلے واپس ہوجائیں گے۔ مسلمانوں نے اس کا وعدہ کرلیا۔ ہم یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ الملک الافضل نے

---

1. الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، ملوک النحل: 5/302، البدایہ والنہایہ: تحت 583ھ
2. صلیبی جنگیں، ہیرلڈ لیمب، ص 83

جو پہلی بار شام آیا تھا اور ہر لحہ جنگ کے نقارے پر چوٹ پڑنے کا منتظر تھا، یہ دورہ محض سیر سپاٹے کے لیے نہیں کیا ہوگا بلکہ اسے یلغار سے پہلے اس بہانے اردگرد کے علاقے سے آگاہی حاصل کرنے سے زیادہ دلچسپی ہوگی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ریمنڈ سلطان کا حلیف بن چکا تھا تو الملک الافضل نے اسے واضح طور پر اپنا مقصد کیوں نہ بتایا۔ وہ سیر وتفریح کا بہانہ بنانے پر کیوں مجبور ہوا؟ حالات پر غور کرنے سے اس کا جواب سمجھ آجاتا ہے۔ دراصل ان دنوں خود ریمنڈ پر عیسائی حکمرانوں کی جانب سلطان سے معاہدہ توڑ کر ان کے اتحاد میں شامل ہونے کے لیے دباؤ بڑھ رہا تھا، ایسی صورتحال میں مسلمانوں کا اس کے علاقوں میں عسکری مقاصد کے تحت جانا ریمنڈ کے لیے مسائل کا باعث بن سکتا تھا اور مسلمان اپنے حلیف کو کسی پریشانی دو چار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہیں سیر سپاٹے کا عنوان سامنے لانا پڑا ہوگا۔ بہرکیف لین پول بتاتا ہے کہ ریمنڈ کی اجازت سے الملک الافضل دریائے اردن کے پار سیر وتفریح کے لیے نکل گیا۔

اس کے فوراً بعد ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ ہوا یہ کہ ان دنوں یروشلم کے نئے بادشاہ گائی کے دو سردار ریمنڈ سے صلح کی بات چیت کرنے اور اسے مسلمانوں کے خلاف عیسائی اتحاد میں شامل کرنے کی نیت سے وہاں آئے تھے۔ ان سرداروں کا تعلق نصرانیوں کے سب سے متعصب جنگجو گروہوں ہاسپٹلرز (اسبتاریہ) اور ٹیمپلرز (داویہ) سے تھا۔ انہیں ریمنڈ کے علاقے میں مسلمانوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ ان متعصب نصرانیوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ سلطان ایوبی کے سپاہی عیسائی علاقے میں سیر وتفریح کریں اور وہ بھی ریمنڈ کی اجازت سے۔ چنانچہ ان کے چار سو جنگجو مشتعل ہوکر ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے جو سیر وتفریح سے فارغ ہوکر واپس جا رہے تھے۔ تاہم مسلمانوں نے سراسیمہ ہوئے بغیر ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ حملہ آور کے پشتوں کے پشتے لگ گئے۔ پھر انہوں نے مقتول نصرانیوں کے کٹے ہوئے سر نیزوں پر بلند کیے اور طبریہ پہنچ گئے۔ ریمنڈ نے اپنی آنکھوں سے جنگجو نصرانیوں کا یہ انجام دیکھا مگر وہ جانتا تھا کہ مقتولین نے اپنے جذباتی پن کی سزا پائی ہے، اس لیے بالکل خاموش رہا۔ مسلمانوں نے بھی اس سے کیے گئے معاہدے کا احترام کیا اور اس کے علاقے کی آبادی کو کوئی گزند پہنچائے بغیر وعدے کے مطابق سورج غروب ہونے سے پہلے واپس چلے گئے۔

اس لڑائی کی یہ روداد یورپی مؤرخین کی مرتبہ کردہ صلیبی جنگوں کی تاریخ سے لی گئی ہے جس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ یہ لڑائی اتفاقیہ طور پر برپا ہوئی تھی اور اس میں الملک الافضل بھی شریک تھا۔

لیکن عرب مؤرخین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ الملک الافضل کے بھیجے ہوئے چھاپہ

ماروں نے شروع کی تھی اور یہ کہ افضل خود اس میں شامل نہ تھا۔ اس طرح معاملہ ذرا الجھ جاتا ہے۔ مگر تمام روایات پر غور کرنے سے سمجھ آتا ہے کہ الملک الافضل نے دو دستے مرتب کیے تھے۔ ایک دستے کو عکا کے گرد و نواح میں جو ریمنڈ کی عملداری سے باہر کا علاقہ تھا، چھاپے مارنے بھیجا تھا جیسا کہ سلطان ایوبی نے الافضل کو اس کی تاکید کی تھی۔ دوسرے دستے کو لے کر الافضل طبریہ چلا گیا تھا۔ اگلے دن جب وہ طبریہ سے لوٹ رہا تھا تو جنگجو نصرانیوں نے بے خبری میں اس پر حملہ کر دیا۔ عین اسی وقت وہ دستہ جو عکا پر چھاپے مارنے کے لیے بھیجا گیا اپنی مہم انجام دے کر واپس آ رہا تھا، چنانچہ وہ الافضل کی مدد کے لیے پہنچ گیا اور یہ معرکہ پیش آ گیا۔

یہ بات اس لیے بھی قرینِ قیاس ہے کہ عکا جہاں سلطان نے افضل کو حملے کی ہدایت کی تھی اور صفوریہ جہاں عرب مؤرخین کے مطابق یہ معرکہ پیش آیا تھا طبریہ سے زیادہ دور نہ تھے، اس لیے ایسا بالکل ممکن تھا کہ وہ چھاپہ مار جنہیں الافضل نے عکا روانہ کیا تھا، اس کی مدد کے لیے بروقت پہنچ گئے ہوں۔

بہرکیف اس لڑائی کا تمام تر فائدہ مسلمانوں کو ہوا۔ ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کے بہت سے سردار اس معرکے میں مارے گئے تھے جن کے مظالم کی داستانیں مسلمانوں میں مشہور تھیں۔ ان کے قتل اور اس فتح سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے اسے مزید بڑی فتوحات کا پیش خیمہ سمجھا۔

اگرچہ اس واقعے میں غلطی ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے جنگجو سرداروں کی تھی جنہوں نے پرامن مسلمانوں پر بے خبری میں حملہ کیا تھا اور اپنی شامتِ اعمال کو آواز دی تھی مگر شام کی عیسائی ریاستوں نے اسے مسلمانوں کی زیادتی قرار دیا اور "بے قصور نصرانیوں" کے اس "قتل عام" کا ڈھنڈورا اس طرح پیٹا کہ ریمنڈ بھی شرمندہ ہو گیا اور اس پر بزدلی کی چھاپ لگ گئی۔ [1]

ریمنڈ اتحادیوں میں شامل: چوں کہ جنگجو ریمنڈ کے علاقے میں مارے گئے تھے اس لیے نصرانیوں نے براہ راست اس واقعے کی ذمہ داری اسی پر ڈال دی۔ عیسائی حکام نے پادریوں اور راہبوں کو ریمنڈ کے خلاف ابھارا جنہوں نے ریمنڈ سے مل کر اسے برا بھلا کہا اور اس کی مذہبی غیرت ابھارنے کے لیے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تم یقیناً مسلمان ہو گئے ہو ورنہ اس دن تم نے مسلمانوں کو ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے قتل عام اور گرفتاریوں سے کیوں نہ روکا۔

ان پادریوں کی لعنت ملامت سے خود ریمنڈ کے افسران بھی متاثر ہوئے اور پادریوں کی موافقت میں بولنے لگے۔ اس طرح ریمنڈ کی ساکھ کو زبردست دھچکا لگا اور اس کو نصرانیوں میں اپنا سیاسی مقام

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/277، صلاح الدین، لین پول، ص 94

بچانے کا واحد راستہ یہی نظر آیا کہ وہ ان کے اتحاد میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ ریمنڈ ان پادریوں، راہبوں اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی کے لیے نکل پڑا۔ اس نے اپنے بدترین حریف گائی کو پہلی بار یروشلم کے بادشاہ کی حیثیت سے قبول کیا۔ لین پول کے مطابق ایک بڑے جشن میں دونوں حریف بغل گیر ہوئے۔ دونوں نے دیگر حکام اور نوابوں کے ساتھ مل کر اپنے دفاع کے لیے مشورے کیے اور طے یہ ہوا کہ تمام ریاستوں کی افواج عیون صفوریہ کے مقام پر جمع ہو جائیں جہاں مسلمانوں کا متحد ہو کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ①

سلطان، کرک سے طبریہ تک ✽ سلطان صلاح الدین ایوبی کرک کے نواح میں ٹھہر کر حالات کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ جب انہیں اس معرکے میں ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے سرداروں کے قتل عام کی اطلاع ملی تو وہ سمجھ گئے کہ طبلِ جنگ پر چوٹ پڑ چکی ہے اور فیصلہ کن جنگ کا وقت قریب آ گیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر راتوں رات شمال کی جانب پلٹے۔ اس دوران سلطان کو یہ اطلاع بھی مل گئی کہ ان کا حلیف ریمنڈ معاہدہ توڑ کر اپنے ہم مذہب نصرانیوں سے مل گیا ہے، یہ خبر تشویشناک ضرور تھی مگر سلطان نے اس کا کوئی خاص اثر نہ لیا۔

اس دوران شمال سے انطاکیہ کے محاذ پر سرگرم تقی الدین عمر جہاد کا مژدہ سن کر پورے لشکر کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچ گیا تھا جبکہ راس الماء کے معسکر میں الملک الافضل کے پاس دور دراز شہروں کی تمام افواج جمع ہو چکی تھیں۔ سلطان کو یقین تھا کہ القدس کی بازیابی کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلنے والے اس لشکر کے جذبے، ولولے اور اخلاص میں کمی نہ ہوئی اور تائید الٰہی اس کے شاملِ حال رہی تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکے گی۔

سلطان نے "عشترا" پہنچ کر پڑاؤ ڈالا اور افواج کو مرتب کیا۔ لشکر کے پیشہ ور سپاہی جو مختلف شہروں یا امراء کی جاگیروں سے تعلق رکھتے تھے 12 ہزار تھے جبکہ رضا کار مجاہدین کی جماعتیں ان کے علاوہ تھیں۔ سلطان نے لشکر کو قلب، میمنہ، میسرہ، ہراول اور ساقہ میں تقسیم کیا۔ قلب کو اپنی کمان میں رکھا، میمنہ پر تقی الدین عمر اور میسرہ پر مظفر الدین کوکبری کو امیر مقرر کیا۔ جمعہ 17 ربیع الثانی 583ھ (26 جون 1187ء) کو لشکرِ اسلام ساحل کی طرف بڑھنے لگا اور اسی رات "خسفین" میں دم لے کر اگلے دن اردن کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ "الاقحوانہ" میں لشکر پانچ دن ٹھہرا رہا۔ سلطان ایوبی نے امرائے فوج کو لڑائی کے شعار (شناختی نعرے، کوڈ ورڈز) سمجھائے اور ان کی پوزیشنیں متعین کیں۔ چوں کہ یہ مقام جھیل

① الکامل فی التاریخ، حصہ 583ھ، صلاح الدین لین پول ص 99

طبریہ کے ساتھ تھا، اس لیے سلطان کے سپاہیوں نے جب یہاں چھاؤنی لگائی تو جھیل کے کنارے خیموں کی ایک دیوار کھڑی ہوگئی۔ ❶

نصرانیوں کی تیاریاں ❁ اس دوران صلیبی ریاستوں میں نہایت تندہی سے سامانِ جنگ مرتب کیا جاچکا تھا۔ پیادے، شہ سوار، تیر انداز، خدام، ملاح، زمیندار، کسان، نواب اور حکام سب ہی آمادۂ پیکار تھے۔ نیزہ باز نائٹ، زرہ بکتروں میں ملبوس ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز قطار در قطار چلے آرہے تھے۔ کلیسا سینٹ جان کے ''ٹروکوپول'' عام طور پر اپنے آپ میں مست رہتے تھے مگر اس موقع پر یہ خون آشام قسم کے راہب بھی میدان میں نکل پڑے تھے۔ شام کے کونے کونے سے جمع ہوکر یہ سب لوگ ایک سمت جارہے تھے۔ یروشلم کے پادری اپنی سب سے مقدس نشانی ''صلیب الصلبوت'' نکال لائے تھے جسے صلیب اعظم بھی کہا جاتا تھا، یہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے مرصع غلاف میں لپیٹ کر رکھی جاتی تھی۔ ❷ بعض پادری کہتے تھے کہ یہی صلیب ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی، بعض کہتے تھے کہ اُس صلیب کی کچھ لکڑی اِس صلیب میں شامل ہے۔ ❸

سلطان ایوبی کے جھیل طبریہ پہنچنے سے پہلے صلیبی اس جھیل سے تقریباً 18 کلومیٹر مغرب کی سمت عیون صفوریہ کے میدان میں ڈیرے ڈال چکے تھے۔ انہوں نے صلیب الصلبوت کو یہیں گاڑ دیا تھا جس کے تقدس کے نام پر چاروں طرف سے عیسائی جنگجو یہاں کا رخ کررہے تھے۔ یہ علاقہ گھڑ سواروں، پیادوں، نیزہ بازوں اور تیر اندازوں سے بھر گیا تھا۔ شاہ یروشلم گائی، ریمنڈ، کاؤنٹ اوف مانسریٹ، کانسٹیبل امالریک، بالین ڈی ابلین، ہمفرے اوف ٹورون کے علاوہ ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے جنگجو اور درجنوں دیگر عیسائی امراء اپنی جمعیتوں کے ساتھ یہاں پہنچ چکے تھے۔ گستاخِ رسالت ریجی نالڈ بھی کرک کے مورچے سے نکل کر یہاں آگیا تھا کیونکہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس کے قلعے کی ناکہ بندی نہیں کی تھی، وہ خود چاہتے تھے کہ ریجی نالڈ سے کسی کھلے میدان میں سامنا ہوسکے۔ ریجی نالڈ کے پہنچ جانے کے بعد نصرانیوں کی مجموعی تعداد 63 ہزار کے لگ بھگ ہوگئی تھی۔ ❹

سلطان کی شوریٰ کا اجلاس ❁ دشمن کی قوت کا اچھی طرح اندازہ لگانے کے بعد سلطان ایوبی نے عسکری مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا اور اگلے اقدام کے بارے میں بحث شروع ہوئی۔ نصرانیوں کی کثرت کے پیش نظر اکثر امراء نے یہ رائے دی کہ کھلے میدان میں براہ راست مقابلے سے گریز کیا

❶ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 10/277؛ الکامل فی التاریخ، تحت 583ھ
❷ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/277
❸ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 10/278
❹ البدایۃ والنہایۃ، تحت 583ھ

جائے، اس کی بجائے چھاپہ مار حملے جاری رکھے جائیں اور ان کے شہروں کو یکے بعد دیگرے تاخت وتاراج کا نشانہ بنایا جائے۔ یہ سن کر ایک مشیر نے کہا:

"اگر دوبدو مقابلے سے احتراز کیا گیا تو اس کا عالم اسلام میں ہماری ساکھ پر منفی اثر پڑے گا، لوگ کہیں گے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے جنگ وجدال میں چست ہیں جبکہ کفار سے نبرد آزمائی سے کتراتے ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ہم دشمن کے شہروں میں گھستے چلے جائیں، انہیں لوٹتے، تاراج کرتے، قیدی بناتے اور بستیوں کو نذر آتش کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں، اس دوران اگر نصرانیوں کا کوئی لشکر سامنے آجائے تو ہم اس سے بھی نمٹ لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا کام کریں جس کا رعایا کو جواز پیش کیا جاسکے اور لوگوں کو ہمارے خلاف زبانیں کھولنے کا موقع نہ ملے۔"

سلطان صلاح الدین ایوبی ان پختہ اور ناپختہ آراء کو دلچسپی سے سنتے رہے اور پھر بولے:

"یہ وہ دن ہے جس کا میں مدت سے انتظار کر رہا تھا۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اہل ایمان کی اس پوری جمعیت کے ساتھ بہرحال کفار کی متحدہ فوج کا مقابلہ کریں گے۔ تقدیر کے فیصلے انسان کے بس میں نہیں ہوتے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ لشکر فراہم کر دیا ہے۔ جہاد کے لیے اتنا بڑا لشکر بہت مشکل سے جمع ہوتا ہے۔ اسے بھرپور جہاد کے بغیر منتشر کر دینا مناسب نہیں۔ میں بھی بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ نہ معلوم کب موت آجائے، اس دن کو غنیمت سمجھو اور قتال کرو۔ میری خاطر نہیں صرف اللہ کے لیے۔"

سلطان کے فیصلے سے سب نے اتفاق کیا اور آگے بڑھ کر کھلے میدان میں نصرانیوں کے متحدہ لشکر سے ٹکرانے کا فیصلہ ہوگیا۔ [1]

سلطان نے الخوانہ سے کوچ کیا اور بحیرۂ طبریہ کو پشت پر چھوڑتے ہوئے مغرب کی طرف بڑھتے چلے گئے، وہ لڑائی کے لیے ایسے مقام کی تلاش میں تھے جہاں سے نصرانیوں کو جو تعداد میں تین یا چار گنا تھے، اپنے جال میں پھانسا جاسکے۔ اس جال کے تانے بانے سلطان اپنے ذہن میں بن چکے تھے، اور شاید ان کے چند رازدار ساتھیوں کے سوا کسی اور کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑی تھی۔ [2]

آگے چل کر سلطان نے "صنبرہ" میں پڑاؤ کرنے کے بعد یہیں سے دریائے اردن کو عبور کیا اور کفر

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/ 287، صلاح الدین الایوبی، تاریخ: ص 582

[2] کتب تاریخ کے مطابق الخوانہ سے سلطان کی روانگی بروز جمعرات 23 ربیع الثانی (2 جولائی) کو ہوئی تھی جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ قاضی ابن شداد کا بیان قرائن کی روشنی میں درست ہے کہ 21 ربیع الثانی (30 جون) کو سلطان طبریہ میں اتر چکے تھے کیونکہ سب کا اتفاق ہے کہ طبریہ میں دشمن کے انتظار میں سلطان نے تین چار دن گزارے تھے اور بروز 25 ربیع الثانی (4 جولائی) کو اصل معرکہ ہوا تھا۔

سمت سے شمال کی طرف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ منگل 21 ربیع الثانی 583ھ (30 جون) کو بحیرۂ طبریہ کے مغرب میں کوئی پانچ میل دور جا کر ایک سرسبز و شاداب اور بلند سطح مرتفع پر اپنا کیمپ لگایا۔[1]

حطین میں ❀ آگے چلنے سے پہلے قارئین کو اس جگہ کا محل وقوع اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر حطین کے تاریخی معرکے کے مختلف پہلوؤں اور سلطان کی حیران کن جنگی منصوبہ بندی کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔

سلطان کا کیمپ ان کے منصوبے کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا۔ اس جگہ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی تھی، سواریوں کے چارے کا قدرتی انتظام موجود تھا۔ زیتون کے درخت کثرت سے تھے اور پانی کی بہتات تھی کیوں کہ شمال مغرب کی طرف وادیٔ حمام میں شیریں پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ ریمنڈ کا مرکزی شہر طبریہ جنوب مشرق میں صرف چھے میل دور نظر آتا تھا۔ اس کے آس پاس بھی پانی وافر مقدار میں تھا۔ سلطان کے کیمپ کے نزدیک ترین آبادی حطین نامی ایک دیہات تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے۔[2] اس دیہات سے جنوب کی طرف ایک پہاڑی ٹیلا تھا، لوگ اسے ''رأس حطین'' کہتے تھے۔ اس ٹیلے پر کھڑے ہو کر مغرب کی طرف جھانکنے سے ایک وسیع و عریض لق و دق میدان نظر آتا تھا جو تقریباً 16 میل لمبا اور مشرق سے مغرب کی طرف پھیلا ہوا تھا، اس میدان کے دوسرے سرے پر ''صفوریہ'' تھا جہاں 63 ہزار فرنگی جنگ کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان کے پاس سلطان کے کیمپ تک پہنچنے کے لیے اس میدان کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ میدان کی لمبائی میں صفوریہ سے حطین تک ایک کشادہ سڑک تھی جو آگے جنوب کی طرف مڑ کر حجاز کی طرف نکلتی تھی۔ اگر عیسائی پیش قدمی کرتے تو انہیں اسی سڑک سے گزرنا پڑتا۔ بظاہر اس سڑک پر 16 میل کا فاصلہ طے کر کے سلطان کے پڑاؤ پر حملہ کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ یہ صرف ایک دن کی مسافت تھی ...... مگر سلطان صلاح الدین ایوبی نے نئی جنگی چالوں کے ذریعے اس مختصر سے فاصلے کو نصرانیوں کے لیے موت کا راستہ بنا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اس میدان کو دیکھ کر ہی جنگ کی منصوبہ بندی کی تھی جو اس قدر کامیاب رہی کہ نصرانیوں کے جہاں دیدہ امراء اور شمشیر آزما افسران بھی اس جال میں الجھتے چلے گئے۔ قرینِ قیاس ہے کہ سلطان کی اس کامیاب منصوبہ بندی میں الملک الافضل اور ان امراء کا حصہ بھی ہوگا جو جنگ سے پہلے طبریہ کے گرد و نواح اور دریائے اردن کے پار صفوریہ تک کا علاقہ دیکھ بھال چکے تھے۔ سلطان کے پیش نظر اس سولہ میل لمبے میدان کی طبعی ساخت

---

[1] النوادر السلطانیہ: 127
[2] البدایہ والنہایہ تحت 583ھ

تھی۔ میدان بالکل خشک اور بنجر تھا، اس سے گزرنے والی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک کوئی چشمہ، کنواں یا ندی نہیں تھی، یہ بات یقینی تھی کہ اگر نصرانیوں کو اس میدان میں روک لیا جاتا تو ان کے لیے پانی حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ سڑک کی دو جانب یعنی میدان کے شمالی اور جنوبی کناروں پر ٹیلوں اور گھنی جھاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جن کی اوٹ سے نصرانیوں پر بھرپور تیر اندازی کی جا سکتی تھی۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ لشکر اسلام ایک پہلو سے بڑے خطرناک مقام پر کھڑا تھا۔ بلندی پر قائم سلطان کی خیمہ گاہ کی پشت پر 5 میل دور گہرے نشیب میں جھیل طبریہ کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں، جنوب میں سطح مرتفع پر نصرانیوں کا قلعہ بالفور بھی بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، شمال میں ان کے ایک اور قلعے صفد کے برج نظر آرہے تھے، اگر سلطان کو شکست ہو جاتی تو دائیں بائیں سے راستہ بنا کر بچ نکلنے کے امکانات کم تھے اور عقبی پسپائی کے دوران ان کی پوری فوج جھیل کی بے رحم گہرائی کی نذر ہو سکتی تھی۔ اس طرح سلطان ایوبی نے نصرانیوں کو اس وادی میں روکنے کے لیے حطین کے مقام کو چن کر ایک زبردست خطرہ بھی مول لیا تھا۔ اس خطرناک صورتحال کا اندازہ لگانے کے باوجود سلطان کا عزم اٹل تھا۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت پر کامل بھروسہ تھا اور اپنی تدبیر کے کارگر ہونے کے متعلق وہ پرامید تھے۔[1]

دونوں حریف نہایت محتاط اور ہوشیار تھے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ دوسرا پیش قدمی شروع کرے۔ سلطان ایوبی آگے بڑھ کر نصرانیوں پر حملے کو خودکشی کے مترادف تصور کرتے تھے کیونکہ چٹیل میدان سے گزرتے ہوئے وہ خود دشمن کی چال کا شکار ہو سکتے تھے۔ ادھر عیسائی منتظر تھے کہ مسلمان اکتا کر خود شام واپس چلے جائیں یا سمندر کے کنارے کنارے القدس کی طرف بڑھیں۔ مسلمانوں کی اصل منزل بھی القدس ہی تھی اور وہ جنوب کی طرف یلغار کر کے القدس پر سیدھے چڑھائی کر سکتے تھے جو اس وقت سپاہیوں سے تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ لیکن عقب میں دشمنوں کی اتنی بڑی تعداد چھوڑ کر ان کا القدس کی طرف جانا کم خطرناک نہ تھا۔ دشمن بھی چاہتا تھا کہ مسلمان عقب سے اس کے حملوں کا نشانہ بن جائیں۔

جب عیسائی آگے بڑھنے پر آمادہ نہ دکھائی دیے تو سلطان ایوبی نے انہیں یلغار پر برانگیختہ کرنے کے لیے چھاپہ مار حملے شروع کیے، چونکہ اصل مقصد دشمن کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اسے پیش قدمی پر ابھارنا تھا، اس لیے یہ حملے دن کے وقت کیے جا رہے تھے۔ سلطان نے دو دن تک منتخب سپاہیوں کے ساتھ بذات خود دشمن کے پڑاؤ کی طرف جا کر ان پر حملے کیے۔ مجاہدین کچھ فاصلے سے ان پر تیر اندازی کرتے ہوئے ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتے۔ سلطان کے ان حملوں سے نصرانیوں کو شدید

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/278، صلاح الدین لین پول 101 ماخوذ و سلسلہ: ص 127

پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، ان کی اکثریت سلطان کے تعاقب میں کیمپ سے نکلنا چاہتی تھی مگر ریمنڈ اور چند کھاگ سردار انہیں منع کر رہے تھے۔ جب سلطان نے دیکھا کہ عیسائی کسی طرح پیش قدمی شروع نہیں کر رہے تو انہوں نے ریمنڈ ہی کی دُکھتی رگ پکڑنے کا فیصلہ کیا۔

بدھ 22 ربیع الثانی (یکم جولائی) کو سلطان ایوبی فوج کو چوکس کرنے کے بعد ایک طوفانی دستہ لے کر یکا یک جنوب مشرق کی طرف روانہ ہوگئے اور چھ میل یلغار کر کے طبریہ پر حملہ کر دیا، سلطان کے کچھ سپاہی شہر میں گھس گئے اور شہر والوں پر رعب طاری کرنے کے لیے جگہ جگہ آگ لگا دی، چوں کہ طبریہ کی اکثر فوج ریمنڈ کی قیادت میں صفوریہ جا چکی تھی اس لیے کسی دشواری کے بغیر چند گھنٹوں میں شہر پر قبضہ ہو گیا البتہ قلعے میں داخل ہونا آسان نہ تھا۔ ریمنڈ کی بیوی جو شوہر کی غیر موجودگی میں شہر کا انتظام سنبھالے ہوئے تھی اپنے خاندان اور تھوڑی سی فوج کے ساتھ قلعے میں پناہ لے چکی تھی۔ سلطان کے سپاہی طبریہ شہر سے اناج کے ذخائر لوٹ کر اپنی رسد کا انتظام کرتے رہے۔ جو سامان منتقل کرنا ان کے لیے فوری طور پر ممکن نہ تھا، اسے وہ نذرِ آتش کر رہے تھے۔ سلطان نے نقب زنوں اور فصیل شکنی کے ماہرین کے ساتھ شہر کی فصیل کا چکر لگایا اور حکم دیا کہ فصیل کے برج گرا دیے جائیں۔ چنانچہ نقب زن برجوں کی بنیادوں میں تیزی سے سرنگیں کھودنے لگے۔ جلد ہی بڑے برج کو منہدم کر دیا گیا۔ نصرانیوں کے اہم شہر کی یہ گت صرف اس لیے بنائی جا رہی تھی تا کہ صفوریہ میں مجتمع ہونے والا لشکر بے تاب ہو کر اسے بچانے کے لیے دوڑ پڑے۔[1]

عیسائی حکمرانوں کی مشاورت ❊ ریمنڈ کی بیوی نے جو قلعے میں محصور تھی، اسی دن مخبر بھیج کر صفوریہ میں جمع ہونے والے عیسائیوں کو یہ پریشان کن اطلاع دے دی۔ یہ اطلاع شام کو وہاں پہنچی۔ اسے سنتے ہی پرجوش امراء نے شور مچا دیا:

"اب چپ چاپ بیٹھے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ہمیں مسلمانوں سے لڑنا ہی ہوگا۔ جب وہ طبریہ پر قبضہ کر چکے ہیں تو باقی شہر بھی جلد ہی فتح کر لیں گے، اب صبر نہیں کیا جا سکتا۔"[2]

ٹیمپلرز کے گرینڈ ماسٹر ڈی فورڈ نے کہا:

"کتنے شرم کی بات ہے کہ دشمن اُس قلعے پر بھی قبضہ کر لے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم یہاں بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں۔"

---

1. الروضتین: 3/279، الکامل فی التاریخ: حوادث 583ھ، صلاح الدین اور صلیبی: 127
2. کتاب الروضتین: 3/279

یہ سن کر سب نے گائی کی طرف دیکھا۔ وہ اس رائے سے اتفاق کر رہا تھا مگر کچھ متذبذب بھی تھا۔ آخر اس نے گھبراتے ہوئے کہا: "مجھ میں جنگ شروع کرنے کی جرأت نہیں ہے۔"

اب سب کی نگاہیں ریمنڈ پر مرکوز ہوگئیں جو طبریہ پر مسلمانوں کے حملے سے براہ راست متاثر ہوا تھا اور اب تک آگے بڑھ کر حملہ کرنے کو غیر معقول قرار دیتا آیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ وہ اب اپنی رائے بدل دے گا مگر ریمنڈ نے جذبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا:

"بے شک طبریہ میرا اور میری بیوی کا شہر ہے مگر ایوبی کو وہاں جو کرنا تھا، کر چکا۔ ویسے قلعہ اب بھی ہمارے قبضے میں ہے اور میری بیوی وہاں محفوظ ہے لیکن اگر ایوبی قلعے پر بھی قبضہ کر کے میری بیوی اور مال و دولت تک کو چھین کر لے جائے تب بھی میں پیش قدمی کی حمایت نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا اتنا بڑا اور ایسا طاقتور لشکر جو آج صلاح الدین کے پاس ہے، پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ایسے لشکر کو طبریہ پر قابض ہونے کے بعد بھی (خوراک و رسد کی کمی کی وجہ سے) جلد واپس جانا پڑے گا۔ زیادہ دنوں تک وہاں ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ جوں ہی مسلمان واپس ہوں گے ہم شہر دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ اگر صلاح الدین اس علاقے میں جمے رہنے پر مصر رہا تو اسے اپنی پوری فوج کے ساتھ ہی رہنا ہوگا، اور یہ ناممکن ہے کہ اس کی سپاہ زیادہ طویل عرصے تک اپنے وطن اور گھروں سے دور رہے۔ جب وہ واپس کوچ کریں گے تب ہم ان سے اپنے قیدی بھی چھڑانے کی کوشش کریں گے۔"

ریمنڈ کی یہ مدبرانہ تقریر شاید مشاورتی کونسل پر چھایا ہوا جوش ٹھنڈا کر دیتی مگر بڈھے ریجی نالڈ نے فوراً اس کی تردید کر دی۔ اس نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا:

"تم نے تو ہمیں مسلمانوں سے ڈرانے کے لیے بڑی لمبی تقریر کر ڈالی، ہمیں یقین ہے کہ تم ان سے ملے ہوئے اور ان کے ہمدرد ہو، ورنہ ایسی بات کیوں کہتے؟ رہی یہ بات کہ ان کی فوج بکثرت ہے تو کیا آگ کو ایندھن کی زیادتی سے کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے؟"

ریجی نالڈ کی پر جوش گفتگو نے صلیب کے نام پر جمع ہونے والے فرنگی سورماؤں کو پھر مشتعل کر دیا اور وہ حملے پر متفق نظر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر ریمنڈ نے کہا: "میں تم میں سے ایک ہوں، اگر تم آگے بڑھو گے تو میں تمہارے ساتھ آگے بڑھوں گا، پیچھے ہٹو گے تو میں بھی پیچھے ہٹوں گا، پھر جو کچھ ہوگا وہ تم خود دیکھ ہی لو گے۔"

بس پھر کیا تھا! مسلمانوں پر جارحانہ حملے کا فیصلہ ہوگیا اور کوچ کے نقارے پر چوٹ پڑنے لگی۔ ❶

❶ الاصل فی التاریخ: تحت 583ھ، البدایہ والنہایہ: تحت 583ھ

متحرک ترین لحات ✽ جاسوسوں نے رات ہی کو یہ اطلاع طبریہ میں سلطان تک پہنچادی کہ صبح صفوریہ سے عیسائی لشکر روانہ ہو رہا ہے۔ سلطان کے کان یہی خبر سننے کے لیے ترس رہے تھے۔ انہوں نے مسرت انگیز لہجے میں کہا:

"خدا کا شکر ہے مقصد پورا ہو گیا، وہی خبر ملی ہے جو ہم چاہتے تھے۔ ہم سخت جنگوں کے شوقین ہیں۔ امکانی حد تک بھر پور جنگ کریں گے۔ اللہ کی نصرت اترنے کو تیار ہے، ان فرنگیوں کو شکست دینے کے بعد ان شاء اللہ طبریہ سے لے کر ساحل شام تک ہمیں روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔" ❶

آئندہ چوبیس گھنٹے نہایت اہم تھے۔ سلطان صلاح الدین جانتے تھے کہ جنگ کا نتیجہ مکمل فتح یا شکست فاش کی صورت میں نکلے گا۔ انہوں نے حسب عادت اللہ تعالیٰ سے خیر کی دعا کی کیوں کہ ان کی زندگی کے متحرک ترین لحات سامنے تھے۔ وہ تھوڑی سی فوج کو طبریہ کے قلعے کے محاصرے پر چھوڑ کر اپنے دستے کے ساتھ نہایت تیزی سے کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ فیصلہ کن معرکہ اب بالکل سر پر تھا۔ اگرچہ سلطان کا منتخب کردہ میدان مسلمانوں کے لیے سازگار تھا مگر یہاں خطرات بھی کچھ کم نہ تھے۔ قاضی بہاؤ الدین شداد کے بقول:

"مسلمان خوب آگاہ تھے کہ ان کے پیچھے بحیرۂ اردن ہے اور سامنے دشمنوں کا ملک۔ اللہ کے سوا کوئی ان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔" ❷

ہیرلڈ لیمب کا بیان ہے:

"نصرانیوں کو معلوم تھا کہ مسلمان ایک گہرے نشیب کے کنارے پر صف بستہ ہیں۔ یہ نشیب جھیل طبریہ کی طرف جھکتا چلا جاتا ہے جو سطح سمندر سے چھ سو فٹ نیچے ہے۔ نصرانیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی صفوں کو توڑ کر انہیں پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اس طرح وہ گہرے نشیب میں گر کر ہلاک ہو جائیں گے اور ان کے باقی ماندہ سپاہی طبریہ کے قلعے کی فوج کی زد میں آجائیں گے۔" ❸

معسکر ایوبی کا نظارہ ✽ رات بھر معسکر ایوبی میں چہل پہل رہی۔ کچھ سپاہی اسلحہ پہن رہے تھے اور کچھ اللہ اکبر اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کی ایمان افروز صدائیں بلند کرتے ہوئے اپنی مقرر کردہ جگہوں پر جا رہے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی پوری رات جاگتے رہے۔ وہ دشمن کو اپنے جال میں پھانسنے کے بعد اس سنہرے موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور کل کی جنگ کو فیصلہ کن بنانے کے لیے اہم

❶ الفتح القسی: 43، کتاب الروضتین: 4/179
❷ النوادر السلطانیہ: 128، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/280_284
❸ صلیبی جنگیں، ہیرلڈ لیمب: 110

اقدامات کر رہے تھے۔ میدان جنگ کا نقشہ کے سامنے رکھ کر افسران کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ صف بندی کی مناسب ترین صورتوں پر غور کر کے ان کی ترتیب طے کی جا رہی تھی۔ اسلحہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ عماد اصفہانی اس رات کے کیف و سرور کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وہ ہم نے وہ رات اس طرح گزاری کہ گویا جنت حاضر تھی اور سنت نافذ تھی، حوض کوثر کے ساقی سامنے کھڑے تھے، بہشت کے پھلوں کے خوشے جھکے جا رہے تھے، نہر سلسبیل کی راہ واضح تھی، سعادت کی سمت ظاہر تھی، فتح کی دلیل ثابت تھی اور اللہ اسلام کا حامی و ناصر تھا۔"[1]

اس جہادی مہم میں مدینہ منورہ کے امیر عز الدین القاسم حسینی بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ وہ حجاز سے واپس آنے والے حاجیوں کے ایک قافلے کے ساتھ آ کر سلطان کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ ایک متقی اور تجربہ کار آدمی تھے، سلطان ایوبی ان سے اکثر مشورہ کرتے رہتے تھے، لشکر میں ان کی موجودگی کو برکت کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ سلطان کے بعض خواص کو یقین تھا کہ جس مہم میں القاسم حسینی ساتھ ہوں گے اس میں فتح ضرور قدم چومے گی۔[2]

سلطان کی خاص توجہ تیر اندازوں اور گھڑ سوار چھاپہ مار حملہ آوروں پر تھی جنھیں "جالیشیہ" کہا جاتا تھا، ان کے پاس آگ لگانے والے تیر بھی ہوتے تھے، سلطان نے انھیں جنگ کے متوقع نقشے کے مطابق اہم ترین مقامات پر تعینات کر دیا، ان میں سے ہر سپاہی کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ اپنا ترکش تیروں سے بھر لے۔

اسلحہ سازوں نے جنگ کے لیے بہت بڑی مقدار میں تیر تیار کر لیے تھے جو چار سو اونٹوں پر لدے ہوئے تھے، ستر تیز رفتار سواریاں صرف اس مقصد کے لیے مقرر کی گئی تھیں کہ ان کے ذریعے تیر اندازوں کو مسلسل تیروں کی کھیپ پہنچتی رہے اور ان کے ترکش کسی لمحے خالی نہ ہونے پائیں۔[3]

متحدہ عیسائی لشکر کی پیش قدمی: جمعرات کا دن تھا اور ربیع الثانی 583ھ کی 23 تاریخ (2 جولائی 1187ء) صبح عیسائی لشکر نے نقاروں کی دھمک اور نفیریوں کی تانوں میں طبریہ کی جانب کوچ کا آغاز کیا۔ یہ ٹڈی دل لشکر ایک متحرک سیاہ پہاڑ کی طرح زمین کو دہلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یلغار کے آغاز میں صلیب کے پرستاروں کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ کیسی افتاد میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ انھیں اپنی کثرت پر پورا بھروسہ تھا۔ پھر 16 میل کا فاصلہ ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ حطین میں فروکش سلطان کے لشکر کو جو تعداد میں ان سے چوتھائی ہے، گاجر

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 280/3
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 309/3
[3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 280/3

مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گے اور شام یا رات تک طبریہ پہنچ کر اسے بھی سلطان سے چھین لیں گے۔

گائی، ریجی نالڈ اور ان کے تمام ہمراہی اسی طرح فتح کے سہانے سپنے دیکھتے ہوئے بڑے طمطراق سے چلے جا رہے تھے۔ ان کا یہ سفر جو نے کی اس پختہ سڑک پر ہو رہا تھا جو صفوریہ سے کوہ حطین اور پھر حجاز کو جاتی تھی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی اسی سڑک پر ان کے لیے ہلاکت خیز شکنجہ تیار کر چکے ہیں۔

سلطان نے فوج کے جالیشیہ دستوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر کے صفوریہ سے حطین تک جگہ جگہ سڑک کے دائیں بائیں مقرر کر دیا تھا جبکہ چند دستے سڑک کے شمال وجنوب میں کسی بھی پانی کے ذخیرے تک فرنگیوں کی رسائی ناممکن بنانے کے لیے متعین کر دیے گئے تھے۔

جب فرنگیوں کی پیش قدمی شروع ہوئی تو چند گھنٹوں بعد سلطان کے چھاپہ ماران کی مزاج پرسی کرنے لگے۔ یہ ایک انوکھی جنگ کا آغاز تھا۔ لشکرِ صلیب کے دو بڑے قائد شاہ یروشلم گائی اور ریمنڈ شام تک طبریہ پہنچ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اتنا ہی پانی ساتھ لیا تھا جو ایک یا دو دن کے لیے کافی ہوتا، مگر جب مسلمانوں کے تیر انداز بار بار حملے کر کے انہیں پریشان کرنے لگے تو لشکر کی پیش قدمی سست پڑ گئی، نصرانیوں کو ان متواتر حملوں سے بچنے کے لیے بار بار دفاعی پوزیشن لینا پڑتی۔ پیادہ اور سوار ڈھالیں تان کر ساکت ہو جاتے اور ان کے حفاظتی دستوں کو لشکر سے الگ ہو کر حملہ آوروں کی تلاش میں نکلنا پڑتا۔

دونوں فوجوں میں اس قسم کی جھڑپیں کسی بڑے وقفے کے بغیر ہوتی رہیں تاہم مسلمانوں کا زور نہ توڑا جا سکا۔ عیسائی اپنی پیش قدمی اور جنگ دونوں جاری رکھنے پر مجبور تھے مگر پیش قدمی کی رفتار برقرار رکھنے کی کوشش رائگاں ہی جا رہی تھیں۔ سڑک دھوپ کی تیزی سے بری طرح تپ رہی تھی۔ جولائی کے مہینے کی شدید گرمی نے دو پہر تک نصرانیوں کو ادھ موا کر دیا۔ سپاہی پیاس بجھانے کے لیے ڈٹ کر پانی پی رہے تھے۔ انہیں کل پیش آنے والی صورتحال کا اندازہ ہوتا تو وہ یقیناً پانی کے استعمال میں احتیاط سے کام لیتے مگر انہیں یقین تھا کہ شام تک وہ طبریہ کے چشموں تک پہنچ جائیں گے۔ خطرے کا صحیح اندازہ صرف ریمنڈ کو تھا۔ مسلمان چھاپہ ماروں کے پے در پے حملے اور اپنے لشکر کی مسلسل دھیمی پڑتی رفتار اس کے چھپے ہوئے خدشات کو تقویت دے رہی تھی۔ سلطان صلاح الدین کا لشکر جو صبح نصرانیوں کے سامنے کے رخ پر تھا، انہیں آگے بڑھنے کا راستہ دیتے ہوئے نہ صرف ان کے دائیں بائیں بلکہ ان کے عقب میں بھی پھیلتا جا رہا تھا۔[1]

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/299، صلاح الدین ایوبی، لین پول، ص 108، صلیبی جنگیں، ہیرلڈ لیمب: 106

پیاسی فوج کا پڑاؤ: عیسائی شام تک نہایت ابتری کی حالت میں آگے بڑھتے رہے۔ عقب کے غیر محفوظ ہونے کے سبب وہ واپس جاتے ہوئے بھی گھبرا رہے تھے حالانکہ صفوریہ زیادہ دور نہ تھا مگر سلطان کے چھاپہ ماروں کے عقبی حملوں انہیں مسلسل آگے ہانک رہے تھے۔ شام کے وقت تھک کر گائی نے فوج کو رکنے کا حکم دیا۔ دیکھا گیا تو اب تک فوج صرف 5 میل طے کر پائی تھی یعنی دوتہائی راستہ ابھی باقی تھا۔ دوسرے لفظوں میں انہیں کل کا پورا دن پھر اس سڑک کو ناپنے میں گزارنا تھا۔

ریمنڈ جانتا تھا کہ کل سپاہیوں کی پیاس کا عالم زیادہ شدید ہوگا اور پانی کا بچا کچھا ذخیرہ بھی رات تک ناپید ہو جائے گا اس لیے جب بادشاہ گائی نے پڑاؤ کا حکم دیا تو اس نے مخالفت کرتے ہوئے اصرار کیا کہ جب تک ممکن ہو فوج آگے بڑھتی رہے تاکہ پانی کے کسی ذخیرے تک پہنچ جائے مگر سپاہی گائی کے فیصلے سے خوش تھے۔ گائی کے حکم سے 'مارس کاشیا' کے مقام پر خیمے گاڑیے گئے۔ تب ریمنڈ نہایت مضطربانہ انداز میں صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور پہلی صف میں جا کر فریاد کی:

''ہائے افسوس! خداوندا! جنگ تو ختم ہو چکی...... ہم مر چکے ہیں...... خداوندا! تیری روحانی سلطنت ختم ہو گئی۔''[۵]

سپاہیوں کو پیاس، مشقت اور ذہنی کوفت نے ادھ موا کر دیا تھا، وہ بہرصورت آرام کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آگے پہاڑیوں پر سلطان کے سپاہی منڈلا رہے ہیں، ان میں ہمت نہ تھی کہ ان سے لڑتے بھڑتے آگے نکل سکتے۔ انہوں نے جی بھر کے پانی پیا اور سو گئے۔

اگلے دن جمعہ 24 ربیع الثانی 583ھ (3 جولائی) کو انہوں نے پھر سفر شروع کیا۔ کوچ کی رفتار اسی طرح نہایت سست رہی۔ سلطان کے سپاہی تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے دائیں بائیں سے ان پر تیر اندازی کرتے رہے۔

قاضی ابن شداد کے مطابق جمعے کے دن سورج ڈھلنے کے بعد سلطان خود قلب کے سپاہیوں کے ساتھ نصرانیوں کے عقب میں پہنچ چکے تھے اور یوں عیسائی نرغے کی سی حالت میں آ چکے تھے۔ مسلمانوں کے حملوں کے تسلسل کے باعث فرنگیوں کو عقب کے دفاع کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کی زیادہ فوج آگے نکل گئی تھی اور عقب کے باقی لشکر سے کٹ جانے کا خطرہ محسوس کیا جانے لگا تھا۔

مسلمانوں کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف لشکرِ صلیب کا عقبی حصہ ہی تھا، یہاں خوراک و رسد کا سامان اور پانی سے لدے ہوئے خچر تھے، جنہیں مسلمان تتر بتر کر رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کا سب سے کارگر وار

[۵] سوانح سلطان، ص ۱۰۲

تھا جس کی وجہ سے صلیبی فوج سہ پہر تک پانی سے تقریباً محروم ہوگئی۔اب نصرانیوں کے پاس وہی پانی تھا جو ان کی چھاگلوں میں رہ گیا تھا اور شدید پیاس انہیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اسے بھی پی لیں۔آخر گرمی اور پیاس سے بے حال ہو کر انہوں نے پانی کے آخری گھونٹ بھی پی ڈالے اور خالی مشکیزے پھینک دیے۔

سلطان کے وہ سپاہی جو مشرق میں نصرانیوں کے لیے تازہ پانی کی فراہمی ناممکن بنانے پر مقرر تھے، پوری طرح چوکس تھے۔صفوریہ سے حطین تک راستے میں پانی کا کوئی قدرتی ذریعہ نہیں تھا۔البتہ حطین کے آس پاس یا پھر طبریہ کے راستے میں چشمے اور ندی نالے بہتے تھے۔یہاں بعض مقامات پر پختہ حوض اور تالاب بھی تھے جہاں قافلے اتر کر پانی لیتے اور اپنے جانوروں کو سیراب کرتے تھے۔مگر سلطان کے سپاہیوں نے ان ندی نالوں اور چشموں کے راستوں کی ناکہ بندی کر لی تھی اور تالابوں کا پانی ضائع کر دیا تھا۔اب طبریہ تک فرنگیوں کے لیے تازہ پانی حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

اگرچہ فرنگی تعداد کے لحاظ سے حریف پر واضح برتری رکھتے تھے......مگر مقابلے سے پہلے ہی نیم جان ہو چکنے والی فوج کب تک لڑ سکتی تھی......اس چٹیل میدان میں پھنس کر وہ شکست کو کھلی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ریمنڈ نے صفوریہ میں رک کر دفاعی حصار تیار کرنے کا جو مشورہ دیا تھا وہ کس قدر برمحل تھا مگر اس وقت طبریہ پر سلطان کے اشتعال انگیز حملے نے ان کی نگاہ سے یہ حقیقت اوجھل کر دی تھی کہ وہ حملہ آور نہیں، مدافعت کرنے والے ہیں، ان کا ہدف آگے بڑھ کر منہ توڑ جواب دینا نہیں، اپنا دفاع کرنا ہے۔انہیں مناسب ترین دفاعی دیوار کے پیچھے رہ کر خود کو بچانا اور حریف کو تھکانا چاہیے تھا......مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

شام تک وہ دو تہائی فاصلہ طے کر چکے تھے،طبریہ کے چشمے اب پانچ چھ میل دور تھے مگر سامنے سلطان کی فوج راستہ روکے کھڑی تھی جسے ہٹائے بغیر پانی تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔عیسائی اس چٹیل میدان میں پڑاؤ ڈال کر بڑی بے یقینی کی حالت میں صبح کے منتظر رہے۔ان پر یہ رات حشر کی رات کی طرح بھاری تھی......کیمپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک سراسیمگی اور گمبھیر خاموشی طاری تھی، البتہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی پیاسے سپاہی کے منہ سے ''پانی، پانی'' کی پکار اس سکوت کو توڑ دیتی تھی۔انسان ہی نہیں، سواری کے جانور بھی پیاس سے بلبلا رہے تھے، گھوڑوں کی بے چین ہنہناہٹوں سے فضا بار بار گونج گونج جاتی تھی۔[1] فرانسیسی مؤرخ میچاڈ لکھتا ہے:

''کبھی وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر خدا سے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے۔کبھی ان

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 281/3، الکامل فی التاریخ: حوادث 583ھ

مسلمانوں کو جوان کے نزدیک منڈلا رہے تھے دھمکیاں دیتے۔ اپنے خوف کو چھپانے کے لیے وہ ساری رات ڈھول اور نفیریاں بجاتے رہے۔"[۳]

اس سے کچھ دور اسلامی لشکر میں جوش وخروش کا ایک عجیب ہی عالم تھا...... مسلمانوں کو یقین تھا کہ کل میدان میں قبلہ اوّل کی آزادی کا فیصلہ ہو جائے گا...... اگر عیسائی پیاس سے بدحال نہ ہوتے تو یقینا مسلمانوں پر ان کی کثرت کا کچھ نہ کچھ رعب طاری ہوتا۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ ان کی پشت پر بحیرہ طبریہ ہے، لہٰذا شکست کی صورت میں انہیں راہِ فرار مشکل سے مل پائے گی۔ مگر اب صورتحال بڑی حد تک سازگار نظر آرہی تھی اور مجاہدینِ اسلام بہت سے اندیشوں سے نجات پاچکے تھے، ان کے چہرے کل کی متوقع فتح کی خوشی سے تمتما رہے تھے، عماد اصفہانی اس رات مجاہدین کی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"ہمارے سپاہی جری تھے اور پیش آمدہ خطرات سے بے فکر ہو چکے تھے۔ کوئی اپنا نیزہ تیز کر رہا تھا، کوئی اپنے گھوڑے کی لگام تھامے تیار کھڑا تھا۔ کوئی تیرانداز تھا جو درست نشانے لگانے کی مشق کر رہا تھا، کوئی فاتح پہلوان بنا داؤ پیچ لگا رہا تھا۔ کوئی کثرت سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کر رہا تھا اور کوئی بے چینی سے صبح کا منتظر تھا، کوئی فتح کی سعادت کا متلاشی تھا اور کوئی شہادت کے لیے بے قرار تھا۔ یہ وہ رات تھی کہ اس میں ہمارے پہرہ دار فرشتے تھے۔ اس کی صبح اللہ تعالیٰ کی عنایت کے ساتھ دم لیتی نمودار ہوئی۔"[۴]

<u>معرکہ حطین ...... فیصلہ کن جنگ</u> ❁ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ رہی تھی۔ اسلحہ مسلمانوں نے اتارا تھا نہ نصرانیوں نے ...... بلکہ دونوں لشکر کل کی لڑائی کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ پھر سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ یہ 25 ربیع الثانی 583ھ (4 جولائی) کی صبح تھی اور ہفتے کا دن۔ مجاہدین نے اذانیں دے کر نمازِ فجر ادا کی اور جنگ کے لیے صفیں درست کرنے لگے۔ عماد اصفہانی کہتے ہیں:

"سلطان کو اللہ کی نصرت شاملِ حال ہونے کا وثوق ہو چکا تھا، وہ خود صفوں میں چل پھر کر مسلمانوں کا حوصلہ بلند کر رہے تھے، انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت کا وعدہ یاد دلا رہے تھے، سپاہیوں کو ثابت قدمی پر ابھار رہے تھے، سپاہی سلطان کو اپنے درمیان پا کر بہترین کارکردگی دکھانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔"[۵]

ادھر عیسائی لشکر بھی صف آرا تھا۔ صبح کی مدہم روشنی میں ان کے گھڑ سوار دستے ایک طویل صف میں

[۳] محاسن حیات صلاح الدین: ص 141

[۴] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 282/3

[۵] کتاب الروضتین: 282/3

آگے بڑھ رہے تھے، سرخ صلیب پوش ٹیمپلرز اور بکتر بند نائٹ سب سر بکف تھے۔ حطین اور صفوریہ کے درمیان سولہ میل لمبے اس میدان میں اب دونوں فوجیں بالکل آمنے سامنے تھیں، جذبہ ایمانی اور شوقِ شہادت سے معمور 12 ہزار بلند ہمت مسلمان اور 63 ہزار سر پر کفن باندھے نصرانی......

حطین سے دو میل جنوب مغرب میں "لوبیا" کا مقام خاص میدان جنگ تھا۔ لوبیا کا گاؤں سنگلاخ پہاڑوں کی دو جڑواں چوٹیوں کے دامن میں واقع تھا جو "قرنا الحطین" کہلاتی تھیں۔ سلطان خود اپنی فوج کے قلب میں تھے، دائیں بازو کی کمان تقی الدین عمر اور بائیں بازو کی مظفر الدین کوکبری کے پاس تھی۔ نصرانیوں کی جنگی حکمت عملی اب بنیادی طور پر دفاعی ہو چکی تھی مگر اس دفاع کی کامیابی بھرپور جارحانہ حملے میں پوشیدہ تھی۔ ان کے لیے پیاس اب ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ سب سے پہلے طبریہ یا حطین کے شمال مشرق میں واقع وادی حمام کے چشموں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ عیسائی فوج کے دائیں بازو کے لیے جو گائی کی قیادت میں تھا طبریہ تک جانا زیادہ آسان تھا...... جبکہ بایاں بازو جو شال کی طرف تھا، وادئ حمام کی طرف نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا، بہر صورت نصرانیوں کی کوشش یہ تھی کہ اپنی عددی برتری کو بروئے کار لاتے ہوئے مسلمانوں کی صفوں کو روند کر پانی کے ذخائر کی طرف نکل جائیں، اس مقصد کے لیے ان کی زرہ پوش گھڑ سوار فوج خوب کام آ سکتی تھی، بشرطیکہ وہ ہمت برقرار رکھتی۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی اور عیسائی گھڑ سوار تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ادھر مسلمانوں نے تیر اندازی شروع کر دی۔ علامہ ابن اثیر کے بقول سلطان کے "جالیشیہ" دستے اس طرح تیر پھینک رہے تھے جیسے ٹڈیوں کا غول امنڈ آیا ہو۔ عیسائی اس وقت گھڑ سوار اور پیادہ فوج میں بٹ کر الگ الگ سمتوں سے مسلمانوں کی صفوں کو توڑنے کی تگ و دو کر رہے تھے...... گھڑ سوار فوج مسلمانوں کی تیر اندازی کی زد میں تھی...... جالیشیہ کے سپاہی دمادم تیر برسا رہے تھے، جب وہ کمانوں کی تانتیں ایک ساتھ کھینچ کر تیر چلاتے تو تیروں کی سنسناہٹ سے فضا گونج اٹھتی اور کمانوں کی تانتیں کپکپا کر ایک عجیب سا ترنم بکھیر دیتیں۔ اس طوفانی تیر اندازی نے عیسائی گھڑ سواروں کو آگے بڑھنے کے قابل نہ چھوڑا، تیروں کی ہر باڑھ ان کے درجنوں افراد کو ہلاک اور بیسیوں کو زخمی کر رہی تھی۔

عیسائی لشکر کا مضبوط ترین حصہ گائی کی قیادت میں میدانِ جنگ کے جنوب کی طرف تھا جو طبریہ جانے والی شاہراہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوج کا یہ حصہ میدان جنگ کے اطراف میں اُگی جھاڑیوں کے جنگل سے پرے آ چکا تھا، یوں یہ گھڑ سوار فوج سے جو قلب میں تھی، کافی دور ہو گیا تھا، تاہم سورج بلند ہونے تک عیسائی فوج کے تمام حصوں کا باہمی رابطہ برقرار تھا...... سلطان صلاح الدین کی نگاہِ دوربین

میدان جنگ کے ہر گوشے کو دیکھ رہی تھی، وہ نصرانیوں کی جنگی منصوبہ بندی کا اندازہ لگا کر جوابی اقدامات کی تیاری کر چکے تھے۔

گائی کو جنوب سے طبریہ کی شاہراہ تک پہنچنے سے روکنے کے لیے انہوں نے ''کفر سبت'' کے کنارے اپنی فوج کا ایک مضبوط حصہ متعین کر دیا تھا۔ سلطان کے ان سپاہیوں نے جنگ کی ابتداء ہی میں گائی کو طبریہ کی شاہراہ سے دور ہٹا دیا...... اب گائی کی دوسری کوشش یہ تھی کہ وہ شمال میں وادئ حمام کے چشموں اور کنوؤں تک پہنچ جائے مگر ایوبی سپاہیوں نے اسے اس طرف بڑھنے سے بھی روک لیا۔

کچھ دیر تک مسلمان نصرانیوں پر ہر طرف سے تیروں کا مینہ برساتے رہے۔ اس دوران سلطان نے دیکھا کہ عیسائی گھڑ سوار میدان میں اُگی خشک گھاس کو روندتے چلے آرہے ہیں۔ نصرانیوں کے نزدیک یہ عمل بدشگونی سمجھا جاتا تھا مگر اس وقت وہ اس پر مجبور تھے۔ سلطان نے ان کی بدشگونی کو مزید پختہ اور حوصلوں کو پست کرنے کے لیے نفط اندازوں کو حکم دیا کہ وہ گھاس کو آتش زنی کا نشانہ بنائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی، جلتے ہوئے روغن نفط کی چند ہانڈیوں نے صحیح نشانے پر گر کر میدان میں روندی جانے والی خشک گھاس کو آتش کدہ بنا دیا۔ نصرانیوں کے گھوڑے بدک کر ادھر ادھر بھاگنے لگے اور صفوں میں بدنظمی پیدا ہوگئی۔ تب سلطان نے نعرۂ تکبیر بلند کر کے یک بارگی بھرپور حملے کا حکم دیا۔ [1] مجاؤ حملے کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جب صلاح الدین نے وہ ہیبت ناک لفظ (اللہ اکبر) پکارا تو مسلمان سب طرف سے حملے کی خوفناک آوازیں (تکبیریں) بلند کرتے ہوئے ٹوٹ پڑے۔'' [2]

گھمسان کی جنگ: دست بدست جنگ کی ابتداء سلطان کے ایک کم عمر غلام ''منکورس'' کے فدائی حملے سے ہوئی، منکورس جس نے ابھی شباب کی چند بہاریں دیکھی تھیں، اللہ کی راہ میں جان دینے کے لیے بے چین تھا اور اسے جنت چند قدم پر مسکراتی نظر آرہی تھی۔ وہ حملے کا اشارہ پاتے ہی اپنے برق رفتار گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا، دیگر سپاہیوں نے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر اس تک نہ پہنچ سکے، دیکھتے ہی دیکھتے منکورس گرد کے بادل اڑاتا نصرانیوں کی پہلی صف پر ٹوٹ پڑا، عیسائی سورما اس کی جواں مردی پر حیرت زدہ رہ گئے، نہ معلوم کیوں انہیں یقین ہو گیا کہ ایسا دلیر انسان سلطان صلاح الدین کا کوئی بیٹا ہی ہو سکتا ہے، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ شوق شہادت ایک عام مسلمان کو بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کے تیور عطا کر دیتا ہے۔ نصرانیوں نے منکورس کو ہر طرف سے گھیر لیا اور اس پر

[1] کتاب الروضتین: 283/3 [2] محاربات صلاح الدین، ص 142

بھوکے درندوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ منکورس بڑی بے جگری سے اکیلا ان کا مقابلہ کرتا رہا، آخر وہ زخموں سے چور ہو گیا اور نصرانیوں نے اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔ [1]

نصرانیوں کی اس حرکت نے مسلمانوں کو مزید جوش دلایا۔ انہوں نے بیک آواز اس جوش وخروش سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا کہ حطین کی وادی لرز اٹھی۔ مسلمانوں نے عام حملہ شروع کیا تو نصرانیوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں اور وہ ان گنت لاشیں چھوڑ کے پیچھے ہٹنے لگے۔

انہوں نے بار بار پیچھے ہٹ کر صفیں درست کرنے کے بعد پوری طاقت سے جوابی حملے کیے مگر ہر مرتبہ انہیں الٹے قدموں لوٹنا پڑا۔

عیسائی اب اپنے آپ کو ہر طرف سے گھرا ہوا محسوس کر رہے تھے، سورج سر پر آ چکا تھا۔ زرہ بکتروں میں ملبوس نصرانیوں کے لیے گرمی قیامت ڈھا رہی تھی، پیاس سے ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور زبانیں باہر لٹکنے لگی تھیں، تاہم قومی وقار اور مذہبی جذبہ انہیں ہتھیار ڈالنے سے روکے ہوئے تھا۔ ایسے عالم میں مسلمانوں نے ایک اور خطرناک وار کر ڈالا، انہوں نے میدان کے دوسرے کنارے کی جھاڑیوں کو بھی آگ لگا دی...... میدان کی اس پٹی میں شعلوں کی دیوار کھڑی ہو گئی اور عیسائی گھڑسوار فوج کا جو گائی کی قیادت میں جھاڑیوں سے پرے تھی، پیادہ فوج سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ [2]

<u>ریمنڈ کا فرار</u>: ریمنڈ اپنی قوم کی تباہی کا یہ منظر دیکھ کر صدمے سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے نوشتۂ دیوار پڑھ کر اپنے سپاہیوں سے کہا:

''میں آگے بڑھ کر ان پر حملہ کرتا ہوں اور ان کی صفوں کو چیر کر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اس نے اپنے خاص رفقاء اور سپاہیوں کے ساتھ جنونی انداز میں لشکر اسلام کی ایک صف پر حملہ کر دیا۔ اس جانب غازیٔ اسلام تقی الدین عمر اپنی جمعیت کے ساتھ چوکس کھڑا تھا، اس نے نصرانیوں کی اس پیش قدمی کو دیکھ کر فوراً بھانپ لیا کہ یہ لوگ جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں، انہیں روکا گیا تو شاید لڑتے لڑتے مر جائیں لیکن انہیں بچ نکلنے کا موقع دیا گیا تو یہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر میدان چھوڑ دیں گے۔

جہاں دیدہ تقی الدین عمر نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ نصرانیوں کے اس ریلے کے لیے راستہ چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ فیصلہ جو ایک عام سپاہی کے نقطۂ نظر سے شجاعت کے خلاف تھا، درحقیقت مسلمانوں کے لیے بہت بابرکت ثابت ہوا۔ تقی الدین عمر نے جوں ہی اپنے دستوں کو راستے سے ہٹایا، ریمنڈ اپنے ساتھیوں

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/283

[2] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، ابن خلدون: 5/303، النجوم الزاہرۃ: 6/321، کتاب الروضتین: 3/284

کے غول سمیت میدان سے بھاگ نکلا۔ تقی الدین عمر نے ایک بار انہیں میدان سے نکلنے کا موقع دینے کے بعد گھڑسواروں کو ان کے تعاقب میں دوڑا دیا، ریمنڈ کے اکثر ساتھی تعاقب کرنے والوں کے ہاتھوں مارے گئے، وہ خود بہت مشکل سے جان بچا کر نکل سکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اپنی قوم کا عبرتناک انجام دیکھنے کی ضرورت تک محسوس نہ کی، اس میں شاید یہ حوصلہ شکن منظر دیکھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔

ریمنڈ کے فرار ہونے کے چند لمحوں بعد صیدا کا شہزادہ بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک صف کو توڑ کر نکل گیا۔ ان کے فرار سے دوسرے نصرانیوں کی ہمت بھی جواب دینے لگی اور ان کی قوت کو سخت دھچکا لگا۔ تاہم گائی اور ریجی نالڈ جیسے کفر کے سرخیلوں نے مذہبی حمیت کا واسطہ دے کر ان کی غیرت کو جھنجھوڑا اور ہمت بڑھائی۔ وہ بہت جلد منظم ہو کر پھر سے مسلمانوں پر جارحانہ حملے کے لیے آگے بڑھے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ جان کی بازی لگا کر نہ لڑے تو صلیب اعظم سرنگوں ہو کر رہے گی، انہوں نے بڑے زور و شور سے حملہ کیا۔ دیر تک خون کے دریا بہتے رہے۔ علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ اگر اللہ کا لطف و کرم شامل حال نہ ہوتا تو فرنگی اپنی قوت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے قدم اکھاڑ دیتے مگر مسلمان ثابت قدم رہے اور آخر کار نصرانیوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد نصرانیوں نے یکے بعد دیگرے کئی خطرناک حملے کیے تاہم ہر بار شدید لڑائی کے بعد انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔

زوال کے وقت عیسائی پیاس سے بے دم ہو رہے تھے، سورج انہیں جھلسائے دے رہا تھا، تیروں کی لگاتار بارش میں انہیں کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ شعلہ زن جھاڑیوں اور گھاس نے ان کی نقل و حرکت کو محدود تر کر دیا تھا۔ چوں کہ قدرتی طور پر ہوا کا رخ نصرانیوں کی طرف تھا اس لیے آگ کی لپٹوں اور دھوئیں کے مرغولوں سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ کاتب عماد اصفہانی تحریر کرتے ہیں:

> ''تین خداؤں کے پرستار تین طرح سے جل رہے تھے، لکڑیوں کے ایندھن کی آگ سے، پیاس کی آگ سے اور تیروں کی آگ سے۔''[1]

گائی اور گھڑسواروں کے بیچ آگ کی دیوار: عیسائی فوج اب واضح طور پر دو حصوں میں نظر آ رہی تھی، گھڑسوار بھڑکتی ہوئی آگ کے ایک طرف مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ کسی طرح جبل طبریہ تک پہنچنا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہوا، سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے زیر کمان دستوں کے ساتھ ان کا راستہ روک لیا۔ اب گھڑسوار جان بچانے کی خاطر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے اور مدافعانہ پوزیشن لے لی۔

آگ کی لپٹوں اور دھوئیں کے مرغولوں کے پار گائی فوج کے بڑے حصے کے ساتھ انتہائی تذبذب

[1] کتاب الروضتین: 284/3

کے عالم میں کھڑا تھا، وہ فرار ہونا نہیں چاہتا تھا، اسے بہر حال مسلمانوں کے مقابلے میں عددی اکثریت حاصل تھی۔ اس نے سوچا کہ اب بھی گھڑ سواروں کو ساتھ لے کر مسلمانوں پر بھر پور حملہ کر کے جان بچانا ممکن ہے۔ اس نے گھڑ سواروں کو پیغام بھیجا کہ وہ پہاڑی سے اتر کر اس سے آملیں۔ اس نے انہیں صلیبِ اعظم اور تختِ شاہی کا واسطہ بھی دیا مگر گھڑ سوار اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ ان کا آخری جواب یہ تھا کہ ہم خود پیاس سے جان بلب ہیں اور لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ [1]

اگر گھڑ سوار گائی کی پکار کا مثبت جواب دیتے تو مسلمانوں کے لیے پریشان کن لمحات آسکتے تھے مگر یہ ششش و پنج نصرانیوں کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ تب مسلمانوں نے مہلت دیے بغیر اس پہاڑی پر ہلہ بول دیا جو گھڑ سواروں کی پناہ گاہ تھی، اس حملے میں گھڑ سواروں کی خاصی تعداد ماری گئی اور باقی گرفتار ہو گئے۔ تاہم گائی اب بھی میدان میں تھا گستاخ ریجی نالڈ سمیت ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے سردار بھی اس کے ساتھ تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی سمجھ چکے تھے کہ جنگ آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ ان کے اشارے پر اسلامی فوج کے دستے ایک وسیع دائرے میں پھیل کر گائی کو گھیرے میں لینے لگے۔ [2]

آخری مرحلہ ❁ گائی جو کہ از سر نو صف بندی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، اپنی فوج کو لے کر حطین کی سطح مرتفع کی طرف بڑھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ راہِ فرار مسدود ہو چکی ہے۔ اب بچنے کی ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ کہیں سے مدد پہنچ جائے اور تب تک وہ سطح مرتفع پر دفاعی پوزیشن لیے رہے۔ بلندی پر آتے ہی اس نے صلیبِ اعظم نصب کرا دی۔ میدانِ جنگ میں اس کی تنصیب کے بعد نصرانیوں کے لیے مرنے مارنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا تھا۔ صلیب کے ساتھ شاہی خیمہ بھی لگا دیا گیا تھا، ابھی مزید خیمے لگانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں مسلمانوں نے سلطان کے اشارے پر اپنا دائرہ تنگ کرتے ہوئے اس بلند ٹیلے پر دھاوا بول دیا، نصرانیوں نے بلندی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھر پور مدافعت کی اور ایک نہایت خون ریز لڑائی شروع ہو گئی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی اس ٹیلے کے قریب آکر افواج کی قیادت کر رہے تھے اور افسران و سپاہ کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ عیسائی صلیبِ اعظم کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا چکے تھے، گائی اپنے ایک سو پچاس نائٹوں کے ساتھ ٹیلے پر کھڑا افواج کو جوش دلا رہا تھا۔ دست بدست گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ جن نصرانیوں کے پاس گھوڑے تھے، وہ بھی پیدل ہو کر لڑ رہے تھے، معرکہ اتنا شدید تھا کہ کبھی مسلمان نصرانیوں کو دھکیل کر اوپر لے جاتے اور کبھی وہ مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے دور ہٹا دیتے۔ [3]

[1] صلاح الدین لین پول: 119 [2] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ [3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/284، الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ

میدانِ جنگ کے اس حصے کو دھول اور مٹی کے بادلوں نے چھپالیا تھا، شکستہ تیر اور ٹوٹے ہوئے نیزے کٹی ہوئی فصل کی طرح زمین پر بکھرے تھے۔ کچلے ہوئے جسم تڑپ رہے تھے، کٹے ہوئے اعضاء پھڑک رہے تھے۔ گردنیں سروں سے جدا ہو رہی تھیں، زمین خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ نصرانیوں کی جانبازی نے جنگ کے اس مرحلے میں صورتحال کو غیر یقینی بنا دیا تھا۔ مسلمان سمجھ رہے تھے کہ جنگ کا فیصلہ اب چند لمحوں میں ہو جائے گا مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کو صحیح طور پر اس لمحے کا اندازہ تھا جو فیصلہ کن تھا۔ وہ پوری تندہی سے ٹیلے اور اس کی ڈھلوان پر گتھم گتھا سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں بار بار ٹیلے پر نصب شاہی خیمے اور صلیب سے الجھ رہی تھیں۔ ان کا نوجوان لڑکا الملک الافضل ان کے بالکل ساتھ کھڑا خون کی ندیاں بہتے دیکھ رہا تھا۔ اتنی بڑی جنگ میں اس کی یہ پہلی شرکت تھی۔

اچانک ٹیلے سے نصرانیوں کا ایک ریلہ اس زور سے آیا کہ مسلمانوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ عیسائی سیلابی ندی کی طرح مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے نیچے آنے لگے اور مسلمان الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہٹے سلطان کے قریب آن پہنچے۔ یہ دیکھ کر سلطان نے غیرت اور جوش سے اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں دبالیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھے، ساتھ ہی ان کا نعرہ گونجا:

"کذب الشیطان" (شیطان جھوٹا ہو)

یہ نعرہ سن کر پسپا ہوتے مسلمان ایک بار پھر پلٹے اور نصرانیوں کو دھکیلنے لگے، عیسائی پیچھے ہٹتے ہوئے پھر ٹیلے پر چڑھ گئے۔ شہزادہ الافضل یہ دیکھ کر خوشی سے چلایا: "ہرا دیا، ہم نے انہیں ہرا دیا۔"

مگر تھوڑی ہی دیر بعد عیسائی ایک بار پھر مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے نیچے لا رہے تھے اور مسلمان افراتفری میں پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ہٹتے ہٹتے وہ دوبارہ سلطان کے نزدیک آگئے۔ تب سلطان پھر اٹھے اور مجاہدین کو جوش دلا کر آگے بڑھانے لگے۔ مسلمانوں نے پھر تازہ حوصلہ پایا اور نصرانیوں کو ایک بار پھر پسپا ہونا پڑا۔ الملک الافضل یہ دیکھ کر پھر بے اختیار چیخا: "ہرا دیا۔ ہم نے انہیں ہرا دیا۔" سلطان نے پلٹ کر اسے دیکھا اور درشت لہجے میں گویا ہوئے:

"چپ رہو! جب تک وہ خیمہ نہیں گرتا ہم انہیں شکست نہیں دے سکتے۔"

یہ کہتے ہوئے سلطان کا اشارہ گائی کے خیمے کی طرف تھا۔ ابھی ان کے الفاظ پورے نہ ہوئے تھے کہ اچانک ٹیلے کی بلندی پر گائی کا خیمہ گرتا دکھائی دیا۔ صلیبِ اعظم بھی سرنگوں ہو رہی تھی۔ سلطان یہ دیکھتے ہی تیزی سے گھوڑے سے نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ شکرِ باری تعالیٰ کے احساس سے ان پر گریہ طاری ہو گیا، ان کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ رہے تھے، اشکوں کے یہ موتی ان کے

تمتماتے گالوں پر بہتے ہوئے ڈاڑھی میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ ٹیلے پر جنگ ختم ہو رہی تھی، نصرانیوں کی صلیب اعظم جسے لڈا کے پادری نے آخر تک بچانے کی کوشش کی تھی، مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، یہ رسواکن منظر دیکھ کر عیسائی بالکل بے دم ہو گئے تھے۔ [1]

<u>ائمۃ الکفر مجاہدین کی قید میں</u> ٭ نصرانیوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے، ٹیلے پر موجود ان کے وہ جیالے جو بھڑکتی شمع کی آخری لو کی طرح جنگ کے آخری مرحلے میں بے حد متحرک ہو گئے تھے، شکست کا یقین ہوتے ہی گھوڑوں سے اتر کر بے جان لکڑیوں کی طرح زمین سے لگ گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے اٹھنے اور چلنے پھرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے، آخری لمحات کی شدید لڑائی نے ان کی پیاس اور بھڑکا دی تھی۔ اب وہ مسلمانوں کے رحم و کرم پر تھے۔ مسلمان انہیں قیدی بنا رہے تھے، بڑے بڑے حکمران، شہزادے، نواب، نائٹ اور سردار سر جھکائے قیدیوں میں شامل ہو رہے تھے، ان میں گائی بھی تھا اور اس کا بھائی املریک بھی۔ گستاخ رسالت ریجی نالڈ بھی تھا اور تورون کا متعصب جنگجو حکمران ہمفری ابن ہمفری بھی، ابلین کا حاکم بالیان بھی تھا اور متعصب پادری اور راہب بھی۔ خونخوار ٹیمپلرز بھی تھے اور جنگجو ہاسپٹلرز بھی۔

عیسائی امراء میں سے ریمنڈ اور صیدا کا شہزادہ رینالڈ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ریمنڈ بھاگ کر زخمی حالت میں صور پہنچا اور کچھ دنوں بعد سلطان کے حملے کے پیش نظر طرابلس منتقل ہو گیا جہاں غم کی شدت سے ذات الجنب کے مرض میں مبتلا ہو گیا، چند دنوں بعد صدمے، زخموں اور بیماری نے اس کا کام تمام کر دیا۔

کافر سرداروں کے علاوہ حطین کے عام قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مسلمان انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے مقتولین سے میدان پٹا پڑا تھا جگہ جگہ لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

عماد اصفہانی اس صورتحال پر نہایت بلیغ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

فمن شاھد القتلیٰ قال ماھناك اسیر، ومن عاین الاسریٰ قال ما ھناك قتیل

یعنی مقتولین اتنے زیادہ تھے کہ انہیں دیکھنے والا باور نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں نے کسی کو قیدی بنانے کے لیے زندہ چھوڑ دیا ہوگا۔ ...اور قیدی اتنے زیادہ تھے کہ انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا

---

[1] حرب الرومتین: 3/228، الکامل فی التاریخ تحت 583ھ، تاریخ ابن خلدون: 6/303، البدایۃ والنہایۃ تحت 583ھ

کہ مسلمانوں نے کسی کو قتل بھی کیا ہوگا۔''ە

491ھ (1098ء) میں القدس پر نصرانیوں کے قبضے کے بعد سے لے کر اب تک یہ ان کی سب سے بڑی شکست تھی جس نے مسلمانوں کے لیے اگلی تمام فتوحات کا دروازہ کھول دیا۔

ریجی نالڈ کا انجام:۔ جنگ کا ہنگامہ تھمتے ہی سلطان صلاح الدین ایوبی نے میدان جنگ میں خیمے گاڑنے اور اہم قیدیوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے سلطان کا خیمہ نصب کیا جانے لگا۔ اس دوران سلطان خیمے کے سامنے بیٹھ گئے۔ جن جن سپاہیوں کو نصرانیوں کے معزز لوگ ہاتھ لگے تھے، وہ انہیں سلطان کے سامنے لا رہے تھے۔ سلطان کا خیمہ گڑ چکا تو وہ خیمے میں اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ ان کا چہرہ مسرت اور احساسِ تشکر سے جگمگا رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد سلطان کی خدمت میں بادشاہ گائی، اس کا بھائی اور ریجی نالڈ حاضر کیے گئے۔ گائی کو ایک سپاہی درباس کردی نے گرفتار کیا تھا جبکہ ریجی نالڈ کو امیر ابراہیم سہرانی کے ایک غلام نے پکڑا تھا۔

گائی کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی، پیاس کی شدت سے اس کی زبان باہر لٹک رہی تھی۔ سلطان نے ایک حکمران کے شایان شان سلوک کرتے ہوئے اسے اپنے قریب بٹھالیا اور برف ملا ٹھنڈا مشروب منگوا کر اسے پلوایا۔ کھجور اور کشمش سے تیار کردہ اس مشروب کو ''حلاب'' کہا جاتا تھا۔

بدبخت ریجی نالڈ بھی گائی کے قریب بیٹھا بے تابی سے اسے شربت پیتا دیکھ رہا تھا۔ گائی نے اس کی پیاس کا اندازہ لگا کر پیالے میں بچا ہوا مشروب اسے دے دیا۔ ریجی نالڈ نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اسے حلق سے نیچے اتار لیا۔ چوں کہ عربوں کے ہاں قیدی کو کھانا کھلانا یا پانی پلانا جان کی امان دینے کی علامت سمجھا جاتا تھا اس لیے شاید ریجی نالڈ کو امید تھی کہ اس طرح سلطان کی مہمانی کا اعزاز حاصل کر کے وہ سزائے موت سے بچ جائے گا..... مگر سلطان کو ان حیلہ سازیوں سے دھوکا نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ریجی نالڈ کو شربت پیتا دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے ترجمان کے ذریعے گائی سے کہا:

''میں خود اسے ہرگز پانی نہ پلاتا۔ تم نے میری اجازت کے بغیر اس شخص کو پانی پلایا ہے، لہٰذا اسے امان نہیں ملے گی۔''

پھر سلطان اپنی نشست سے اٹھے اور اس بڑے خیمے سے کچھ دور اپنی خلوت گاہ میں چلے گئے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے ریجی نالڈ کو وہاں طلب کیا۔ جب وہ اندر پہنچا تو سلطان نے تلوار سنبھالی اور اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ یہی تو وہ بدبخت تھا جس نے بارہا سلطان سے معاہدوں کی خلاف ورزی کی

ە حرب ہلال ص 288/2

تھا۔ مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ سب سے بڑھ کر اس نے حرمین شریفین پر حملہ کیا تھا، حجاج کرام کے قافلے لوٹے تھے اور حضور رحمت عالم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کی تھیں۔ سلطان نے اسے قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور اب اس قسم کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کے باوجود اسلامی عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سلطان نے پہلے اس کے جرائم ایک ایک کر کے گنوائے اور پھر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ مگر اس شقی القلب انسان کی قسمت میں یہ سعادت کہاں تھی۔ تکبر ونخوت کے خول میں بند اس کی ناپاک روح، اسلام کے چشمۂ صافی سے خود کو پاک کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ چوں کہ ریجی نالڈ نے قافلۂ حجاج پر حملے کے دوران قیدی بنائے گئے حاجیوں کے سامنے حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اپنے محمد سے کہو آ کر تمہیں چھڑا لے۔ (نعوذ باللہ)

اس لیے گستاخ نبوت کو اس کا وہ بے ہودہ جملہ یاد دلاتے ہوئے سلطان نے کہا:

''اچھا تو لے! میں تجھ سے محمد ﷺ کا انتقام لیتا ہوں، میں حضور ﷺ کا نمائندہ بن کر ان کی طرف سے ان کی امت کا بدلہ لے رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہی سلطان نے اپنی چھوٹی تلوار جسے ''نیمچاہ'' کہا جاتا تھا، نیام سے کھینچ لی اور ایک ہی وار میں ریجی نالڈ کو کاندھے سے سینے تک چیر کر رکھ دیا۔ گستاخ نبوت وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سلطان کے خادموں نے مزید وار کر کے اسے بالکل ٹھنڈا کر دیا۔

اس موقع پر سلطان نے کہا:

''میں نے دوبارہ اسے قتل کرنے کی نذر مانی تھی، ایک اس وقت جب اس نے حرمین شریفین پر حملے کی کوشش کی تھی اور دوسری بار جب اس نے حاجیوں کے قافلے پر دھوکے سے حملہ کیا تھا۔''

ملعون کے کٹے ہوئے سر اور لاش کو گھسیٹ کر اس خیمے کی چوکھٹ پر پھینک دیا گیا جہاں گائی اور دیگر قیدی امراء کو بٹھایا گیا تھا۔ انہیں اس دوران سلطان کے حکم سے کھانا کھلا دیا گیا تھا۔ گائی اس خوفناک منظر کو دیکھ کر لرز اٹھا، اسے یقین ہو گیا کہ اب میری باری ہے۔ سلطان کو اس کی تشویش کا علم ہوا تو اسے بلوایا اور قریب بٹھا کر تسلی دیتے ہوئے کہا:

''بادشاہوں کی روایت نہیں کہ وہ بادشاہوں کو قتل کریں۔ مگر اس شخص کی حرکتیں ہر حد سے بڑھ چکی تھیں، اس لیے اس کے ساتھ جو ہوا سو ہوا۔''

ریجی نالڈ کے علاوہ ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کے سردار اور جنگجو بھی کسی رعایت کے بغیر قتل کر دیے گئے کیوں کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف نصرانیوں کو بھڑکانے میں سب سے پیش پیش رہے تھے۔ گائی اور

دیگر اہم قیدیوں سے بہر حال اچھا برتاؤ کیا گیا اور انہیں دمشق کے قید خانے بھیج دیا گیا۔ [1]

فتح کی یہ رات یوم عید کی طرح پر رونق تھی، ایوبی لشکر سے مسرت انگیز آوازیں سکوت شب کو توڑتے ہوئے دور دور تک جا رہی تھیں۔ مگر یہ آوازیں محفل رقص و سرود کی تھیں، نہ بزم شراب و کباب کی۔ اس چہل پہل میں گویوں کی تانیں سنائی دیتی تھیں نہ سارنگی اور بانسری کے سُر...... بلکہ یہ خوش الحانی قاریوں کی تلاوت تھی جو دلوں کو منور کر رہی تھی...... تکبیر کے جوشیلے نعرے تھے جو مجاہدین کے سینوں سے نکل رہے تھے...... لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں تھیں جو تاریکی میں توحید کا اجالا پھیلا رہی تھیں۔ [2]

جنگ کی چند دلچسپ یادیں: حطین کی اس شاندار فتح کے تذکرے عرصہ دراز تک مسلمانوں کی محفلوں کو گرماتے رہے۔ جنگ کے عجیب و غریب واقعات کئی نسلوں تک سنے اور سنائے جاتے رہے۔ حطین کے میدان میں سالہا سال تک مقتول نصرانیوں کی لاشوں کے پنجر نظارہ عبرت بنے رہے۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں معرکہ حطین کے تقریباً ایک سال بعد اس معرکہ کی جگہ سے گزرا تو زمین کو ہڈیوں سے بھرا پایا جو دور سے نظر آتی تھیں۔ بہت سی ڈھیروں کی شکل میں اوپر تلے پڑی تھیں اور بہت سی بکھری ہوئی تھیں۔ یہ باقیات ان آثار کے علاوہ تھیں جنہیں سیلابوں نے مٹا دیا تھا یا جنہیں درندے جنگلوں اور کھائیوں میں ختم کر چکے تھے۔" [3]

- نصرانیوں کے 30 ہزار گرفتار کیے گئے تھے۔ جنگ کے چشم دید گواہ کاتب عماد اصفہانی کہتے ہیں:

"قیدیوں کی تعداد اتنی تھی کہ خیموں کی رسیاں بھی انہیں باندھنے کے لیے کم پڑ گئی تھیں، میں نے خود دیکھا کہ 43 قیدی ایک ہی رسی سے باندھے گئے اور انہیں ایک گھڑ سوار کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ ایک جگہ میں میں نے سو، دو سو قیدی دیکھے جن پر صرف ایک نگران پہرہ دے رہا تھا۔" [4]

- نصرانی گھڑ سوار جنہیں نائٹ کہا جاتا تھا، سر سے پاؤں تک لوہے میں چھپے ہوئے تھے، ان پر تلواروں کی ضرب اثر کرتی تھی نہ تیر اندازی۔ مگر سورج کی تپش نے نائٹوں کی سر تا پا محیط زرہ بکتروں کو ان کے لیے آگ کا شکنجہ بنا دیا تھا اور پیاس کی شدت نے ان کے گھوڑوں کو نڈھال کر دیا تھا۔ نائٹوں کی تعداد ہزاروں میں تھی اور وہ فوج کا مضبوط ترین عنصر تھے۔ جب تک وہ

---

[1] کتاب الروضتین: 3/282، ماخوذ از رسالہ ...: ص 130، 131، الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، ...: 5/303، البدایۃ والنہایۃ: تحت 583ھ

[2] کتاب الروضتین: 3/288، ماخوذ از رسالہ ...: ص 131

[3] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ

[4] کتاب الروضتین: 3/286

گھوڑے کی پشت پر جمے رہتے تھے ان پر کاری وار کرنا بہت دشوار ہوتا تھا مگر قدرت خداوندی نے انہیں مسلمانوں کے لیے مسخر کردیا تھا۔ مسلمان پہلے نائٹوں کے گھوڑوں پر حملہ کرتے، گھوڑے کے زخمی ہونے سے نائٹ گر پڑتا اور مسلمان فوراً اسے بھالوں اور تلواروں سے چھید ڈالتے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو مال غنیمت میں کوئی صحیح وسالم گھوڑا نہ مل سکا، اکثر گھوڑے مرچکے تھے یا زخمی تھے۔ [1]

- مال غنیمت میں حاصل شدہ اسلحے خصوصاً زرہوں اور خودوں (ہیلمٹ) کا شمار مشکل ہوگیا۔
- قیدیوں کو دمشق کے بازاروں میں فروخت کیا جانے لگا۔ ان کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ تین تین دینار میں ایک قیدی بک رہا تھا۔ قیدیوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جو نصرانیوں کی خیمہ گاہوں سے گرفتار ہوئے تھے، ان میں سے بہت سے خاندان ایک ہی بولی میں فروخت ہورہے تھے۔ ایک مؤرخ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے کہ میرے سامنے ایک آدمی، اس کی بیوی، اس کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں بیک وقت 80 دینار میں فروخت ہوگئے۔
- مال غنیمت کے دیگر ذخائر کا اندازہ بھی حدوشمار سے باہر تھا۔ گھوڑوں، گایوں، بکریوں اور مویشیوں کے گلے اتنے زیادہ تھے کہ ان کے خریدار کم پڑ گئے تھے۔
- فرنگی قیدیوں میں سے جن کا تعلق ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز سے ثابت ہوجاتا انہیں سلطان کے حکم سے قتل کرکے ان کے سروں کی سرعام نمائش کی جاتی تھی۔ دمشق میں آئے دن ایسے سر خربوزوں کی طرح بازار میں سجے نظر آتے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے عادی تھے۔
- ایک عجیب لطیفہ یہ ہوا کہ سلطان کے ایک غریب سپاہی کے حصے میں ایک قیدی آیا، اس سپاہی کو جوتوں کی ضرورت تھی، اس نے کسی سے جوتے خریدے اور قیمت کے طور پر قیدی اسے دے دیا۔ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ قیدی اتنا سستا کیوں دے دیا؟ بولا:
  ''میں چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ نصرانیوں کی ذلت کی مثال بن کر یاد کیا جاتا رہے۔'' [2]
- شاہ یروشلم گائی کی گرفتاری اور صلیب الصلبوت کا مسلمانوں کے ہاتھ لگ جانا نصرانیوں کے لیے ایک ایسی ذلت تھی جس نے ان کا سر بالکل نیچا کردیا تھا۔

عماد اصفہانی لکھتے ہیں:

''بادشاہ کے گرفتار ہوتے ہی صلیب الصلبوت بھی چھین لی گئی اور اس وقت باطل تباہ ہوگیا۔ یہ و...

---

[1] کتاب الروضتین: 286/3 [2] کتاب الروضتین: 209/3

صلیب ہے کہ جب اسے گاڑا، کھڑا کیا یا اٹھایا جاتا ہے تو ہر عیسائی اسے رکوع وسجدہ کرتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس لکڑی سے بنائی گئی ہے جس پر ان کے معبود (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے گمان کے مطابق) سولی دی گئی تھی۔ نصرانیوں نے اسے سرخ سونے کا غلاف پہنا رکھا تھا اور اس پر ہیرے موتی جڑے تھے۔ انہوں نے اسے انتہائی خطرات کے وقت مجتمع ہونے اور خاص مقررہ دنوں کے لیے تیار کیا تھا، جب پادری اور راہب اسے (جنگ کے موقع پر) نکالتے اور سروں پر رکھتے تو سب اس کی طرف لپکتے اور جھپٹتے۔ کسی کے لیے جائز نہ ہوتا کہ وہ رُکا رہے۔ اس سے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے جان کی امان نہ رہتی تھی۔ اس صلیب کا چھن جانا ان کے لیے اپنے بادشاہ کی قید سے بھی زیادہ الم ناک تھا اور اس معرکے میں یہ انہیں پہنچنے والی سب سے سخت مصیبت تھی۔ اس لیے کہ چھینی ہوئی صلیب کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا تھا۔"[1]

صلیب کو قاضی ابن عصرون کے حوالے کر دیا گیا، وہ اسے لے کر دمشق میں داخل ہوئے تو عوام کا ایک سیلاب اس تاریخی منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ نصرانیوں کی سب سے بڑی مذہبی علامت الٹی لٹکی ہوئی تھی اور مسلمان اسے ساتھ لیے چلے آرہے تھے۔ یہ صلیب دمشق کے مقام "قطاریہ" میں ایک عرصے تک اوندھی لٹکی رہی اور مسلمانوں کو توحید کی شاندار فتح اور تثلیث کی عبرتناک شکست کی یاد دلاتی رہی۔[2]

فریقین کی تعداد:- اس جنگ میں فریقین کی تعداد کا تناسب کیا تھا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ سلطان کی فوج کے بارے میں مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ بارہ ہزار پیشہ ور سپاہیوں اور ان کے علاوہ بہت سے رضا کار مجاہدین پر مشتمل تھی۔ نصرانیوں کے لشکر کی تعداد مختلف بتائی جاتی ہے۔ بعض مؤرخین نے 50 ہزار کی تعداد بیان کی ہے مگر صحیح تر تعداد وہ معلوم ہوتی ہے جو خود سلطان کی جانب سے اس معرکے کی تفصیلات پر مشتمل ایک مراسلے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے مطابق عیسائی لشکر میں 63 ہزار گھڑ سوار اور پیادے تھے۔ اس خط میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے معرکے میں 30 ہزار عیسائی مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے۔

اس تفصیل کی موجودگی میں یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ نصرانیوں کی تعداد 63 ہزار تھی۔ بعض مؤرخین نے ان کی تعداد 36 ہزار بتائی ہے جو بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مغربی مؤرخین مثلاً لین پول نے نصرانیوں کی تعداد کو 12 سو نائٹوں، 18 ہزار پیادوں اور بہت سے گھڑ سواروں میں تقسیم کر کے اصل تعداد کو چھپانے کی کوشش کی ہے، تاکہ بارہ ہزار مسلمانوں سے 63 ہزار نصرانیوں کے شکست فاش کھانے کی خفت کم کی جاسکے۔ اس ضمن میں سب عجیب بلکہ مضحکہ خیز دعویٰ امریکی مستشرق ہیرلڈ لیمب کا ہے جس

[1] کتاب الروضتین: 287/3
[2] کتاب الروضتین: 341/3، ماہنامہ پیام انجیا جت 583ھ

نے اپنی تصنیف "کروسیڈز" میں جنگ حطین کے حوالے سے حاشیے پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اس لڑائی میں ایک نصرانی کے مقابلے میں چھ مسلمان گھڑسوار تھے۔ یہ دعویٰ اس بددیانتی کی ایک معمولی مثال ہے جس کا مظاہرہ مستشرقین اپنی "تحقیقات" میں عموماً کرتے رہتے ہیں۔

بشارت نامے: فتح حطین کے چند دن بعد سلطان نے خلیفہ بغداد کو اپنے مکتوب میں معرکے کے نتائج کی بشارت یوں دی:

"عیسائی بادشاہ کو قید کرلیا ہے، یہ دن کفار پر بڑا بھاری رہا۔ ریجی نالڈ بھی گرفتار کرلیا گیا، اس پر اللہ کی لعنت ہو، اس کے سر کی فصل کاٹ دی گئی ہے۔ خادم نے اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرکے اپنی نذر پوری کی۔ عیسائی بادشاہ کی سلطنت کے بڑے بڑے سردار اور گمراہی کے سرخیل قید ہوگئے ہیں، مقتولین کی تعداد چالیس ہزار سے زائد ہے۔ داویہ (ٹیمپلرز) کا کوئی فرد زندہ نہیں بچا۔ پس سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ خادم یہ عریضہ "عکا" کی سرحد سے تحریر کررہا ہے، اس وقت اسلام کی جولان گاہ وسیع ہوچکی ہے اور اس کے مددگار اور جواں مرد غالب آچکے ہیں، جبکہ کفر پر خوف و دہشت مسلط ہے اور اس کی موت قریب آچکی ہے۔"[1]

- سلطان کے وزیر قاضی فاضل نے جو ان دنوں دمشق کے انتظامی معاملات سنبھالے ہوئے تھے، فتح کی خوشخبری سن کر سلطان کو مبارکباد کا یہ مکتوب تحریر کیا:

"آقا کو مبارکباد ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے دینِ قیم کو استوار کردیا اور وہ جو ل تھے "میرے اور ہر مسلمان کے آقا بن گئے" اللہ نے ان پر دونوں قسم کی نعمتیں مکمل کردیں باطنی بھی اور ظاہری بھی۔ انہیں دونوں طرح کی بادشاہت عطا فرمائی، دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی۔ خادم اس حال میں یہ خط لکھ رہا ہے کہ اب تک سر سجدے میں ہے اور اشکِ مسرت رخساروں سے نہیں پونچھے گئے۔ خادم جب بھی یہ سوچتا ہے کہ اب گرجے، مساجد بن جائیں گے اور وہ مقامات جہاں اللہ کو تین میں سے تیسرا کہا جاتا تھا وہاں آج اللہ کو ایک کہا جا رہا ہے، تو (یہ سوچ کر) بار بار از سر نو شکر بجالاتا ہے۔ کبھی زبان سے اور کبھی دل سے۔"[2]

اس موقع پر عماد اصفہانی اپنے ایک خط میں القدس کی فتح کے لیے بے چین ہوکر تحریر کرتے ہیں:

---

[1] کتاب الروضتین، ج2، ص83

[2] کتاب الروضتین، ج2، ص83

"مقدس گنبدِ صخرہ اب ہمیں پکار رہا ہے، فریاد کر رہا ہے۔ اللہ کے نیک بندے اللہ کے سچے موعودہ وعدے کے مطابق وہاں پہنچنے والے ہیں۔ القدس کی فتح کی بشارت پوری ہونے میں اب دیر نہیں رہ گئی۔ اس شاندار فتح کے بعد ہمتیں خوب بلند ہو گئی ہیں۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی حمد سے سب بھلائیاں تمام ہوتی ہیں۔"٥

اس "فتح مبین" پر شعراء اسلام نے بے شمار قصائد لکھے، ابن ساعاتی نے جھوم کر کہا:

جَلَتْ عزماتُكَ الفتحَ المُبِيْنا — فقد قَرَّتْ عيونُ المُؤمِنِيْنا
آپ کے پختہ ارادوں نے کھلی فتح کو ظاہر کر دیا — جس سے مومنوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں

يُقَاتِلُ كُلُّ ذِى مُلْكٍ رِياءً — وَاَنتَ تُقَاتِلُ الاَعْدَاءَ دِيناً
ہر بادشاہ شہرت اور دکھاوے کے لیے لڑتا ہے — مگر آپ دشمنوں سے مذہب کی خاطر لڑتے ہیں

قَضَيْتَ فريضةَ الاِسلامِ مِنْها — وَصَدَّقْتَ الاَمانِى وَالظُّنُونا
آپ نے اسلام کا فریضہ جہاد ادا کر دیا — اور مسلمانوں کی آرزوئیں اور توقعات کو پورا کر دکھایا

تَهُزُّ مَعاطِفَ القُدْسِ ابْتِهاجًا — وَتَرْضىٰ عَنْكَ مَكَّه والحُجُونا
بیت المقدس کے شانے مسرت سے پھڑک رہے ہیں — اور مکہ اور حجون آپ سے خوش ہیں

فَلَوْ اَنَّ جَماداً يُطِيقُ نُطْقًا — لَنَادَتْكَ ادْخُلُوها آمِنِيْنا
اگر جمادات بولنے کی قدرت رکھتے — تو پکار کر کہتے: "بے خوف و خطر قدس میں داخل ہو جائیے"

---

٥ [illegible]

فصل:3

غازیانِ اِسلام کی سیلابی فتوحات

سلطان صلاح الدین ایوبی کئی راتوں سے آرام نہیں کر سکے تھے، حطین کے معرکے کے اختتام تک وہ اس طرح رہے تھے کہ کئی دنوں سے انہیں اپنا خیمہ لگانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ معرکے کے اختتام پذیر ہونے کے بعد ہی ان کا خیمہ گاڑا گیا تھا۔ مگر اتوار 26 ربیع الثانی 583ھ (5 جولائی 1187ء) کی صبح طلوع ہوئی تو سلطان صلاح الدین ایوبی نمازِ فجر ادا کر کے آمادۂ سفر نظر آئے۔ ان کا خیمہ پھر اکھاڑ لیا گیا اور وہ کچھ فوج کے ساتھ طبریہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ [1]

طبریہ پر قبضہ: انہوں نے اسی دن طبریہ پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ریمنڈ کی بیوی جو کسی بیرونی امداد سے مایوس ہو چکی تھی، فوراً ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئی، اس نے اپنے بال بچوں اور ساتھیوں کے لیے جان کی امان کے وعدے پر قلعہ سلطان کے حوالے کر دیا۔ سلطان نے وعدے کا پورا پورا لحاظ کیا اور وہ اپنے خاندان، رفقاء اور مال و دولت سمیت بحفاظت وہاں سے نکل کر اپنے مقتول شوہر ریمنڈ کے شہر طرابلس چلی گئی۔ [2] سلطان حطین واپس لوٹے اور یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے مقبرے پر حاضری دی۔ وہ قیدیوں کے معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے بادشاہ گائی اور دیگر عیسائی امراء کو قلعۂ دمشق کے والی ناصح الغیدی کی حراست میں دمشق روانہ کر دیا۔ [3]

ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کو سزائے موت: ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز کے جنگجو سلطان کے نزدیک قابلِ معافی نہ تھے، ان کی طبیعت میں اسلام اور مسلمانوں کا بغض کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سلطان نے ان سے کوئی رعایت نہ برتنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اس لیے حکم دیا کہ انہیں ایک جگہ جمع کر کے قتل کر دیا جائے۔

لشکرِ اسلام میں ابھی تک زیادہ تر قیدی سپاہیوں کی تحویل میں تھے۔ ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے قیدی بھی

[1] النوادر السلطانیہ: 131
[2] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، کتاب الروضتین: تحت 583ھ
[3] النوادر السلطانیہ: 131

انہی میں گھل مل گئے تھے۔ سلطان کے بہت سے سپاہی اپنے اپنے قیدیوں کی آزادی کے عوض فدیے کی مناسب رقم کی امید رکھتے تھے، سلطان کی جانب سے یہ اعلان سننے کے بعد بھی انہوں نے اس تحقیق میں دلچسپی نہ لی کہ آیا ان کے ہاتھ آنے والا قیدی مطلوبہ طبقے کا ہے یا نہیں۔ سلطان کو خبر ہوئی تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو سپاہی ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے قیدی لا کر دے گا، اسے فی قیدی 50 مصری دینار دیے جائیں گے۔ اس اعلان کے بعد تھوڑی ہی دیر میں ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کے دو سو قیدی سلطان کی بارگاہ میں حاضر کر دیے گئے۔

سلطان نے ان علماء، صوفیاء اور درویشوں کو بلالیا جو بیت المقدس کی فتح میں ان کے ساتھ تھے اور انہیں پیش کش کی کہ وہ چاہیں تو ایک ایک قیدی کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ کچھ نے موقع غنیمت جان کر اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ کچھ نے اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے معذرت کر لی۔ کچھ نے کسی کو اپنا نائب بنا کر اس کام میں حصہ لیا۔ ان قیدیوں کے سر قلم کرانے کے ساتھ ہی سلطان نے دمشق میں اپنے نائب کو بھی حکم بھیج دیا کہ ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز کا جو بھی قیدی دمشق پہنچے اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔[1]

ٹیمپلرز اور ہاسپٹلرز کے بارے میں سلطان کا یہ سخت رویہ ان کے عام معمول کے خلاف تھا۔ جو لوگ ان تنظیموں کی تاریخ سے ناواقف ہیں وہ سلطان کی اس سختی کو غیر معقول روش یا جذباتی پن سے تعبیر کریں گے مگر حقیقت آگاہ لوگ تسلیم کریں گے کہ سلطان کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ہم ان تنظیموں کی اصلیت کچھ کھول کر بیان کر دیں۔

ان تنظیموں کا ظہور پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کے اواخر میں اس وقت ہوا جب پہلی صلیبی جنگ چھڑی اور صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ قبضے کے بعد اکثر یورپی حکام اپنی فوجوں سمیت واپس چلے گئے۔ پیچھے شہر کی حفاظت کے لیے کوئی فوج تھی نہ خدمات کے لیے کوئی انتظامیہ۔ اس وقت یورپ سے آئے ہوئے کچھ شہزادوں، نوابوں اور سپاہیوں نے رضا کار جماعتوں کی شکل میں خود کو بیت المقدس کی حفاظت کے لیے پیش کر دیا۔ ان میں سے جو عسکری خدمات کے لیے مشہور ہوئے وہ ٹیمپلرز اور جو علاج معالجے اور رفاہی کاموں میں آگے آئے وہ ہاسپٹلرز کہلائے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم بغیر تنخواہ کے شہر کا نظام چلائیں گے۔ یورپ کی حکومتوں نے ان کے ساتھ تعاون کیا اور انھیں بہت مراعات دیں۔ ان کو عموماً نصرانیوں کی سطح مذہبی رضا کار تنظیمیں سمجھا جاتا رہا اور بڑی حد

[1] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، کتاب الروضتین: تحت 583ھ

تک یہ بات درست تھی مگر خوفناک سربستہ راز جو دو صدیوں بعد کھلا، یہ تھا کہ ان کی باگ ڈور چند پس پردہ یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بیت المقدس میں مسجدِ اقصیٰ کے پاس وہاں بنایا جہاں یہود ہیکلِ سلیمانی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ ہیڈ کوارٹر بظاہر گرجا (Church) تھا لیکن اندر کیا ہورہا تھا، یہ پادریوں کو بھی دو سو سال بعد معلوم ہوا۔

ان جنونی کارکنوں نے مقدس مقامات کی حفاظت کے عنوان سے الگ فوجیں بنائیں اور پورے شام میں ساحل کے ساتھ ہر پہاڑ پر ایک قلعہ تعمیر کرلیا۔ رفتہ رفتہ یہ فوجیں یورپ کی تمام فوجوں سے زیادہ مضبوط ہوگئیں۔ ان کے سپاہی متعصب عیسائی تھے لیکن ان کے پس پردہ قائدین نے نظام ایسا بنایا تھا کہ منصب کے اعتبار سے ترقی کر کے اوپر آنے والے صرف ایسے متعصب یہودی ہوتے تھے جو شیطان کی پوجا کرتے تھے۔ دو صدیوں تک اس تنظیم کو نصرانی ہی تصور کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ خفیہ طور پر شیطان کے پجاری تھے اور ہم جنس پرستی سمیت تمام شیطانی کاموں کے عادی تھے۔ یہود کی سرشت کے مطابق یہ لوگ سودخوری اور سرمایہ داری میں بھی طاق تھے۔ بڑے بڑے عیسائی بادشاہ ان سے قرضے لیتے اور ان کی تنظیم کی اعزازی رُکنیت اختیار کرتے تھے۔

چھٹی صدی ہجری میں جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے نصرانیوں سے جہاد شروع کیا تو ٹیمپلرز کی یہ خفیہ کارستانیاں دنیا سے مخفی تھیں مگر سلطان صلاح الدین اللہ کی بخشی ہوئی فراست سے دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ عام نصرانی نہیں ہیں بلکہ کفر و سرکشی میں ہر حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ اس لیے سلطان نے عام عیسائیوں کے ساتھ تو اچھا سلوک کیا، لیکن ٹیمپلرز اور ہاسپٹلرز کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سلطان ایوبی کے سوا سو سال بعد فرانس کے بادشاہ فلپس چہارم نے ان بدبختوں سے تنگ آکر ان کے خلاف تحقیقات کروائیں تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ عیسائی نہیں شیطان کی پوجا کرنے والے یہودی ہیں، تب پورے یورپ میں ان پر پابندی عائد کی گئی اور ان کے بہت سے سرکردہ لوگوں کو قتل کیا گیا۔ [۵]

<u>سلطان کا حیرت انگیز دور اور لائحہ عمل</u> ❁ حطین کے معرکے سے فارغ ہو کر منگل 28 ربیع الثانی (7 جولائی) کو ظہر کے وقت سلطان نے حطین کے گوشے "لوبیا" میں اپنے لشکر کو از سرِ نو مرتب کیا اور بدھ کو صبح سویرے مغرب کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ بحیرۂ روم کا مشہور ساحلی شہر "عکا" ان کا ہدف تھا۔ [۶]

یہاں ہم سلطان کی دور اندیشی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے حطین سے جنوب کی طرف مڑ کر براہ راست القدس تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ <u>ان کے لئے القدس پر حملے میں کوئی رکاوٹ نہ</u>

۵ ٹیمپلرز۔ ہارون یحییٰ: ص 16_40 ۶ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/337

تھی مگر وہ اس سے قبل عقب کو مکمل طور پر محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شام کے شمال اور جنوب میں آباد عیسائی شہروں اور قلعوں کے درمیان رابطہ منقطع کر دیا جائے۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی تھی مشرق سے مغرب کی طرف ایک عسکری حصار کھینچ کر فلسطین کو باقی شام سے کاٹ دیا جاتا۔ چنانچہ سلطان نے یہی کیا۔ انہوں نے حطین سے مغرب کی طرف پیش قدمی کر کے ساحل تک دھاوا بولا اور شمالی وجنوبی شام کا رابطہ ختم کر دیا۔ یہ بہت بڑی جنگی چال تھی جسے اہلِ نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ سلطان معرکۂ القدس سے پہلے ساحلِ شام کے ان بڑے شہروں کو فتح کرنا ضروری سمجھتے تھے جو آئندہ کی متوقع جنگوں میں نصرانیوں کی جوابی کارروائیوں کے مراکز اور یورپ سے اترنے والی فوج کی ''چھاؤنیاں'' بن سکتے تھے۔ اگر ساحل نصرانیوں کے پاس رہتا تو وہ جلد یا بدیر موقع ملتے ہی القدس پر دوبارہ حملہ کر سکتے تھے مگر اس دور اندیش سپہ سالار نے ایسا محتاط طریقہ اختیار کیا جس کی بناء پر القدس کی بازیافت سے پہلے ہی اس کے تمام اطراف خطرات سے محفوظ ہو گئے۔ سلطان کے اس لائحہ عمل کے نتیجے میں کفار آٹھ صدیوں تک القدس کو اپنے قبضے میں نہ لے سکے۔ فتح القدس کے بعد سلطان ایوبی کی زندگی میں وہ پانچ برس تک ان سے آمادۂ پیکار رہے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں سے پون صدی تک لڑے بھڑتے رہے مگر اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ القدس کے گرد اسلامی شہروں کی چوطرفہ دیواریں سربلند اور مجاہدین اسلام کی شمشیریں بے نیام رہیں۔ جب تک مسلمانوں نے خود تلوار نیام میں نہ ڈال دی، کفار اس پر دوبارہ قبضے کی جرأت نہ کر سکے۔

عکا کی فتح: ساحلِ شام کی طرف اس لشکر کشی میں بھی مدینہ منورہ کے امیر قاسم ابن المہنا الحسینی سلطان کے ہم رکاب تھے۔ آخر عکا کی بلند فصیل اور اس پر لہراتے صلیبی پرچم نظر آنے لگے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی افواج مختلف پہاڑیوں سے اتریں اور شہر کا محاصرہ شروع کر دیا۔ کاتب عماد اصفہانی کہتے ہیں:

''فصیل پر مزاحمت کرنے والے جمع ہو چکے تھے مگر ان کے پرچموں کی پھڑ پھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ ان کے دلوں پر کپکپی طاری ہے اور روح پرواز کرنے کو ہے۔''[1]

سلطان کا خیمہ شہر کے قریب ایک ٹیلے پر نصب کر دیا گیا۔ نشیب میں سلطان کی فوج دور دور تک پھیل گئی۔ یہ بات یقینی تھی کہ شہر والے مزاحمت نہیں کر سکیں گے، اس لیے سلطان کے ارد گرد موجود رفقاء اور امراء بے فکر نظر آرہے تھے۔ تاہم سلطان سنجیدگی سے ان کے درمیان بیٹھے کل اور اس کے بعد کی لڑائیوں کی حکمت عملی پر غور کر رہے تھے۔ خاصی دیر وہ سپاہ وافسران کو حوصلہ دلاتے رہے، ان سے

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/338

تجاویز لے کر ان پر بحث کرتے رہے۔ کھلے ماحول میں مشورہ سلطان کی محفلوں کی ایک خصوصیت تھی جس سے ہر معاملے کے اچھے برے پہلو خوب واضح ہوجاتے تھے اور غلطیوں کا امکان کم سے کم رہ جاتا تھا۔ سلطان کے بعض رفقاء انہیں عسکری امور کے بارے میں مشورہ دے رہے تھے، بعض ان سے عہدِ وفاداری کی تجدید کررہے تھے، کچھ انہیں دعائیں دے کر اظہارِ محبت کررہے تھے۔ کچھ انہیں مزید فتوحات کی خوشخبری دے رہے تھے۔ [1]

اگلے دن جمعرات کو سلطان ایوبی گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کے ساتھ فصیل شہر کی طرف بڑھے اور صفیں آراستہ کردیں۔ اردگرد کے ٹیلوں پر بھی مسلمان سپاہی نظر آرہے تھے، عکا کے باشندوں میں مزاحمت کی قوت نہیں تھی، وہ امان طلب کرتے ہوئے شہر سے باہر نکل آئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ مسلمان ان کے خون سے ضرور ہاتھ رنگیں گے مگر سلطان کا عفو و کرم دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ سلطان نے عیسائی عوام کو جان و مال کے تحفظ کا یقین دلایا اور اجازت دی کہ جو لوگ شہر میں رہنا چاہتے ہیں خوشی سے رہیں اور جو کہیں اور منتقل ہونا چاہتے ہیں امن و امان سے چلے جائیں۔ وہ جو کچھ ساتھ لے جاسکتے ہیں وہ بھی لے جائیں۔ البتہ جو وہ چھوڑ جائیں گے وہ مسلمانوں کا ہوگا۔

سلطان کی اس فراخدلانہ پیش کش کے بعد عکا کی اکثر آبادی نے قریبی عیسائی ریاستوں میں نقل مکانی کو ترجیح دی، وہ زیادہ ترقیمتی ساز و سامان اور سونا چاندی لے گئے، تاہم جو کچھ شہر میں رہ گیا تھا، وہ بھی کم نہیں تھا۔

اب سلطان کے سپاہی شہر میں داخل ہوئے، ان کے سپاہیوں نے ہر محلے میں نیزے گاڑ کر فصیلوں پر اسلامی پرچم نصب کردیے۔ سلطان نے شہر کی ولایت اپنے بڑے بیٹے الملک الافضل کو سونپ دی۔ شہر میں اب بھی اجناس کی شکل میں بے حساب دولت تھی۔ یہ شہر مقامی نصرانیوں اور یورپ کے تاجروں کا اہم تجارتی و اقتصادی مرکز تھا، ان تاجروں نے بازار کی مندی کے باعث اموال تجارت کے بے پناہ ذخائر یہاں جمع کر رکھے تھے، اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر ٹیمپلرز کے ان جنگجوؤں کا بڑا گڑھ تھا جو حطین کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ ان کی جائدادیں جو یہاں رہ گئی تھیں سلطان نے فقیہ عیسیٰ کے نام کردیں۔ اس کے ساتھ ہی فقیہ کو شہر کے تمام سرکاری ذخیروں، گوداموں اور اثاثوں کو تحویل میں لینے اور مدفون ذخائر و خزائن کی تلاشی کا حکم دیا۔

اس سرگرمی کے نتیجے میں عکا سے سونے چاندی، جواہر، اسلحے، شکر، اناج اور دیگر ساز و سامان کے

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 339/3

اتنے ذخائر ہاتھ لگے کہ فوج کے غریب سپاہی بھی مالدار ہو گئے۔ الملک الافضل کی سخاوت طبع کے باعث یہ ذخائر سپاہیوں ہی میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔ غالباً انہیں یہ رخصت بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاتھ جو لگے وہ اسے اپنی ملکیت میں لے سکتے ہیں۔

شیخ عماد اصفہانی اس قدر سخاوت کو غیر مناسب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اس مال و دولت کو فوج میں تقسیم کرنے کی بجائے بیت المال کے لیے محفوظ کر لیا جاتا تو سلطنت کے اہم امور اور ناگہانی مسائل میں یہ سرمایہ بہت کام دے سکتا تھا۔ [1]

بہر حال یہ فیصلہ اس لحاظ سے ٹھیک تھا کہ مسلسل جنگوں اور مہمات کے تھکے ہارے سپاہیوں میں اس کرم نوازی نے ایک نئی جان ڈال دی۔ عکا سے چار ہزار کے لگ بھگ مسلمان قیدی بھی بازیاب کرائے گئے تھے، ان کے چہرے قید و بند کی اذیتوں سے جھلسے ہوئے تھے مگر آزاد ہو کر دار الکفر کو دار الاسلام میں بدلتا دیکھنے کے بعد وہ ہر غم اور صدمے کو بھول چکے تھے۔ [2]

جمعہ یکم جمادی الاولیٰ 583ھ (9 جولائی 1187ء) کو سلطان فاتحانہ انداز میں عکا میں داخل ہوئے۔ اسی دن سلطان کے وزیر اعظم قاضی فاضل بھی دمشق سے یہاں پہنچ گئے تھے۔ شہر کی قدیم جامع مسجد جسے نصرانیوں نے گرجا بنا لیا تھا، ایک بار پھر سجدوں سے آباد ہوئی۔ یہاں منبر نصب کیا گیا اور فقیہ جمال الدین عبداللطیف نے خطبہ دیا۔ سلطان نے ان کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔ نصرانیوں کے قبضے سے لے کر اس وقت تک 90 برس میں یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو شام کے ساحلی شہروں میں ادا کی گئی تھی۔ سلطان نے عکا کی قضا اور خطابت کے مناصب فقیہ جمال الدین کے سپرد کر دیے۔ [3]

<u>الملک العادل کی آمد</u>: سلطان نے عکا میں چند دن قیام کے بعد کوچ کر دیا، اس دوران فتح حطین کی خوشخبری مصر پہنچ چکی تھی، سلطان نے اپنے بھائی الملک العادل کو فی الفور شام کی طرف یلغار کرتے ہوئے شام و مصر کی سرحد پر واقع عیسائی قلعوں کے محاصرے کا حکم دے دیا تھا۔ الملک العادل کے سپاہیوں کا ایک بڑا حصہ اس مہم کے آغاز ہی سے شام آکر سلطان کے پرچم تلے لڑ رہا تھا۔ اب سلطان کا حکم ملتے ہی الملک العادل باقی ماندہ فوج کے ساتھ مصر کی جانب سے نصرانیوں کی سرحدی علاقوں پر ٹوٹ پڑا اور نصرانیوں کا اہم قلعہ ''مجدل یابا'' فتح کر لیا۔ سلطان کو یہ خوشخبری ملی تو انہوں نے الملک العادل کو تاکید کی کہ وہ شام و مصر کی سرحد پر پڑاؤ ڈال دے اور وہاں مصر سے مزید سپاہیوں اور رضا کار

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ فصل فی فتح عکا
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ فصل فی فتح عکا
[3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ فصل فی فتح عکا

مجاہدین کو جمع کرے۔ "مجدل یابا" کے بعد العادل نے نصرانیوں کے اہم ساحلی شہر یافا پر حملہ کیا اور اسے بزورِ شمشیر فتح کر کے عیسائی مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد کو قیدی بنالیا۔

اب سلطان کے لیے القدس تک راستہ بالکل ہموار تھا۔ حطین کے معرکے میں بڑے بڑے عیسائی جرنیلوں کے قتل اور گرفتاری سے ان کی قیادت کا صفایا ہو چکا تھا لہٰذا کوئی ایسا قائد دور دور تک نظر نہیں آتا تھا جو نصرانیوں کو حوصلہ دلاتا یا انہیں مجتمع کرتا۔ ویسے بھی حطین میں شام کے نصرانیوں کی طاقت کا جنازہ نکلنے کے بعد نصرانیوں کے قلعوں اور شہروں میں صرف وہی سپاہی رہ گئے تھے جو حفاظتی امور پر مقرر تھے۔ عکا اور یافا کی فتح کے بعد اکثر عیسائی صلح کو ترجیح دے رہے تھے لہٰذا سلطان کو کسی جوابی حملے کا خطرہ نہیں تھا۔

سلطان صلاح الدین عکا سے آگے بڑھے تو ان کا لشکر ایک سیلاب کی طرح راہ میں آنے والے ہر قلعے، فصیل اور شہر کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا گیا۔ مہینوں کی فتوحات دنوں میں حاصل ہوتی چلی گئیں، اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہر ہر قدم پر شاملِ حال نظر آتی رہی، دشمنانِ اسلام کے دلوں پر مجاہدینِ اسلام کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا تھا۔

نصرانیوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اپنے حکمرانوں کے ظلم و تشدد سے نالاں تھے، غریبوں کی اکثریت حکام کے جبر و جور تلے پستی چلی آرہی تھی۔ یہ لوگ ایک وقتی جوش کے تحت مسلمانوں کی مخالفت میں اپنے حکمرانوں کے گرد جمع ہو گئے تھے مگر اب وہ مسلمانوں کے اس حسن سلوک کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس کی متعصب عیسائی معاشرے میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ ان علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بھی آباد تھے۔ ساڑھے پانچ صدیوں تک یہ علاقے ان کے رہے تھے مگر گزشتہ 90 سالوں سے وہ نصرانیوں کے ماتحت تھے۔ سقوطِ القدس کے بعد ان کی تیسری نسل نصرانیوں کی غلامی میں تھی۔ یہ لوگ اس امید پر زندہ تھے کہ کبھی ان کے مسلمان بھائی آکر انہیں کفار کی غلامی سے آزاد کرائیں گے۔ سلطان کی فاتحانہ آمد پر ان بے کسوں کی مسرت و سرشاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ ان کی زندگی کے سب سے مسرت انگیز دن تھے جب وہ اہلِ تثلیث کی غلامی سے آزاد ہو کر توحید کے پرچم تلے جمع ہو رہے تھے۔ [1]

فتوحات ہی فتوحات ❊ عکا سے اگلے قدم پر سلطان نے اپنے لشکر کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ مسلمان الگ الگ راستوں سے یلغار کرتے ہوئے ہر فصیل بند بستی اور شہر پر قبضہ کرتے چلے گئے، ہر فتح میں مالِ غنیمت کے انبار لگ رہے تھے، جنگی قیدیوں کی قطاریں چلی آرہی تھیں۔ "خولہ" "طیمپل" (داویہ)

[1] کتاب الروضتین: جلد 2، ص 583، فصل فی فتح ...

کے جنگجوؤں کا اہم قلعہ تھا، انہوں نے قلعے سے نکل کر سلطان کے سپاہیوں کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور سب کے سب مارے گئے۔ صرف ان کے غلاموں اور نچلے طبقے کے ماتحت لوگوں کو زندہ چھوڑا گیا۔

عکا اور طبریہ کے نواح میں بیسان، دبوریہ، جنین، طور، زرعین، اللجون، القیمون، الزیب، معلیا، البعنہ، منواث اور اسکندرونہ جیسے قلعے دیکھتے ہی دیکھتے فتح ہو گئے۔ سلطان کے مایہ ناز جرنیل تقی الدین عمر نے ''تبنین'' اور ''صور'' کی ناکہ بندی کر کے وہاں سے فرنگیوں کی کمک اور رسد کا راستہ مسدود کر دیا۔ مغوریہ جیسے اہم شہر کو جس کے باہر حطین کے صلیبی لشکر کی چھاؤنی تھی، نصرانیوں نے سلطان کے خوف سے از خود خالی کر دیا۔ ادھر مظفر الدین کو کبری ناصرہ پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر لیا۔[1]

<u>فلسطین کی فتح</u>:- سلطان کے دو اور سالاروں بدر الدین دلدرم اور غرس الدین قلیج نے فلسطین تک یلغار کی اور ساحلی شہر قیساریہ پر آن کی آن میں قبضہ کر لیا۔ حیفا اور ارسوف جیسے آباد اور دولت مند شہر بھی کسی پس و پیش کے بغیر ان کے آگے سرنگوں ہو گئے۔

سلطان کا بھانجا حسام الدین فلسطین کے اہم شہر نابلس کو فتح کرنے پر مامور تھا جس کی اکثر آبادی مسلمان تھی۔ اسے خود نابلس کے مقامی مسلمانوں نے بلایا تھا۔ جب یہاں کی عیسائی آبادی کو مسلمانوں کی پے در پے فتوحات کا علم ہوا تو ایک کہرام مچ گیا اور انہیں مسلم اکثریت والے اپنے شہر میں رہنا خطرناک محسوس ہوا، چنانچہ اکثر عیسائی شہر چھوڑ کر چلے گئے جبکہ بہت سے عیسائی مقامی فوج کے ساتھ قلعے میں محصور ہو گئے۔ مقامی مسلمانوں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور مفرور نصرانیوں کے مال و متاع اور جانوروں پر قبضہ کر لیا، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے قلعے کی ناکہ بندی بھی کر لی اور سلطان ایوبی کو فوری پیغام بھیجا کہ وہ حسام الدین کو یہاں بھیج دیں کیونکہ مقامی مسلمانوں میں اس نوجوان کے کارناموں کی خاصی شہرت حاصل تھی۔

حسام الدین اپنے لشکر کے ساتھ نابلس کی طرف بڑھا تو پہلے ''سبسطیہ'' نامی بستی سے گزرا۔ یہ بستی حضرت زکریا علیہ السلام کی شہادت گاہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ یہ مقام اسلامی دور میں بھی غیر معمولی شرف و احترام کا حامل اور معروف زیارت گاہ تھا مگر نصرانیوں نے اپنے دور حکومت میں یہاں ایک بہت بڑا گرجا بنا لیا تھا، شہادت گاہ کو خوبصورت پردوں اور سونے چاندی کی جالیوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ عیسائی دور دور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ پادریوں کی طرف سے پابندی تھی کہ ہر زائر کوئی نہ کوئی قیمتی ہدیہ پیش کرے، اس طرح یہ زیارت گاہ ان کے لیے آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔

حسام الدین یہاں پہنچا تو اس زیارت گاہ کو نصرانیوں کی تحویل سے لے کر اس کے اصل وارثوں کے

---

[1] حرب ارمین، تحت 583ھ فصل فی فتح نابلس

سپرد کر دیا۔ شہادت گاہ کو زیارت کے لیے عام کھول دیا گیا اور عمارت میں قبلہ رخ محراب بنا کر نماز کا اہتمام شروع کیا گیا۔

اس کے بعد حسام الدین نابلس کی طرف بڑھا۔ شہر کے دروازے کھلے تھے، عیسائی فوج قلعے میں پناہ گزیں تھی، حسام الدین نے محاصرہ کیا تو انہوں نے جان کی امان پر ہتھیار ڈال دیے۔ حسام الدین نے جان بخشی کے ساتھ ساتھ ان کی جائداد اور مال و دولت سے بھی کوئی سروکار نہ رکھا۔ سلطان صلاح الدین نے نابلس اور اس کے نواحی قلعوں اور بستیوں کو جاگیر کے طور پر حسام الدین کے نام کر دیا۔ مرتے دم تک حسام الدین یہاں کا جاگیردار رہا۔ [1]

تبنین کی فتح: ادھر تقی الدین عمر نے آگے بڑھ کر دمشق اور صور کے درمیان واقع تبنین کا محاصرہ کر لیا تھا، یہ مضبوط قلعہ ایک پہاڑ پر واقع تھا اور اسے فتح کرنا آسان نہ تھا۔ قاضی ابن شداد کے بقول یہاں کے لوگ بڑے دلیر، جنگجو اور کٹر مذہب پرست تھے، اس لیے شدید مزاحمت کر رہے تھے۔ تقی الدین عمر نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ مسلمانوں کی طوفانی فتوحات کا ریلا یہاں آ کر تھم سکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو نصرانیوں کو تیاری کا موقع مل جائے گا۔ اس نے بلا تاخیر سلطان کو مراسلہ بھیج کر بذاتِ خود اس محاذ پر آنے کی ضرورت کا احساس دلایا، سلطان نے مراسلہ ملتے ہی 8 جمادی الاولیٰ 583ھ کو تبنین کی طرف کوچ کیا اور تین دن کے سفر کے بعد 11 جمادی الاولیٰ (19 جولائی) کو اپنی زیر کمان فوج کے ساتھ محاذ پر پہنچ گئے۔ اب سخت ترین محاصرہ اور بھرپور حملہ شروع ہوا۔ سلطان ایوبی کی بذاتِ خود آمد نے اہل قلعہ پر دہشت طاری کر دی تھی انہوں نے جنگ کی شدت کم کرانے اور مسلمانوں کو نرمانے کے لیے اپنے قید خانے سے 100 مسلمان قیدیوں کو رہا کر کے سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ دراصل انہیں یقین تھا کہ آج نہیں تو کل قلعہ بزورِ شمشیر فتح کر لیا جائے گا اور تب جان کی امان ملنا بھی یقینی نہ ہوگا۔ قیدیوں کی رہائی سلطان کے لیے خوشی کا باعث بنی، انہوں نے ان کو اپنے پاس بلوایا، انہیں نیا لباس اور زادِ راہ دیا تاکہ وہ سہولت سے اپنے ملکوں اور گھروں تک پہنچ جائیں۔ پانچ دن بعد محصور نصرانیوں کی ہمت بالکل جواب دے گئی۔ انہوں نے سلطان سے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا اور جان کی امان کی شرط پر پانچ دن کے اندر ہتھیار ڈالنا اور شہر خالی کرنا قبول کر لیا۔ سلطان نے انہیں مہلت دے دی۔ طے یہ ہوا کہ عیسائی اپنے اسلحے، مویشی اور دولت کو یہیں چھوڑ جائیں گے اور مسلمان انہیں آرام سے نکلنے کا موقع دیں گے۔ پانچ دن تک عیسائی نقل مکانی کرتے رہے۔ جب شہر خالی ہو گیا تو سلطان نے ان بے گھر

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ 583ھ فصل فی فتح نابلس

نصرانیوں کا اتنا لحاظ کیا کہ انہیں محافظ سپاہیوں کی نگرانی میں سہولت کے ساتھ ''صور'' پہنچا دیا جو ایک بڑا ساحلی شہر تھا جہاں وہ اطمینان سے رہ سکتے تھے۔ [1] ......18 جمادی الاولیٰ کو سلطانی لشکر فاتحانہ شان سے تبنین میں داخل ہو گیا۔

صیدا اور بیروت ٭ سلطان کا اگلا ہدف مشہور ساحلی شہر، صیدا تھا۔ سلطان نے اس پر حملے کے لیے شمال کی طرف یلغار کی، راستے میں پھولوں اور پھلوں سے لدا ہوا سرسبز و شاداب شہر ''صرفند'' کسی لڑائی کے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ 20 جمادی الاولیٰ 583ھ کو سلطان ''صیدا'' کی فصیل کے سامنے کھڑے تھے۔ شہر کی دوسری جانب بحیرۂ روم تھا جس کی لہروں کو چھو کر آنے والی ٹھنڈی ہوائیں اسلامی لشکر کا استقبال کر رہی تھیں۔ شہر کا حاکم گھبرا کر فرار ہو گیا تھا اور مسلمانوں سے مزاحمت کے لیے کوئی طاقت سامنے نہ تھی۔ چنانچہ اگلے دن یعنی بدھ 21 جمادی الاولیٰ (29 جولائی) کو علی الصبح شہر کے معززین نے حاضر ہو کر شہر کی چابیاں خدمت سلطانی میں پیش کر دیں۔ لشکر اسلام کا نارنجی جھنڈا صیدا کی بلند فصیل اور برجوں پر لہرا دیا گیا۔ سلطان ایوبی نے یہاں بالکل قیام نہ کیا اور فوراً شمال کی طرف ساحل کے ساتھ ساتھ مزید آگے بڑھے اور ایک دن رات میں صیدا سے بیروت پہنچ گئے جو علامہ ابن اثیر کے بقول شام کے ساحلی شہروں میں سب سے مستحکم، پاک صاف، پررونق اور خوبصورت شہر تھا۔ اس شہر کی فصیل آسمان سے باتیں کر رہی تھی جس پر مسلح افراد کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ان کا ہتھیار ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انہیں اپنی قوت اور شہر کے مضبوط دفاعی نظام پر بھروسہ تھا اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ کئی سال پہلے ایک بار اس شہر پر سلطان کی فوج کشی ناکام ہو چکی تھی تاہم اس بار سلطان کے تیور مختلف تھے۔ انہوں نے شہر پر پے در پے حملے شروع کیے، اہل شہر دفاعی لڑائی لڑتے رہے مگر وہ سلطان کا عزم تبدیل نہ کر سکے۔ زبردست جنگ جاری رہی۔ سلطان کسی وقفے کے بغیر ایک کے بعد ایک دستے کو حملے کے لیے آگے بڑھاتے رہے۔

ایک ہفتے تک یہ سلسلہ چلتا رہا، محصورین ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے مگر آٹھویں دن جنگ کے دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ مسلمان ایک جانب سے شہر پر قابض ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ افواہ مسلمانوں نے ہی پھیلائی ہو کیوں کہ عین اس وقت جبکہ عیسائی یہ خبر سن رہے تھے، شہر کے ایک گوشے سے زبردست نعروں، شور شرابے اور چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نصرانیوں کے حواس جواب دے گئے تاہم ان کے چند ہوش مند افراد نے خبر کی تصدیق کے لیے مخبروں کو اس جانب روانہ کیا، انہوں نے واپس آ کر بتایا

[1] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، کتاب الروضتین: تحت 583ھ فصل فی فتح تبنین

کہ خبر جھوٹی ہے۔ شہر کا ہر گوشہ محفوظ ہے۔ مگر اتنی دیر میں افواہ ہر طرف پھیل چکی تھی، بدحواسی میں عیسائی ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اور ہتھیار ڈالنے یا نہ ڈالنے کے اختلاف سے خود ان کے درمیان تلوار چلنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، یہ دیکھ کر شہر کے عمائد نے شہر سلطان کے حوالے کر دینے ہی میں عافیت سمجھی۔ [1] ......یہ واقعہ جمعرات 29 جمادی الاولیٰ 583ھ (6/اگست 1187ء) کا ہے۔ سلطان کے کاتب عماد اصفہانی نے جوان دنوں بیمار پڑ گئے تھے، صلح بیروت کا مسودہ تحریر کیا اور سلطان نے انھیں رخصت دے کر علاج کے لیے دمشق واپس بھیج دیا۔ [2]

بیروت کے محاصرے کے دوران ہی ''جبیل'' بھی فتح ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ جبیل کے حاکم ''اوک'' نے جو حطین کی لڑائی میں گرفتار ہو کر دمشق کے قید خانے میں زندگی بسر کر رہا تھا، مسلمانوں کو پیش کش کی کہ اگر اسے آزاد کر دیا جائے تو وہ جبیل ان کے حوالے کرا دے گا۔ یہ پیش کش سلطان کو پہنچی تو اسے دمشق کی جیل سے بلوا لیا۔ بیروت کے محاصرے کے دوران یہ سخت پہرے میں سلطان کی خدمت میں لایا گیا۔ سلطان نے اس سے براہ راست بات چیت کی اور پھر اپنے نمائندے جبیل بھیج کر شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر حاکم کو وعدے کے مطابق رہا کر دیا گیا۔

صیدا، بیروت اور جبیل مسلم اکثریتی شہر تھے۔ ان کی فتح نے مقامی مسلمانوں کو جو 90 سال سے ذلت و مسکنت کی زندگی گزار رہے تھے از سر نو عزت بخشی۔ غلامی سے آزادی کے بعد اب وہ ایک نئی صبح کا نظارہ کر رہے تھے جس میں مسلمانوں کی عظمت کا آفتاب ایک بار پھر بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ [3]

صور کا قضیہ ❊ شام کے ساحلی شہروں میں اب صرف صور اور عسقلان باقی رہ گئے تھے جو نصرانیوں کی مدافعانہ سرگرمیوں کے مراکز اور یورپ سے آنے والی افواج کے لیے محفوظ چھاؤنی ثابت ہو سکتے تھے۔ بچے کھچے زیادہ تر عیسائی ہر طرف سے سمٹ کر صور میں جمع ہو رہے تھے جو سمندر کے اندر ایک جزیرہ نما کی طرح تھا اور اس کی فصیل بھی غیر معمولی طور پر وسیع اور بلند تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی جو القدس پر فیصلہ کن حملے سے پہلے ساحل کے تمام عیسائی مورچوں کو مسمار کرنا ضروری سمجھتے تھے ''صور'' کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے مگر اس کے جغرافیائی استحکام کے پیش نظر جانتے تھے کہ یہاں قبضہ کرنے میں زیادہ وقت صرف ہو سکتا ہے لہٰذا پہلے وہ ارد گرد کے ساحلی شہر فتح کرتے رہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ صور اپنی بہترین حفاظتی فصیل اور مضبوط قلعے کے باوجود کسی مرتب پیشہ ور فوج اور قائد سے خالی ہے۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ
[2] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، کتاب الروضتین تحت 583ھ، فصل فی فتح صیدا و بیروت
[3] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، کتاب الروضتین: تحت 583ھ فصل فی فتح صیدا و بیروت

یہاں صرف پناہ گزین تھے یا لٹے پٹے شکست خوردہ سپاہی۔ یہ صور کب تک حفاظت کر سکتے تھے۔ اس لیے اس کی مہم مؤخر کرنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بہر کیف جمادی الاولیٰ 583ھ کے اختتام تک سلطان کی سپاہ صور کے دائیں بائیں پوری ساحلی پٹی پر قابض ہو چکی تھی اور اب ان کا اگلا ہدف لازماً صور ہی تھا۔ ۞

کونرڈ مارکوئیس عکا کے ساحل پر: مگر سلطان ایوبی کے صور پر حملے سے پہلے اچانک وہ ہو گیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ ایک جنگجو سالار اپنے سپاہیوں کے ساتھ اچانک ساحل پر آ نکلا اور اس نے صور کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں جانے سے بچا لیا۔ اس کا نام کونرڈ تھا۔ وہ نواب مانسٹریٹ، مارکوئیس کا بیٹا تھا۔ تاریخ میں وہ کونرڈ مارکوئیس آف مونٹ فرٹ یا مارکوئیس آف مانسٹریٹ کے لقب سے مشہور ہوا۔ عرب مؤرخین اسے مرکیس یا مرکیش کہتے ہیں حالانکہ مارکیس اس کے باپ کا نام تھا۔ کونرڈ ایک خودغرض انسان اور مکار جنگجو تھا۔ یورپی مؤرخ کہتے ہیں کہ بہادری کے سوا اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ اس کا تعلق قسطنطنیہ کی بازنطینی سلطنت سے تھا۔ اٹلی کے خلاف جنگوں میں اس نے بڑی شہرت پائی تھی۔ پھر وہ قیصر آئزک دی اینجل (اسحٰق فرشتہ صفت) کا بہنوئی بن گیا۔ اس کا باپ مارکوئیس جو شام میں مسلمانوں سے مذہبی لڑائیوں میں بڑے جوش و جذبے سے شریک رہتا تھا کچھ دنوں پہلے حطین کے معرکے میں گرفتار ہو چکا تھا مگر کونرڈ مارکوئیس کو اپنے باپ کی گرفتاری کا علم نہ تھا۔ وہ اپنے ملک میں سیاسی داؤ کھیل کر کوئی بڑا ہاتھ مارنے کی کوشش کرتا رہا پھر ناکامیوں سے تنگ آ کر اس نے قسطنطنیہ چھوڑ دیا۔ اب وہ القدس کی زیارت کے لیے شام آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تجارت کے ذریعے مال و دولت بھی کمانا چاہتا تھا، چنانچہ جب وہ شام روانہ ہوا تو تجارتی سامان کے انبار اس کے بیڑے پر لدے تھے۔ کونرڈ کے ساتھ زائرین کے علاوہ پیشہ ور سپاہی بھی تھے۔

یہ لوگ کسی جنگی مہم پر نہیں نکلے تھے مگر کونرڈ کو معلوم تھا کہ شام میں سلطان صلاح الدین کا نام عیسائی ریاستوں کے خاتمے کا عنوان بن چکا ہے لہٰذا وہ اپنے ہم مذہبوں کی مدافعت کے لیے فکرمند بھی تھا۔ البتہ ساحل تک پہنچتے پہنچتے اسے یہ علم نہیں تھا کہ سلطان کی حالیہ فوج کشی نے ساحل کا سیاسی جغرافیہ کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ وہ عیسائی امراء کے دستور کے مطابق پہلے القدس کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے بیڑے کو عکا کے ساحل پر لے آیا۔ شامی نصرانیوں کی عادت تھی کہ وہ یورپ سے آنے والے سپاہیوں، تاجروں اور زائرین یروشلم کا بگل اور نقارے بجا کر ساحل پر بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے مگر جب کونرڈ کا بیڑا عکا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو اس کے استقبال کے لیے کوئی نہ نکلا۔ جو لوگ ساحل پر

۞ ایضاً

نظر آرہے تھے ان کی وضع قطع بھی الگ تھی۔ گرجوں کی گھنٹیاں بھی خاموش تھیں۔ یہ دیکھ کر کونرڈ کا ماتھا ٹھنکا۔ تاہم وہ حقیقتِ حال سے واقف نہ ہوسکا۔ ادھر عکا میں سلطان کے نائب الملک الافضل نے بندرگاہ کے پاس غیر ملکی جہاز لنگر انداز دیکھا تو اس کی خبر لینے آدمی بھیجے جو کشتی میں بیٹھ کر جہاز تک پہنچے اور کونرڈ سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ کونرڈ نے اپنا تعارف کرانے کے بعد ان سے عکا میں خلافِ معمول خاموشی کی وجہ پوچھی۔ مسلمانوں نے بتایا کہ حطین کے میدان میں عیسائی شکست فاش کھا چکے ہیں۔ شاہ یروشلم اور بڑے بڑے صلیبی امراء دمشق کے قید خانے میں ہیں، عسقلان اور صور کے سوا تمام ساحلی پٹی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ عکا بھی ان کے پاس ہے اور اب وہ القدس پر حملہ کرنے والے ہیں۔

الملک الافضل کے اہلکار جب ایک غیر ملکی کو یہ حقائق صاف صاف بتا رہے تھے تو انہیں اس بات کا وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ان کی صاف گوئی کا نتیجہ کتنا خطرناک نکلے گا۔ وہ اس جہاز کو ایک عام تجارتی جہاز اور کونرڈ کو محض ایک تاجر سمجھ رہے تھے۔ شاید اس بے احتیاطی کے پیچھے اپنی فتوحات کا کچھ زعم بھی کارفرما ہوگا، تب ہی وہ کسی غیر ملکی کے ساتھ ایسی بے فکری برت رہے تھے۔

مگر کونرڈ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اس نے حالات کی نزاکت کا اندازہ لگا کر فیصلہ کر لیا کہ اسے فوراً لنگر اٹھا کر یہاں سے قریب تر عیسائی شہر صور پہنچنا چاہیے۔ مگر خاصی دیر سے سمندری ہوا رکی ہوئی تھی۔ ایسے میں بادبان کام نہیں دے سکتے تھے لہٰذا سفر ممکن نہ تھا۔ کونرڈ یہ بھی جانتا تھا کہ بندرگاہ پر اترنے میں اس کا تذبذب مسلمانوں کو چوکنا کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے نمائندوں کے ذریعے الملک الافضل سے بات چیت جاری رکھی اور ساتھ ساتھ سمندری ہوا کے چلنے کا انتظار کرتا رہا۔

بات چیت کے پہلے مرحلے میں اس کے قاصد نے الملک الافضل سے مال ومتاع سمیت شہر میں داخلے کی اجازت اور امن وامان کی ضمانت طلب کی۔ الملک الافضل کی جانب سے مثبت جواب ملا۔ کونرڈ نے اس پر خواہ مخواہ شک کا اظہار کرتے ہوئے کہلوایا کہ وہ الملک الافضل کے ہاتھ کی تحریری ضمانت کے سوا کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اس طرح وہ وقت گزاری کے لیے مختلف ضمانتیں طلب کرتا رہا۔ الملک الافضل ان پر غور کر کے اپنا جواب بھیجتا رہا۔ اس کی جگہ اگر یہاں تقی الدین عمر یا الملک العادل ہوتے تو ضرور چونک کر فرنگی جہاز کی نگرانی شروع کرا دیتے مگر سادہ مزاج اور پرجوش الافضل کو دیر تک کوئی شک وشبہ نہ ہوا۔ ابھی نامہ وپیام کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ سمندری ہوا چل پڑی۔ کونرڈ نے فوراً لنگر اٹھوایا، بادبان کھلوائے اور اپنے بیڑے کا رخ صور کی طرف پھیر دیا۔ الملک الافضل کو اطلاع ہوئی تو جنگی کشتیاں

تو تب میں روانہ کیں مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ کونرڈ ہاتھ نہ آیا اور بحفاظت صور کی بندرگاہ پر اتر گیا۔ ●

ادھر سلطان صلاح الدین خشکی کی جانب سے صور کا محاصرہ کر چکے تھے۔ اس گنجان شہر میں اگرچہ ہزاروں مسلح لوگ موجود تھے مگر کسی قائد کی عدم موجودگی میں وہ مزاحمت سے مایوس تھے اور سلطان سے رابطہ کر کے شہر حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب کونرڈ اپنے جہاز کے ساتھ وہاں اترا تو ان میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس نامور سپاہی کا خیر مقدم کیا۔ صور میں شام کے ان کئی شہروں اور درجنوں دیہاتوں کے پناہ گزین جمع تھے جنہیں سلطان نے حال ہی میں فتح کیا تھا اور پھر فراخ دلی کے ساتھ عیسائیوں کو وہیں بسے رہنے یا کسی اور شہر چلے جانے کی اجازت دی تھی، ان کی اکثریت نے صور کو ترجیح دی تھی اور سلطان نے انہیں ان کے مال و اسباب سمیت بحفاظت صور پہنچانے کا اہتمام بھی کیا تھا۔ اب یہی احسان فراموش لوگ کونرڈ کے گرد جمع ہو کر سلطان کے خلاف لڑنے پر تل گئے۔

کونرڈ نے اہل شہر کو یقین دلایا کہ وہ ان کی حفاظت کر کے دکھائے گا تاہم اس نے یہ شرط عائد کی کہ صور اور اس کے نواحی اضلاع کا حاکم وہی ہوگا۔ لوگوں نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ کونرڈ نے اپنا تجارتی سرمایہ شہر کے دفاعی انتظامات اور لوگوں کی ضروریات پر صرف کر دیا۔ شہر کی خندقیں دوبارہ گہری کر کے کھودی گئیں۔ فصیل کی مرمت کا کام شروع ہوا اور اسے پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیا گیا۔ سلطان ایوبی نے محصورین کا تازہ جوش و خروش دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اب اس شہر کی فتح میں کئی ماہ بیت سکتے ہیں جبکہ اس مدت میں دوسرے اہم ترین ساحلی شہر عسقلان پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان ایوبی کو القدس کی جنگ میں یورپی طاقتوں کی طرف سے مداخلت کا شدید خدشہ لاحق تھا۔ صور میں کونرڈ کی مورچہ بندی کے بعد یہ خطرہ مزید قوی ہو گیا تھا۔ آخر سلطان نے صور کے محاصرے میں مزید وقت ضائع نہ کرنے پر غور شروع کر دیا، اس لیے کہ اگر محاصرہ طویل ہو جاتا تو اتنے میں یورپ کی افواج صور پہنچ جاتیں اور بیت المقدس کی فتح کا مسئلہ مہینوں بلکہ سالوں تک ملتوی ہو سکتا تھا۔ خاص کر اگر مسلمانوں کو صور کے محاذ پر شکست ہو جاتی تو یورپی طاقتیں آگے بڑھ کر القدس کے گرد ایسی مزاحمتی دیواریں کھڑی کر دیتیں جنہیں گرانا شاید ممکن نہ ہوتا۔ صور کا محاصرہ ترک کرنے کی کچھ اور وجوہ بھی تھیں مثلاً سپاہیوں کی تکان اور فوج کا انتشار۔ کاتب عماد اصفہانی کہتے ہیں:

"سلطان کی فراست انہیں بتا رہی تھی کہ صور کی مہم دشوار گزار اور اس پر قبضہ تھکا دینے والا ہوگا۔ کیونکہ ساحل پر اس سے زیادہ مستحکم شہر کوئی اور نہ تھا۔ چنانچہ سلطان نے اپنا رخ اس مہم کی طرف

● [illegible]

پھیر دیا جو نسبتاً آسان تھی۔"[1]

سلطان کے دوسرے سوانح نگار قاضی بہاؤالدین ابن شداد کہتے ہیں:

"سلطان نے صور کی مہم میں مصروف رہنا بہتر نہ سمجھا حالانکہ وہ اس کے سامنے فوج اتار چکے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی فوج ساحلی علاقوں میں منتشر ہو رہی تھی اور ہر انسان اپنے لیے غنیمت جمع کرنے میں لگ گیا تھا۔ سلطان کے سپاہی مسلسل جنگ وجدال سے تھک بھی چکے تھے۔ ادھر ساحل کے باقی ماندہ تمام فرنگی صور میں جمع ہو گئے تھے۔ (ان سے لڑنا دشوار تھا) اس لیے سلطان نے عسقلان کا رخ کرنا بہتر سمجھا۔"[2]

<u>عسقلان کا معرکہ</u> ❊ صور کے بعد عسقلان بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل تھا۔ القدس سے پہلے اس پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ دراصل یہ شہر مصر اور شام کی سرحد پر واقع تھا اور دونوں ملکوں کی تجارتی شاہراہ یہاں سے گزرتی تھی۔ اگر یہ نصرانیوں کے پاس رہتا تو مصر سے شام کو کمک ملنے میں رکاوٹ پڑتی رہتی۔ چنانچہ سلطان صور کو اسی حال میں چھوڑ کر عسقلان روانہ ہو گئے۔ اس دوران ان کی ہدایت کے مطابق الملک العادل بھی مصری فوج کے ساتھ عسقلان کی طرف بڑھ رہا تھا۔[3]

سلطان رملہ، یبنیٰ اور داروم پر قابض ہوتے ہوئے 16 جمادی الثانیہ کو عسقلان پہنچ گئے۔ یہاں الملک العادل بھی ان سے آملا۔ عسقلان کے سامنے صحرا میں لشکرِ اسلام کے خیمے گڑ گئے اور سیاہ وسبز پرچم لہرانے لگے۔ عسقلان کا قلعہ خشکی اور ساحل کے اہم عسکری نقاط پر واقع تھا۔ شہر کے دفاعی انتظامات بھی غیر معمولی تھے۔ اس لیے یہاں بھی ایک سخت جنگ کی توقع تھی۔ تاہم سلطان جلد از جلد اپنے اہداف حاصل کرنا چاہتے تھے اور خون ریزی سے حتی الامکان گریز کے حق میں تھے یہی وجہ تھی کہ عسقلان کے محاصرے کے آغاز میں انہوں نے نرمی کا مظاہرہ کیا مگر اہلِ شہر اسے سلطان کی کمزوری گمان کر کے مقابلے پر کمربستہ ہو گئے۔ تب سلطان نے محاصرے میں شدت پیدا کی اور منجنیقیں نصب کرا کے شہر پر سنگ باری شروع کی۔ شہر والے قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے۔ سلطان کی سپاہ فصیل میں نقب لگانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس لڑائی میں سلطان کا ایک خاص امیر حسام الدین ابراہیم مہرانی شہید ہو گیا۔

کچھ دنوں تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر سلطان نے معاملہ جلد نمٹانے کی خاطر دمشق کے قید خانے سے <u>نصرانیوں کے بادشاہ گائی اور ٹمپلرز کے سردار ڈی رڈ فورڈ کو اپنے پاس بلوا لیا اور ان سے</u>

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ فصل فی فتح مستون

[2] النوادر السلطانیہ: ص 126 ط دار بیروت

[3] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ ذکر فتح مستون، النوادر السلطانیہ: ص 126، کتاب الروضتین: تحت 583ھ ذکر فتح مستون

وعدہ کیا کہ اگر وہ یہ شہر مسلمانوں کے سپرد کرادیں تو انہیں رہا کردیا جائے گا۔ گائی کے لیے اس سے بڑھ کر فراخدلانہ پیش کش اور کیا ہوسکتی تھی، اس نے فوراً عسقلان کے امراء کو خط لکھ کر ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا اور انہیں کہا: "اس سے پہلے کہ تم بالکل بے بس ہو جاؤ، صلح کرلو۔"

مگر اہل شہر نے گائی کے مشورے کو بھی نظر انداز کردیا۔ گائی کی جانب سے نمائندے خطوط لے کر جاتے رہے۔ آخر کار گائی نے اپنے نمائندے کے ذریعے انہیں خفیہ طور پر یہ کہلا بھیجا:

"میرا مشورہ مان لو، میری جان کی حفاظت کرو۔ یہ تمہارا قومی سرمایہ ہے۔ جب مجھے رہائی مل جائے گی تو میں اپنے شہروں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا دوں گا، یورپ کے حکمرانوں سے مدد طلب کروں گا اور نصرانیوں کی تمام ریاستوں سے گھڑسواروں اور پیادوں کی افواج منگوالوں گا۔"

اتنے دنوں میں شہر والوں کو بھی شکست کا یقین ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے گائی کے مشورے کے مطابق ہتھیار ڈالنے کا معاہدہ کرلیا۔ انہوں نے جو بھی شرائط لکھیں سلطان نے منظور کرلیں جن کے مطابق انہیں ان کے تمام مال و دولت اور اہل و عیال سمیت بحفاظت نقل مکانی کی سہولت مہیا کی گئی۔ کچھ نصرانیوں کو ڈر تھا کہ سلطان کے سپاہی اپنے اعلیٰ افسر حسام الدین ابراہیم مہرانی کے قتل کا بدلہ لیں گے، خاص کر مہرانی کے قبیلے والے ان کے قافلے پر حملے ضرور کریں گے مگر یہ تمام خدشات غلط ثابت ہوئے۔ سلطان کے سپاہیوں نے ان کی خواہش کے مطابق انہیں پوری حفاظت سے بیت المقدس تک پہنچادیا۔

شاہ گائی اور ٹیمپلرز کے سردار سے بھی سلطان نے اپنا وعدہ نبھایا اور اگلے سال موسم گرما میں بادشاہ، اس کے بھائی، ٹیمپلرز کے سردار اور بہت سے عیسائی امراء کو رہا کردیا۔ چودہ دن کے محاصرے کے بعد ہفتہ 29 جمادی الثانیہ 583ھ (5 ستمبر 1187ء) کو مسلمان عسقلان میں داخل ہوئے۔ فرنگیوں نے جمادی الثانیہ 548ھ (ستمبر 1153ء) میں اسے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ 35 سال بعد یہاں ایک بار پھر اذانیں گونجیں اور اسلامی شعائر زندہ ہوئے۔

عسقلان کی فتح کے بعد سلطان ایوبی چند دن شہر کے سامنے پڑاؤ ڈالے رہے اور افواج کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے گردونواح کے فلسطینی شہروں پر قبضے کے لیے بھیجتے رہے۔ غزہ، بیت جبریل، بیت اللحم اور نطرون جیسے تاریخی اور مذہبی حیثیت کے اہم علاقے انہی دنوں فتح ہوئے۔ ٹیمپلرز کے تمام گڑھ سرنگوں ہوگئے۔ اس دوران سلطان کا منجھلا بیٹا الملک العزیز عثمان القدس کی فتح میں شرکت کے لیے مصر سے چلا آیا۔ سلطان کو اس کی آمد سے بے حد خوشی ہوئی۔ عسقلان سے سلطان نے اپنے گھر والوں کو ایک

تفصیلی خط بھیج کر حالات سے آگاہ کیا جس میں تحریر کیا:

''ہم اس سمت میں آگئے ہیں جہاں القدس اور عسقلان ہیں۔ ہم نے اس خطے کے قلعے اور شہر فتح کر لیے ہیں جن میں حیفہ، قیساریہ، ارسوف، یافا، رملہ، تل صافیہ، بیت جبریل، الدیر اور الخلیل شامل ہیں۔ ہم نے عسقلان پر دھاوا بولا جو کہ ایک مضبوط گڑھ اور مستحکم علاقہ ہے اور بلند ٹیلے پر واقع ہے، یہاں دشمن کی قوت، جنگی ساز و سامان اور تعداد اتنی تھی کہ آرزوئیں اس کی فتح سے عاجز تھیں مگر ہم نے یہ مقام چودہ دن بعد صلح سے فتح کر لیا۔ شہر کی فصیلوں اور برجوں پر توحید کے پرچم نصب کر دیے گئے ہیں۔ یہاں مسلمان آباد ہو گئے ہیں۔ شہر مشرکین و کفار سے خالی ہو گیا ہے۔ یہاں چار سو موذنوں کی اذانیں گونج رہی ہیں۔ اب ساحل شام میں جبیل سے لے کر مصر کی سرحد تک القدس اور صور کے سوا کوئی شہر (فرنگیوں کے پاس) باقی نہیں رہا۔ اب عزم مصمم ہے کہ القدس کا رخ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس مہم کو آسان کرے اور جلد پورا فرمائے۔ جب اللہ تعالیٰ فتح بیت المقدس کی ارزانی فرما دیں گے تو ہم صور کی طرف بڑھیں گے۔ والسلام''[1]

عسقلان سے روانگی سے پہلے سلطان نے شہر کی خطابت اور قضا سمیت دیگر دینی معاملات کا ذمے دار شیخ جمال الدین دمشقی کو بنا دیا جو قاضی الیمن کے لقب سے مشہور تھے۔[2]

مصری بحری بیڑے کی آمد ❊ اب جبکہ سلطان بیت المقدس کی فتح کو اوّلیت دیتے ہوئے اس جانب روانہ ہو رہے تھے انہیں اپنی پشت پر یقینی تحفظ درکار تھا۔ انہیں مصری بحریہ کی آمد کا انتظار تھا، جس کی طلبی کے احکام وہ دے چکے تھے۔ مصری بحریہ کو طلب کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ فتح بیت المقدس تک کوئی یورپی بیڑہ امدادی فوجیں لے کر ساحل پر اترنے نہ پائے۔ بصورتِ دیگر بیت المقدس کی فصیل تلے لڑی جانے والی جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کے خلاف جا سکتا تھا۔ چند دنوں بعد مصری بحریہ اپنے مایہ ناز امیر حاجب حسام الدین لولو کی قیادت میں ساحل شام پر آن پہنچی۔ یہ بیڑہ مصر سے شام تک فرنگیوں کی بحری کمک کے راستے مسدود کرتا ہوا آیا تھا۔ لولو نے راستے میں فرنگیوں کی جس بھی کشتی یا جہاز کو دیکھا اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کی کوشش تھی کہ بیت المقدس کی فتح تک شام کے فرنگیوں کے یورپ سے رابطے منقطع رہیں اور اہل یورپ کو یہاں کی کوئی خبر پہنچنے نہ پائے۔

ساحل پر مصری بیڑے کے آنے کے بعد سلطان بیت المقدس کے محاصرے کیلئے گامزن ہو گئے۔[3]

1. الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ ذکر فتح عسقلان، النوادر السلطانیہ ص 126، الروضتین: تحت 583ھ ذکر فتح عسقلان
2. محولہ جات بالا
3. الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ ذکر فتح بیت المقدس

فصل:4

فتح بیت المقدس

بیت المقدس میں شام کے نصرانیوں کی تمام باقی ماندہ قوتیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔ان میں پیشہ ور سپاہی بھی تھے اور زائرین بھی، تارک الدنیا راہب بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی۔خود مقامی باشندوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی جو القدس کو اپنا مذہبی ورثہ تصور کرتے تھے اور اس سے کسی قیمت پر دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔نصرانیوں کے متعصب جنگجو گروہوں ٹیمپلرز، ہاسپٹلرز اور بارونیہ کے لوگ بھی یہاں بکثرت تھے۔سلطان کے حملے کے خوف کے باوجود ان میں لڑنے کا زبردست جوش وخروش پایا جاتا تھا۔یروشلم کے سب سے بڑے پادری ''بطریق اعظم'' کی موجودگی ان کے حوصلے بلند کر رہی تھی۔پھر بالیان بن بارزان کی شکل میں انہیں ایک نیا عسکری قائد بھی مل گیا تھا۔

بالیان قلعۂ ابلین کا حاکم تھا، وہ معرکۂ حطین میں شکست کے بعد گرفتار ہو گیا تھا۔پھر سلطان نے ابلین حوالے کر دینے کی شرط پر اسے رہا کر دیا تھا۔القدس پر سلطان کے حملے سے کچھ ہی دنوں پہلے وہ اپنے اہل وعیال کو جو بیت المقدس میں تھے، ساتھ لینے یہاں پہنچا تھا مگر بطریق اعظم ہرکولیس نے اس کی مرضی کے خلاف اسے روک لیا تھا اور اس کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اسے القدس کی حفاظت کے لیے سلطان سے جنگ پر آمادہ کر لیا تھا۔کسی عسکری رہنما سے محروم عوام نے بالیان کی موجودگی کو غنیمت تصور کیا اور جوق در جوق اس کے گرد جمع ہو گئے۔بالیان نے ان میں جنگ کا ولولہ پیدا کر دیا۔علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ القدس کی اس صورتحال کو یوں بیان کرتے ہیں:

''عیسائی مسلمانوں کے القدس پر قبضہ کرنے سے پہلے مر جانا بہتر سمجھتے تھے، وہ اپنی جان، مال اور اولاد کو القدس کی حفاظت کے لیے قربان کرنا لازمی تصور کرتے تھے۔''[۵]

چنانچہ یہ لوگ شہر کے دفاع اور مزاحمت کی بھرپور تیاریاں کر رہے تھے۔فصیلوں پر منجنیقیں نصب

۵ الکامل فی التاریخ: سنۃ 583ھ ذکر فتح بیت المقدس

کردی گئی تھیں تاکہ شہر کے سامنے پڑاؤ ڈالنے والی فوج پر سنگ باری کی جاسکے۔ شہر پناہ کی مرمت کی جارہی تھی جبکہ خندق کی کھدائی کر کے اسے مزید وسیع اور گہرا کردیا گیا تھا۔ ہر برج پر مسلح افراد کے جتھے تعینات تھے۔ فصیل کا کوئی گوشہ لڑنے والوں سے خالی نہیں رہا تھا۔ [1]

ادھر سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے جانبازوں کے ساتھ القدس کی جانب چلنے کے لیے تیار تھے، مسلمانوں کے جوش وخروش کا عالم دیدنی تھا۔ ہر سپاہی اس مقدس جہاد میں شرکت کو سعادت سمجھتا تھا۔ فتح بیت المقدس کا شرف حاصل کرنے کے لیے شام اور مصر کے علماء، فقہاء اور مشائخ کی بہت بڑی تعداد بھی اس لشکر میں شامل ہوگئی تھی، برسوں سے وہ جس دن کے منتظر تھے وہ آیا چاہتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے جذبات کا اندازہ لگانا شاید کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ جس ہدف کو پانے کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی اب وہ چند گام کے فاصلے پر تھا۔ ان کی سالہا سال کی جہادی مہمات، تھکا دینے والے اسفار اور جسم وجان کو پگھلا دینے والی صعوبتوں کا ثمرہ ملنے والا تھا۔ جس مقصد کے لیے ان کے پرچم تلے ہزاروں مجاہدوں نے خون بہایا تھا وہ حاصل ہونے کو تھا۔ شہیدوں کی قربانیاں رنگ لانے والی تھیں اور قبلہ اوّل کی بازیابی کی خاطر تین نسلوں کی دعائیں قبول ہورہی تھیں۔

کوچ سے پہلے سلطان ایوبی نے دربار آراستہ کیا۔ امراء، جرنیل، شہزادے، علماء ومشائخ، اور غلام سب ہی جمع تھے۔ سلطان نے پہلے ان سے مشورہ کیا کہ بیت المقدس کی طرف پیش قدمی کے لیے کونسا راستہ مختصر اور موزوں تر ہے۔ پھر سلطان نے خلاف معمول ایک طویل خطبہ دیتے ہوئے حاضرین کے جذبۂ شوق کو مہمیز دی۔ انہوں نے کہا:

> ''اگر اللہ اپنے دشمنوں کو بیت المقدس سے نکال باہر کرنے کی توفیق ہمیں عطا کرے تو اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہوسکتی ہے۔ اگر وہ اس کام میں ہماری مدد کرے تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی۔ 91 برس ہوگئے کہ بیت المقدس کافروں کے قبضے میں ہے۔ اس تمام مدت میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں خدائے واحد کی عبادت نہیں ہوئی۔ مسلم بادشاہوں کی توجہ اس کے سوا دوسری مہمات میں صرف ہوتی رہی، اس سے غفلت میں کئی نسلیں گزر گئیں اور فرنگی اس کے مالک بنے رہے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت آل ایوب کے مقدر میں لکھی ہے تاکہ اس خدمت کو قبول کر کے مسلمانوں کو ان کے گرد متحد کرے۔ بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی فتح کے لیے ہمیں دل وجان سے کوشش کرنا ہوگی۔ مسجد اقصیٰ وہ ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے...... بیت

[1] النوادر السلطانیہ: 127 کتاب الروضتین: فتح بیت المقدس ماہ شوال والنہایۃ النہایۃ حوادث 583ھ

المقدس انبیائے کرام کا مسکن ہے۔ اولیائے عظام کا ٹھکانہ ہے...... پرہیزگاروں کی عبادت گاہ ہے...... زمین کے ابدال اور آسمان کے فرشتوں کی زیارت گاہ ہے...... یہ وہ مقام ہے جہاں مخلوق کو زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور حساب و کتاب ہوگا۔ اللہ کے پیارے بندے اس کی زیارت کے لیے جوق در جوق آتے رہے۔ یہیں وہ مقدس چٹان ہے جس پر حضور اکرم ﷺ کے معراج پر جانے کا نشان یادگار کے طور پر بنا ہوا ہے جس پر ایک اونچا گنبد تاج کی طرح سایہ فگن ہے جس سے حضور اکرم ﷺ برق رفتار براق پر سوار ہو کر بجلی کی تیزی سے آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ اس رات نے سراج منیر ﷺ سے وہ روشنی پائی کہ جس سے سارا جہان روشن ہو گیا۔ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی محراب اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت تھا۔ یہاں چشمۂ سلوان بھی ہے جسے دیکھ کر حوضِ کوثر یاد آجاتا ہے۔

بیت المقدس مسلمانوں کے دو قبلوں میں سے پہلا قبلہ ہے، اللہ کے گھروں میں سے دوسرا مقدس گھر ہے۔ حرمین شریفین میں سے تیسرا حرم ہے۔ یہ ان تین مساجد میں سے ایک ہے جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد

"انہی تین مساجد کی طرف سواریاں تیار کر کے خصوصی سفر کیا جائے" لوگ عقیدت مندی کے ساتھ انہی کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

امید ہو چلی ہے کہ اللہ تعالیٰ اب یہ مقدس مقام ہمیں اسی حسنِ کامل کے ساتھ دوبارہ عطا کر دے گا جس کا ذکر اس نے کلام پاک میں اشرف الخلائق ﷺ کے ذکر کے ساتھ تفصیل سے کیا ہے۔

اللہ عز و جل نے فرمایا:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾

"پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک"

اس کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ اسی سے رسول خاتم الانبیاء حضور اکرم ﷺ کو معراج ہوئی۔ اس کی زمین کے لیے آسمانوں کے دروازے کھلے۔ کتنے پیغمبروں کے حالات، اولیاء کے واقعات، شہداء کی قربانیاں، صالحین کی کرامات اور علماء کی نشانیاں اس شہر سے وابستہ ہیں۔ یہ برکات کا سرچشمہ اور خوشیوں کی پرورش گاہ ہے۔ یہاں کا مبارک صخرہ شریفہ قدیم قبلہ ہے

جہاں سے خاتم الانبیاء ﷺ کے قدم مبارک آسمان کی طرف بلند ہوئے...... یہاں آسمانی برکات کا نزول مسلسل ہوتا ہے...... یہیں رسول اللہ ﷺ نے تمام انبیاء کی امامت کی جبکہ حضرت روح الامین علیہ السلام ہمراہ تھے۔ حضور ﷺ نے یہیں سے اعلیٰ علیین کی طرف پرواز کی۔ یہیں حضرت مریم کی وہ محراب ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾

''جب بھی حضرت زکریا ان کے پاس محراب میں داخل ہوتے ان کے پاس رزق موجود پاتے۔''

خدا کے نیک بندے یہاں دن بھر عبادت کرتے اور رات کو بیدار رہتے۔ یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے ڈالی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی تعمیر کی وصیت کر گئے۔ اس سے بڑھ کر اس کی بزرگی کی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ پاک نے اس کی تعریف کو سبحان الذی سے شروع کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے فتح کیا تھا۔ اس کی تعریف میں اللہ پاک نے ایک باعظمت سورت (الاسراء) کا آغاز فرمایا۔

پس یہ مقام کتنا باعظمت ہے، کتنا عالی شان ہے، کس قدر شرافتوں کا حامل ہے۔ کیسا عظیم ہے۔ کتنا بلند مرتبہ ہے۔ کیسا جلیل القدر ہے۔ یہ جگہ کیا ہی حسین اور روشن ہے۔ یہ مسجد کتنی بابرکت ہے، کیسی مامون ہے۔ اس کے محاسن کتنے زیادہ ہیں۔ اس کی خوبیاں کیا ہی شیریں ہیں۔ اس کی دلکشی کتنی عجیب ہے۔ اس کی زینت کیا پر رونق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت شان کو یوں بیان کیا ہے:

﴿الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا﴾

''یعنی یہ وہ مقام ہے جس کے اردگرد کو ہم نے برکت عطا کی۔''

یہاں اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو اپنی قدرت کاملہ کی کتنی نشانیاں دکھائیں۔ اس مقام کے فضائل ہم نے حضور ﷺ سے سنے جو حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔''[1]

اس خطاب کا ایک ایک لفظ نہ صرف بیت المقدس سے سلطان صلاح الدین کے عشق کا گواہ ہے، بلکہ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سلطان کو القدس سے متعلق آیات، احادیث اور تاریخی روایات کا گہرا علم تھا۔ اس تقریر نے حاضرین محفل پر ولولے اور سرور کی ایک عجیب کیفیت طاری کر دی۔ سب بیت المقدس کی آزادی کے لیے جان نچھاور کرنے پر تیار نظر آنے لگے۔ اب سلطان نے سب کے سامنے قسم کھا کر کہا:

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین جت 583ھ ذکر فتح بیت المقدس بروایۃ العماد

"جب تک میں بیت المقدس میں اسلام کا پرچم نصب نہ کر دوں، جب تک حضور نبی اکرم ﷺ کے اقدام عالیہ سے مس ہونے والی اس سرزمین تک خود چل کر نہ پہنچوں اور جب تک صخرہ مقدسہ کو کفار کی گرفت سے آزاد نہ کرا لوں...... میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"[1]

آخر کار امنگوں اور دعاؤں کے ساتھ لشکر نے القدس کی طرف کوچ کیا۔ ابھی سلطان راستے میں ہی تھے کہ انہیں ایک رنج کا سامنا کرنا پڑا۔ لشکر کے ہراول دستوں میں سے ایک دستے کا امیر "جمال الدین الزرزاری" عجلت کے عالم میں اپنے ساتھیوں سے کچھ آگے نکل گیا تھا، غالباً اسے گمان نہیں تھا کہ راستہ اتنا پرخطر ہوگا مگر القدس کے عیسائی دور دور تک گشت کر رہے تھے، ان کی ایک ٹولی نے جو خوراک و رسد لینے یا جاسوسی کرنے پر مقرر تھی، "قبیبات" کے علاقے میں امیر جمال الدین پر حملہ کر دیا۔ امیر لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔[2] سلطان کو اطلاع ہوئی تو غمگین ہوئے۔ تاہم راہ جہاد میں ایسے زخم ناگزیر تھے اور سلطان کو ان کی عادت پڑ چکی تھی۔ اگلے دن اسلامی لشکر القدس کے نواح میں پہنچ گیا۔

لشکرِ اسلام القدس کے سامنے ❊ اتوار 15 رجب (20 ستمبر 1187ء) کو اسلامی لشکر پہاڑیاں اور وادیاں عبور کرتے ہوئے مغرب کی سمت سے القدس کے سامنے اترنے لگا۔ مسلمان قبلہ اوّل کے امین شہر کو اپنے سامنے پا کر مسرت سے نہال نظر آ رہے تھے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے شب معراج میں تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، جو سولہ (16) ماہ تک امت مسلمہ کا قبلہ رہا تھا، جس کا چپہ چپہ انبیاء سابقین کی برکات سے معمور اور وحی کے انوار سے روشن تھا۔ یہی وہ مقام تھا جس کی وراثت کا دعویٰ ایک صدی سے مسلمانوں اور نصرانیوں میں خوں ریز جنگوں کی بنیاد بنا ہوا تھا۔ اکیانوے (91) برس سے یہ شہر نہ صرف شام کی عیسائی ریاستوں کا دارالحکومت تھا بلکہ یورپی ممالک کے نزدیک بھی اس کی اہمیت اپنے سیاسی مرکز اور پایہ تختوں سے کہیں زیادہ تھی، وہ اسے اپنے مذہب کا عالمی مرکز مانتے تھے اور مسیح و مریم کی میراث کی حیثیت سے اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی جب القدس کی وادی میں اترے تو دیکھا، شہر پناہ جنگجوؤں سے بھری پڑی ہے۔ مسلمان سپاہی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ دشمن کی تعداد ان کی توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ نہ صرف فصیل پر کھڑے عیسائی نعرے بلند کر رہے تھے بلکہ اندرون شہر سے بھی جوش و غضب سے بھرپور نعروں کی گونج اٹھ اٹھ کر وادی میں دور دور تک پھیل رہی تھی۔[3]

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ ذکر فتح بیت المقدس بروایۃ العماد
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ ذکر فتح بیت المقدس بروایۃ العماد
[3] کتاب الروضتین، الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، ابن خلدون: 6/305

یہ بات واضح تھی کہ حریف ہتھیار ڈالنے کی بجائے لڑکر مرجانے کو ترجیح دے گا تاہم ان میں پیشہ ور سپاہی زیادہ نہ تھے، اکثریت عوام کی تھی جنہیں بالیان اور بطریق اعظم کی پرجوش تقاریر نے سردھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ کردیا تھا۔ عماد کاتب کے مطابق ان لڑنے والوں کی تعداد 60ہزار سے کم نہ تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی بیت المقدس میں خوں ریزی سے احتراز کرنا چاہتے تھے مگر نصرانیوں کا جوش وخروش ظاہر کررہا تھا کہ ارض مقدس کی عزت واحترام کے مشترکہ جذبات کے باوجود جنگ ہوکررہے گی۔

معرکۂ القدس بپا ہوتا ہے ❋ اسلامی لشکر پانچ دن تک القدس کے مغرب میں فروکش رہا۔اس دوران سلطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ القدس کے ارد گرد چکر لگا کر فیصلہ کن حملے کے لیے بہتر جگہ تلاش کرتے رہے۔

بیت المقدس کی عمارت اور خاص طور پر گنبد صخرہ کو تو شہر کے باہر ہر طرف سے دیکھا جاسکتا تھا مگر اردگرد کی بلند پہاڑیوں اور ٹیلوں سے شہر کے اندر کا منظر بھی صاف نظر آتا تھا۔اس وقت بیت المقدس پر جگہ جگہ صلیبیں نصب تھیں، فصیل کے ہر برج پر صلیبی نشان والے پرچم پھڑ پھڑا رہے تھے۔ان سب سے بڑھ کر گنبدِ صخرہ پر ایک بہت بڑی صلیب جگمگا رہی تھی۔ یہ مناظر مسلمانوں کی حمیت پر چوٹیں لگا رہے تھے۔ ہر افسر جلد از جلد حملے کے لیے بے چین تھا تاہم مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے صحیح منصوبہ بندی کرلی جائے اور موزوں تر مقام چن لیا جائے۔ مغرب کی سمت جہاں اس وقت فوج تھی وادی وسیع نہیں تھی۔ پھر یہاں صبح سے لے کر دوپہر تک سورج آنکھوں کے سامنے رہتا تھا، اس حالت میں محصورین کی تیر اندازی اور سنگ باری سے بچ کر آگے بڑھنا بہت مشکل تھا۔شہر پناہ اتنی بلند اور مضبوط تھی کہ کسی بھی جانب سے کامیاب حملہ کرنا بہت مشکل تھا۔

جمعہ 20رجب (25ستمبر) کی شام سلطان کی افواج اپنے خیمے اور ڈیرے اکھاڑ کر القدس کے سامنے سے ہٹنے لگیں۔نصرانیوں نے یہ منظر دیکھ کر گمان کیا کہ مسلمان جارہے ہیں، چنانچہ شہر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔عیسائی خود کو فاتح تصور کرکے مسرت کے نعرے لگانے لگے مگر سلطان نے صرف حملے کی سمت تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔رات کو سلطانی افواج القدس کے شمال میں خیمے لگارہی تھیں۔اسی رات سلطان کے سپاہیوں نے منجنیقیں نصب کرنا شروع کردیں، صبح تک وہ اس کام سے فارغ ہوچکے تھے۔اس جانب شہر پناہ کا دروازہ "باب عمود" کہلاتا تھا۔فصیل کے پیچھے دور دور تک القدس کی گنجان آبادی تھی۔بلند عمارتوں کا سلسلہ شہر پناہ کے پار سے بھی نظر آتا تھا، یہاں ایک قدیم معبد تھا جو "کنیسہ صیہون" کہلاتا تھا۔

سورج نکلتے ہی حملہ شروع ہوگیا، منجنیقیں فصیل پر بھاری پتھر برسانے لگیں۔نصرانیوں میں اس شدید

حملے سے افراتفری پھیل گئی مگر جلد ہی وہ منظم ہو گئے۔ انہوں نے بھی جوابی کارواں کے لیے منجنیقیں تیار کر لیں اور کچھ دیر بعد فصیل شہر سے سلطان کی فوج پر سنگ باری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر اچانک عیسائی گھڑسوار پر جوش نعرے لگاتے ہوئے شہر سے باہر نکل آئے اور اسلامی لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ ایک زوردار معرکہ شروع ہو گیا۔ فرنگی دیر تک لڑتے بھڑتے رہے اور مسلمانوں کو فصیل شہر تک پہنچنے سے روکے رکھا۔

اگلے دن بھی اسی طرح جنگ ہوتی رہی، عیسائی گھڑسوار میدان میں آکر مسلمانوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ان سے دست بدست مقابلے کے دوران سلطان کی فوج کا امیر عزالدین عیش بن مالک شہید ہو گیا۔ وہ ہر دلعزیز شخص تھا، اس کا باپ ''جعلبر'' کا قلعہ دار تھا، اس کی شہادت سے مسلمانوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ تب اسلامی لشکر نے یک بارگی ایک طوفانی حملہ کیا جس کے سامنے صلیبی گھڑسوار ٹھہر نہ سکے۔ وہ پشت پھیر کر بھاگے اور شہر پناہ میں داخل ہو گئے۔ مسلمان آگے بڑھتے ہوئے خندق عبور کر کے فصیل سے قریب تر ہو گئے۔ اب فصیل شکن بھاری اسلحہ طلب کیا گیا۔ فصیل پھلانگنے والے جانبازوں اور فصیل کی بنیادوں میں بارودی سرنگیں بچھانے والے ہنرمند اپنے کارکنوں کے ساتھ تیزی سے آگے آئے۔ مگر ان سب کو روکنے کے لیے فصیل سے نصرانیوں نے زبردست سنگ باری اور تیراندازی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھولتا ہوا پانی اور گرم گرم تارکول بھی پھینک رہے تھے۔ فصیل سے ہونے والی شدید مزاحمت کے دوران سرنگیں بچھانے کا کام تسلسل سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے سلطان کی فوج کے تیرانداز حرکت میں آگئے۔ منجنیقیں دور سے فصیل پر سنگ باری کرنے لگیں، اس کے ساتھ ساتھ جلتے ہوئے تیل کی ہانڈیاں بھی پھینکی گئیں جن سے فصیل پر جگہ جگہ آگ لگ گئی۔ مسلم تیرانداز مناسب مقامات پر آکر نشانہ بازی کرنے لگے۔ ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ عیسائی جنگجوؤں کو فصیل سے ہٹا دیا جائے۔ ادھر سلطان نے اپنی گھڑسوار فوج بھی میدان میں اتار دی۔ 10 ہزار شہ سواروں نے جوزفات اور سینٹ اسٹیفن کے پھاٹکوں پر حملہ کر کے وہاں سے عیسائیوں کو پسپا کر دیا۔

اس وقت تیروں، پتھروں اور آگ کے گولوں کی بارش سے القدس کے شمال میں ایک ہنگامہ محشر بپا تھا۔ فصیل شکن اسلحہ، آہنی پھاٹک توڑنے والے آلات اور سرنگیں بچھانے کا سامان تیزی سے فصیل تک پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ سامان آگے منتقل کرنے والوں کی حفاظت کے لیے تیرانداز بار بار تیروں کا مینہ برسا رہے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو گرد و غبار کے مرغولوں، خون کے فواروں اور تلواروں کی کوندتی بجلیوں کے درمیان بیت المقدس کا سنہرا گنبد نظر آ رہا تھا۔ سپاہیوں کی للکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور تکبیر کے نعروں کے ساتھ انہیں مسجد اقصیٰ میں گونجنے والی وہ اذان سنائی دے رہی تھی جو مدتوں سے خاموش تھی۔

تیروں کی بے پناہ بارش دونوں طرف سے جاری تھی کہ سلطان کے اشارے پر پیادہ دستے ڈھالوں کی اوٹ میں فصیل کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ان دستوں کے پیچھے لکڑی کے بلند و بالا مینار نما "دبابے" تھے جنہیں سینکڑوں غلام اور مزدور دھکیل رہے تھے۔ان کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے زمین دہل رہی تھی (عربی میں دبابوں کو عرادات کہا جاتا ہے، یہ اس زمانہ کی بکتر بند گاڑی تھی) جوں جوں دبابے فصیل کے قریب تر ہو رہے تھے، نصرانیوں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی، اس کے ساتھ ان کی مدافعت کا جوش واضطراب بھی بڑھ رہا تھا۔تاہم ان کی بھرپور مزاحمت کے باوجود مسلمان "دبابوں" کو دھکیل کر فصیل کے ساتھ لے آئے۔دبابوں کی چوٹی فصیل سے کچھ اوپر ہی تھی۔اب بہترین تربیت یافتہ سپاہی تیزی سے دبابوں کے اندر لگی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے درجے میں پہنچے۔پھر ایک زوردار نعرے کے ساتھ انہوں نے سامنے لگا دروازہ گرا دیا جس کا دوسرا سرا کسی پل کی مانند فصیل سے جالگا۔مسلمان سپاہی نعرۂ تکبیر بلند کر کے اس پل سے فصیل پر کودنے لگے اور پوری فصیل پر ایک خوں ریز جنگ شروع ہوگئی۔

شدید لڑائی کے باوجود نصرانیوں نے فصیل پر مسلمانوں کے قدم نہ جمنے دیے۔شام تک القدس کے برجوں پر صلیبی جھنڈے بدستور لہرا رہے تھے۔مگر اس دوران مسلمان انجینئروں نے فصیل کی بنیادوں میں سرنگیں بچھانے کا کام بڑی حد تک پورا کر لیا تھا۔

اگلے دن منجنیقوں کی پے در پے سنگباری اور بارودی سرنگوں کے دھماکوں نے فصیل کا ایک حصہ اڑا کر رکھ دیا۔عیسائی جو سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے تھے، اب مدافعت سے مایوس ہوگئے۔ان کے نائٹوں اور جانبازوں نے فصیل کے منہدم حصے پر انسانی جسموں کی دیوار بنا کر مسلمانوں کو اندر داخل ہونے سے روکے رکھا مگر تابکے۔بارودی سرنگیں پھٹنے کا سلسلہ جاری تھا اور شگاف وسیع ہوتا جارہا تھا۔[1]

لین پول اس وقت شہر کی اندرونی حالت بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی، چرچ لوگوں سے بھر گئے تھے، دعائیں ہو رہی تھیں، لوگ پادریوں کے سامنے اپنے اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے تھے اور خود کو اذیتیں دے کر خدا سے رحم کی فریادیں کرتے تھے۔شہر کو آغوش رحمت میں لانے کی خاطر پادریوں اور راہبوں نے انجیل اور صلیب کے ساتھ مناجات گاتے ہوئے شہر میں جلوس نکالا مگر (خود لین پول کے الفاظ میں)

"خدا اس شہر کی بدکاری اور شہوت پرستی سے نالاں ہو چکا تھا، گناہوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی دعائیں اس کی دربار میں قبول نہ ہوئیں۔"[2]

---

[1] کتاب الروضتین: تحت 583ھ ذکر فتح بیت المقدس بروایۃ العماد و الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ و البدایۃ والنہایۃ: تحت 583ھ [2] گزشتہ حوالہ

صلح کی بات چیت: اب فصیل کا اتنا بڑا حصہ گر چکا تھا کہ عیسائی کسی طرح بھی مسلمانوں کے ریلے کو نہیں روک سکتے تھے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں وہ ہتھیار ڈال دیتے یا لڑتے لڑتے مرجاتے۔ عوامی طبقات سے تعلق رکھنے والے سرکردہ لوگ ہتھیار ڈالنے کے حق میں تھے مگر فوجی جرنیل اور پیشہ ور سپاہی لڑکر مرجانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس دوران بطریق اعظم ہرکولیس نے ایک درمیانی راہ سجھائی وہ یہ کہ معقول شرائط پر باعزت صلح کرلی جائے۔

اس مشورے کے مطابق شہر کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک وفد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارکان وفد نے مقدس شہر سلطان کے حوالے کردینے پر رضامندی ظاہر کی اور اس کے بدلے سلطان سے جان و مال کی امان طلب کی مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کو خوب یاد تھا کہ ان صلیبیوں نے القدس پر قبضے کے وقت بے گناہ مسلمانوں پر کیسے لرزہ خیز مظالم ڈھائے تھے۔ سلطان کے تصور میں وہ ستر ہزار بے گوروکفن جسم تڑپ رہے تھے جنہیں صلیبی درندوں نے اپنی خون آشامی کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ مسجد اقصیٰ میں پناہ لینے والے ان بچوں اور عورتوں کی چیخیں سلطان کے کانوں میں گونج رہی تھیں جن کی بوٹیاں اڑادی گئی تھیں۔ شہداء کی وہ پامال لاشیں سلطان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں جن کے خون کا دریا صلیبی نائٹوں کے گھوڑوں کی لگاموں کو چھونے لگا تھا۔ تب وقت کی باگ شیطان کے کارندوں کے ہاتھوں میں تھی اور رحمان کے بندے بے بس تھے۔ آج اللہ واحد وقہار نے مسلمانوں کو زمانے کی مقتدر قوت بنادیا تھا۔ آج فیصلے کا اختیار اللہ کے بندوں کے پاس تھا۔ وہ صلیبیوں کو عبرت کا نمونہ بنا سکتے تھے۔ ان کے ماضی کی ستم خیزیوں کو دیکھتے ہوئے وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے فیصلہ سنادیا:

> ''میں بیت المقدس کو تم سے اسی طرح چھینوں گا جیسے اکانوے برس پہلے تم نے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ تب صلیبیوں نے قتل عام کو روا سمجھا تھا اور کسی جان کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ پس اب میں صلیبیوں کے مردوں کو قتل کرکے فنا کرڈالوں گا اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنالوں گا۔ برائی کا بدلہ اس کی مثل ہی ہوتا ہے۔''[5]

سلطان نے اس جواب کے ذریعے اپنے اختیار کو واضح کردیا تھا۔ تاہم فتح القدس کے بعد انہوں نے مقامی لوگوں سے جو انتہائی فراخ دلانہ سلوک کیا، اسے سامنے رکھیں تو صاف محسوس ہوتا ہے سلطان نے اس وقت وفد پر اسلام کی برتری اور اپنے اختیار کا سکہ جمانے کے لیے یہ سخت فیصلہ سنایا تھا۔ وہ چاہتے

5 محاضرات ص

تھے کہ پہلے مسلمانوں کے قہر اور شوکت کا رعب طاری کر کے دشمن کے غرور و تکبر کا بت پاش پاش کر دیا جائے اور فتح کے بعد برعکس خلاف توقع احسانات کرتے ہوئے ممنون کیا جائے۔

بہرحال سلطان کے اعلان نے ان کی توقع کے عین مطابق نصرانیوں کو لرزا دیا۔ جب وفد کے ارکان واپس پہنچے تو القدس میں ایک کہرام مچ گیا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اب وہ زندہ نہیں بچیں گے۔

تب شہر کے عارضی حاکم بالیان نے آخری کوشش کے طور پر ایک بار خود سلطان کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ بالیان ایک ہوشیار اور دلیر آدمی تھا۔ محاصرے کے دوران بالیان نے القدس کو سلطان سے بچانے کے لیے جو کوششیں کیں اس کی بنا پر اسے یورپی مؤرخین خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس نے پہلے سلطان کو خط بھیج کر جان کی امان کے ساتھ حاضری کی اجازت طلب کی کیوں کہ سلطان نے اسے جن وعدوں پر قید سے رہائی دی تھی، وہ ان کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو چکا تھا، لہٰذا اسے سلطان سے عہد شکنی کی سزا کا خوف تھا۔ مگر سلطان نے بڑی بردباری کے ساتھ اسے جان کی امان اور حاضری کی اجازت مرحمت کی۔ تب وہ سلطان کے خیمے میں پہنچا۔ اس نے بڑی منت و زاری کے ساتھ اہل شہر کے لیے امان کی درخواست کی مگر سلطان نصرانیوں کو مزید مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ ان کا جواب تھا:

''تمہارے لیے کوئی امن ہے نہ امان۔ اب ذلت ہی تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کل ہم بزورِ قوت تم پر حکومت کریں گے۔ فوج کو قتل و گرفتاری کی کھلی چھوٹ دیں گے۔ مردوں کا خون بہائیں گے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنائیں گے۔''

جب بارزان نے دیکھا کہ سلطان کو منانا مشکل ہے تو اس نے مایوسی اور غصے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا:

''ٹھیک ہے، جب ہم آپ کی امان سے مایوس اور آپ کے احسان سے محروم کر دیے گئے ہیں اور اب نجات اور صلح و صفائی کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تو ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ سلطان عالی مقام! آپ جان لیں کہ شہر میں آبادی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی تعداد خدا ہی جانتا ہے۔ یہ لوگ امان کی امید پرست پڑ گئے ہیں۔ انہیں توقع ہے کہ آپ دیگر شہروں کی طرح انہیں امان طلبی کا مثبت جواب دیں گے۔ یہ لوگ موت سے بے زار اور زندگی کے مشتاق ہیں مگر جب ہم یہ دیکھیں گے کہ موت کے سوا کوئی چارہ نہیں تو بخدا ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو خود قتل کر دیں گے، مال و دولت اور ساز و سامان کے ذخیروں کو نذرِ آتش کر دیں گے۔ آپ کو غنیمت کے طور پر ایک درہم و دینار بھی نہیں ملے گا، آپ ہمارے کسی مرد و عورت کو غلام یا باندی نہیں بنا سکیں گے۔ صرف

بھی نہیں بلکہ پھر ہم گنبدِ صخرہ اور مسجدِ اقصیٰ کو منہدم کر دیں گے۔ ہمارے پاس آپ کے پانچ ہزار مسلمان قیدی ہیں۔ ان سب کو قتل کر دیں گے۔ شہر میں کوئی جانور یا مویشی نہ چھوڑیں گے جو آپ کے کام آئے۔ یہ سب کر کے ہم آپ کے مقابلے میں آئیں گے۔ ہمارا ہر آدمی آپ کے کم از کم ایک آدمی کو قتل کر کے مرے گا اور ہمارا ہر زخمی آپ کے دس افراد زخمی کر چکا ہوگا۔ ہم فاتح نہ ہوئے تب بھی عزت کی موت تو مریں گے۔ بتائیے پھر اس فتح سے آپ کو کیا حاصل ہوگا......؟''

بارزان کی اس پرجوش تقریر سے واضح ہو گیا کہ نصرانی مایوس اور خوفزدہ ہیں اور ان سے رحم کے طلب گار بھی۔ پھر مایوسی واشتعال کی انتہاء میں وہ مسجدِ اقصیٰ تک کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ سلطان خود بے جا خوں ریزی کے خلاف تھے مگر نصرانیوں کی حد سے متجاوز سرکشی دیکھنے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ پہلے اسلام کی قوت کا سکہ کفار پر اچھی طرح جما کر نصرانیوں کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیں، پھر انہیں حسنِ سلوک سے نہال کر دیں۔ اب جب کہ بیت المقدس میں صلیب کی قوت کو توڑا جا چکا تھا، خونریزی کی نہیں، احسان کی ضرورت تھی۔ پھر بھی سلطان نے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے سب امراء اور مشیروں سے مشورہ کیا۔ سب نے سلطان کو نرمی اختیار کرنے کی رائے دی۔ [5]

<u>معاہدۂ القدس</u> ﷺ: آخر سلطان نے مذاکرات کی پیش کش قبول کر لی۔ صلح کی ابتدائی بات چیت میں طے یہ ہوا کہ اہلِ شہر کو جان کی عام امان دی جائے گی۔ تاہم وہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدی تصور کیے جائیں گے، اس کے بعد مسلمان انہیں طے شدہ نرخ یا زرِ فدیہ کے مطابق رہا کرتے جائیں گے۔ معاہدے کی خوشخبری القدس پہنچی تو جان سے مایوس ہونے والوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سلطان اور نصرانی نمائندوں کے درمیان مزید چند ملاقاتوں اور اجلاسوں کے بعد دیگر تفصیلات بھی طے ہو گئیں۔ طے یہ پایا کہ ہر مرد چاہے مالدار ہو یا غریب، دس دینار زرِ فدیہ ادا کرے گا۔ عورت پانچ دینار اور بچے اور بچیاں دو، دو دینار ادا کر کے آزاد ہوتے جائیں گے۔ [6]

زرِ فدیہ کی ادائیگی کے لیے خاصا وسیع وقت دیا گیا۔ یعنی چالیس دن۔ جو شخص اس مدت کے گزرنے پر بھی ادائیگی نہ کر سکے گا وہ بہرحال غلام شمار ہوگا۔ نصرانیوں کے مویشیوں، اناج خانوں، گوداموں، اسلحہ خانوں اور خالی گھروں کو مسلمانوں کی ملکیت مانا جائے گا۔ تمام نصرانیوں کو دوسرے <u>محفوظ شہر (صور) تک بحفاظت پہنچانے کا کام مسلمانوں کے ذمے ہوگا۔</u> [7]

[5] الکامل فی التاریخ: تحت 582ھ، کتاب الروضتین: تحت 583ھ، مذکرۂ فتح بیت المقدس بروایت العماد والقاضی ابن شداد، النوادر السلطانیہ: 135
[6] کتاب الروضتین: تحت 583ھ، مذکرۂ فتح بیت المقدس بروایت العماد، البدایہ والنہایہ: تحت 583ھ
[7] البدایہ والنہایہ: تحت 583ھ

بارزان، پادری، ہاسپٹلرز، ٹیمپلرز اور دیگر جنگجو گروہوں کے افراد، پیشہ ور سپاہی، نائٹ، یروشلم کے اسیر بادشاہ گائی کی ملکہ اور تمام خواص بھی اس معاہدے میں شامل سمجھے گئے۔ سب کو جان کی امان دی گئی۔ سلطان نے کسی سخت سے سخت دشمن کا بھی استثنا کر کے اس کا خون بہانے پر اصرار نہیں کیا۔ بات چیت کے دوران بارزان نے ہزاروں غریب شہریوں کی طرف سے جو زرِ فدیہ کی ادائیگی سے معذور تھے 30 ہزار دینار پیش کرنے کی تجویز دی۔ سلطان نے اسے بھی قبول کیا۔ مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان اس معاہدے پر 27 رجب 583ھ (2/اکتوبر) کو دستخط کیے گئے۔ اسی دن شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ امت کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش دن تھا۔ ارضِ مقدس اس دن فاتحینِ اسلام کی قدم بوسی کر رہی تھی، مسلمانوں کے چہروں پر خوشی، نشاط اور بشاشت کا ایسا عالم تھا جو کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ القدس کی روح پرور فضا کا ہر جھونکا ان کے مشامِ جان کو معطر کر رہا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور ان کے عالی ہمت رفقاء کے جذبات ثریا کی بلندیوں پر تھے۔ احساسِ تشکر میں بسی مناجاتیں ان کے ہر سانس کے ساتھ جاری تھیں۔ ان کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ سپاس و منت کے ترانے عرش تک پہنچ رہے تھے۔ القدس کے قلعے، فصیل اور برجوں سے صلیبیں ہٹائی جا رہی تھیں، ان کی جگہ سرخ ہلالی پرچم نصب کیے جا رہے تھے۔ [1]

---

[1] الروضتین: بحث 583ھ، الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، ابن خلدون: 5/306

بعض بے سند مغربی روایتوں کا محاکمہ

القدس کی فتح کے بارے میں مغربی مورخین بڑے وثوق سے نقل کرتے ہیں کہ:

عسقلان کی فتح کے دن (یکم رجب 4 ستمبر کو) سلطان کی دعوت پر بیت المقدس کے معزز شہریوں کا ایک وفد سلطان سے مذاکرات کے لیے آیا۔ سلطان نے انہیں سمجھایا کہ وہ بیت المقدس کو اللہ کا گھر مانتے ہیں اور جنگ کے ذریعے مقامات مقدسہ کی توہین کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ سلطان نے انہیں پیش کش کی کہ اگر وہ القدس کو پرامن طور پر مسلمانوں کے حوالے کردیں تو وہ جتنا علاقہ بھی سنبھال سکیں انہیں عطا کردیا جائے گا اور بھاری مقدار میں مالی تعاون بھی کیا جائے گا۔ عیسائی وفد نے اس پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرادیا کہ جس سرزمین پر مسیح نے جان دی ہم اسے مسلمانوں کے حوالے کریں گے نہ ہی فروخت کریں گے۔ سلطان نے مزید فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور انہیں کہا کہ اگر وہ پرامن طور پر شہر مسلمانوں کی نگرانی میں دے دیں تو انہیں بدستور وہیں بسے رہنے کی اجازت دی جائے گی اور وہ القدس اور شہر کے اردگرد "یوم خمیس" تک پانچ میل کے علاقے کے مختار ہوں گے، وہاں زراعت کرسکیں گے اور شہر کے دفاعی انتظامات کو مزید مضبوط بنانے کے بھی مجاز ہوں گے، مسلمان ایک طے شدہ مدت تک انہیں سامان خورد ونوش بھی مہیا کریں گے اور ان کے تمام اخراجات کی کفالت کریں گے۔ اس طے شدہ مدت کے اندر اندر اگر نصرانیوں کو بیرونی کمک پہنچ جائے تو القدس بدستور انہی کے پاس رہنے دیا جائے گا لیکن اگر کمک نہ پہنچ سکی تو وہ شہر مسلمانوں کے حوالے کردیں گے اور مسلمان انہیں مال ومتاع سمیت کسی اور عیسائی ملک میں پہنچادیں گے۔ نصرانیوں نے اسے بھی مسترد کردیا۔ تب سلطان نے قسم کھائی کہ اب شہر کو بزور شمشیر فتح کیا جائے گا۔[1]

مگر یاد رکھیے اس روایت کا کہیں کوئی ثبوت موجود نہیں۔ عسقلان میں سلطان کی القدس کے نصرانیوں سے ایسی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

[1] صلاح الدین لین پول:197۔ الحروب الصلیبیۃ:162

رہی یہ بات کہ سلطان القدس میں خونریزی کو ناپسند کرتے تھے.....تو حقیقت یہ ہے کہ وہ القدس تو کیا کہیں بھی بے جا خونریزی کے حق میں نہیں تھے۔ مگر معرکۂ القدس سے پہلے جانبین میں اتنی سخت کشیدگی تھی کہ تلوار کے سوا کسی اور زبان کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ فریقین مرنے مارنے پر تلے تھے۔ نہ نصرانیوں نے اس وقت صلح کی کوئی بات کی نہ سلطان نے انہیں کوئی امید دلائی۔ سلطان نے عیسائیوں کو ایسی پیش کش ہرگز نہیں کی تھیں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں تو اتنا مال یا فلاں فلاں علاقے انہیں دے دیے جائیں گے۔ یہ بات بھی بالکل ہی غلط ہے کہ سلطان نے بس عیسائیوں کی ضد سے جھلا کر القدس کو بزورِ شمشیر فتح کرنے کی قسم کھالی تھی۔ اسلامی تاریخی روایات میں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ ظاہر ہے سلطان ایوبی کے قول وفعل کے بارے میں ان مسلم مؤرخین پر اعتماد کیا جانا چاہیے، جو سلطان کے رفیق کار تھے اور ان کی ہر بات کو قلم بند کیا کرتے تھے۔ ان کی روایات اس بات کی قطعاً تصدیق نہیں کرتیں کہ سلطان نے ایسی کوئی پیش کش کی تھی یا ایسی کوئی قسم کھائی تھی۔ عقلاً بھی یہ بعید ہے کہ سلطان ایوبی جیسے دانش مند قائد نے شہر فتح کرنے کی حکمت عملی کے بارے میں اپنا اختیار خود ختم کر دیا ہو اور خود کو ایک خاص حالت کا پابند بنانے کی غلطی کر لی ہو۔ صحیح بات جو ہم مستند روایات کے تحت پیچھے بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ سلطان کسی ''قسم'' کی وجہ سے نہیں بلکہ پیش آمدہ صورتحال کے تحت القدس کو بزورِ قوت فتح کر رہے تھے۔

❖ فتح القدس کے تحت ہم بتا چکے ہیں کہ جب سلطان کے حملے سے شہر کی فصیل ٹوٹ گئی تو اس وقت صلح کی پیش کش خود عیسائی وفد نے کی۔ مگر سلطان نے کہا کہ فیصلہ تلوار ہی کرے گی۔

مغربی مؤرخین کے مطابق سلطان نے اتنا سخت فیصلہ اس لیے سنایا تھا کہ ان پر القدس کو بزورِ شمشیر فتح کرنے کی قسم پورا کرنا واجب تھا۔ مگر پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قسم کھانے کی بات افسانہ ہے۔ صحیح بات یہ تھی کہ سلطان نے یہ سخت فیصلہ عیسائیوں کو نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کے لیے سنایا تھا، تاہم انہیں خوفزدہ کرنے کا ہدف حاصل کر لینے کے بعد سلطان نے بعد میں مذاکرات بھی کیے اور دشمن سے حسن سلوک بھی روا رکھا۔

❖ لین پول نے لکھا ہے کہ چونکہ سلطان پر شہر کو بزورِ قوت فتح کرنے کی قسم کی پابندی لازم تھی اس لیے وہ نرمی اختیار کرنے کی گنجائش محسوس نہیں کرتے تھے مگر مشیروں اور علماء کے کہنے پر انہوں نے اپنی قسم کو نرم کر دیا۔ مشیروں نے سلطان کو سمجھایا کہ اگر عیسائی غیر مشروط طور پر شہر حوالے کر دیں تو یہ شہر پر بزورِ قوت قبضے کے مترادف ہوگا اور سلطان کی قسم پوری ہو جائے گی۔ اس کے بعد سلطان اپنی صوابدید پر اہل شہر سے رحمدلانہ سلوک کر سکتے ہیں۔ سلطان نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل کیا۔

یہ بیان بھی بالکل غلط ہے۔ جب بزور شمشیر قبضے کی قسم کھانا ہی ثابت نہیں تو اس سے متعلقہ دیگر باتوں کا کیا جواز۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی اور سلطان نے علماء سے مشورہ کیا ہوتا تو اس کا علم کاتب عماد اصفہانی، ابن شداد اور سلطان کے دوسرے وقائع نگاروں کو کیوں نہ ہو سکا؟ انہوں نے اشارۃً بھی ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ بالفرض اگر سلطان نے ایسی قسم کھائی ہوتی تو بھی وہ اس کی پابندی پر مجبور نہ ہو سکتے تھے۔ شرعی مسئلے کے مطابق دس غریبوں کو کھانا کھلا کر یا غلام آزاد کر کے یا تین روزے رکھ کر قسم سے آزاد ہو جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ قسم والی روایت افسانہ ہے۔

فصل:5

اقصیٰ کا مسافر، منزل کی آغوش میں

27 رجب 583ھ کو القدس مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ مشہور قول کے مطابق اسی تاریخ کی شب حضور رحمت ﷺ کو سفر معراج کرایا گیا تھا، آپ ﷺ کو فرشتوں کی معیت میں براق پر مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لایا گیا۔ یہاں آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیائے سابقین نے آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ کیسا عجیب موقع تھا کہ اسی دن القدس ایک بار پھر اپنے ورثاء کو واپس مل رہا تھا۔ مسجد اقصیٰ 91 برس کی ویرانی کے بعد پھر سجدوں سے آباد ہونے والی تھی۔

سلطان کے سوانح نگار قاضی ابن شداد 27 رجب کو القدس کی فتح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس عجیب اتفاق کو دیکھیے، کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یہ مقام ایسے وقت میں مسلمانوں کو واپس دلایا جیسے وقت میں ان کے پیغمبر ﷺ کو معراج ہوئی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اطاعت کی قبولیت کی علامت ہے۔"[1]

شہر فتح ہوتے ہی مسلمان مسجد اقصیٰ کی طرف دوڑ پڑے۔ گنبدِ صخرہ کی چوٹی پر سونے کی مرصع صلیب ڈھلتے سورج کی کرنوں سے چمک رہی تھی مگر یہ اس کی چمک دمک کے آخری لمحات تھے۔ چند جوان تیزی سے گنبد پر چڑھ گئے، شہر کے اندر ہزاروں عیسائی اور فصیل کے باہر ہزاروں مسلمان بیک وقت یہ تاریخی منظر دیکھ رہے تھے۔ پرجوش جوانوں نے دیکھتے ہی دیکھتے طلائی صلیب کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف ایسا شور اٹھا کہ زمین و آسمان دہل گئے۔ مسلمان خوشی سے تکبیر کے نعرے بلند کر رہے تھے اور نصرانیوں کی صدمے میں ڈوبی ہوئی آہیں سنائی دے رہی تھیں۔[2]

مسلمانوں کے لیے کئی خوشیاں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ بیت المقدس مسلمانوں

---

1. النوادر السلطانیہ: ص 135
2. الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ فتح بیت المقدس

کے حوالے کیا گیا تو سورج ڈھل رہا تھا۔ نمازِ جمعہ کا وقت گزرتا جا رہا تھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ مسجد اقصیٰ میں نمازِ جمعہ ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ مسجد کی مغربی سمت کو جس طرف خانہ کعبہ تھا، نصرانیوں نے ایک عرصے سے نجاست گاہ بنا دیا تھا۔ یہاں ہر طرح کی آلائش ڈالی جاتی تھی۔ مردار خنزیر یہیں پھینک دیے جاتے تھے۔ پھر مسجد اور بیت القدس کے احاطے میں جگہ جگہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہیں اور صلیبیں آویزاں تھیں۔ مسجد میں نمازوں کی ادائیگی شروع کرنے سے پہلے ان نجاستوں سے پاکی اور کفر و شرک کے مظاہر سے تطہیر ضروری تھی چنانچہ اس روز مسجدِ اقصیٰ میں نمازِ جمعہ ادا نہ کی جا سکی۔ [1]

<u>اظہارِ تشکر کی محفل</u>: فتح کی خوشخبری راتوں رات دور دور تک پھیل گئی تھی اور اب ہر طرف سے عمائدِ سلطنت، فقہاء، علماء، صوفیاء، شعراء اور ادباء سلطان کو مبارک باد دینے چلے آرہے تھے۔ ان معزز مہمانوں کو باریابی کا موقع دینے کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی نے شہر پناہ کے باہر ایک تقریب منعقد کی۔ اس دور کے عام بادشاہوں کے برخلاف سلطان صلاح الدین بڑی سے بڑی فتح اور انتہائی مسرت کے مواقع پر بھی حدودِ شریعت سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ وہ ایسا جشن نہیں مناتے تھے جس میں راگ رنگ اور غل غپاڑہ ہو۔ وہ ایسی تقاریب کے قائل نہیں تھے جن میں اسلام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شراب و کباب اور رقص و سرود سے فتح کی شادمانی کو آلودہ کیا جائے۔ ان کی محفلیں اور جشن سب سادگی، وقار اور سنجیدگی کا نمونہ ہوتے تھے جن میں سخاوت، مہمان نوازی اور خاطر مدارات کے ساتھ حقیقی مسرت کا بڑے باوقار انداز میں اظہار کیا جاتا تھا۔

اس دن بھی سلطان کی مجلس ایسی ہی متانت کی عکاسی کر رہی تھی۔ شامیانوں کے درمیان سلطان کی نمایاں نشست تھی۔ دائیں بائیں ارکینِ دولت، امرائے فوج اور علماء و فقہاء براجمان تھے۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے نشستیں نمایاں رکھی گئی تھیں۔ سلطان سے ملاقات پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ مہمان جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے چہرے پر ایک عجیب چمک اور لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی...... نووارد مہمان جو ابتداء میں سلطان سے مرعوب ہو جاتے تھے اس مسکراہٹ سے حوصلہ پاتے تھے۔ [2]

<u>فتح کے بشارت نامے</u>: سلطان کے مصاحب ان سے درخواست کر رہے تھے کہ فتح کی خوشخبری پر

---

[1] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ، الروضتین: تحت 583ھ فی سنۃ ثلاث و ثمانین
[2] النوادر السلطانیہ: 135، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 683ھ فصل فی ذکر صلاح

مشتمل مراسلے بھیجنے میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے مگر سلطان کو اپنے دست راست شیخ عماد اصفہانی کا انتظار تھا جو بیروت کے محاصرے کے دوران بیمار پڑ کر علاج کے لیے دمشق چلے گئے تھے اور اب فتح القدس کی خبر سن کر تیزی سے ادھر چلے آرہے تھے۔ فتح کے دوسرے دن شیخ عماد اصفہانی آفتاب کی پہلی کرن کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور مراسلے نگاری کا کام شروع کر دیا۔ پہلے ہی دن ستر (70) خطوط مختلف اسلامی شہروں اور ملکوں کو روانہ کر دیے گئے۔ ①

✤ خلیفہ بغداد کے نام درج تاریخی خط ارسال کیا گیا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ②

''اللہ تعالیٰ نے تم میں سے اہل ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل لوگوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں ضرور حکومت عطا کرے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت عطا کی۔''

سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندوں کے لیے وعدۂ خلافت کو سچ کر دکھایا، مشرکین اور نافرمانوں پر فرزندان توحید کو غالب کر دیا اور دیوان عزیز (خلافت عباسیہ) کی سطوت کو اس خلافت کے ساتھ خصوصیت دی۔ یہ وہ فتح ہے کہ گزشتہ بادشاہ اور سابقہ زمانے اس کی آرزو کی مسرت، اس کی توقع کی سنسنی خیزی اور اس کے حصول کی حسرت کے ساتھ گزر گئے۔ اس تک رسائی سے ہمتیں جواب دے گئیں اور قوم کے حکمران القدس کا انتقام لینے میں ناکام رہے۔ پس سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے القدس نیک لوگوں کو لوٹا دیا، اسے ناپاکی سے بچا لیا اور اس کی فتح کی بابت من کی مرادیں پوری کیں، اسی نے یہاں کفر کی وحشت کو اسلام کی مانوسیت سے بدل دیا، یہاں آج کی اس فتح سے گزشتہ کل کی ذلت کو مٹا دیا۔ یہاں پادریوں، راہبوں، صلیب کے پجاریوں اور مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے والوں کی جہالت اور ضلالت کی جگہ فقہاء، علماء کو لا بسایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے گمراہ شہروں پر اپنے اہل علم مؤمن بندوں کو فتح یاب فرمایا اور ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی۔ الحمد للہ رب العالمین۔'' ③

✤ وزیر اعظم قاضی فاضل کو جو دمشق میں تھے مراسلے میں کہا: ''الحمد للہ ثم الحمد للہ یہاں جاہلوں اور احمقوں کی جگہ اہل علم وحلم آباد ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں بھی اور اس جگہ کو بھی آپ کی آمد کا انتظار ہے

① کتاب الروضتین: حوادث 583ھ [illegible]
② سورۃ النور، آیت 55
③ کتاب الروضتین: حوادث 583ھ [illegible]

کیونکہ ان فتوحات کے پیچھے آپ کی دعائیں کام کررہی تھیں۔"

✤ اپنے بھائی سیف الاسلام کو جو یمن میں تھا خط میں لکھا: "اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو فتح کرادیا جو 91 سال سے کفار کے ہاتھوں میں گروی تھا۔ اس کی قید بہت طویل ہوگئی تھی، کمزوری بڑھ گئی تھی، مسئلہ القدس سے اجنبیت عام ہوگئی تھی، اس کے ستون ضعیف ہوچکے تھے، غم بڑھ گیا تھا، حُسن زائل ہوگیا تھا، زمین خشک اور ہدایت کی شادابی ختم ہوچکی تھی۔ خوف غالب تھا اور امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ اسلام غمزدہ تھا کہ یہاں اللہ واحد کی بجائے عیسیٰ کو ابن اللہ کہا جارہا تھا۔ تثلیث قائم تھی اور صلیب حاکم۔ گزشتہ بادشاہوں نے بھی اس کو چھڑانے کی آرزوئیں کی مگر شیطان نے اپنا قبضہ مستحکم رکھا۔ لیکن اللہ کی مشیت میں طے تھا کہ انجام کار شیطان کی طاقت دفع ہوگی۔ چنانچہ اب یہاں قرآن کی تلاوت ہورہی ہے، احادیث بیان ہورہی ہیں، علم دین کے حلقے لگے ہیں۔ صخرہ شریفہ دلہن کی طرح سج گیا ہے۔"[۵]

شعراء کا خراجِ تحسین ✤ اس بے پایاں مسرت کے موقع پر سلطان کی تعریف وتوصیف اور بیت المقدس کی شان وعظمت پر مشرق ومغرب میں سینکڑوں قصیدے کہے گئے، درجنوں شعراء نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا مدحیہ کلام سنایا۔

✤ کاتب عماد اصفہانی جو ہر فتح پر قصیدہ پیش کرنے میں آگے آگے رہتے تھے، اس موقع پر اپنے جذبات پر کیسے قابو پاسکتے تھے۔ ان کے طویل قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

جُنُوْدُكَ اَمْلَاكُ السمَاءِ وَظَنُّهُم
عُدَاتُكَ جِنَّ الارضِ فِي الفَتْكِ لَاالاِنْسا

آپ کے سپاہی آسمانی فرشتے ہیں مگر ان کے
دشمن ان کی خونریزی دیکھ کر انہیں زمین کے جنات سمجھتے ہیں

فَلا يَسْتَحِقُّ الْقُدْسَ غَيْرُكَ فِى الورىٰ
فَاَنْتَ الَّذِى مِنْ دُونِهِم فَتَحَ الْقُدسا

آپ کے سوا مخلوق میں القدس کی فتح کا حقدار کوئی نہ بن سکا
ان میں آپ ہی ہیں جس نے القدس فتح کیا

وَمِنْ قَبلِ فتحِ الْقُدسِ كُنْتَ مُقَدَّساً
فَلاعَدِمَتْ اَخلاقُكَ الطُّهرُ والقُدسا

۵ [illegible]

القدس کی فتح سے پہلے بھی آپ پاکیزہ تھے
آپ کے اخلاق طہارت و پاکیزگی سے کبھی خالی نہ رہے

نَزَعْتَ لباسَ الكُفْرِ عَن قُدْسِ اَرضِها
وَاَلْبَسْتَها الدِّينَ الَّذِى كَشَفَ اللُّبْسا

آپ نے اس پاک سرزمین سے کفر کا لباس اتار کر
اسے دین کی پوشاک پہنائی جو فریب کھول دیتا ہے

وَاَعَدتَ بيتَ ا ـِ اَحكامَ دِينِهِ
وَلا بِطرِيًّا اَبقَيْتَ فيه وَلا قِسّا

آپ نے اللہ کے گھر میں اس کے دینی احکام دوبارہ نافذ کردیے
یہاں کوئی پادری باقی چھوڑا نہ راہب

وَقَد شَاعَ فى الآفاقِ عَنكَ بَشارةٌ
بِاَنَّ اَذانَ القُدْسِ قد بَطَّلَ النَّقْسا

آپ کی جانب سے پوری دنیا میں یہ بشارت پہنچ گئی
کہ القدس کی اذان نے ناقوس کو فنا کردیا ہے

❖ مصر سے ابوعلی الحسن جوینی نے اس بھی شاندار قصیدہ ارسال کیا جسے سلطان کے روبرو پڑھ کر سنایا گیا، اس میں کہا گیا:

جُنْدُ السَّماء لِهٰذا المَلِكِ اَعْوانُ
مَنْ شَكَّ فيهم فَهٰذا الفتحُ بُرْهانُ

آسمانی فوجیں اس بادشاہ کی مددگار ہیں
جسے اس میں شک ہو اس کے لیے یہ فتح کافی ثبوت ہے

هٰذِى الفُتُوحُ فُتُوحُ الانْبِيَاءِ وَمَا لَها
سِوى الشُّكرِ بِالافْعَالِ اَثْمَانُ

یہ فتوحات دراصل انبیاء علیہم السلام (کے دین) کی فتوحات ہیں
اور اعمال (صالحہ) کیساتھ شکر ادا کرنے کے سوا ان کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی

تِسْعُونَ عَاماً بِلاداً تَصْرَخُ
وَالِاسْلَامُ نصارُهُ صُمٌّ وَعُمْيَانُ
نوے برس تک اللہ کے یہ مقدس شہر فریاد کرتے رہے
جب کہ اسلام کے مددگار بہرے گونگے بنے رہے
فَالآنَ لَبّٰی صَلاحُ الدین دَعْوَتُهم
بِأَمْرِمَنْ هُوَلِلْمِعْوَانِ مِعْوانُ
بس اب صلاح الدین نے ان شہروں کی پکار پر
اس کے حکم سے لبیک کہا جو مددکرنے والے کا مددگار ہے

✤ مصر کے ایک اور معروف شاعر الجوانی نے اپنے دلی تاثرات کو یوں لکھا کہ آنکھیں بھر آتی ہیں:

أَ تَرٰى مَناماً مَا بِعَيْنِيْ اَبْصُرُ
اَلْقُدْسُ يُفْتَحُ وَالْفَرَنْجَةُ تُكْسَرُ
میں جو کچھ جاگتی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کیا تو اسے خواب سمجھ رہا ہے؟
بیت المقدس فتح ہوچکا ہے اور فرنگی شکست کھا چکے ہیں
وَمَلِيْكُهُم فِي الْقَيْدِ مَصْفُوْدٌ وَلَمْ
يُرَقَبْلَ ذاكَ لَهُم مَلِيْكٌ يُؤْسَرُ
ان کا بادشاہ (گائی) زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے
جبکہ اس سے پہلے ان کا کوئی بادشاہ گرفتار نہیں ہوا
قَدْ جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ الَّذِی
وَعَدَالرَّسُوْلُ فَسَبِّحُوْا وَاسْتَغْفِرُوْا
اللہ کی مدد آن پہنچی اور وہ فتح نصیب ہوئی
جس کا رسول ﷺ نے وعدہ کیا تھا، پس تسبیح اور استغفار کرو
فُتِحَ الشامُ وَطُهِرَ الْقُدْسُ الَّذِی
هُوَفِی الْقِيامَةِ لِلأَنامِ الْمَحْشَرُ
شام فتح ہوا اور وہ ارضِ مقدس پاک ہوگئی
جو قیامت میں تمام مخلوق کی اجتماع گاہ بنے گی

❖ اسپین کے مشہور مسلم سیاح ابوالحسین ابن جبیر اندلسی جو فتح القدس سے چند برس پہلے عالم اسلام کے کئی ممالک کے علاوہ ایوبی سلطنت کا دورہ بھی کر چکے تھے، اس فتح کی خوشخبری ملنے پر ہلکی پھلکی بحر میں اپنی مسرت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

ثَأَرْتَ لِدِینِ الْهُدٰی فِی الْعِدٰی
فَآثَرَكَ اللهُ مِنْ ثَائِرٖ
آپ نے دشمنوں سے دین ہدایت کا انتقام لیا
پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر بدلہ لینے والے پر فضیلت دی

وَقُمْتَ بِنَصْرِ اِلٰهِ الْوَرٰی
فَسَمَّاكَ بِالْمَلِكِ النَّاصِرِ
آپ مخلوق کے رب (کے دین) کی نصرت کے لیے کھڑے ہوئے
تو اس نے آپ کو "الملک الناصر" کا نام دے دیا

وَجَاهَدْتَ مُجْتَهِدًا صَابِرًا
فَلِلّٰهِ اَجْرُكَ مِنْ صَابِرٖ
آپ نے جدوجہد کے ساتھ صبر کرتے ہوئے جہاد کیا
پس اے صبر کرنے والے اللہ ہی آپ کو اجر دے

تَبِیْتُ الْمُلُوْكُ عَلٰی فُرْشِهِمْ
وَتَرْفُلُ فِی الزَّرَدِ السَّابِرِ
دوسرے بادشاہ اپنے بستر پر شب گزارتے ہیں
جبکہ آپ اپنی زنجیر دار زرہ میں مزے سے چلتے ہیں

وَتُؤْثِرُ جَاهِدَ عَیْشِ الْجِهَاد
عَلٰی طِیْبِ عَیْشِهِمِ النَّاضِرِ
آپ نے جہاد کی سخت زندگی کو
ان بادشاہوں کی ناز و نعمت کی زندگی پر ترجیح دی ہے

فَتَحْتَ الْمُقَدَّسَ مِنْ اَرْضِهٖ
فَعَادَتْ اِلٰی وَصْفِهِ الطَّاهِرِ

آپ نے ارضِ مقدس کو فتح کیا
اب وہ اپنے اصل پاکیزہ وصف پر واپس لوٹ آئی ہے

لَكُمْ ذَخَرَ اللّٰهُ هٰذَا الْفُتُوْحَ
مِنَ الزَّمَنِ الْأَوَّلِ الْغَابِرِ

اللہ نے یہ فتوحات آپ کے لیے جمع کر رکھی تھیں
زمانہ قدیم سے، ہمیشہ سے

وَخَصَّكَ مِنْ بَعْدِ فَارُوْقِهٖ
بِهَا لِاصْطِنَاعِكَ فِى الْاٰخِرِ

اللہ نے اپنے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کو اس سعادت کے لیے چنا
کیونکہ آپ آخرت کو ترجیح دیتے ہیں

مَحَبَّتُكُمْ اُلْقِيَتْ فِى النُّفُوْسِ
بِذِكْرِكُمْ فِى الْوَرٰى طَائِرٍ

آپ کی محبت دلوں میں اتاردی گئی ہے
اور آپ کی شہرت کا پنچھی زمانے میں محوِ پرواز ہے [5]

بیت المقدس کو پاک کردیا گیا: سلطان صلاح الدین ایوبی اگلے جمعہ کی نماز پورے اہتمام سے مسجد اقصیٰ میں ادا کرنا چاہتے تھے، انہوں نے فوری طور پر کفروشرک کی علامات سے مسجد کی تطہیر، اس کی ضروری مرمت اور تعمیراتی کام کا حکم دے دیا تھا۔ نصرانیوں نے مسجد اقصیٰ کی پاکیزگی، خوبصورتی اور دلکشی کو پامال کرتے ہوئے گنبد صخرہ اور مسجد اقصیٰ کی اصل شکل کو مسخ کردیا تھا۔ دیواروں پر پیغمبروں اور ولیوں کی فرضی تصاویر نقش کردی تھیں۔ جگہ جگہ ان کی مورتیاں نصب اور صلیبیں آویزاں تھیں۔ بیت المقدس میں کئی چرچ بنالیے گئے تھے۔ مسجد اقصیٰ کے ساتھ رہائشی مکانات بنا کر اس کی ہیئت بدل دی گئی تھی۔ محراب مسجد کو دیوار چن کر چھپادیا گیا تھا۔ گنبدِ صخرہ کے نیچے چرچ اور قربان گاہ بنا کر وہاں بے ہودہ تصاویر کی بھرمار کردی گئی تھی۔ وہاں موجود مقدس چٹان ''صخرہ شریفہ'' پر خنزیر کی شبیہیں بنادی گئی تھیں اور اس کو سنگ مرمر کی سلوں سے اس طرح ڈھانپ دیا گیا تھا کہ اسے دیکھنا ناممکن ہوگیا تھا۔

[5] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/360۔372 فصل فی سنۃ 583ھ

علامہ ابن اثیر اسے ڈھانپنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پادری ایک عرصے تک زائرین کو اس مقدس چٹان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرتے تھے۔ یورپ میں اس تبرک کی بڑی مانگ تھی۔ جو زائر اس کا ایک ٹکڑا بھی پانے میں کامیاب ہو جاتا وہ اسے اپنے وطن لے جا کر اس کی بنیاد پر ایک چرچ تعمیر کر لیتا اور اس ٹکڑے کو چرچ کی قربان گاہ کی زینت بناتا۔ آخر کسی عیسائی حکمران نے یہ محسوس کیا کہ اس طرح چٹان بالکل ختم ہو جائے گی، اس نے یہ سلسلہ روکنے کے لیے اسے سنگ مرمر کی سلوں سے ڈھانک دیا۔

ان تبدیلیوں کے علاوہ نصرانیوں نے مسجد کی مغربی سمت ایک بڑا رہائشی بنگلہ اور ایک بلند و بالا چرچ تعمیر کر لیا تھا۔ مسجد کا جو حصہ اس رہائشی تعمیر کی زد میں آ گیا تھا، وہ ان کے لوازمات مثلاً طہارت خانوں اور بیت الخلاؤں وغیرہ سے بھی آلودہ ہو رہا تھا۔ تعصب و عداوت پر مبنی ان بھونڈی تعمیرات نے پیغمبروں کی مقدس عبادت گاہ کا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے حکم کے مطابق نصرانیوں کی ان تمام تعمیرات کو منہدم کر دیا گیا، محراب مسجد کو کھول دیا گیا، صخرہ شریف سے سنگ مرمر کی سلوں کو ہٹا دیا گیا، مورتیاں توڑ دی گئیں، تصاویر اور صلیبیں مٹا دی گئیں۔ گنبد صخرہ اور مسجد کو مکمل طور پر پاک وصاف کر دیا گیا۔ [1]

<u>القدس میں پہلا جمعہ، قاضی ابو المعالی کا تاریخی خطبہ</u>: القدس کی فتح کے آٹھویں دن تک مسجد کی تطہیر کا کام مکمل ہو چکا تھا، البتہ مرمت کا کام جاری تھا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور شعبان کی چوتھی تاریخ۔ سلطان نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ جمعہ بہر حال مسجد اقصیٰ میں ادا کرنا ہے۔ چنانچہ صبح سے بیت المقدس میں ایک عجیب چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ دور دور سے عوام وخواص کے قافلے اس اجتماع میں شرکت کے لیے چلے آ رہے تھے۔ نماز جمعہ کے وقت مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پہلی صف سے گنبد صخرہ تک مسلسل صفیں بن چکی تھیں۔ سلطان صلاح الدین آخری صفوں میں تھے جو گنبد صخرہ کے سائے میں بنائی گئی تھیں۔ [2]

اس دن نماز جمعہ کے خطبے اور امامت کی ذمہ داری ایک بہت بڑی سعادت اور ایک بے مثل شرف تھا۔ لوگ صبح سے اندازے لگا رہے تھے کہ یہ اعزاز کسے نصیب ہوگا۔ سلطان کے وابستگان میں ایک سے بڑھ کر ایک اہل علم وفضل اور ورع وتقویٰ کے آفتاب و ماہتاب موجود تھے۔ پھر اس موقع پر عالم اسلام کے اور بھی کئی نامور ائمہ، مشائخ اور فقہاء تشریف لے آئے تھے۔ جمعہ کی پہلی اذان تک تذبذب

---

1. کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 3/377_378، الکامل فی التاریخ: حوادث 583ھ
2. کتاب الروضتین: 3/381

کی یہ فضا قائم تھی۔ تب سلطان نے دمشق کے قاضی القضاۃ محی الدین ابو المعالی کو یہ اعزاز سونپا۔ قاضی صاحب منبر پر تشریف فرما ہوئے تو لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر ان کی زیارت کرنے لگے۔ مؤذن نے دوسری اذان دی اور قاضی صاحب خطبے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ [5]

انہوں نے فصیح و بلیغ عربی میں ایسا شاندار خطبہ دیا کہ لوگ وجد میں آ گئے۔ کاتب عماد اصفہانی کے بقول سحبان بن وائل کی سجع بندیاں بھی اس تقریر کے آگے ہیچ تھیں۔ قاضی صاحب نے انوکھے انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، حضور ﷺ اور خلفائے اربعہ پر درود بھیجا اور پھر انتہائی مؤثر پیرائے میں ایک تقریر کی جس میں اظہارِ مسرت بھی تھا اور احساسِ تشکر بھی۔ جوش بھی تھا اور سنجیدگی بھی، حوصلہ افزائی بھی تھی اور تنبیہ و نصیحت بھی۔ تقریر کے دوران حاضرین کے دل موم کی طرح پگھل رہے تھے، آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور دل شکر و امتنان کے جذبات سے لبریز تھے۔ قاضی القضاۃ نے موقع کے مطابق پہلے درج ذیل آیات قرآنیہ تلاوت کیں:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

پھر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مُعِزِّ الْاِسْلَامِ بِنَصْرِهٖ وَمُذِلِّ الشِّرْكِ بِقَهْرِهٖ وَمُصَرِّفِ الْاُمُوْرِ بِاَمْرِهٖ وَمُدِيْمِ النِّعَمِ بِشُكْرِهٖ وَمُسْتَدْرِجِ الْكَافِرِيْنَ بِمَكْرِهٖ الَّذِيْ قَدَّرَ الْاَيَّامَ دُوَلًا بِعَدْلِهٖ وَجَعَلَ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ بِفَضْلِهٖ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اسلام کو اپنی نصرت سے عزت بخشی، شرک کو اپنے قہر سے رسوا کیا، جو تمام امور کو اپنے حکم سے ادلتا بدلتا ہے، جو نعمت کا شکر کرنے پر اسے باقی رکھتا ہے، جو

5 کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: 381/3

کفار کو اپنی تدبیر سے ڈھیل دیتا ہے، جو دنوں کو اپنے انصاف کے مطابق پھیر دیتا ہے، جس نے اپنے فضل سے اخروی کامیابی کو پرہیز گاروں کے لیے خاص کیا ہے، جس نے بندوں پر اپنا سایۂ رحمت پھیلا رکھا ہے، جس نے اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دکھایا ہے۔ وہ رب تمام بندوں پر غالب ہے، اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اپنی شان کے مطابق ظاہر ہے، اس سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے، اس کے خلاف کوئی درخواست دائر نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق حکم دیتا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

میں اس کی تعریف بیان کرتا ہوں کہ اس نے اپنے دوستوں کو غالب کیا اور عزت دی، اپنے دین کے مددگاروں کی مدد کی، اپنے بیت المقدس کو شرک کی ناپاکی سے پاک کیا۔ یہ ایسے شخص کی حمد ہے جو دل کی گہرائیوں سے بھی ثناخواں ہے اور ظاہراً زبان سے بھی۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ یکتا ہے، بے مثال ہے۔ نہ کوئی اس سے پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ یہ ایسے شخص کی گواہی ہے جس کا دل توحید نے پاک کر دیا ہے اور اس نے اس کلمے سے اپنے رب کو راضی کیا ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ جنھوں نے شکوک دور کیے، شرک کو مٹایا اور جھوٹ کے پردے چاک کیے۔ جن کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لایا گیا۔ یہاں سے آسمان کی بلندیوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا جس کے پاس جنۃ الماویٰ ہے۔ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ چوکی نہ حد سے بڑھی۔

اللہ کی رحمتیں ہوں ان پر اور ان کے خلیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر جو سب سے پہلے ایمان لائے اور امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر جنھوں نے سب سے پہلے اس جگہ سے صلیبی نشانات ہٹائے۔ اور امیر المومنین عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر جنھوں نے قرآن مجید جمع کیا اور امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر جنھوں نے شرک کو اکھاڑ پھینکا اور بتوں کو توڑ ڈالا۔ اور آل و اولاد اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور ان سب پر جنھوں نے ان کی نیکی کے ساتھ پیروی کی۔

لوگو! اللہ کی رضامندی کی خوشخبری لو جو اصل مقصود اور اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اللہ نے ہماری گم شدہ متاع گمراہ لوگوں سے ہمیں واپس دلا دی۔ تقریباً ایک صدی تک مشرکین کے ہاتھوں پامال ہونے کے بعد اسے پھر سے اسلام کی آغوش میں پہنچا دیا۔ یہ گھر جس کا اللہ نے احترام کرنے اور اس میں اپنا نام لینے کا حکم دیا ہے، پاک کر دیا گیا ہے۔ اس کے راستے جن میں شرک کی آلودگی

بھر چکی تھی اور شرکیہ علامات ثبت ہو چکی تھیں، صاف کر دیے گئے ہیں۔ اللہ نے اسے توحید کے ساتھ پھر سے سربلند کر دیا ہے، کیونکہ توحید اور تقویٰ پر ہی اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ہر دور میں اس کی تعمیر تقویٰ کی اساس پر ہوئی ہے۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا وطن اور تمہارے پیغمبر ﷺ کی جائے معراج ہے۔ یہ وہی قبلہ ہے جس کی طرف تم ابتدائے اسلام میں رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے۔ یہ انبیاء کا مسکن، اولیاء کی جائے ارادت، رسولوں کا ٹھکانہ، وحی کا مقام اور امر و نہی کی منزل ہے۔ اسی جگہ حشر و نشر ہو گا۔ یہ وہی مقدس سرزمین ہے جس کا ذکر اللہ نے قرآن پاک میں کیا ہے۔ یہ وہی مسجد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ملائکہ مقربین کی موجودگی میں نماز ادا کی۔ یہی شہر ہے جس میں اللہ نے اپنے بندے، رسول اور کنواری مریم کی طرف القاء کیے گئے کلمے اور روح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا۔ اللہ نے انہیں رسالت سے مشرف اور نبوت سے مکرم بنایا۔ وہ اپنے مقام عبودیت سے کبھی نہ ہٹے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾

مسیح کو اس بات سے ہرگز کوئی عار نہیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور نہ ہی مقرب فرشتوں کو۔

اور ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی تو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہے۔

حضرات! یہ قبلہ اوّل، کائنات کی دوسری قدیم ترین مسجد اور تیسرا حرم پاک ہے۔ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے بعد اسی کی طرف مستقل سفر کیا جاتا ہے۔ اگر اللہ نے اپنے بندوں اور پوری دنیا کے باشندوں میں سے آپ کو بطور خاص نہ چنا ہوتا تو اس شہر کی فتح کی فضیلت کیوں عطا کرتا۔ اس شرف میں کوئی آپ کا شراکت دار اور ہم سر نہیں۔ خوش قسمت ہے وہ لشکر جس کے ہاتھ پر نبیوں کے معجزات جیسے واقعات، اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کی سی کرامات، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی عزیمت، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسی فتوحات، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسی لشکرکشی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسی شجاعت ظاہر ہوئی۔

تم نے اسلام کی تاریخ میں قادسیہ کے معرکے، یرموک کی لڑائی، خیبر کے حملے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جنگوں کی یاد تازہ کر دی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے حبیب محمد ﷺ کی طرف سے بہترین جزائے خیر عطا کرے اور دشمنوں کے مقابلے میں تمہاری جان نثاری اور جدوجہد کو قبول فرمائے۔

اس کا قرب پانے کے لیے تمہارے بہنے والے خون کو شرف قبولیت نصیب ہو۔ اللہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت میں داخل کرے جو اہل سعادت کا گھر ہے۔

لوگو! اللہ تم پر رحم کرے، اس نعمت کی قدر کرلو جیسا کہ اس کی قدردانی کا حق ہے۔ تم پر جو شکر واجب ہے اسے اللہ کی رضا کے لیے ادا کرتے رہو۔ اس کا تم پر بہت بڑا احسان ہے کہ یہ فتح کی نعمت بطور خاص تمہیں عطا کی اور تمہیں اس خدمت کے لیے قبول کیا۔

یہی تو وہ فتح ہے جس کے لیے آسمان کے دروازے کھل گئے۔ جس کی روشنی سے اندھیروں کے چہرے منور ہو گئے۔ جس پر مقرب فرشتے بھی خوش ہوئے اور انبیاء و رسل کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اس سے بڑھ کر تم پر کیا انعام ہوسکتا ہے کہ اس آخری دور میں تم کو بیت المقدس کا فاتح بنایا۔ آفتاب نبوت کے پردہ کر جانے کے بعد تمہیں وہ لشکر بنایا گیا جس کی شمشیروں نے اسلام کے پرچم بلند کیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ محروموں کی بہ نسبت اس نعمت کو پانے والے زیادہ غافل ہو جائیں اور ناقدرے بن جائیں۔

کیا یہ وہی گھر نہیں جس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا اور ارشاد فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا﴾

کیا یہ وہی جگہ نہیں جس کی عظمت بادشاہوں نے مانی، جس کی تعریف رسولوں نے کی۔ جس میں تمہارے رب کی چاروں آسمانی کتب پڑھی جاتی رہیں۔ کیا یہ وہی گھر نہیں جسے حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھ پر فتح کرانے کے لیے اللہ پاک نے سورج کو غروب ہونے سے روک دیا اور اس کی مسافت کو طویل کر دیا تاکہ القدس کی فتح آسان اور قریب تر ہو جائے۔

کیا یہ وہی قبلہ نہیں جس کی فتح کے لیے اللہ پاک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا اور ان کی قوم میں سے دو کے سوا کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر اس سرکشی کی پاداش میں ان کی قوم کو وادیٔ تیہ میں محصور کر دیا۔

لوگو! اللہ کا شکر بجالاؤ کہ اس نے ایسے مقام کی فتح کے بارے میں تمہارے عزائم پورے کیے، جس سے بنی اسرائیل تمام جہانوں پر فضیلت کے باوجود محروم رہے۔ تمہیں ایسی سعادت بخشی جس سے گزشتہ اقوام نامراد رہیں اور اس مہم کے بہانے تمہیں متحد اور مجتمع کر دیا حالانکہ تم پہلے منتشر تھے اور اس نے تمہیں آج کل اور پرسوں کے تذبذب سے بچالیا۔

مبارک ہو کہ اب اللہ نے تمہارا ذکر اپنے فرشتوں میں کیا ہے۔ تم جو کل تک اپنی خواہشات کے تابع تھے اب اس کا لشکر بن چکے ہو۔ فرشتے تمہارے قدردان ہیں کہ تم ہی اس گھر میں کلمۂ توحید بلند کر رہے ہو۔ اسے تسبیح وتحمید سے آباد کر رہے ہو۔ اس کے راستوں سے کفر وشرک اور تثلیث کی نجاستوں اور گندے عقائد کی پلیدی کو دور کر چکے ہو۔ ہاں اب فرشتے بھی تمہارے لیے استغفار کر رہے ہیں اور تمہارے لیے رحمت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

لوگو! اللہ تم پر رحم کرے! پرہیز گاری کے ساتھ اللہ کے اس ہدیے کی حفاظت کرو اور اس عطیے کی نگرانی رکھو، جسے تقویٰ نصیب ہوا وہ سلامت رہے گا۔ جس نے اس کا دامن تھام لیا وہ نجات پائے گا۔ خواہشات کی پیروی سے، ہلاکت خیز کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے اور الٹے پاؤں پھرنے سے بچتے رہنا۔ فرصت سے فائدہ اٹھا لو، جو کسر رہ گئی ہے اسے پورا کرلو۔

اللہ کے بندو! اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا جہاد کا حق ہے۔ اللہ کی خوشنودی میں اپنی جانوں کو بیچ ڈالو کہ اس نے تمہیں اپنا خاص بندہ بنایا ہے۔

خبردار! بچتے رہنا کہیں شیطان تم پر مسلط نہ ہو جائے۔ کہیں تم سرکشی نہ کرنے لگو اور یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ یہ فتح تمہاری تیز دھار تلواروں، تمہارے برق رفتار گھوڑوں اور دشمن کی سرزمین میں تمہاری پامردی کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے۔ نہیں!

﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

اللہ کی قسم، فتح ونصرت کے فیصلے صرف اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ بے شک وہ زبردست، حکمتوں والا ہے۔

اللہ کے بندو! اب جبکہ اللہ نے تمہیں یہ عظیم فتح عطا فرما دی، یہ گراں مایہ تحفہ بخش دیا، فتح مبین تمہارے لیے مختص کر دی اور تمہارے ہاتھوں کو اپنی مضبوط رسی سے وابستہ کرلیا تو ایسا نہ ہو کہ تم کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے لگو، بڑی بڑی معصیتوں میں منہمک ہو جاؤ۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا﴾

اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو تمہاری مثال اس سوت کاتنے والی کی سی ہوگی جو سوت کاتے اور پھر اسے دھجی دھجی کر کے پھینک دے، کہیں تم اس بد بخت کی طرح نہ ہو جاؤ۔

﴿الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾

جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا علم دیا ہو مگر وہ اس سے روگردانی کرے، شیطان اس کے پیچھے پڑ

جائے اور آخر وہ راہ سے بھٹک کر رہے۔

لوگو! جہاد! جہاد تو افضل ترین عبادت ہے، بڑے شرف والی مصروفیت ہے۔

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾

لوگو! تم اللہ کے دین کی مدد کرتے رہو، اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ کو یاد کرو اللہ تمہیں یاد رکھے گا۔ اللہ کا شکر کرتے رہو وہ تمہیں اور زیادہ عطا کرے گا اور تمہاری قدردانی کرتا رہے گا۔

ہاں! بیماری کے خاتمے کی خوب کوشش کرو، دشمنوں کا قلع قمع کردو، اللہ کی باقی اس زمین کو بھی پاک صاف کردو جہاں سے ہونے والے اعمال اللہ اور اس کے رسول کی ناراضی کا سبب بن رہے ہیں۔ کفر کی شاخوں کو بھی کاٹ ڈالو اور اس کی جڑوں کو بھی نابود کردو۔ زمانہ پکار رہا تھا کہ اسلام اور ملت محمدیہ کا انتقام کب لیا جائے گا۔ اللہ اکبر! اللہ کے دین کو فتح ملی۔ اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کی۔ اس کا حکم غالب آ گیا۔ اسی کا فیصلہ نافذ ہوا اور اس نے کفار کو ذلیل وخوار کردیا۔

مسلمانو! یاد رکھنا یہ فرصت ملی ہے تو اسے غنیمت جانو، شکار سامنے ہے اس پر جھپٹ پڑو! مہمات درپیش ہیں ان کے لیے اپنی ہمتوں کا اظہار کرو اور اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاؤ۔ اپنے عزم کے لشکروں کو مرتب کرو اور حرکت دو۔ تمام کاموں کا دارو مدار ان کے اختتام پر ہی ہوتا ہے۔ تمام محنتوں کی حیثیت جمع پونجی کے بقدر ہوتی ہے۔ اللہ نے تمہیں ان نامراد دشمنوں پر غالب کردیا ہے جو تمہارے برابر یا تم سے تعداد میں زیادہ تھے۔ پھر اب کیا ڈرنا ہے کہ اب تو تمہارے بیس افراد کے مقابلے میں ان کا ایک رہ گیا ہے۔ دیکھو! اللہ نے کیا فرمایا ہے۔

﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾

تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوئے تو کفار کے دوسو افراد پر غالب رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کی تعمیل اور ممنوعات سے احتراز میں ہماری اور آپ کی مدد فرمائے، اور ہم مسلمانوں کی اپنی بارگاہ سے خاص نصرت فرمائے۔

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ مبَعْدِهٖ﴾

اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا، مگر وہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے۔"

اس کے بعد قاضی القضاۃ نے آہوں اور سسکیوں کی گونج میں یہ بے تابانہ دعا کی!!

"یا اللہ! اس بادشاہ کی حکومت کو باقی رکھ جو تیری ہیبت کے آگے جھکا ہوا بندہ ہے، تیری نعمتوں کا معترف اور تیری عطا کا شکر گزار ہے، جو تیری شمشیرِ آبدار ہے، جو تیرا چمکتا شعلہ ہے۔ تیرے دین کا محافظ ہے۔ تیری حدود کا نگران ہے۔ تیرے احکام کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ یہ سیدنا صلاح الدین سلطان الناصر ہے جس نے کلمہ توحید پر لوگوں کو اکٹھا کر دیا ہے اور صلیبیوں کو مٹا دیا ہے۔ یہ صلاح الدین بھی ہے اور صلاح الدنیا بھی۔ دین و دنیا کی اصلاح کرنے والا ہے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کا سلطان ہے جس نے بیت المقدس کو پاک کیا ہے۔ یہ یوسف بن ایوب ہے جس نے عباسی خلیفہ کی حکومت کو حیاتِ نو بخشی ہے۔

یا اللہ! اس کی وسیع مملکت کو مستحکم فرما، اپنے فرشتوں کو اس کے پرچموں کے ہمراہ رکھ۔ دینِ حنیف کے لیے اس کی کوششوں کا بہترین بدلہ دے۔ ملت محمد یہ کے لیے اس کے عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اسلام کے لیے اس کی ذات کو تا دیر باقی رکھ۔ ایمان کے لیے اس کے چشمے کو جاری رکھ۔ مشرق و مغرب میں اس کے پیغام کو عام فرما۔

یا اللہ! جس طرح بیت المقدس کی فتح سے ہماری پس و پیش اور مایوسی کے باوجود تو نے اس بادشاہ کے ہاتھ پر اس سرزمین کو آزاد فرما دیا، اسی طرح اس کی فتوحات کو دنیا کے کونے کونے تک لے جا۔ کفار کے گڑھ اور ان کی پیشانیاں اس کے آگے مسخر کر دے۔ جو لشکرِ کفار اس سے بھڑے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، جو گروہ اس کے آڑے آئے وہ بکھر جائے۔

اے اللہ! حضرت محمد ﷺ کی جدوجہد کو مشکور فرما، ان کے اوامر و نواہی کو مشرق تا مغرب ساری دنیا میں نافذ فرما۔ یا اللہ! آپ ﷺ کی برکت سے شہروں کے مراکز کو بھی اچھا کر دے اور مضافات کو بھی۔ ملک کے اضلاع کو بھی درست کر دے اور سرحدوں کو بھی۔ اے اللہ ان کے طفیل کفار کے مسخ چہروں کو رسوا کر دے اور سرکشوں کی ناک نیچی کر دے۔ اس وطن کے گیسوؤں کو سب شہروں تک پھیلا دے۔ اس کے لشکروں کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دے۔

اے اللہ اس بادشاہت کو اس حکمران اور اس کی اولاد میں تا قیامت باقی رکھ۔ اور اس کا سایہ اپنی اولاد اور سعادت مند بھائیوں پر تا دیر قائم رکھ۔ بادشاہ کی قوت کو ان کی بقا کے ذریعے مضبوط کر۔ ان کے دوستوں کی عزتوں کو باقی رکھ۔ اے اللہ جس طرح تو نے اس بادشاہ کو ایسی عظیم نیکی کی توفیق دی جو مدتوں بعد بھی زندہ رہے گی اور کتنے ہی ماہ و سال گزرنے پر بھی اس کی شہرت رہے گی، تو اسی طرح اسے وہ دائمی بادشاہت بھی دے دے جو متقیوں کو جنت میں نصیب ہو گی۔ اس

کے حق میں یہ دعا قبول فرمالے:

﴿رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ﴾

میرے رب مجھے توفیق مرحمت کر کہ میں تیری نعمتوں کا شکر گزار رہوں جو مجھ پر اور میرے والدین پر ہوئیں اور میں ایسے نیک عمل کرتا رہوں جن سے تو خوش ہو اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرمالے۔"

نماز جمعہ کے بعد سلطان ایوبی نے زین الدین نجا الواعظ سے فرمائش کی کہ وہ حاضرین سے خطاب کریں۔ انہوں نے منبر پر چڑھ کر بیت المقدس کی فتح، فریضۂ جہاد، علامات قیامت، میدانِ محشر اور جنت وجہنم پر ایک ایسی مؤثر، پرجوش اور فصیح وبلیغ تقریر کی جس سے حاضرین کی آنکھیں نم ہوگئیں اور سب کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔[1]

نصرانیوں کا انخلاء اور سلطان کا حسن انتظام ❊ القدس کے بعد سلطان کی فوج اردگرد کے قلعے اور فصیل بند بستیاں بھی فتح کر چکی تھی۔ فلسطین میں کوئی زمین نصرانیوں کے قبضے میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ القدس کے غیر مسلم معاہدے کے مطابق چالیس دن کے اندر اندر فدیے کی رقم ادا کر کے ارضِ مقدس چھوڑ دینے کے پابند تھے۔ القدس کی فتح کے بعد اب تک شہر کے دروازوں پر کڑے پہرے لگے ہوئے تھے تاکہ اہلِ شہر کے لیے انخلاء کے سرکاری انتظامات کی تکمیل اور زرِ فدیہ کی ادائیگی سے پہلے کوئی شخص نقل مکانی نہ کر پائے۔ شہر کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ ساٹھ ہزار تو صرف وہ پیشہ ور گھڑسوار اور پیادہ سپاہی تھے جو مسلمانوں سے لڑتے رہے تھے۔ کاتب عماد اصفہانی کے مطابق شہر کے مرد وزن اور بچے ایک لاکھ سے متجاوز تھے۔ علامہ ابن اثیر کے بقول شہر اتنا گنجان تھا کہ اس کی گلیاں اور چرچ لوگوں سے بھرے رہتے تھے اور چلنا پھرنا دشوار ہوجاتا تھا۔ پھر اس میں ہزاروں لوگ وہ تھے جو دور دراز سے القدس کی زیارت کے لیے آئے تھے اور بہت سے ایسے تھے جو عسقلان، رملہ اور غزہ جیسے شہروں پر مسلمانوں کے حملے سے پہلے یا اس کے بعد نقل مکانی کر کے القدس آگئے تھے۔

زرِ فدیہ کی وصولی اور عیسائی آبادی کا انخلاء ایک بہت بڑا اور پیچیدہ کام تھا مگر سلطان صلاح الدین نے اپنے رفقاء کی مدد سے اسے پوری خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی تیاری کر لی تھی۔ آخر انخلاء شروع ہوا۔ شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ سلطان کے سپاہی تعینات تھے تاکہ امن وامان برقرار رہے۔ ان

[1] کتاب الروضتین: حوادث 583ھ

سپاہیوں کی نگرانی کرنے کے لیے سلطان کے معتمد امیر موجود تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی غیر مسلم سے بدسلوکی نہ ہونے پائے۔ شہر کے تمام دروازوں پر سلطان کے افسران فدیہ کی رقم جمع کرنے کے لیے متعین تھے۔ ہر مرد دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ یا بچی دو دینار ادا کر کے شہر سے نکل رہے تھے۔ جو لوگ زرِ فدیہ ادا کرتے جا رہے تھے وہ صور جانے والے قافلوں میں شامل ہو رہے تھے۔ قافلوں کو صور تک بحفاظت لے جانا بھی سلطان کے سپاہیوں کی ذمہ داری تھی۔

فدیے کی ادائیگی کی ابتداء شہر کے سابق حاکم بالیان نے کی۔ اس نے باب داؤد پر تعینات افسر کو شاہ ہنری کے خزانے سے 70 ہزار دینار ادا کیے اور اپنی قوم کے سات ہزار غریب افراد کو آزاد کرا لیا۔ ان لوگوں کو شہر سے نکلنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد ہر دروازے سے فدیہ ادا کر کے نکلنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ مالدار اور صاحبِ حیثیت لوگوں کے لیے اتنی معمولی رقم ادا کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ آسانی سے نکل گئے۔ اگر ان کی اکثریت بالیان کی طرح اپنی قوم سے ہمدردی کا ثبوت دیتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ القدس کے تمام غریب عیسائی سہولت سے آزاد ہو کر اپنی منزل کی طرف نکل جاتے مگر خوشحال نصرانیوں میں سے چند ایک کے سوا سب نے بخل کا ثبوت دیا۔ وہ اپنی جان بچا کر نکل گئے اور مفلس لوگوں کو بڑی بے فکری سے غلامی کے لیے چھوڑ گئے۔ اگر زرِ فدیہ کچھ گراں ہوتا تو یقیناً نصرانیوں کی اکثریت غلام رہ جاتی مگر فدیے کی رقم معمولی تھی، متوسط طبقے کے لوگ بھی اسے ادا کر کے نکلتے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود ایسے نادار لوگ کم نہ تھے جو کچھ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر رحم دل سلطان اور ان کے کشادہ دل امراء رعایتوں میں اضافہ کرتے گئے۔ [1]

انخلاء کے عمل میں سلطان کی خوش تدبیری کا یہ عالم تھا کہ مقامی لوگوں سے ناروا سلوک کا کوئی ایک واقعہ بھی رونما نہیں ہوا۔ خود یورپی مؤرخین نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور سلطان کے اس بے مثال حسنِ سلوک اور حسنِ انتظام کی تعریف کی ہے۔ شہر کے دروازوں پر جہاں فدیہ وصول کیا جا رہا تھا سلطان کے خاص معتمد امیر موجود تھے جو ایک رجسٹر میں فدیہ ادا کر کے نکلنے والوں کے نام درج کر رہے تھے۔ ایسا کہیں نہیں ہوا کہ کسی سے فدیہ وصول کر لیا گیا ہو مگر اس کا اندراج رہ گیا ہو اور پھر اسے دوبارہ ادائیگی پر مجبور کیا گیا ہو۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ سلطان کی رعایت اور نرمی سے فائدہ اٹھا کر بعض افسر فدیہ وصول کرنے کی جگہ معمولی رشوت لے کر لوگوں کو چھوڑتے رہے۔ بعض مسلمانوں نے نصرانیوں سے زرِ فدیہ کی بہ نسبت کم رقم وصول کر کے انہیں مسلمانوں کا لباس پہنا دیا اور اس طرح ان کے نکل جانے کا انتظام

[1] الکامل فی التاریخ: حوادث 583ھ

کیا۔ بعض نے انہیں رسیوں کے ذریعے فصیل پھلانگ کر فرار ہونے کا موقع دیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے سلطان سے اجازت لے کر فدیہ کی رقم خود رکھ لی۔ بہر صورت نظم وضبط کی اس کمی سے صرف سلطان کے سرکاری خزانے کا نقصان ہوا۔ غیر مسلموں کو اس سے کوئی گزند نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ ان کے لیے اس طرح آسانی پیدا ہوگئی تھی۔ [1]

اس موقع پر کئی امراء نے سلطان سے درخواست کر کے غیر مسلموں کے مختلف طبقات کے قیدیوں کا معاملہ اپنے ذمے لے لیا اور پھر ان میں سے بعض کو کچھ لے کر اور بعض کو مفت میں جلد از جلد چلتا کر دیا۔ مظفر الدین کوکبری نے رُہا کے ایک ہزار اَرمنی نصرانیوں کا معاملہ سنبھال لیا۔ البیرہ کے حاکم نے بھی پانچ سو اَرمنیوں کو اپنا ہم وطن بتا کر ان کا فدیہ خود وصول کرنے کی اجازت لے لی۔ کاتب عماد اور کئی مشیروں کا خیال تھا کہ یہ رقم مرکزی خزانے ہی میں محفوظ کی جائے تا کہ آڑے وقت اور اگلی متوقعہ مہمات میں کام آئے مگر سلطان نے فدیے سے حاصل شدہ اس رقم کو جو مجموعی طور پر ایک لاکھ دینار تھی بلا تکلف امرائے سلطنت، علماء، فقہاء، صوفیاء، مہمانوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں سے ایک دینار بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ [2]

<u>سلطان کا رحم وکرم انتہاء پر</u>: القدس میں نصرانیوں کا ایک طبقہ وہ تھا جو یہاں مسلمانوں کی سابقہ حکومت کے دور سے آباد چلا آ رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا نسلی تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ سلطان کی جانب سے انخلاء کی پابندی کا اصل مقصد ان لوگوں کو باہر نکالنا تھا جو گزشتہ اکانوے برس میں مسلمانوں کو بے دخل کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ یورپی نسل کے یہ عیسائی یقیناً اب ارضِ مقدس میں رہنے کے حق دار نہیں تھے۔ مگر جو عیسائی خاندان صدیوں سے یہاں آباد تھے سلطان نے ان کے لیے رعایتی پہلو باقی رکھا۔ جب انہوں نے سلطان سے گزارش کی کہ وہ جزیہ ادا کرتے ہوئے یہیں رہنا چاہتے ہیں تو سلطان نے اس درخواست کو فوراً قبول کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ شہر کے ضعیف نصرانیوں اور زائرین کی خدمت کے لیے ہاسپٹلرز کے کارکنوں کو بھی شہر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

شہر چھوڑنے والے نصرانیوں کو اسلحے اور گھوڑوں کے سوا تمام مال ودولت کا بدستور مالک تسلیم کیا گیا تھا، اس لیے ان سے جتنا ممکن ہو سکتا تھا ساز وسامان اور نقدی ساتھ لے جا رہے تھے مگر اس کے باوجود گھروں کا سارا اثاثہ سمیٹنا عام لوگوں کے لیے ممکن نہ تھا چنانچہ نقل مکانی کرنے والے اپنا بہت سا فالتو

---

1. کتاب الروضتین: تحت 583ھ، البدایہ والنہایہ: تحت 583ھ
2. کتاب الروضتین: تحت 583ھ، النوادر السلطانیہ: ص: 135_136

سامان بیچ رہے تھے۔ ان میں قالین، مسہریاں، الماریاں، صندوق، عمارتی سامان، سنگ مرمر، منقش چوکے، کھڑکیاں، دروازے، تیار شدہ سامان، گل کاری کیے ہوئے پتھر، نگینے اور آرائشی چیزوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہ سامان وہ عیسائی بہت سستے داموں خرید رہے تھے جنہیں سلطان نے یہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمان سپاہی اور افسران بھی سامان خریدنے میں شریک تھے۔ اس کے باوجود بہت کچھ بچ گیا تھا۔[1]

آخر شہر تقریباً خالی ہوگیا۔ صرف وہی نصرانی باقی رہ گئے جو زرِ فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ اب معاہدے کے تحت یہ سب کے سب مسلمانوں کے غلام تھے مگر سلطان نے یہاں بھی پوری فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ جب بطریق (بڑے پادری) اور سابق حاکم بالیان نے جو ابھی تک القدس میں ٹھہرے ہوئے تھے، سلطان سے درخواست کی کہ ان غلاموں میں ایک ایک ہزار افراد انہیں عطا کر دیے جائیں تو سلطان نے فوراً ان کی خواہش پوری کردی اور انہوں نے ان دو ہزار افراد کو آزاد کر دیا۔ اس کے بعد سلطان نے غلامی کی زد میں آنے والے تمام بوڑھے لوگوں کو اپنی صوابدید پر آزادی کا تحفہ عطا کر دیا۔ سلطان کے کئی امراء نے اس طرح ہزاروں باندیاں اور ہزاروں غلام سلطان سے مانگ مانگ کر آزاد کیے۔[2]

<u>یروشلم کی ملکہ ازابیلا سے برتاؤ</u>❊ اب تک شام اور یورپ کے بعض معزز عیسائی خاندانوں کی خواتین القدس میں مقیم تھیں۔ سلطان نے ان کے ساتھ بھی احسان کا معاملہ کیا۔

سب سے اہم مسئلہ نصرانیوں کی ملکہ ازابیلا (سبل) کا تھا۔ القدس کے شاہی محل میں بسنے والی اس عورت نے اپنی مذہبی جنگ بڑی دلیری سے لڑی تھی۔ درحقیقت شام کے فرنگیوں کی اصل حکمران اور شاہی خاندان کی وارث یہی تھی۔ جہاں تک اس کے شوہر گائی کا تعلق ہے، وہ شاہی خاندان کا نہیں، بلکہ ایک یورپی سپاہی تھا۔ شاہ بالڈون چہارم کی موت کے بعد جب شاہی خاندان میں کوئی بالغ مرد نہ بچا تو ازابیلا نے اپنی قوم کو ایک مضبوط قیادت بخشنے کے لیے گائی سے شادی کر لی تھی اور اسے شاہی اختیارات دے کر مسلمانوں سے جنگ کا مرکزی کردار بنا دیا تھا مگر گائی حطین کے معرکے میں رسوا کن شکست کے بعد گرفتار ہو گیا تھا جس سے ملکہ کے منصوبے چکنا چور ہو گئے تھے۔ اب القدس پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد ازابیلا اپنے بارے میں کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھ سکتی تھی مگر ایک بے بس، کمزور

---

[1] کتاب الروضتین، تحت 583ھ، مالاسل فی التاریخ: تحت 583ھ

[2] صلاح الدین۔ لین پول:202

اور بے سہارا عورت پر طاقت جتانا سلطان صلاح الدین ایوبی کی شرافت کے خلاف تھا۔ انہوں نے حسب عادت مہربانی کا برتاؤ کرتے ہوئے اسے اس کے تمام مال و دولت اور حشم و خدم سمیت اس کی مرضی کی جگہ چلے جانے کی اجازت دے دی۔ ملکہ اس حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوئی، اس نے سلطان سے اجازت طلب کی کہ وہ اپنے شوہر گائی کے پاس جانا چاہتی ہے۔ گائی اس وقت مسلمانوں کی قید میں نابلس کے قلعے میں بند تھا۔ وعدے کے مطابق اسے چند ماہ بعد رہا کرنا طے تھا۔ سلطان نے اتنی مدت کے لیے ملکہ کو اس کے پاس بھیج دیا۔[1]

اپنے سب سے بڑے دشمنوں کے لیے اتنی فراخدلی کا مظاہرہ صلاح الدین ایوبی ہی کا کام تھا۔

ریجی نالڈ کی بیوہ پر احسان ❁ سلطان کے ہاتھوں قتل ہونے والے ملعون ریجی نالڈ کی بیوہ اس وقت قلعۂ کرک اور قلعۂ شوبک کی ملکہ تھی۔ وہ سوالی بن کر اپنے قلعے ''کرک'' سے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کا بیٹا ہمفری مسلمانوں کی حراست میں تھا۔ اس نے سلطان کا رحم و کرم دیکھ کر اپنے بیٹے کی رہائی کی درخواست کی۔ جب سلطان نے شرط لگائی کہ وہ قلعۂ کرک مسلمانوں کے حوالے کر دے تو اس نے خواہش ظاہر کی کہ پہلے اس کے بیٹے کو دمشق کے قید خانے سے بلوا کر اس کے سامنے لایا جائے۔ سلطان نے یہ خواہش پوری کر دی اور اسے اطمینان دلایا کہ جوں ہی کرک کا قلعہ مسلمانوں کو دیا جائے گا مسلمان اس کے لڑکے کو آزاد کر دیں گے۔ وہ بخوشی اس پر آمادہ ہو گئی مگر جب وہ اپنے مصاحبین کے ساتھ اپنے علاقے واپس گئی اور حسب وعدہ قلعہ مسلمانوں کے حوالے کرنا چاہا تو اس کے امراء نے بغاوت کر دی اور اسے وہاں سے دھتکار دیا۔ مجبور ہو کر اس نے ''صور'' میں پناہ لی اور سلطان سے ایک بار پھر اپنے بیٹے کی رہائی کی التماس کی۔ اس صورت حال میں سلطان اس کے بیٹے کو رہا کرنے کے پابند نہ تھے مگر انہوں نے اتنی رعایت کی کہ اس کا مال و دولت اور خدام وغیرہ جو مسلمانوں کی تحویل میں تھے واپس کر دیے اور ساتھ ہی تسلی دی کہ جب مسلمان کرک کا قلعہ فتح کر لیں گے تو اس کے بیٹے کو آزاد کر دیا جائے گا۔[2] (بعد میں سلطان نے یہ وعدہ پورا کیا)

یورپی تارک الدنیا ملکہ ❁ القدس میں یورپ کی ایک تارک الدنیا ملکہ بھی رہتی تھی۔ وہ الگ تھلگ درویشانہ زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے پاس غلاموں، باندیوں اور خدمتگاروں کی ریل پیل تھی۔ طرح طرح کے ہیرے جواہر اور نادر و نایاب موتی اس کے خزانے کی زینت تھے۔ سلطان نے اس کی

---

[1] کتاب الروضتین: جز 583ھ

[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: جز 583ھ، الکامل فی التاریخ: جز 583ھ

درخواست پر اسے تمام مال و دولت اور نوکروں چاکروں سمیت بحفاظت القدس سے نکلنے اور کسی نئی منزل تک جانے کی سہولت دی۔ [1]

<u>بڑے پادری سے چشم پوشی</u> ٭ شہر سے نکلنے والے آخری چند لوگوں میں بڑا پادری بطریق اعظم ہرکولیس بھی تھا۔ یہ القدس کے علاوہ وہاں کے سب سے قدیم اور بڑے گرجے ''کلیسائے قمامہ'' (چرچ سینٹ جان) کا سربراہ تھا۔ کلیسائے قمامہ دنیا بھر کے نصرانیوں سے نذرانے وصول کرتا تھا۔ اس کی شان و شوکت نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ عمارت پر پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی منقولہ دولت اور ساز و سامان بھی حد و شمار سے باہر تھا۔ قیمتی قالین، ریشمی پردے اور سونے چاندی کی درجنوں انواع کی چیزیں یہاں تھیں۔ نصرانیوں کے عقیدے کے مطابق یہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے تدفین تھی جسے سونے چاندی کی تختیوں سے سجایا گیا تھا۔ بڑا پادری ہرکولیس یہ سب کچھ لے کر جانا چاہتا تھا چنانچہ جب وہ شہر کے پھاٹک کی طرف روانہ ہوا تو اس کے پاس بڑا بھاری قیمتی ساز و سامان تھا۔ اس نے چرچ کی جتنی دولت ممکن تھی سمیٹ لی تھی، تبرکات کی حفاظت کے نام پر اس نے گرجے سے سونے کے پیالے، آب مطہر رکھنے اور بپتسمہ دینے کا سامان حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ''مرقد مسیح'' کے طلائی برتن تک ساتھ لے لیے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی ذاتی دولت اور ساز و سامان بھی بہت تھا۔ یہ مالدار پادری چاہتا تو اس مال کے ایک حصے سے کتنے ہی نصرانیوں کو آزاد کرا سکتا تھا مگر اسے اپنا مفاد زیادہ عزیز تھا۔

بہرکیف سلطان نے اس کے مال سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ عماد اصفہانی کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ بڑا پادری سب کے سامنے اتنا سامان سمیٹ کر لے جائے، انہوں نے سلطان سے کہا:

''ہم نے نصرانیوں کو ان کی ذاتی دولت کے بارے میں امان دی تھی۔ مگر یہ تو سب کا سب سامان لوٹ کر لے جا رہا ہے۔''

بعض مشیروں نے کہا:

''کیوں نہ ہم اس نالائق سے یہ سامان چھین لیں، اس طرح ہم اپنی معاشی طاقت بڑھا سکتے ہیں۔''

مگر سلطان نے ناگوار لہجے میں جواب دیا:

''میں اس سے عہد شکنی نہیں کروں گا۔''

انہوں نے کاتب عماد کو سمجھاتے ہوئے کہا:

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: حوادث 583ھ

"یہ لوگ ہماری تاویل کو نہیں سمجھیں گے۔ بلکہ ہم پر حلال کو حرام قرار دینے کا الزام لگائیں اور کہیں گے کہ مسلمانوں نے عہد کی پاسداری نہیں کی۔ ہم امان کے ظاہری مطلب کی پاسداری کریں گے اور انہیں موقع دیں گے کہ وہ اہل ایمان کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے رہیں۔"

آخر کار بڑا پادری بھی عام آدمیوں کی طرح صرف 10 دینار دے کر نکل گیا اور سلطان کی دیانت داری کی ایک اور مثال تاریخ کے صفحات پر نقش ہوگئی۔ [1]

ارنول کا اعتراف: صلیبی جنگوں کے ایک مشہور کردار ارنول نے سلطان کے حسن سلوک کے یہ واقعات بچشم خود ملاحظہ کیے تھے، اس کا بیان ہے کہ سلطان نے صلیبی جنگوں کے مقتول اور گرفتار نائٹوں کی بیویوں سے بڑا شریفانہ برتاؤ کیا، جب ان خواتین نے سلطان کے سامنے اپنی بدحالی کی فریاد کی تو سلطان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان خواتین کے شوہروں میں سے جو گرفتار تھے، وہ فوراً رہا کر دیے گئے۔ جن عورتوں کے خاوند قتل ہو چکے تھے انہیں ان کے مرتبے کے مطابق مال و دولت دے کر عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا گیا اور ہر طرح ان کی تشفی اور دلداری کی گئی۔ وہ سلطان کے اس احسان سے اتنی متاثر ہوئیں کہ ہمیشہ ان کی سخاوت کا ذکر ممنون لہجے میں کیا کرتی تھیں۔ [2]

لین پول کا خراج تحسین: اس موقع پر لین پول پہلی صلیبی جنگ میں القدس پر نصرانیوں کے قبضے کے دوران مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم کو یاد کر کے سلطان صلاح الدین کے رحم وکرم کو داد دیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ وہ کہتا ہے:

"جب ہم سلطان کے ان احسانات کو یاد کرتے ہیں تو ہمیں وہ وحشیانہ حرکات یاد آتی ہیں جو صلیبیوں نے بیت المقدس فتح کرتے وقت کی تھیں۔ جب گاڈفرے اور ٹنکرڈ یروشلم کے بازار سے گزر رہے تھے اور وہاں مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور زخمی جاں بلب ہو کر تڑپ رہے تھے۔ جب صلیبیوں نے بے قصور اور بے کس مسلمانوں کو شدید اذیتیں دے دے کر قتل کیا تھا اور انسانوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ جب مسلمان القدس کی چھت پر پناہ کی تلاش میں چڑھے تھے اور نصرانیوں نے انہیں وہیں سے تیروں سے چھلنی کر کے نیچے گرا دیا تھا۔ ان کے اس قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا، انہوں نے اس مقدس شہر کو ظلم اور بدنامی کے رنگ میں رنگ دیا جہاں مسیح نے رحم ومحبت کا وعظ سنایا تھا اور فرمایا تھا: مبارک ہیں وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں کیوں کہ ان پر بھی رحم کیا جائے گا۔ یہ عیسائی اس پاک اور مقدس شہر کو مسلمانوں کے خون سے مقتل بناتے

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: حوادث 583ھ
[2] مآثر حیات صلاح الدین: 196

ہوئے اس کلام کو بھول گئے تھے۔ یہ بے رحم نصرانیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین نے ان کے ساتھ لطف ومہربانی کا سلوک کیا۔ اگر صلاح الدین کے کارناموں میں سے صرف یہی ایک کام دنیا میں مذکور ہوتا کہ اس نے کس انداز سے یروشلم کو واپس لیا تو ایک یہی کارنامہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانے کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی ہمت انسان تھا جو شان ومرتبے میں تنہا اور بے نظیر تھا۔''[1]

بیت المقدس میں اسلام کی بہارِ نو:- سلطان صلاح الدین ایوبی نے تقریباً ایک ماہ القدس میں قیام کیا اور اس مختصر سی مدت میں اس شہر کو دوبارہ اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ بنانے کا کام بڑی حد تک پورا کرلیا۔ گنبد صخرہ کی چھاؤں تلے مقدس چٹان اب زیارت کے لیے کھول دی گئی تھی۔ یہاں ہر دم خوش الحان قاریوں کی تلاوت گونجتی رہتی تھی جنہیں سلطان نے معقول تنخواہوں پر مقرر کیا تھا۔ سلطان نے انتہائی خوشنما کتابت کے مصاحف قرآنی بڑی تعداد میں صخرہ شریف اور محراب مسجد کے پاس رکھوا دیے تھے۔ یہ مصاحف خوبصورت الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ زائرین یہاں آکر تلاوت میں ایک عجیب لطف محسوس کرتے تھے۔

صخرہ شریف کے لیے خاص طور پر اور پورے بیت المقدس کے لیے عمومی طور پر حفاظ، قراء، علماء، صالحین اور صوفیاء کی جماعتیں تشکیل دیں جو یہاں ہمیشہ ذکر وعبادت اور تلاوت میں مشغول رہتی تھیں۔ القدس کے انتظامات کے مصارف کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف کردی گئیں۔ خاص گنبد صخرہ کی دیکھ بھال کے اخراجات کے لیے ایک عمارت ایک جاگیر اور ایک باغ وقف کیا گیا۔ فقیہ عیسیٰ کو صخرہ سے متعلق تمام امور کا نگران بنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ دنوں بعد صخرہ کی حفاظت کے لیے اس کے گرد آہنی جالیوں والی کھڑکیاں نصب کرادیں۔

سلطان کے دیگر امراء، بیٹوں اور ارکان سلطنت نے بھی بیت المقدس کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تقی الدین عمر ایک دن آبِ گلاب کے مشکیزوں کے ساتھ گنبد صخرہ تلے آیا۔ یہاں خود جھاڑو دی، پانی سے اس جگہ کو خوب دھویا، پھر مقدس چٹان، فرش اور دیواروں پر عرق گلاب اس طرح بہایا کہ فضا دور دور تک معطر ہوگئی، پھر عمارت کو خوشبو کی دھونی دے کر مزید مہکایا، اس کے بعد اس نے ایک بہت بڑی رقم القدس کے غریبوں میں تقسیم کردی۔

سلطان کا بیٹا الملک الافضل نہایت دیدہ زیب اور بیش قیمت قالین لے کر حاضر ہوا اور بیت المقدس میں

[1] سوانح صلاح الدین، ص: 204، 206

بجھادیے۔ سلطان کے منجھلے بیٹے الملک العزیز عثمان نے جو فتح میں شرکت کے لیے مصری افواج کے ساتھ آیا تھا، واپسی کے موقع پر اپنا تمام اسلحہ القدس کے دفاع کے لیے وقف کر دیا۔ مصری فوج کا یہ اسلحہ اتنا زیادہ تھا کہ القدس کو آئندہ کسی بھی ممکنہ جنگ میں سامانِ حرب کے لحاظ سے بیرونی کمک کی ضرورت نہ رہی۔

صرف مسجد اقصیٰ اور گنبدہ صخرہ ہی کو نہیں سلطان نے پورے شہر کو اسلامی شعائر سے منور کر دیا۔ یہاں دینی مدارس کھلوائے، خانقاہیں اور سرائیں بنوائیں، ہاسپٹلرز جنگجوؤں کی پرشکوہ عمارت ''دارالاستبار'' کو مدرسہ شافعیہ بنادیا۔ شہر کے پھاٹک کے پاس ایک بلند قلعے میں ''محراب داؤد علیہ السلام'' تھی۔ القدس کا عیسائی حاکم یہیں رہتا تھا، اسی قلعے میں دارداؤد علیہ السلام اور دار سلیمان علیہ السلام نامی دو عمارتیں بھی تھیں۔ سلطان نے ان مقدس مقامات کا ایک مستقل نگران اور یہاں نمازوں کے لیے امام اور مؤذن مقرر کر دیے۔

باب اسباط کے قریب مشہور چرچ ''صندحنہ'' تھا، سلطان نے اسے مدرسہ بنادیا۔ کلیسا قمامہ کے پاس القدس کے بڑے پادری کی حویلی تھی۔ سلطان نے اسے صوفیاء کی خانقاہ اور قیام گاہ کے طور پر وقف کر دیا۔ [1]

ایک طرف شہر مقدس میں یہ تعمیراتی و ترقیاتی کام ہو رہے تھے دوسری طرف سلطان کی سادگی، بے نفسی اور جفا کشی کا یہ عالم تھا کہ اس حالت میں بھی وہ ایک عام سپاہی کی طرح شہر کے باہر فوجی کیمپ کے خیمے میں مقیم تھے حالانکہ شہر میں ان کے قیام کے لیے بہتر سے بہتر عمارتیں موجود تھیں۔ عیسائی امراء کے خالی کیے ہوئے محلات کی آسائشیں ان کی مہینوں کی تھکان دور کر سکتی تھیں، مگر سلطان نے خود کو عام سپاہیوں اور مجاہدین پر ترجیح نہ دی اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی کا وطیرہ ترک نہ کیا۔ [2]

<u>بڑے گرجے کا قضیہ</u>: توحید کے فروغ اور اسلامی شعائر کی ترویج کے ساتھ شہر سے تثلیث کی بیخ کنی اور صلیبی آثار کو مٹانے کا کام بھی جاری تھا۔ اس کے ذیل میں سلطان نے القدس کے سب سے بڑے گرجے کلیسائے قمامہ کو بند کرا دیا اور نصرانیوں کو اس کی زیارت سے روک دیا۔ اس پر بڑی کھلبلی مچی، یہ مسئلہ متنازعہ بن گیا، آخر سلطان کے ہاں اس موضوع پر مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ بعض مشیروں نے کلیسا کو منہدم کر دینے اور اس کا نام و نشان مٹا دینے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے کہا:

''جب کلیسا منہدم ہو جائے گا اور (عیسیٰ علیہ السلام کی فرضی) قبر اکھاڑ دی جائے گی اور اس جگہ کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا تو ایک زمانہ گزرنے کے بعد یہاں عیسائی زائرین کی آمد بھی بند

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: حوادث 583ھ
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: حوادث 583ھ

ہو جائے گی اور اس جگہ کی زیارت کے ارادے اور آرزوئیں خاک ہو جائیں گی۔اس کے برعکس اگر یہ عمارت باقی رہے گی تو زیارت کا سلسلہ بھی نہیں رک سکے گا۔"

مگر سلطان کے کچھ اور معتمدین کا کہنا تھا:

"گرجے کی عمارت گرانا بے سود ہے۔اس لیے کہ نصرانیوں کے نزدیک مقدس عبادت گاہ یہ جگہ ہے جہاں صلیب نصب کی جاتی رہی ہے اور یہ زمین ہے جہاں مقبرہ ہے۔جب تک زمین کا یہ ٹکڑا باقی ہے، نصرانیوں کا اس سے جذباتی تعلق ختم نہیں کیا جا سکتا چاہے اس خاک کے ذرات اڑا کر آسمان تک کیوں نہ پہنچا دیے جائیں۔"

ان مشیروں نے یہ بھی کہا:

"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے القدس کو فتح کیا تھا تب بھی نصرانیوں کے اس گرجے کو باقی رکھا گیا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی عمارت کو منہدم کرانے کا حکم نہیں دیا تھا۔"

غرض اکثر امراء نے گرجے کو باقی رکھنے کی تجویز دی اور سلطان نے دلائل کی روشنی میں ان سے اتفاق کیا۔نئے فیصلے کے مطابق "کلیسائے قمامہ" کھول دیا گیا۔وہاں چار پادریوں کو رہنے کی اجازت مل گئی اور انہیں ٹیکس اور جزیے سے استثناء کی رعایت بھی دے دی گئی۔[5]

میں حق دار کا حق کیوں روکوں؟ ❊ القدس سے رخصت ہونے سے پہلے سلطان نے زرِ فدیہ کے ذریعے جمع کردہ تمام آمدن یہیں کے غریبوں، مسکینوں اور درویشوں میں تقسیم کر دی۔اس کا قصہ سلطان کے بھائی الملک العادل ابوبکر نے خود یوں سنایا:

"القدس کی آمدن جمع کرنے کا ذمہ دار میں تھا۔میں نے کل رقم سے ستر ہزار دینار سلطان کو بھیج دیے مگر علی الصبح سلطان کے خزانچی نے آکر کہا: 'آج صدقہ و خیرات کے لیے مزید رقم درکار ہے کیوں کہ جو کچھ (آپ نے دیا) تھا وہ کل ہی ختم ہو گیا تھا۔' میں نے یہ سن کر باقی 30 ہزار دینار بھی اسی وقت بھیج دیے۔"

کاتب عماد کہتے ہیں کہ سلطان کے مصاحبین نے اس قدر صدقہ وخیرات کرنے پر اعتراض کیا اور سلطان پر خاصی تنقید کی تو سلطان نے جواباً کہا:

"میں حق داروں سے ان کے حق کو کیوں روکوں؟ جو خرچ کر رہا ہوں، دراصل اسی کو محفوظ کر رہا ہوں، جب کوئی حق دار اس رقم کو قبول کرتا ہے تو دراصل میں اس پر نہیں وہ مجھ پر احسان کر رہا

[5] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: جلد3 ص683

ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ مجھے امانت کی ادائیگی کے فرض سے سبکدوش اور اس کی زنجیروں کی جکڑ سے آزاد کرتا ہے۔ بے شک جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے وہ اہل حقوق کی امانت ہے جس کا میں صرف محافظ ہوں۔''[1]

سلطان سے کسی نے کہا:

''کاش آپ اس مال کو ذخیرہ کر لیا کریں تو بہتر ہوگا۔''

سلطان نے جواب دیا:

''میں اللہ سے بہت پر امید ہوں۔ وہی آرزؤں کو پورا کرنے کا کفیل ہے۔''[2]

سلطان نے اس رقم کا ایک بڑا حصہ ان مسلمان قیدیوں پر خرچ کیا تھا جو بیت المقدس میں نصرانیوں کے قید خانوں سے آزاد کیے گئے تھے۔ ان کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ سلطان نے ان سب کو اپنے پاس جمع کیا۔ انہیں لباس پہنایا، خرچہ دیا، ان سے مہربانی کا سلوک کیا اور ان کی تمام تکالیف کو دور کیا۔ وہ سب اپنے اپنے وطن کو اس طرح خوش و خرم واپس لوٹے کہ انہیں کسی بات کا خوف اور رنج نہیں تھا۔[3]

نور الدین زنگی کا تیار کردہ منبر مسجدِ اقصیٰ میں ❊ برسوں پہلے سلطان نور الدین زنگی نے نصرانیوں کو بے دخل کرنے اور مسجد اقصیٰ کو واگزار کرانے کے لیے جہاد کا آغاز کیا تھا، ان کے خوابوں میں القدس کی آزادی کا منظر ہر روز و شب ابھرتا رہا۔ جب وہ مسجد اقصیٰ میں نماز کی ادائیگی کے تصور سے سرشار ہوتے تو انہیں خیال آتا کہ اس عظیم مسجد کی آرائش بھی اسی کے شایان شان ہونی چاہیے۔ مگر سر دست یہ ممکن نہ تھا۔ تب انہوں نے سوچا کہ کم از کم اتنا تو کیا جا سکتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے لیے ایک بے مثال منبر تیار کرا لیا جائے جس کی رعنائی اور دلکشی مبہوت کر دینے والی ہو۔ سلطان زنگی کو یقین تھا کہ القدس بہت جلد آزاد ہوگا۔ اس بنا پر انہوں نے منبر کی تعمیر میں ایسی دلچسپی لی گویا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے مسجد اقصیٰ میں نصب کرنے والے ہیں۔

ان کے دار الحکومت حلب میں ''الاختر ینی'' نامی ایک نہایت ماہر فن بڑھئی تھا، سلطان زنگی نے اس کی شہرت سن کر اسے بلوایا اور حکم دیا کہ بیت المقدس کے لیے ایسا منبر تیار کرو جس کی مثال کہیں نہ ملے۔ الاختر ینی کو کھلا سرمایہ فراہم کیا گیا۔ نہایت باریک بینی، نفاست اور مہارت کے ساتھ کیے جانے والے اس کام میں کئی برس لگے مگر جب یہ منبر تیار ہوا تو لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چوں کہ القدس پر ان

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ
[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ
[3] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ

دلوں فرنگیوں کی گرفت بہت مضبوط تھی اس لیے اس منبر کو دیکھ کر لوگ حسرت سے کہتے تھے:

"ایسا کب ہوگا کہ القدس واپس مل سکے، فرنگی مدتوں سے وہاں قابض ہیں اور شاہانِ اسلام انہیں ہٹانے سے عاجز ہیں۔"[1]

سلطان نورالدین زنگی کی زندگی میں واقعی القدس کی بازیابی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور یہ منبر حلب کی جامع مسجد میں رکھا رہا۔ مگر نورالدین زنگی کا اخلاص رائگاں نہیں گیا، انہوں نے امت کو جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلا کر القدس کی آزادی کا جو راستہ متعین کر دیا تھا، سلطان صلاح الدین نے اسے اپنا کر مسلمانوں کو ان کا قبلۂ اوّل واپس دلا دیا تھا۔ جب سلطان صلاح الدین نے قبلۂ اوّل میں پہلا جمعہ ادا کیا تھا تو اس دن محراب میں لکڑی کا عام سا منبر لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس دوران مسجد کی تزئین و آرائش کا کام شروع ہو چکا تھا، محراب میں خوبصورت ٹائلیں لگائی جا رہی تھیں، سلطان نے سوچا کہ مسجد اقصیٰ کا منبر بھی بہت عمدہ ہونا چاہیے۔ اس وقت ان کے مشیروں نے انہیں سلطان زنگی کا منبر کی یاد دلایا جو مسجد اقصیٰ ہی کے لیے بنوایا گیا تھا اور کب سے اپنی منزل کے لیے تڑپ رہا تھا۔ سلطان نے فوراً حلب سے وہ منبر منگوا کر مسجد اقصیٰ میں نصب کرا دیا۔ یوں فتح القدس کی شاندار تکمیل مسجد اقصیٰ کی محراب میں سلطان نورالدین زنگی کے تیار کردہ منبر کی تنصیب سے ہوئی۔[2]

علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ منبر کی تیاری اور اسے القدس میں نصب کرنے کے درمیان 20 برس سے زائد عرصہ گزر گیا تھا۔ یہ نورالدین زنگی کی کرامت اور ان کی حسن نیت کا اثر تھا کہ وفات کے بعد بھی ان کی محنت بار آور ہوئی۔[3]

---

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ

[2] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین: تحت 583ھ، الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ

[3] الکامل فی التاریخ: تحت 583ھ

اسباقِ تاریخ

اس حصے میں ہم نے 583ھ میں نصیب ہونے والی فتوحات خاص طور پر معرکہ حطین اور فتح بیت المقدس کا مطالعہ کیا ہے۔ ان فتوحات پر غور کرنے سے بہت سے اسباق ملتے ہیں مثلاً:

- اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب اس کا حکم ہو جائے تو پھر مشکل سے مشکل مہم آسان ہو جاتی ہے۔ جو علاقے تقریباً ایک صدی سے نصرانیوں کے زیرِ قبضہ تھے اور مسلمانوں کی تین چار نسلیں ان کی بازیافت سے عاجز رہی تھیں، اللہ نے چند ہفتوں میں سلطان کو نصیب کر دیں۔
- حطین کا معرکہ عسکری قائدین اور مجاہدین کے لیے بطورِ خاص مطالعے کی چیز ہے۔ اس کے ہر ہر جزو میں سلطان کی تدبیر اور منصوبہ بندی کی مثالیں اور عجیب و غریب جنگی چالیں دکھائی دیتی ہیں۔ سلطان کا طرزِ عمل ارشادِ نبوی "الحرب خدعة" (جنگ چالبازی کا نام ہے) کا مصداق دکھائی دیتا ہے۔
- دشمنوں میں سے بعض سے صلح کرنا اور بعض سے جنگ جاری رکھنا، سیاسی تدبیر کا حصہ ہے۔ ہر حکمران کو ایسے مواقع سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ سلطان کی کوشش تھی کہ وہ نصرانیوں کو متفرق کر کے رکھیں۔ اس لیے وہ ریمنڈ سے صلح کے پابند رہے۔ یہ ریمنڈ کی بدقسمتی تھی کہ وہ آخر میں نصرانیوں سے مل گیا۔
- بڑی مہمات سے پہلے اپنے رفقاء، ماتحتوں اور کارکنوں کے جذبات کو ابھارنے اور سب کی فکر و نظر کو ایک نکتے پر مرکوز کرنے کے لیے ان سے خطاب کرنا بہت مفید ہوتا ہے جیسا کہ القدس کے معرکے سے پہلے سلطان نے امراء کو جمع کر کے ان سے خطاب کیا۔ یہ خطاب طویل نہیں ہونا چاہیے۔ عملیت پسند لوگوں کی باتیں مختصر مگر پر اثر ہوتی ہیں۔
- بیت المقدس کی فتح کے بعد مقامی نصرانیوں سے سلطان کا حسنِ سلوک اس اعلیٰ کردار کی روشن مثال ہے جس کا مظاہرہ مسلم فاتحین ہمیشہ کرتے چلے آئے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور جہاد کا مقصد اسی امن و سلامتی کے دشمنوں کا خاتمہ ہے۔
- مشورے میں خیر ہوتی ہے۔ قائد کتنا بھی تجربہ کار اور بصیرت مند کیوں نہ ہو، اسے مشورے کی

ضرورت رہتی ہے۔مشورے میں معاملے کا ہر پہلو سامنے آجاتا ہے اور صحیح فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔مجلسِ مشاورت میں کھلے انداز میں دلائل سے بات کرنے کا ماحول ہونا چاہیے اور اگر کوئی بات دلائل میں وزنی ہو تو اسے قبول کرنے میں ہچکچانا نہیں چاہیے۔سلطان کے ہاں ایسا ہی تھا۔انہوں نے امراء کے دلائل سن کر نصرانیوں کے گرجے کو منہدم کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

- سچے جذبے سے شروع کیا گیا سفر کبھی ادھورا نہیں رہتا۔ایک راہبر راستے میں دم توڑ دے تو قافلہ دوسرے رہنما کی سرکردگی میں منزل تک جا پہنچتا ہے۔نورالدین زنگی نے القدس کی آزادی کا جو سفر شروع کیا وہ ان کی زندگی میں نہ سہی، ان کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کے ذریعے پورا ہوا۔زنگی کا منبر مسجد اقصیٰ کی زینت بن کر رہا۔

اِختتامیہ

تیسری صلیبی جنگ کا مختصر احوال

سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا تو یورپ کی تمام چھوٹی بڑی عیسائی مملکتوں میں اشتعال کی ایک لہر دوڑ گئی۔ القدس کا لاٹ پادری راہبوں، مذہبی پیشواؤں اور امراء کے ایک وفد کے ہمراہ سیاہ ماتمی لباس میں روم پہنچا اور پاپائے اعظم کی سرپرستی میں پورے یورپ کا دورہ کیا۔ وہ مسلمانوں کے مظالم کے فرضی افسانوں کے ذریعے یخ بستہ یورپ کو ایک دہکتے آتش فشاں میں تبدیل کرنے لگا۔ چنانچہ پورے یورپ میں کہرام مچ گیا۔

اس مہم میں صور کا حاکم کونرڈ مارکویس پیش پیش تھا۔ اس نے یورپ کے سادہ لوح عوام کو مشتعل کرنے کے لیے ایک بہت بڑی تصویر بنوائی جس میں ایک مسلم گھڑسوار کو قبر مسیح پر چڑھتے اور اسے گھوڑوں کے سموں سے پامال کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ دیوہیکل تصویر یورپ کے کونے کونے میں گھمائی گئی اور بڑے بڑے جلسوں میں دکھائی گئی جس نے عیسائیوں کو مزید جوش دلا دیا۔ دراصل عیسائی مذہبی پیشواؤں اور بادشاہوں کو یقین تھا کہ اگر دیر کی گئی تو ایک طرف عیسائی اقوام میں صلیبی جنگوں کا بپھرا ہوا جذبہ اور بیت المقدس کی بازیافت کا جوش سرد پڑ جائے گا اور دوسری طرف مسلمانوں کا اقتدار دن بدن مستحکم ہوتا جائے گا چنانچہ پورے یورپ میں "تیسری صلیبی جنگ" کا بگل بجا دیا گیا۔

دو سال کی مسلسل تیاریوں کے بعد 585ھ (1139ء) میں تمام یورپ کی متحدہ افواج عالم اسلام سے بیت المقدس کو چھیننے کے لیے شام کے ساحل پر لنگر انداز ہونے لگیں۔ شاید ہی کوئی معروف یورپی حکمران ہو جو اس جنگ میں اپنے لشکر سمیت شامل نہ ہوا ہو۔ فرانس کا بادشاہ فلپ آگسٹس، شاہ برطانیہ رچرڈ شیر دل اور جرمنی کا حکمران فریڈرک باربروسا ان میں پیش پیش تھے۔ سسلی، آسٹریا اور دیگر چھوٹے چھوٹے یورپی ملکوں اور جزیروں کے حاکم اور نواب بھی اپنے اپنے زرہ پوش دستوں سمیت اس سیلاب میں شامل تھے جبکہ عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کا فریضہ ادا کرنے کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی تنہا تھے۔ خلافت عباسیہ عافیت کوشی کا لحاف اوڑھے بغداد میں محو خواب تھی اور دیگر چھوٹے

بڑے مسلم ممالک کے حکمران بھی اپنی سیاسی چپقلشوں سے فارغ نہ تھے۔

آخر کار صلیبی شام کے اہم ساحلی شہر عکا کے ساحل پر پہنچ گئے اور خشکی وتری دونوں جانب سے اس کا سخت محاصرہ کر لیا۔ سلطان ایوبی ان کے مدمقابل آئے تو ایک ہولناک جنگ کا آغاز ہوا جسے تاریخ تیسری صلیبی جنگ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ پانچ برس تک جاری رہی جس میں سو سے زیادہ لڑائیاں اور نو بڑے معرکے ہوئے۔ سلطان صلاح الدین اور ان کے سپاہیوں نے حملہ آوروں کا ہر محاذ پر بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ نصرانیوں کی پوری کوشش یہ رہی کہ انہیں ساحلی قلعوں پر قبضہ جما کر بیت المقدس کی طرف بڑھنے کا موقع مل جائے، اس قبضے کے لیے انہوں نے عکا پر قبضے کے لیے اپنی پوری قوت آزما ڈالی، بحری اور بری دونوں راستوں سے وہاں مسلسل حملے کیے مگر سلطان کے سپاہیوں نے اس پہلی دفاعی لائن پر اتنی زبردست مزاحمت کی کہ صلیبیوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔ تین سال تک صلیبی حملہ آوروں کی سنگ باری سے فصیل ٹوٹ گئی تو عکا کے مسلمانوں کو مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مجاہدین کی بڑی تعداد قید ہوگئی۔ سلطان صلاح الدین نے مذاکرات کے ذریعے ان کی جان بچانے کی کوشش کی مگر صلیبیوں نے بدعہدی کی اور بڑی تعداد میں قیدیوں کو شہید کر ڈالا۔ سلطان صلاح الدین کے لیے یہ ایک شدید دھچکا تھا مگر ان کی ہمت اور حوصلے میں فرق نہ آیا۔ انہوں نے دیگر محاذوں پر بھرپور مزاحمت جاری رکھی اور عکا کے علاوہ ہر مقام پر صلیبیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ ادھر حملہ آوروں میں سے جرمنی کا بادشاہ ایشیائے کوچک کے ایک دریا میں ڈوب کر مر گیا اور شاہِ فرانس فلپ آگسٹس نے برطانوی فرمانروا رچرڈ سے اختلافات کی وجہ سے بددل ہو کر واپسی اختیار کی تاہم رچرڈ اور دیگر یورپی فرمانروا میدان میں جمے رہے۔

عکا پر قبضے کے بعد صلیبی حملہ آور رچرڈ کی قیادت میں عسقلان کی طرف بڑھے، سلطان صلاح الدین افواج کی کمی کے باعث عسقلان کا فوری دفاع نہ کر سکتے تھے، بہرحال انہوں نے صحرائے ارسوف میں رچرڈ کے ٹڈی دل لشکر کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی، بہت سے مجاہدین اس معرکے میں شہید ہوئے اور باقی پسپا ہو گئے۔ اب رچرڈ عسقلان کی طرف بے روک ٹوک پیش قدمی کر رہا تھا۔ ''عسقلان'' کی فصیل نہایت بلند اور قلعہ بڑا مستحکم تھا مگر سلطان صلاح الدین فوج کے مختلف محاذوں پر مصروف ہونے کے باعث اس کی زیادہ دنوں تک حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر رچرڈ عسقلان پر قابض ہو جاتا تو بیت المقدس پر حملے کے لیے اسے ایک مضبوط چھاؤنی اور یورپ سے کمک ورسد کے لیے ایک بہترین بندگاہ ہاتھ آجاتی۔ سلطان صلاح الدین کے پاس وقت کم تھا، انہوں نے بیت المقدس کو بچانے کے لیے ایک عجیب اقدام کیا، ان کے حکم سے عسقلان کی آبادی کو وہاں سے منتقل

کر دیا گیا اور فصیل شہر، قلعہ، دیگر عمارتوں اور بندرگاہ کو تباہ و برباد کر کے مٹی کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ جب رچرڈ کی فوجیں وہاں پہنچیں تو ان کو آڑ میں لینے والی کوئی دیوار اور ان پر سایہ کرنے والی کوئی چھت تک وہاں نہ بچی تھی، رچرڈ کو سخت مایوسی ہوئی اور وہ وہاں کوئی مورچہ نہ بنا سکا۔

ایک عارضی وقفے کے بعد 588ھ (1192ء) میں رچرڈ نے فرانسیسی افواج کو ساتھ ملا کر بیت المقدس پر حملہ کیا اور ارض مقدس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نازک وقت پر سلطان صلاح الدین نے بڑی دانائی سے کام لیا اور حملہ آوروں کے اردگرد کے تمام علاقوں اور راستوں کے پانی کے ذخائر نا قابل استعمال بنا دیے۔ برطانوی اور فرانسیسی افواج طویل عرصے تک محاصرہ کیے بغیر القدس کو فتح نہیں کر سکتی تھیں اور اتنے دنوں بغیر پانی کے ان کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ متحدہ فوجیں اس حملے کو کسی مناسب موقع پر ملتوی کر کے پسپا ہو گئیں۔

محدود وقفوں کے ساتھ کئی سال تک ہلال اور صلیب کے مابین جنگوں سے دونوں فریق تھک کر بے حال ہو گئے۔ عکا کے ساحل سے لے کر بیت المقدس جانے والی شاہراہ تک لاتعداد مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا مگر عیسائیوں کے سیلاب کو مقدس شہر تک نہ پہنچنے دیا۔ انجام کار یورپی طاقتوں کو شدید نقصانات اٹھانے کے بعد مایوس ہونا پڑا۔ رچرڈ نے اس بے نتیجہ جنگ سے بیزار ہو کر سلطان کو لکھا:

"مسلمان اور عیسائی لڑتے لڑتے تباہ ہو جائیں گے، ہمارے ملک ویران ہو گئے ہیں، معاملہ صرف بیت المقدس، فلسطین اور صلیب مقدس کا ہے، بیت المقدس ہماری عبادت گاہ ہے جس سے ہم دست بردار نہیں ہو سکتے۔ فلسطین میں اردن تک کا علاقہ ہمارا ہے اور صلیب اعظم آپ کے لیے محض ایک لکڑی اور ہمارے لیے ایک عظیم شے ہے لہٰذا سلطان کو (صلیب اعظم ہمارے حوالے کر کے) ہم پر اس بارے میں احسان کرنا چاہیے۔"

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس کا یہ جواب دیا:

"القدس جیسے آپ کے لیے محترم ہے ہمارے لیے بھی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر قابل احترام ہے کہ یہیں سے ہمارے پیغمبر اسلام ﷺ کو معراج ہوئی تھی لہٰذا اس کا تصور بھی نہ کریں کہ ہم اس سے دست بردار ہوں گے، جہاں تک فلسطین کا مسئلہ ہے تو وہ ہمارا ملک ہے، آپ نے محض مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کو غصب کر لیا تھا، رہی صلیب کی بات تو اس پر قبضہ برقرار رکھنا ہماری مصلحتوں پر موقوف ہے۔"

بالآخر پانچ سال کے طویل کشت وخون کے بعد صلیبی حملہ آوروں کے حوصلے پست ہو گئے اور شعبان

588ھ مطابق (ستمبر 1192ء) میں "صلح رملہ" نامی معاہدے پر اس تیسری صلیبی جنگ کا خاتمہ ہوا جس میں فریقین نے اپنی پوری قوت جھونک دی تھی۔ جنگ کے اختتام پر صورتحال یہ تھی کہ بیت المقدس سمیت مسلمانوں کے شہر اور قلعے ان کے پاس تھے صرف عکا کا ساحلی شہر نصرانیوں کے قبضے میں تھا۔

ایک صلیبی مؤرخ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"پاپائے روم کی فریاد سنتے ہی کل مسیحی دنیا نے ہتھیار اٹھا لیے تھے، قیصر فریڈرک، شاہان انگلستان وفرانس وسسلی آسٹریا کا لیو پلولڈ، برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈر کا کاؤنٹ، سینکڑوں مشہور ومعروف بیرن، اور تمام عیسائی قوموں کے نائٹ، یروشلم کا عیسائی بادشاہ اور فلسطین کے دیگر عیسائی والیان ملک، طبقہ داویہ اور طبقہ اسبیطار کے بڑے بڑے شہسوار، یہ سب کے سب اس کوشش میں معروف رہے کہ بیت المقدس پر اپنا قبضہ جمالیں اور یروشلم کی مسیحی سلطنت جو مٹنے کے قریب ہے پھر شاداب ہو جائے...... لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ اس عرصے میں قیصر فریڈرک فوت ہو گیا، شاہان انگلستان وفرانس اپنے اپنے ملک لوٹ گئے جبکہ ان کے بڑے عالی مرتبت معزز ساتھی سرزمین ایلیا میں دفن ہو گئے۔ اس کے باوجود القدس سلطان صلاح الدین ایوبی ہی کے پاس رہا۔"

دس گنا صلیبی افواج کے سیلاب کو روکنا اور منہ توڑ جواب دینا بلاشبہ چھٹی صدی ہجری میں اسلام کا زندہ معجزہ تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے جس پامردی سے اس ہولناک یلغار کا مقابلہ کیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادرکھی جائے گی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ حکومت، طاقت اور اختیار کو اسی کی رضا مندی اور طاعت میں صرف کرتے ہوئے دشمنوں سے مسلسل جہاد کیا بیت المقدس کو آزاد کرا لیا اور زندگی کے آخری لمحے تک اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کی۔

جہاد کی پرمشقت زندگی اور مسلسل بے آرامی نے سلطان کو مستقل مریض بنا دیا تھا، مرض کی شدت میں رمضان کے کئی روزے قضا ہو گئے مگر جہاد نہ چھوٹا، اب جو موقع ملا تو روزے قضا کرنا شروع کر دیے، معالج نے ان کی تکلیف کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے منع کیا مگر سلطان نے یہ کہہ کر "نہ معلوم آئندہ کیا حالات پیش آئیں" تمام قضا روزے پورے کیے۔

وسط صفر 589ھ میں مرض شدت اختیار کر گیا اور وفات سے تین روز قبل غشی کی سی حالت طاری ہو گئی، معلوم ہوتا تھا کہ بیس سال کا تھکا ماندہ مجاہد تکان اتار رہا ہے۔ 27 صفر (3 مارچ 1193ء) کی صبح کا ستارہ افق پر نمودار ہوا تو سلطان صلاح الدین ایوبی کی نبضیں ڈوب رہی تھیں۔ شیخ ابو جعفر رحمہ اللہ نے سکرات

موت کے آثار محسوس کر کے سورہ حشر کی تلاوت شروع کی جب آیت:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ﴾

پہنچے تو یکا یک سلطان نے آنکھیں کھول دیں، مسکرائے اور تبسم ریز لہجے میں کہا: ''سچ ہے'' یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ سلطان کے غم میں ہر آنکھ اشکبار نظر آتی تھی، صلیبی دنیا کے چھکے چھڑا دینے والے بطل جلیل کا انتقال اس حال میں ہوا کہ ترکے میں کوئی باغ اور مکان نہ چھوڑا تھا۔ اتنی رقم بھی نہ تھی کہ تجہیز و تکفین کے اخراجات پورے ہو سکتے۔ قرضہ لے کر کفن منگوایا گیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے ارضِ مقدس بازیاب کرا کے اُمت پر جو احسان کیا اُمت تا قیامت سے نہیں بھول سکتی۔ ان کے سنہری کارنامے آج بھی صلیبی جنگجوؤں سے ٹکرانے والے مجاہدین کے حوصلوں کو جلا بخش رہے ہیں۔

......نوٹ......

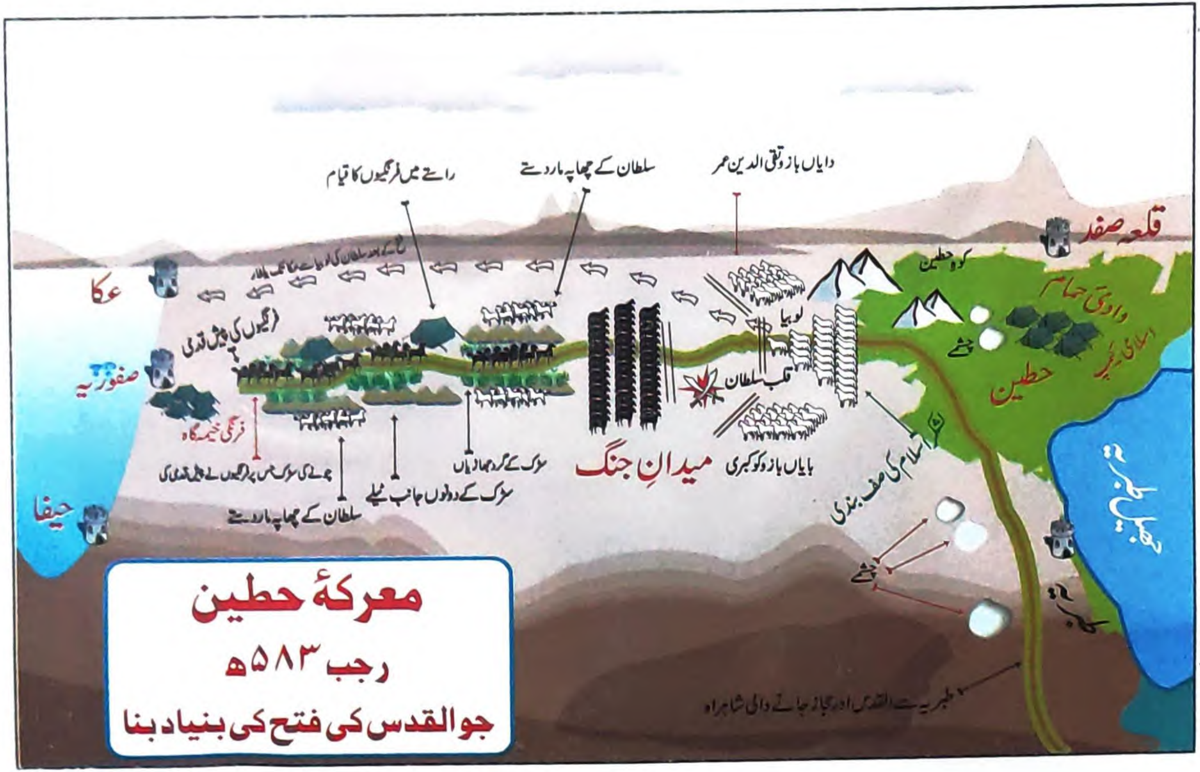
تیسری صلیبی جنگ کی تفصیلی روداد آپ اس تصنیف کی جلد دوم میں ملاحظہ کریں گے۔



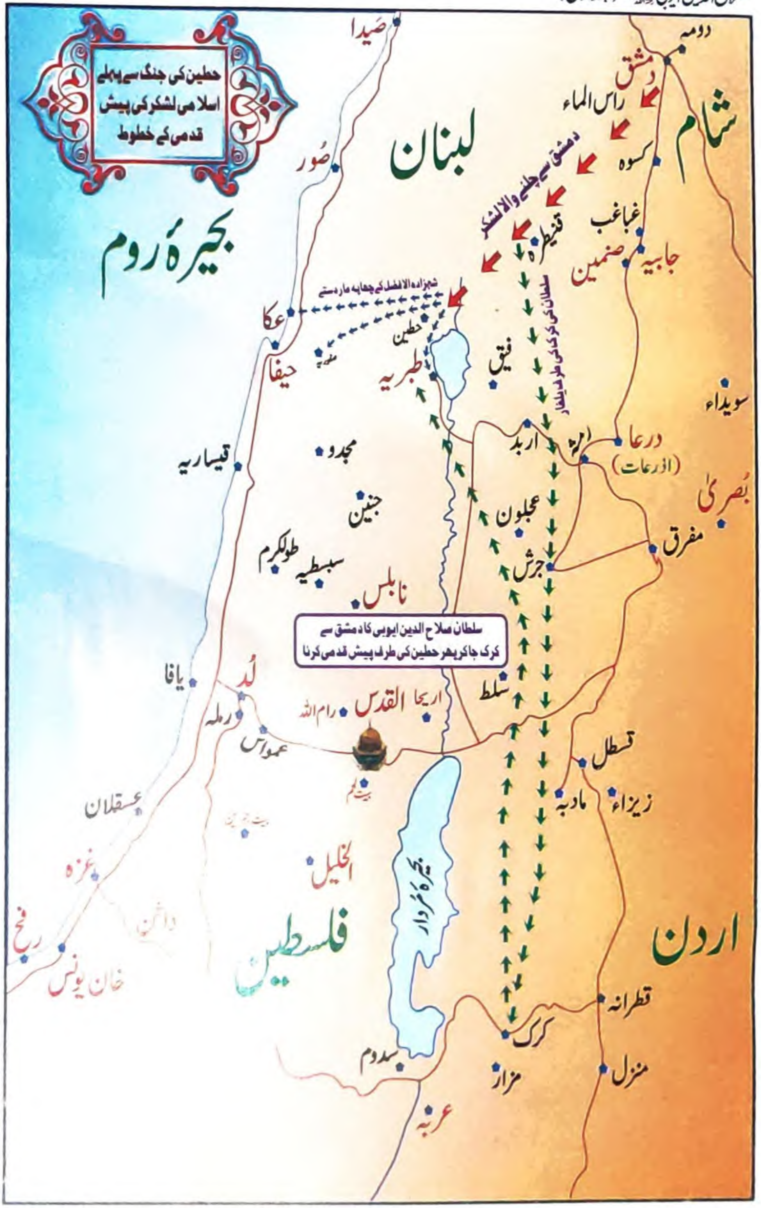
ملک شاہ کے دور میں سلجوقی سلطنت

ملک شاہ کی وفات کے بعد اس کی سلطنت کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی، بنو عبید نے نصرانیوں کو عالم اسلام پر حملے کی دعوت دی اور اہل یورپ شام کے ساحلوں پر ٹوٹ پڑے۔


پانچویں صدی ہجری یعنی صلیبی جنگ کے بعد ایشیا اور یورپ کا جغرافیہ
براعظم ایشیا
براعظم یورپ
براعظم افریقہ
بحیرہ خزر
بحیرہ اسود
بحیرہ روم
خلیج فارس
بحر ہند
بحر اوقیانوس
بحیرہ بالٹک
خراسان
بغداد
موصل
قاہرہ
دولت عبیدیہ مصر
مکہ معظمہ
مدینہ منورہ
یونان
بلغاریہ
ہنگری
آسٹریا
پولینڈ
جرمنی
فرانس
انگلینڈ
ڈنمارک
ناروے
سویڈن
اٹلی
سسلی
پرتگال
نصرانی اندلس
اسلامی اندلس
تیونس
مراکش
دولت اتابکیہ
سلطنت سلاجقہ روم
سلطنت سلاجقہ عراق
ماوراء النہر
بحیرہ خوارزم
قزوین
کردستان


معرکۂ حطین
رجب ۵۸۳ھ
جو القدس کی فتح کی بنیاد بنا
قلعہ صفد
کوہ حطین
وادی حمام
اسلامی لشکر
حطین
جھیل طبریہ
طبریہ
چشمے
اسلام کی صف بندی
طبریہ سے القدس اور حجاز جانے والی شاہراہ
دایاں بازو تقی الدین عمر
سلطان کے چھاپہ مار دستے
راستے میں فرنگیوں کا قیام
لوبیا
قلب سلطان
بایاں بازو کوکبری
میدانِ جنگ
سڑک کے گرد جھاڑیاں
سڑک کے دونوں جانب ٹیلے
سلطان کے چھاپہ مار دستے
فرنگیوں کی پیش قدمی
فرنگی خیمہ گاہ
عکا
صفوریہ
حیفا

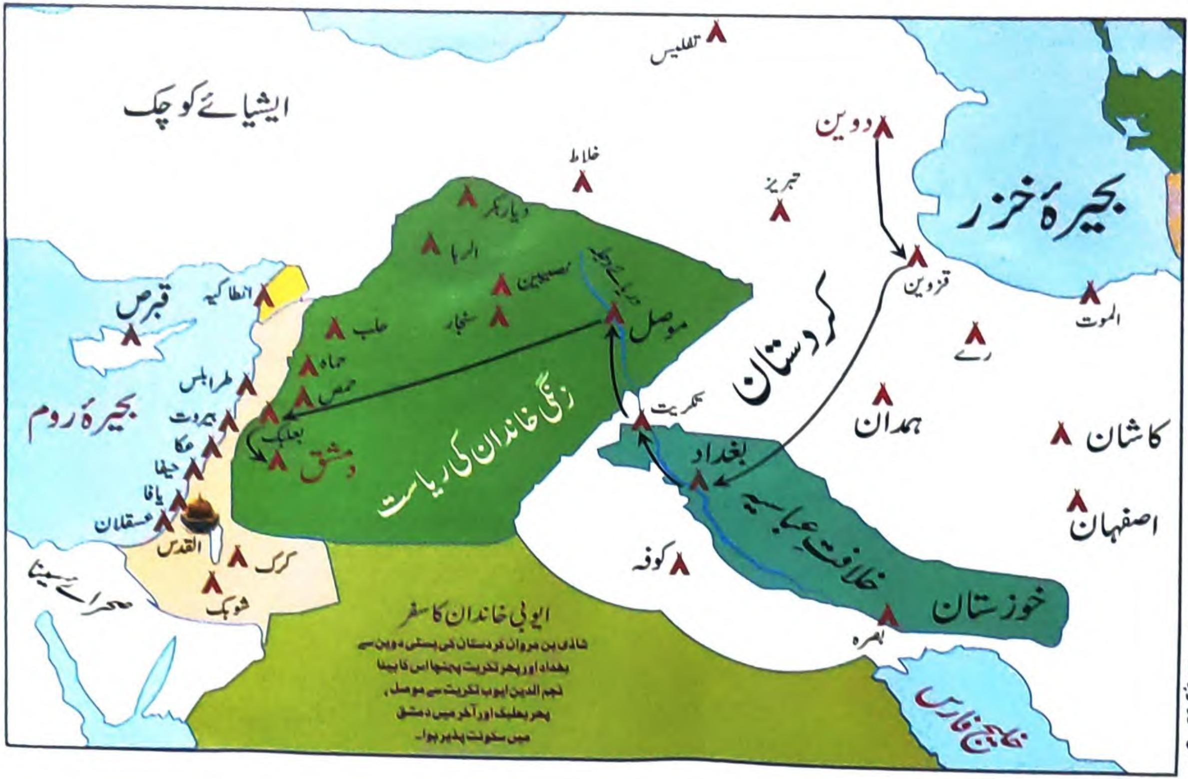

قسطنطنیہ
رومی بازنطینی حکومت
سلطنت سلاجقہ روم
انقرہ
قونیہ
آرمینیا
کردستان
یونان
ارمنی ریاست
الجزیرہ
موصل
حلب
انطاکیہ
روڈس
کریٹ
قبرص
حماہ
طرابلس
حمص
بحیرۂ روم
بیروت
صور
شام
دمشق
عکا
حیفا
قیساریہ
یافا
دمیاط
عسقلان
غزہ
القدس
صحرائے عرب
قاہرہ
ایلہ
مصر
صحرائے اعظم
مدینہ منورہ
اسوان
بحیرۂ احمر
ینبوع
عیذاب
جدہ
مکہ معظمہ
مصر جہاں سے سلطان صلاح الدین ایوبی کا اقتدار شروع ہوا
شام جسے ایوبی نے زنگی کے بعد سنبھالا
حلب جسے سلطان ایوبی نے ۵۷۹ھ میں فتح کیا
سلطان ایوبی کے زیر انتظام حجازِ مقدس
سلطان کے ماتحت الجزیرہ، موصل اور کردستان کے نیم خود مختار علاقے
جنگِ حطین ۵۸۳ھ کے بعد بازیاب کرائے گئے علاقے
معاہدۂ رملہ کے تحت فرنگیوں کے پاس رہ جانے والا علاقہ
فرنگیوں کے وہ علاقے جو سلطان صلاح الدین ایوبی فتح نہ کر سکے


حطین کی جنگ سے پہلے
اسلامی لشکر کی پیش
قدمی کے خطوط
لبنان
شام
بحیرۂ روم
صیدا
صور
عکا
حیفا
قیساریہ
یافا
لُد
رملہ
عمواس
عسقلان
غزہ
رفح
خان یونس
دومہ
دمشق
راس الماء
کسوہ
غباغب
جابیہ
صنمین
قنیطرہ
دمشق سے چلنے والا لشکر
شہزادہ الافضل کے چھاپہ مار دستے
حطین
طبریہ
فیق
سویداء
درعا
(اذرعات)
اربد
بُصریٰ
مفرق
عجلون
جرش
مجدو
جنین
سبسطیہ
طولکرم
نابلس
سلطان صلاح الدین ایوبی کا دمشق سے
کرک جا کر پھر حطین کی طرف پیش قدمی کرنا
سلط
القدس
اریحا
رام اللہ
قسطل
مادبہ
زیزاء
الخلیل
فلسطین
اردن
بحیرۂ مُردار
قطرانہ
کرک
سدوم
مزار
منزل
عربہ


جنوبی شام
(اردن وفلسطین)
بحیرہ روم
عکا
حیفا
بحیرہ طبریہ
طبریہ
دریائے یرموک
ناصرہ
قیساریہ
بیسان
بصریٰ
جنین
دریائے اردن
نابلس
تل ابیب
لد
رام اللہ
رملہ
بیت المقدس
عسقلان
بیت جبرین
مجدل
بیت لحم
غزہ
الخلیل
بحیرہ لوط (بحیرہ مردار)
فلسطین
العریش
کرک
غور
اردن
وادی العریش
مصر
شوبک
مصر
(سیناء)
ایلہ
عقبہ


بحیرۂ روم
خلیج اسکندرونہ
اسکندرونہ
انطاکیہ
دریائے عاصی
عزاز
منبج
حلب
الرہا
حران
راس العین
نصیبین
سنجار
رقہ
جھیل اسد
صفین
دریائے فرات
دریائے خابور
اریحا
معرۃ النعمان
لاذقیہ
جبلہ
خان شیخون
حماۃ
بانیاس
سلمیہ
مصیاف
طرطوس
صافیتا
حمص
قصیر
تدمر
شام
میادین
عراق
دریائے دجلہ
طرابلس
جبل لبنان
جبیل
بعلبک
بیروت
ناصریہ
دمشق
لبنان
صیدا
صحرائے شام
کسوہ
صور
بانیاس
صفد
فلسطین
دریائے اردن
بُصریٰ
اُردن
شمالی شام
آج کل یہ علاقہ موجودہ شام اور لبنان پر مشتمل ہے۔ یاد رہے کہ قدیم شام موجودہ شام اور لبنان کے علاوہ اُردن اور فلسطین (اسرائیل) کو بھی محیط تھا۔


شمالی شام، الجزیرة اور گردونواح کے علاقوں میں
سلطان صلاح الدین ایوبی
کی مہمات
(تلواروں کے نشان سے مراد میدان جنگ ہے)
عراق
الجزیرة
خلاط
آمد
حسن کیفا
میافارقین
دیار بکر
ماردین
نصیبین
الرہا
حران
عزاز
حلب
منبج
البیرہ
دریائے فرات
تل خالد
تل السلطان
جباب الترکمان
رقہ
قرون حماة
حماة
تدمر
حمص
دمشق
دریائے خابور
سنجار
موصل
دریائے زاب اکبر
اربل
دریائے زاب اصغر
دریائے دجلہ
جھیل ارمیہ
سلطان صلاح الدین کی جائے پیدائش
تکریت
جھیل ثرثار
دریائے دجلہ
دریائے فرات
بغداد
مدائن


ایشیائے کوچک
تفلیس
دوین
خلاط
تبریز
بحیرۂ خزر
قزوین
الموت
رے
کردستان
ہمدان
کاشان
اصفہان
دیار بکر
الرہا
نصیبین
سنجار
موصل
حلب
انطاکیہ
قبرص
حماہ
حمص
طرابلس
بیروت
بحیرۂ روم
عکا
حیفا
یافا
عسقلان
بعلبک
دمشق
زنگی خاندان کی ریاست
تکریت
بغداد
خلافت عباسیہ
کوفہ
خوزستان
بصرہ
خلیج فارس
القدس
کرک
شوبک
صحرائے سینا
ایوبی خاندان کا سفر
شادی بن مروان کردستان کی بستی دوین سے
بغداد اور پھر تکریت پہنچا اس کا بیٹا
نجم الدین ایوب تکریت سے موصل،
پھر بعلبک اور آخر میں دمشق
میں سکونت پذیر ہوا۔

تاریخ افغانستان

محمد اسماعیل ریحان



افغانستان کی مکمل تاریخ ۔ زمانہ ماقبل از اسلام سے حالیہ دور تک ۔ افغان کون ہیں؟ صحابہ کرام نے افغانستان میں کس طرح جہاد کیا؟ انہوں نے اسلام کب قبول کیا؟ افغانستان میں کون کون سے حکمران خاندان اقتدار میں رہے؟ ان تمام سوالات کے جواب دیتا ایک تحقیقی شاہکار۔

سوویت روس کے خلاف جہاد، طالبان دورِ حکومت اور امریکا کے خلاف مزاحمتی تحریک کی پوری تفصیلات ۔ ایک ساتھ۔

دو جلدیں ۔ جلد اوّل صفحات:433 جلد دوم، صفحات498

شیرِ خوارزم سلطان جلال الدین خوارزم شاہ اور تاتاری یلغار

محمد اسماعیل ریحان



آٹھ صدیوں میں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے جہادی کارناموں پر والہانہ اسلوب میں لکھی گئی پہلی مفصل کتاب ۔ وہ مردِ مجاہد جس کی شمشیرِ آبدار نے فاتح جہاں سوز چنگیز خان کا غرور خاک میں ملا دیا ۔ وہ شہ سوار جس کے گھوڑے کی جولان گاہ سمرقند و بخارا سے کابل اور غزنی تک وسیع تھی ۔ جس نے دریائے سندھ کے دھارے میں بے خوف و خطر جست لگا دی ۔ خوارزم کے گلستانوں سے قفقاز کے پہاڑوں تک بکھری ہوئی دلوں کو گرما دینے والا ایک ایمان افروز تاریخی و ادبی شاہکار۔

صفحات:554

نظریاتی جنگ کے محاذ

محمد اسماعیل ریحان



نظریاتی جنگ کے مختلف محاذوں کو طشت از بام کرنے والی مفصل کتاب ۔ استشراق، استعمار، تبشیر، عالمگیریت اور سیکولرازم سمیت مختلف طاغوتی ازموں کا بے لاگ تجزیہ ۔ مسلمان دنیا میں اس طرح زبوں حال کیوں ہیں؟ مسلم حکمران متحد کیوں نہیں ہوتے؟ جگہ جگہ علاقائی، لسانی اور فرقہ ورانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ ان تمام سوالات کے تفصیلی جوابات ایک ہی کتاب میں۔ اسلام دشمن طاقتوں کی سازشیں اس طرح بے نقاب کہ آپ قدم قدم پر چونک اٹھیں گے۔

صفحات:400

نظریاتی جنگ کے اُصول

محمد اسماعیل ریحان



عسکری اور نظریاتی جنگ میں کیا فرق ہے؟ استعمار اور استشراق کی تحریکیں کس طرح پروان چڑھیں؟ مشنری ادارے کس طرح مسلمانوں کا ایمان چھین رہے ہیں؟ مسلمانوں کو کس کس طرح سے نظریاتی طور پر گمراہ کیا جا رہا ہے؟ صیہونی ادارے کس طرح کام کر رہے ہیں؟ ایک ایسی کتاب جو آپ کی آنکھوں سے اندھیرے دور کر کے آپ کو روشن حقائق کی دنیا میں لا کھڑا کرے گی۔

ہمہ گیر موضوعات کو مختصر اوراق میں سمیٹ لینے والی ایک کتاب جسے ہر اسکول، کالج اور مدرسے میں داخلِ نصاب ہونا چاہیے۔

صفحات:126

AL - MANHAL

04628

بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009 | 0321-2000870

almanhalpublisher@gmail.com

almanhalpublisher@hotmail.com

www.almanhalpublisher.com